مِصباحُ المجالِس

جلدِ چہارم

مُصنّفہ
سیّدُ المفسّرین
ادیبِ اعظم الحاج مولانا سیّد ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی
بانی جامعہ امامیہ و صدر جامعہ امامیہ کمیٹی

ناشر
ظفر شمیم پبلیکیشنز ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
ناظم آباد ۲ کراچی

مجلسِ اوّل

فضائل حضرت رسولِ خداؐ و وفات آنحضرتؐ

جناب سکینہؑ کا لاشِ پدر سے لپٹ کر رونا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَشَفِیْعِ الْمُذْنِبِیْنَ وَرَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ مِنْ یَّوْمِنَا هٰذَا اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ **اَمَّا بَعْدُ** فَقَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِهِ الْمُبِیْنِ وَکَلَامِهِ الْمَتِیْنِ وَهُوَ اَصْدَقُ الْقَائِلِیْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِهِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِهِ الْحَمِیْدِ

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ط (سورہ الاحزاب ۴۰/۳۳)

(محمد صلعم تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں)

اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ زید بن حارثہ کو جو کہ کم سِن تھا حضور سرکارِ دو عالمؐ نے خرید فرمالیا آپؐ اس پر بے حد شفقت فرماتے تھے اور وہ بھی حضورؐ سے حد درجہ مانوس ہوگیا۔ ایک روز حارثہ، زید کا باپ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگا کہ آپ میرا بیٹا مجھے دے دیں یہی میرا ایک فرزند ہے۔ اس کے بغیر میری زندگی تلخ ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اگر وہ تیرے ساتھ جانا پسند کرے تو شوق سے لے جا۔ اس نے خوش ہوکر بیٹے سے کہا۔ میرے ساتھ چل۔ مگر زید نے صاف انکار کر دیا۔ باپ نے کہا کیا وجہ ہے کہ تو میرے ساتھ نہیں چلتا۔ اس نے کہا تمہارے پاس دنیوی آرام و آسائش کا سامان میرے لئے ہوسکتا ہے لیکن حضور سرورِ انبیاءؐ کے سایۂ عاطفت میں رہ کر مجھے دنیوی راحت بھی نصیب ہے اور آخرت میں نجات کی اُمید بھی۔

عرب کا یہ دستور تھا کہ جو بچہ جس گھر میں پرورش پاتا تھا۔ وہ اُسی گھر والے کا بیٹا کہا جانے لگتا تھا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آذر کے گھر میں پرورش پائی تو لوگ اس کو حضرت ابراہیمؑ کا باپ کہنے اور سمجھنے لگے۔ اسی کے خاورہ کا لحاظ کرتے ہوئے قرآن نے بھی اس کو حضرت ابراہیمؑ کے باپ کے لفظ سے ذکر فرمادیا ہے۔ اسی دستور کے مطابق زید کو لوگ ابن رسول اللہ کہنے لگے۔

عام لوگوں کے لئے تو یہ نسبت قابلِ پذیرائی تھی لیکن خُدا کے برگزیدہ رسولؐ کے لئے باعثِ توہین تھی کیونکہ اول تو رسولؐ اور اولادِ رسولؐ کی طینت عام لوگوں سے جُدا تھی اور اس طینت کے خواص ہی کچھ اور تھے۔ دوسرے اللہ عزوجل نے اس نسل کو کفر و شرک سے پاک رکھا تھا اور نُورِ رسولؐ اور اولاد رسولؐ اصلاب طاہرہ سے ارحامِ طاہرہ کی طرف منتقل ہوتا چلا آیا تھا۔ زید بن حارثہ اس فضیلت میں کیونکر شریک ہوسکتا تھا جبکہ اس کے ماں باپ کافر تھے۔ دوسرے جو اوصاف وراثتاً اولادِ رسولؐ کو ملتے تھے۔ زید بن حارثہ اس کا جامع کیسے ہوسکتا تھا کیونکہ وہ اس طیب و طاہر نسل ہی سے نہ تھا۔ تیسرے عرب کی اس رسمِ بد کو توڑنا بھی منظور تھا کہ وہ کسی غیر کے بچے کو اپنی نسل میں شامل کرلیتے تھے۔

اس لئے خُداوندِ عالم نے اس آیت میں کُھلے الفاظ کے اندر لوگوں کو بتادیا کہ محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں وہ تو اللہ کے رسولؐ ہیں اور پھر خاتم الانبیاءؐ ہیں۔ کیونکر ممکن ہے کہ ان کے اس شرف میں کوئی غیر شامل ہوجائے۔ یہاں یہ شُبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ مردوں میں سے کسی کے باپ نہ تھے تو پھر حسنینؑ کے بھی باپ نہ ہوئے اور اس لئے حسنین علیہما السّلام کو فرزندِ رسولؐ کہنا غلط ہوا۔ اس شبہ کا ازالہ ہم یوں کرتے ہیں کہ آیت میں رِجَالِکُمْ ہے یعنی تمہارے یعنی اُمّت کے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، نہ کہ اپنی اولاد کے بھی باپ نہیں۔ رہا یہ کہنا کہ حسنین علیہما السلام چونکہ رسول اللہؐ کے صُلبی فرزند نہ تھے لہٰذا ان پر اہلبیتؑ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس کے

دو جواب ہیں ایک قرآن مجید سے دوسرے حدیث شریف سے۔ قرآن میں جناب عیسیٰؑ کو اولاد ابراہیمؑ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ حالانکہ حضرت عیسیٰؑ کے باپ نہ تھے معلوم ہوا پوتوں کی طرح نواسے بھی اولاد میں شامل ہوتے ہیں۔ دوسرے مباہلہ کی آیت میں اَبْنَاءَنَا کا لفظ حسنینؑ علیہما السلام ہی کے لئے آیا ہے کیونکہ مباہلہ میں ان دونوں شہزادوں کے سوا اور کوئی بچہ حضرت نبی اکرمؐ کی صلبی اولاد سے آپ کے ساتھ گیا ہی نہ تھا جو مصداق اَبْنَاءَنَا قرار پاتا۔

اب رہا حدیث پاک سے ثبوت تو بسند معتبر آنحضورؐ سے یہ حدیث مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ ذُرِّيَّةَ كُلِّ نَبِيٍّ فِي صُلْبِهٖ وَجَعَلَ ذُرِّيَّتِي فِي صُلْبِ عَلِيِّ بْنِ اَبِي طَالِبٍؑ

(اللہ نے ہر نبی کی ذریت اس کے صلب میں قرار دی ہے اور میری ذریت یعنی اولاد، صلب علی بن ابی طالبؑ میں رکھی۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ

عرب کا یہ دستور تھا کہ وہ بیٹیوں کو بہت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اپنے باعث رسوائی و ذلت سمجھتے تھے چنانچہ اسی بنا پر وہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے اور جو بے چاریاں اس رسم بد کی زد سے بچ جاتی تھیں ان کی اولاد حقیر سمجھی جاتی تھی۔ میراث میں نہ لڑکی کا حصہ تھا نہ اس کی اولاد کا۔ خدا نے ان کے اس عقیدہ فاسدہ کو باطل کرنے کے لئے رسولؐ کو لڑکی دی۔ اور اس لڑکی کی اولاد کو ابنائے رسولؐ قرار دیا میراث رسولؐ میں بھی ان کو شریک بنایا اور اوصاف رسولؐ میں فضل و شرف میں بھی اور روحانی اقتدار میں بھی۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ

۱ آیہ زیر غور میں فرمایا کہ محمدؐ، اللہ کے رسولؐ ہیں اور خاتم الانبیاءؑ ہیں یعنی آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں رسولؐ کا مرتبہ نبیؑ سے زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ رسولؐ صاحب کتاب و شریعت ہوتا ہے۔ پس جب آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی ہی آنے والا نہیں تو رسولؐ کا ذکر ہی کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے جو فضیلتیں حضور سرور دو عالم کو عطا فرمائی تھیں وہ تمام انبیاء کے فضل و شرف سے مرتبے میں زیادہ تھیں۔ اسی لیے آپ کو سید المرسلین کہا جاتا ہے۔

حضور سرکار دو عالمؐ کو بارگاہ باری میں قبل پیدائش وہ تقرب خاص حاصل تھا کہ آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک جتنے انبیاءؑ آئے ان سب سے حضرتؐ کی نبوت اور رسالت کا اقرار لیا گیا اور ان سب پر حضرت کی محبت کو واجب کیا گیا اور یہ فرض قرار دیا گیا کہ وہ حضورؐ کے عالم ظہور میں آنے کی پیشین گوئی اپنی اُمتوں کے سامنے بیان کرتے رہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے جو سلسلہ بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں۔ صاف لفظوں میں حضورؐ کے آنے کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ آپ نے فرمایا!

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (سورہ الصف ۶۱/۶)

(اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف خدا کا رسول ہو کر آیا ہوں اور تصدیق کرنے والا ہوں اس کتاب (توریت) کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دینے والا ہوں اس رسول کی جو میرے بعد آنے والا ہے جس کا نام احمدؐ ہوگا)

اس سے معلوم ہوا کہ پیدائش سے پہلے حضورؐ کا نام احمدؐ تھا لفظ احمد، حمد کا افعل التفضیل ہے یعنی سب سے زیادہ حمد کرنے والا۔ حامد صرف حمد کرنے والے کو کہتے ہیں اور احمد جو سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو پس عالم نور میں حضورؐ سب سے زیادہ خدا کی تعریف کرنے والے تھے۔ آپؐ احمدؐ تھے اور خدا محمود (محمدؐ یعنی تعریف کیا ہوا) اور جب عالم ظہور میں آئے تو خدا احمد و حامد بنا اور آپ محمدؐ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ۔

حضور سرور کائنات کی ولادت باسعادت ایسی سرزمین پر ہوئی جہاں ہر طرف جہالت کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور جہاں بت پرستی اور خود پرستی نے اہل عرب کو انسانی سطح سے کوسوں دور پھینک دیا تھا۔ نوع انسانی کے لیے جتنی بدترین عادتیں اور خصلتیں ہو سکتی ہیں وہ سب اس قوم میں موجود تھیں۔ ان کے انسانیت سوز رسم و رواج نے ان کو حیوانوں سے بدتر بنا رکھا تھا۔ ایسے ضلالت آگین دور میں سرکار دو عالمؐ کا ظہور ہوا۔ پیدا تو ایسے خاندان میں ہوئے جس کا فضل و شرف بیں طوطی بول رہا تھا۔ اور جس کی سیادت و شرافت کے سامنے عرب کے بڑے بڑے سرکشوں کے سر جھکتے تھے۔ لیکن خلاق عالم نے اپنی قدرت کاملہ کا یہ کرشمہ دکھایا کہ ماں باپ دونوں کا سایہ آپ کے سر سے اٹھا لیا۔ دو ماہ کے تھے کہ آپ کے والد ماجد جناب عبداللہؑ کا انتقال ہو گیا اور آپ چار سال کے تھے مادر گرامی جناب آمنہؑ کی آغوش شفقت و تربیت سے محروم ہو گئے ایسے یتیم کو جس کی نہ ماں تھی نہ باپ۔ پہلے شفیق دادا جناب عبدالمطلبؑ نے پرورش کیا۔ ان کے مرنے کے بعد آپؐ کے شفیق چچا جناب ابو طالب علیہ السلام نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ایک ایسا بچہ جس کا دل ماں باپ کے مرنے سے ٹوٹا ہوا ہو۔ جس کے مربی و محسن ایک کے بعد دیگرے اس سے جدا ہوتے جاتے ہوں۔ جس نے کسی درس گاہ میں تعلیم نہ پائی ہو۔ جس کی تہذیب اخلاق کا کوئی خاص بند و بست نہ ہو وہ اس حال میں لوگوں کے سامنے آتا ہے۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانہ چند ملت بشست

وہ جس کی تعریف میں شاعر کہتا ہے ؎

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ
کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ
صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ آلِہٖ

کون سی آسمانی کتاب تھی جس کا نور آپؐ کے سینے میں نہ تھا۔ کون سی امت تھی جس کی کارگزاریاں آپ کے پیش نظر نہ تھیں۔ تہذیب اخلاق کا کون سا باب تھا جو آپ کے سامنے کھلا ہوا نہ تھا۔ ہدایت انسانی کا کون سا راستہ تھا جس پر آپ کے قدم

نہ تھا۔ یہ ہی ثبوت تھا اس بات کا کہ آپ خدا کے رسول ہیں۔ یہی ثبوت تھا اس کا کہ آپ درس گاہ من لدن کے تعلیم یافتہ تھے۔ یہی ثبوت تھا اس بات کا کہ آپ کی صنف عام اصناف مردم سے جدا تھی۔

بعثت کے بعد آپ نے اپنی تبلیغ و ہدایت کا کام ایک ایسے ناموافق ماحول میں شروع کیا جہاں انسانیت سر بکف کر رہی تھی۔ عقلِ بشری جاہلانہ رسم و رواج کے سیلاب میں بہی چلی جا رہی تھی۔ جہاں خدا پرستی کے نام سے لوگوں کو چڑ تھی۔

سرکار دو عالم کی ایک ذات تھی اور بے شمار محاذوں پر اعلانِ جنگ۔ آپ کا مقابلہ ان بت پرستوں سے تھا۔ جو ایک دو نہیں تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا کرنے والے تھے۔ آپؐ کا مقابلہ ان یہودیوں سے تھا جو عزیز نبی کو ابن اللہ کہتے تھے۔ آپ کا مقابلہ ان عیسائیوں سے تھا جو مسیح کو ابن اللہ کہتے تھے۔ آپؐ کا مقابلہ ان زندیقوں سے تھا جو کہتے تھے ہم کو زمانہ ہلاک کرتا ہے ہم پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں یہ سب مادّہ کی سحر کاریاں ہیں۔ آپؐ کا مقابلہ ان احمقوں سے تھا جو ستاروں کو اپنا معبودِ حقیقی سمجھتے تھے، آپ کا مقابلہ ان عقل کے دشمنوں سے تھا جو خدا کو مادّی شکلوں میں دیکھنے والے تھے۔ آپ کا مقابلہ اس قوم سے تھا جو آگ کو خدا سمجھ رہی تھی۔ آپ کا مقابلہ ان لوگوں سے تھا جن کا محبوب مشغلہ قتل و غارت، شراب خواری و زناکاری، چوری اور سینہ زوری، ظلم پسندی و فتنہ پروری سے تھا۔

غور کرو ایک ایسا بےکس و بےبس انسان جس کے پاس نہ مال و دولت تھی نہ جاہ و حشمت، نہ زور نہ زر نہ خاندانی قوت نہ قوم کی حمایت۔ لیکن جب وہ اپنے بازوؤں میں خدائی زور اور اپنی زبان میں وحی کی قوت لے کر اٹھا تو اس نے بات کتنے ملک عرب کی کایا پلٹ دی کہ عقلِ انسانی حیرت میں آگئی اور خدا کا برگزیدہ دین تمام ادیان پر غالب آگیا۔

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (سورہ التوبہ ۹/۳۳) ۲۳ سال کی روح فرسا اور جانکاہ جدوجہد کے بعد تمام عرب اور اس کے ملحقہ ممالک اس کی مٹھی میں آگئے اور لوگوں کا یہ حال ہوا يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (سورہ النصر ۱۱۰/۲)

یہ تھی ہمارے رسولؐ کی رسالت۔ نعرہ صلوٰت

ایک بار قریش نے حضرت رسولِ خدا سے سوال کیا آپؐ کو تمام انبیاءؑ پر فضیلت کس وجہ سے ہے حالانکہ آپؐ سب سے آخر میں آئے ہیں۔ فرمایا میں خدا پر سب سے پہلے ایمان لایا ہوں۔ اور میں سب سے پہلا نبی ہوں جس نے روز الست سب سے پہلے خدا کی ربوبیت کا اقرار کیا اور بَلٰی کہا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا اللہ کی ذات واجب الوجود ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا جب کوئی چیز بھی نہ تھی تو خدا نے سب سے پہلے ایک نور خلق فرمایا یہ نور محمدؐ و علیؑ تھا اس کے بعد ہر شے خلق ہوئی۔ یہ نور جہاں خلق ہوا تھا شب معراج خدا نے اپنے نبیؐ کو بلا کر بھر وہی مقام دکھایا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں کسی بشر کے قدم جانے کا تو ذکر ہی کیا۔ فرشتہ بھی بلکہ ان سب کا سردار جبرئیل بھی نہیں جا سکتا۔

ابوبصیر نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا حضورؐ کو کتنی بار معراج ہوئی فرمایا دو بار۔ جب حضورؐ معراج کے لئے تشریف لے گئے تو جبرائیل نے ایک مقام پر ٹھہر کر کہا۔ اے حبیبِ خدا یہ وہ مقام ہے جہاں نہ کوئی فرشتہ پہنچا نہ کوئی نبی۔ خداوند عالم درود بھیجتا ہے۔ پوچھا درود کیا ہے؟ عرض کیا وہ فرماتا ہے:

سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ اَنَا رَبُّ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَالرُّوحِ سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ غَضَبِیْ

نبی اکرمؐ نے یہ سن کر فرمایا: اَللّٰھُمَّ عَفْوَکَ عَفْوَکَ

ابوبصیرؒ نے کہا یا ابن رسول اللہ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کیا ہے آپ نے فرمایا وہ حجاب عظمت و جلال باری ہے، اس سے زیادہ بتانے کا حکم نہیں۔

فرمایا حضرت ابوعبداللہ نے جو مقامِ قربت و منزلت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہے انسانی عقول اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ ایک بار آنحضورؐ نے لوگوں کے درمیان خطبہ پڑھا۔ پھر اپنا داہنا ہاتھ اُٹھا کر کوئی شئے مٹھی میں لی اور لوگوں سے پوچھا بتاؤ اس میں کیا ہے لوگوں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جاننے والا ہے فرمایا یہ نام ہیں اہل جنت اور ان کے آبا کے اور ان کے خاندان کے جو قیامت تک ہونے والے ہیں اور دوسری مٹھی میں اہل دوزخ اور ان کے آبا کے نام ہیں۔

حضور سرور انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی ایسی خصوصیات عطا فرمائی تھیں جو دوسرے انبیاء کو نہیں ملیں۔ یہ خصوصیات بے شمار ہیں۔ میں ان میں سے چند ایک اس مجلسِ فیض آثار میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

- حضور خاتم الانبیاء اور آپ کی شریعت کاملہ ہے جو قیامت تک باقی رہنے والی ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہوگا، کیونکہ خداوند عالم اکمال دین اور اتمام نعمت کا مژدہ غدیر خم میں آپ کو سنا چکا ہے۔ آپ کا دین تمام ادیانِ عالم کا ناسخ ہے اور سب پر غالب آنے والا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ (سورہ التوبہ ۹/۳۳) بلحاظ دلائل و براہین تو اس دین کو غلبہ ہر زمانہ میں ہی رہا ہے۔ لیکن خصوصیت سے اس کا غلبہ ظاہر ہوگا جب حضرت کے بارہویں نائب حضرت حجت عجل اللہ فرجہ ظہور فرمائیں گے۔

- دوسری خصوصیت آپ کی وہ مقدس کتاب ہے جو آپ پر نازل ہوئی جو ناسخ ہے تمام کتب سابقہ کی اور جس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی مثل کوئی ایک سورت بھی بنا کر نہیں لا سکتا۔ اگرچہ تمام جن و انس بھی مل کر کوشش کریں یہ خصوصیت بھی اس کتاب کی ہے کہ اس کے اندر خلاق عالم نے ہر شئے کو لکھ دیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (سورہ الانعام ۶/۵۹)

- تیسری خصوصیت آپ کی یہ ہے کہ خدا نے آپ کے ذوی القربیٰ کی محبت کو آپ کی اُمت پر واجب کیا ہے۔ اور بلحاظ اہمیت دانا دیت اس مودت کو اجر رسالت قرار دیا ہے سوائے حضورؐ کے کسی نبی کی آل کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو خصوصیت آپؐ کے ذوی القربیٰ میں تھی وہ دوسرے انبیاء کی اولاد میں نہ تھی۔

چوتھے آپؐ کی اُمّت، خیرالامم ہے جیسا کہ فرماتا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (سورہ آل عمران ۳/۱۱۰)
لیکن یہ خیرِ اُمت صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو آپ کے نشانِ قدم پر چلنے والے ہوں اور خدا کی نافرمانی انہوں نے کسی حالت میں بھی نہ کی ہو۔ فساق و فجار، ظلم پسند و بدکردار کو خیرِ اُمت نہیں کہا جا سکتا۔

- پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ پر اور آپؐ کی اولاد پر درود و سلام بھیجنے کا حکم ہے۔ اگر چہ ابراہیمؑ اور اولادِ ابراہیمؑ پر بھی صلوٰۃ بھیجی جاتی ہے۔ لیکن اس کا حکم وجوبی نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ اس صلوٰت کا تعلق صرف بندوں سے ہے۔ اور محمدؐ و آل محمدؐ پر صلوٰت کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ اور ملائکہ بھی اس صلوٰت میں شریک ہیں، اور ایمان والوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم بھی درود و سلام بھیجو۔ چونکہ صلّوا علیہ وسلّم امر کے صیغے ہیں لہذا یہ حکم وجوب پر دلالت کرتا ہے اور استمرار کے ساتھ کیونکہ جب تک اللہ اور ملائکہ صلوٰۃ بھیجیں گے۔ ایمان والوں پر بھی اس کا وجوب ثابت ہوگا۔

- چھٹے حضرت موسیٰ و عیسیٰ کی طرح آپ کے بھی بارہ وصی تھے لیکن ایک خصوصیت ایسی ہے کہ وہ انبیائے سابقین کے اوصیا کے لئے نہیں اور وہ یہ ہے کہ انبیائے سابقین کے اولیاء کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب ان میں سے کوئی باقی نہیں لیکن حضورؐ کے بارہویں وصی اب تک دُنیا میں موجود ہیں چونکہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے اوصیاء ختم ہونے والے تھے اور محافظ شریعت کوئی باقی رہنے والا نہ تھا لہذا ان کے ادیان منسوخ کر دیئے گئے اور شریعتِ محمدی اس لئے قیامت تک باقی ہے کہ اس کا ایک محافظ و حامی ہر زمانہ میں موجود رہا اور قیامت تک موجود رہے گا۔

- ساتویں آپؐ پر اور آپؐ کے اہل بیت پر صدقہ کو حرام کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ میل کچیل ہے ایسی مقدس ہستیوں سے جن کو اللہ نے ہر رجس ظاہری و باطنی سے پاک کیا ہو، اس کا تعلق ان کی توہین و تذلیل ہے۔ عام امت صدقہ خوار ہے نکہ اہل بیت رسولؐ ان کا حق خمس میں ہے جس کے ایک حصہ کا مالک خدا بھی ہے، عام لوگوں کو اہل بیتؑ کے فضل و شرف میں شریک کرنا انتہائی غلطی ہے کیونکہ صدقہ کھانے والے الگ ہیں۔ جن پر صدقہ حرام ہے وہ الگ اُمت والے اس صدقہ میں اسی سطح پر ہیں جس پر اور تمام بنی نوع انسان ہیں۔ ہر دین میں صدقہ کا رواج ہے اور عام لوگ اس کو کھاتے پیتے ہیں لیکن خمس ایک ایسا پاک صاف حق ہے جس میں ایک حصّہ خدا نے بھی اپنا قرار دیا ہے۔ اللہ رسولؐ اور ذوی القربیٰ کے حصّے ہی جداگانہ ہیں اس میں کسی کو شرکت کا حق نہیں۔

آٹھویں۔ آپؐ جس طرح آگے سے دیکھتے تھے پیچھے سے بھی دیکھتے تھے اور یہ خصوصیت آپؐ کے اہل بیتؑ میں بھی منقول ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کی زرہ میں پشت کا حصّہ نہ تھا۔ کسی نے پوچھا آپؑ پشت کی حفاظت کا بندوبست کیوں نہیں کرتے فرمایا جب میں دشمن کی طرف پشت ہی نہیں کرتا تو پھر اس کی ضرورت کیا اس نے کہا اور جو کوئی پشت کی طرف سے آکر وار کر دے فرمایا اگر کوئی پشت کی طرف سے آتا ہے تو میں اسے دیکھ لیتا ہوں۔

- نویں۔ آپ تمام اُمّ سابقہ کے اعمال کے گواہ روزِ قیامت ہوں گے اور کسی نبیؐ کے لئے یہ خصوصیت نہیں خدا فرماتا ہے

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (سورہ النساء ۴/۴۱)
اس روز ہم ہر اُمّت کو اس کے گواہ کے ساتھ بلائیں گے اور اے رسولؐ تم ان سب پر گواہ ہو گے۔
دسویں۔ ملک الموت آپؐ کے اذن کے بغیر آپ کی رُوح قبض نہیں کر سکتا۔ سوائے آپؐ کے اور کسی نبیؑ کو یہ خصوصیت نصیب نہ ہوئی نیز یہ کہ آپؐ کو آپ کی موت کے وقت سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ جب جبرئیلِ امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (سورہ الزمر ۳۰/۲۹) تو اس کے ساتھ فرمایا۔ خدا فرماتا ہے اب دنیا سے آپؐ کے رخصت ہونے کا وقت آگیا ہماری ملاقات کے لئے تیار ہو جیئے۔
حضورؐ نے یہ سُن کر گریہ فرمایا کسی نے کہا یا رسولؐ اللہ، آپؐ موت کے خوف سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: موت سے ڈر کر نہیں رو رہا۔ بلکہ تنگیٔ قبر ظلمت قبر اور احوالِ قیامت کے تصوّر سے رو رہا ہوں۔
ایک روز حضرتؐ نے اپنے اصحاب کو جمع کر کے فرمایا: لوگو، اب میں عنقریب تم سے جُدا ہونے والا ہوں میں دو گراں قدر چیزیں تم میں چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ کی کتاب، دوسرے اپنی عترت۔ یہ دونوں حوض کوثر پہنچنے سے پہلے ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گی۔ میں وہاں تم سے سوال کروں گا کہ تم نے میرے اہلِ بیتؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دیکھو ان کے بارہ میں کوتاہی نہ کرنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ تم ان کو سکھانا پڑھانا نہیں یہ تم سے زیادہ جاننے والے ہیں۔
منقول ہے کہ جب حضرت کو مرض الموت لاحق ہوا تو آپؐ، امیرالمومنینؑ اور چند دیگر حضرات کے ساتھ جنت البقیع میں تشریف لے گئے اور فرمایا: مجھے اہلِ بقیع کے لئے استغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: السلامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ اس کے بعد دیر تک ان کے لئے دُعائے مغفرت کرتے رہے اور امیرالمومنینؑ سے فرمایا: جبرئیل میرے اُوپر ہر سال ایک بار قرآن پیش کرتے تھے اس سال دو بار ایسا کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ میری موت کا وقت آگیا ہے میں ہر چیز سے زیادہ لقاءِ الٰہی کا مشتاق ہوں۔ وہاں سے محزون و مغموم خانہ ام سلمہؓ میں تشریف لائے۔ انہوں نے کہا یا رسولؐ اللہ میں نے آج سے پہلے آپ کو اس طرح ملول نہیں دیکھا اس کی کیا وجہ ہے۔ فرمایا اب میرے مرنے اور تم سے جُدا ہونے کا وقت آ رہا ہے۔ میری پارہ جگر آنکھوں کی ٹھنڈک فاطمہؑ کو بلاؤ۔ جب فاطمہ آئیں تو آپؐ نے اپنے سینے سے لگا کر فرمایا: بیٹی! اب تم عنقریب اپنے باپ سے جُدا ہونے والی ہو۔ اس کے بعد کوئی خیال آیا کہ حضرت زار زار رونے لگے۔ مومنین غالباً سیّدہ عالم کی مصیبت کا زمانہ یاد آگیا ہو گا۔ سیّدہ بھی رونے لگیں فرمایا بیٹی صبر سے کام لو اس کے بعد حسنؑ و حسینؑ کو بلایا۔ امام حسن علیہ السلام کے لبوں پر بوسے دیئے۔ اور امام حسینؑ کے گلوئے مبارک کو بار بار چُوما۔ اور دونوں نواسوں کو چھاتی سے لپٹا کر دیر تک روتے رہے اس وقت حضرت کی نظر کے سامنے وہ تمام ہولناک مناظر تھے۔ جو آپؐ کے بعد آپؐ کے اہلِ بیت کے سامنے آنے والے تھے لکھا ہے جب حضرت پر مرض کی شدّت ہوئی

تو جناب سیدہ نے اپنے گھر رہنا چھوڑ دیا۔ ہر وقت آپؐ کی خدمت میں لگی رہتیں۔ آپؐ بار بار حسینؑ کو گلے لگاتے تھے امیر المومنین علیہ السلام سے سرگوشیاں کر کے کچھ راز کی باتیں بتلاتے تھے۔

ابن عباس سے منقول ہے کہ مرض الموت میں جب حضور پر شدت ہوئی اور آپ غشی کے عالم میں تھے تو کسی نے دق الباب کیا جناب سیدہ نے پوچھا کون ہے۔ اس نے کہا کہ میں ایک مرد غریب ہوں۔ مجھے اجازت دو کہ رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کروں۔ فرمایا اے شخص جو تیری حاجت ہو بیان کر یہ وقت حضرت سے ملنے کا نہیں وہ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد پھر دق الباب کیا اور داخلہ کی اجازت چاہی جناب سیدہؑ نے کہا نہ معلوم یہ کون شخص ہے کہ منع کرنے پر بھی باز نہیں آتا۔ اس وقت حضرت ہوش میں تھے۔ فرمایا زہرا یہ وہ ہے جو جماعتوں میں تفرقہ ڈالتا ہے لذات کو قطع کرتا ہے بچوں کو ماں باپ سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کر دیتا ہے۔ یہ ملک الموت ہے یہ کسی سے اجازت کا طالب نہیں ہوتا۔ بیٹی، یہ تمہارے گھر کا احترام ہے کہ وہ اجازتِ دخول چاہ رہا ہے۔ یہ سننا تھا کہ جناب سیدہؑ بے تاب ہو کر رونے لگیں۔ والدہ کو روتا دیکھ کر حسنین بھی روئے۔ رسول اللہؐ نے جناب فاطمہؑ کو اپنے قریب بلا کر فرمایا۔ بیٹی صبر کرو عرض کی بابا آپ کی جدائی پر مجھے کیوں کر صبر آسکتا ہے میں کڑھ کڑھ کر مر جاؤں گی۔ فرمایا اے بیٹی! صبر کر عنقریب تم مجھ سے آ کر ملو گی۔ میرے خاندان میں سب سے پہلے مجھ سے ملنے والی تم ہی ہو۔

امیر المومنین علیہ السلام کو قریب بلا کر اپنی چادر میں لیا اور دیر تک سرگوشی کرتے رہے۔ لوگوں نے جب امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا کہ رسول اللہؐ نے مرتے دم آپ سے کیا باتیں کی تھیں تو فرمایا حضورؐ نے مجھے ہزار باب علم کے تعلیم کئے اور پھر ہر باب سے ایک ایک ہزار باب علم کا میرے اوپر اور منکشف ہو گیا۔

جب آپ کی زندگی میں چند سانس باقی تھے تو امیر المومنینؑ سے فرمایا یا علیؑ! مجھے غسل تم ہی دینا۔ تم ہی میری تجہیز و تکفین کرنا۔

حضورؐ کی موت کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ عالم ارضی و سماوی کی تمام مخلوق پر رنج و ملال کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ اس واقعے کا اثر علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ پر تھا۔ دل ہلا دینے والے تصورات دل و دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ آہ اب وحی کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ آہ اب فرشتوں کی آمد و رفت بند ہو جائے گی۔ آہ خیر و برکت کے بادل جو اس گھر پر چھائے ہوئے رہتے تھے۔ اب وہ کہاں نظر آئیں گے۔

اسلام سر پیٹ رہا ہے ایمان گریبان چاک ہے۔ سیدہؑ اشکوں سے اپنے دامن بھگو رہی ہیں۔ علی مرتضیٰ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار نہیں تھمتا۔ حسینؑ دہاڑیں مار مار کر رو رہے ہیں۔ زینبؑ و کلثومؑ پچھاڑیں کھا رہی ہیں۔ وَا مُحَمَّدَاہُ وَا اَبَتَاہُ وَا جَدَّاہُ کے نعروں سے زمین و آسمان ہل رہے ہیں۔ سب سے بڑا دلگداز منظر جو ان غم نصیب سوگواروں کے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ رسولؐ کا جنازہ تیار ہے۔ مگر گھر والوں کے سوا کوئی اس پر

نوحہ کرنے والا کوئی اس کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرنے والا، قبر تک پہنچانے والا نظر نہیں آتا۔ کہاں گئے وہ لوگ جو کل تک ان کے جاں نثار بنے ہوئے تھے اور شمع رسالت کے پروانے کہلاتے تھے۔

اگر کسی قوم کا سردار، کسی محلہ کا امیر، یا کسی گروہ کا رئیس مر جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور صاحبانِ عزا کو تسلّی و دلاسا دیتے ہیں، تجہیز و تکفین میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں لیکن آہ کیا زمانہ کا انقلاب ہے کہ یہ کیا دُنیا کی ریت ہے کہ دین و دُنیا کا شہنشاہ، اسلام کا تاجدار، مسلمانوں کا ہادی برحق، محسنِ اعظم دُنیا سے اٹھ گیا اور کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔

جب رسولؐ اس مدینہ میں ہجرت کر کے آئے تھے تو کیسا جوش و خروش تھا۔ ہمدردی کے جذبات کا کیسا اُبھار ہر طرف سے جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ سرکارِ دو عالمؐ کے قدم چومے۔ اپنا مہمان بنائے۔ آہ! آج وہی رسولؐ مدینے سے رخصت ہو رہا ہے تو اس کے جنازے کے پاس اس کے خاندان والوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ کیسا بھیانک سماں ہے کیسا دلدوز منظر ہے۔ سوگوار بیٹی کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ علی مرتضیٰؑ کیسے گہرے خیال میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔

آج گرم اور ٹھنڈی محبت کا پتہ چلا ہوگا۔ آج ظاہری و باطنی محبت کے رُخ سے نقاب اُلٹی ہوگی۔ آج اُبھری ہوئی شخصیتوں کے سمجھنے کا پہلا موقعہ آیا ہوگا۔

خدا کا حبیبؐ، نبیوں کا سردارؐ، رسولوں کا تاجدارؐ سپردِ خاک کر دیا گیا، اور لوگوں کو پتہ نہ چلا کہ حادثۂ عظمیٰ کس دن اور کس تاریخ ہوا۔ معمولی لوگوں کے مرنے کا دن اور تاریخ یاد رہتی ہے لیکن مسلمانوں کے حافظے نے جواب دیا تو رسولؐ کی تاریخ وفات اور رحلت کے دن کے متعلق

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

اس موت نے سیدہؑ کے رگ رگ میں درد پیدا کر دیا تھا۔ سکون و اطمینان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لیا تھا۔ رات دن یادِ پدر میں مُنہ ڈھانپ کر رویا کرتی تھیں۔ صبر دلانے والے صبر دلاتے تھے مگر یہ وہ مصیبت نہ تھی جس پر صبر غالب آجاتا، راتوں کو آہیں تھیں، دن میں دہاڑیں۔ موذّن جب اذان میں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہتا، سیدہؑ کے دل پر چھریاں چل جاتیں۔ بے اختیار زبان سے نکلتا۔ آہ اے اذان دینے والے اب وہ محمدؐ کہاں ہیں جن کی رسالت کی تو گواہی دے رہا ہے۔

(روئیں اور اتنا روئیں کہ اہل محلہ کی نیند حرام ہو گئی۔ کچھ لوگ جمع ہو کر امیر المومنینؑ کے پاس آئے اور کہا کہ سیدہؑ کے رونے نے ہماری نیندوں میں خلل ڈال دیا ہے۔ ان سے کہیئے یا تو دن میں رو لیا کریں یا رات کو۔ امیر المومنینؑ نے جب دل شکستہ نبی زادی سے یہ شکایت بیان کی تو فرمایا یا علیؑ ان سے کہہ دو کہ تم چین سے سوؤ، آرام سے رہو۔ چند روز

کے بعد تم اس رونے والی کو اس دنیا میں نہ پاؤ گے۔ اس کے بعد معمول ہو گیا کہ حسنؑ یا حسینؑ کو ساتھ لے کر علی الصبح جنت البقیع میں جاتیں اور شام تک یاد پدر میں اشک فشانی کرتی رہیں۔ ایک روز بڑے دردناک لہجے میں امیر المومنینؑ نے فرمایا: یہ غم میرے دل سے کبھی نہ جائے گا کہ باپ کے غم میں لوگوں نے مجھے جی بھر کر رونے بھی دیا۔

میں عرض کرتا ہوں السیدۂ عالم آپ کچھ دن، تو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد رولیں، گھر میں نہ سہی جنت البقیع ہی میں سہی۔ آپ کے دل کی کچھ تو گرمی نکل گئی ہوگی۔ آنسو بہا کر کچھ تو تسکین حاصل ہوئی ہوگی لیکن اس یتیم بچی کا کیا حال ہوا ہوگا جو اپنے باپ کی لاش پر دم بھر بھی نہ رو سکی۔ سیدۂ عالم آپ نے اپنے پدر بزرگوار کا اٹھتا جنازہ تو دیکھ لیا۔ قبر میں دفن ہوتے تو دیکھ لیا۔ صفِ ماتم تو بچھالی۔ محلہ کی عورتوں کا پرسہ تو لے لیا، مگر آہ سکینہ کو تو ان میں سے ایک بات بھی نصیب نہ ہوئی اس بچی نے تو وہ ہولناک منظر دیکھے کہ ان کے تصور سے کلیجہ پھٹتا ہے۔

خیمے کے دروازے پر سکینہ اس انتظار میں کھڑی ہیں کہ بابا میدان جنگ سے واپس آتے ہوں گے۔ میرے لیے پانی لاتے ہوں گے کہ یکایک فوجِ دشمن میں یہ آوازیں بلند ہوئیں۔ قُتِلَ الْحُسَيْنُ بِكَرْبَلَاءَ وَذُبِحَ الْحُسَيْنُ بِكَرْبَلَاءَ بچی سہمی ہوئی خیمے میں آئی۔ ماں اور پھوپھی سے لپٹ کر رو کر کہنے لگی۔ آہ! یہ کیسی آوازیں ہیں کیا میرے بابا قتل کر دیئے گئے کیا میں یتیم ہو گئی۔ ہائے بابا جان میں آپ کو کہاں ڈھونڈنے جاؤں۔ اچھی پھوپھی مجھے میرے بابا جان تک پہنچاؤ۔ میں اپنے بابا جان سے شکایت کروں گی کہ آپ مجھے چھوڑ کر کیوں چلے آئے۔ خیمہ میں کہرام بپا ہے۔ ہر بی بی گریبان چاک سر پر خاک وَاحُسَيْنَاهُ وَمَظْلُومَاهُ کے نعرے مار رہی ہے۔ بچی ان کی یہ حالت دیکھ کر سہمی جاتی ہے۔ ہر ایک سے فریاد کر رہی ہے۔ مجھے بابا جان تک پہنچا دو۔

آہ ابھی سیدانیاں سر و سینہ پیٹ ہی رہی تھیں کہ دشمن لوٹنے کے لئے خیموں میں آ گھسے۔ ایسا لوٹا کہ کسی بی بی کے سر پر چادر اور پیر میں خلخال تک نہ چھوڑی۔ کاش اسی پر اکتفا کرتے۔ خیموں میں آگ لگادی۔ سیدانیاں بدحواس ہر طرف پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ مگر ان بے کسوں کے لئے پناہ کہاں۔

اس عالمِ اضطراب میں بچے پراگندہ ہو گئے۔ سکینہ بھی وَا اَبَتَاهُ وَا اَبَتَاهُ کے نعرے مارتے قتل گاہ تک آگئیں۔ اور ایک لاش سے لپٹ کر اپنی مصیبت بیان کرنے لگیں۔ تلاش کرتی ہوئی جب جناب زینب وہاں پہنچیں تو فرمایا بیٹی یہ تم کس کی لاش سے لپٹی رو رہی ہو۔ عرض کی پھوپھی اماں یہ میرے پدر بزرگوار کی لاش ہے۔ فرمایا بیٹی! تم نے کیسے پہچانا۔ لاش کی پہچان یا تو سر سے ہوتی ہے یا لباس سے۔ ظالموں نے اس تنِ بے جان پر نہ سر کو چھوڑا نہ لباس کو۔ سکینہ نے کہا پھوپھی اماں جب اس میدان میں ہر طرف وَا اَبَتَاهُ وَا اَبَتَاهُ کہتی پھرتی تھی تو اس لاش سر بریدہ سے آواز آئی يَا بُنَيَّةَ اِلَيَّ اِلَيَّ میری پیاری بیٹی ادھر آ۔ تیرا مظلوم باپ یہیں سر کٹائے پڑا ہے بس میں سمجھ گئی کہ میرے بابا جان کی لاش یہی ہے۔

ایک طرف تو جناب زینب بھائی کی لاش سے لپٹی رو رہی تھیں۔ جناب سکینہ مظلوم باپ کے زخمی سینے سے چمٹی ہوئی تھیں کہ شمر جفاکار نے دیکھ لیا۔ دوڑا ہوا آیا اور کہا یہ کون لاش سے لپٹا ہوا ہے۔ جلد ہٹ جاؤ اب ہم ان لاشوں کو پامال کریں گے۔ تم نہ ہٹو گی تو ٹاپوں سے کچلی جاؤ گی۔ یہ سنتے ہی جناب زینبؑ کا عجب حال ہوا۔ واہ محمداہ واجداہ کے نعرے مارتی ہوئی اس خیال سے ہٹ گئیں کہ یہ ظالم بازو پکڑ کر نہ ہٹانے پائے سیدہ کی بیٹی کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ان کو نامحرم کا ہاتھ لگے۔ مگر سکینہ کسی طرح جدا نہ ہوتی تھیں۔ شمر نے بڑھ کر بچی کا بازو پکڑا، اور زمین پر دے پٹکا۔ بچی بلبلا گئی۔ جناب زینبؑ نے بچی کو گود میں لیا اور آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ خداوندا، ہم تیرے نبیؐ کی آل ہیں آہ ہم پر وہ ظلم ہو رہا ہے جو کسی نبی کی اولاد پر نہ ہوا ہوگا ہمارے بچے اور جوان گوسفندان کی قربانی کی طرح ذبح کیے گئے۔ ہمارا پھلا پھولا باغ تیغوں سے کاٹا گیا۔ پالنے والے تو دیکھ رہا ہے کہ یہ ظالم ہم پر کیا کیا ظلم کر رہے ہیں۔ ہماری گودیں خالی ہو گئیں۔ ہمارے وارثوں کا سایہ ہمارے سروں سے اٹھ گیا۔ اب ہم ان ظالموں کے نرغے میں بے لبس و بیکس ہیں۔ نہ کوئی یار و مددگار ہے۔ نہ مونس و غمگسار پالنے والے تو ہی اس کا بدلہ ان اشقیا سے لینے والا ہے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

مجلسِ دوم

مودّت اہلبیتؑ کے متعلق قیامت میں سوال

مصائب جناب سیدہؑ۔ امام حسینؑ کی مدینہ سے رخصت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا (سورہ بنی اسرائیل ۱۷/۳۶)

(قیامت کے دن، آنکھ کان، اور دل سے ان سب سے اس چیز کے متعلق سوال کیا جائے گا)

روز قیامت ہر انسان سے اس کے ایک ایک عمل کی پرسش ہوگی اور جس نے نیک و بد جو کچھ کیا ہوگا اس کی سزا و جزا اس کے لحاظ سے ملیگی فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ۝ (سورہ الزلزلۃ ۹۹/) (جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کا بدلہ پائے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اس کا بدلہ پائے گا) کیسا سخت دن ہوگا خدا پناہ میں رکھے۔ سورج سر کے قریب ہوگا۔ زمین تو سے سے زیادہ گرم ہوگی۔ نامۂ اعمال گلے میں پڑا ہوگا ذرا ذرا سی بات کی جواب طلبی ہوگی گرمی کا یہ عالم ہوگا کہ چوٹی کا پسینہ ایڑی تک جا رہا ہوگا۔ دماغ کھول رہے ہوں گے۔ ایسی حالت میں قیامت کے دن کھڑے کھڑے جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہ ایک دن ہماری دنیا کے اعتبار سے پچاس ہزار برس کا ہوگا۔ اتنی طویل مدت تن بدن کو جھلس دینے والے دھوپ میں کھڑا رہنا اور پھر اس پر عادل حقیقی کی سرکار میں اپنے گناہوں کی جواب دہی ایک ایسا ہولناک

منظر ہوگا۔ اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

پھر بےکسی دبے‌بسی کا یہ عالم کہ ہر شخص اپنی مصیبت میں گرفتار ہوگا۔ نہ تاب رفتن نہ روئے ماندن ہر طرف نفسی نفسی کی پکار ہوگی۔ بھائی بھائی سے بھاگے گا۔ باپ بیٹے سے۔ جورو شوہر سے کسی کی فریاد کا سننے والا نہ ہوگا۔ اس قہار و جبار اور عادل کی سرکار میں نہ کسی کی سعی و سفارش کام دے گی۔ نہ بدلہ کی کوئی صورت نکلے گی، نہ کسی کی رُو رعایت ہوگی، نہ کوئی بات چھپائے بنے گی۔ نہ کسی حیلہ و فریب سے کام چلے گا، دنیوی سطوت و جبروت کی داستانیں یہاں نہ دھرائی جائیں گی۔ مال و زر کی کہانیاں دماغوں سے نکلی ہوئی ہوں گی۔ ہزاروں جھوٹ بولنے والی زبان پر مہر سکوت لگادی جائے گی کسی کی زبان سے کوئی بات نہ سُنی جائے کیونکہ زبان کا اعتبار ختم ہوچکا ہوگا۔ اب تو وہاں بولنے والے بے زبان اعضا ہوں گے جو دُنیا میں کبھی نہ بولے تھے انسان ان کو اپنے اعضا سمجھا تھا۔ حالانکہ وہ خدائی جاسوس تھے جیساکہ خداوند عالم نے فرمایا ہے۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝ (سورہ یٰسین ۳۶/۶۵)

اس روز ہم ان کے منہوں پر مہر لگادیں گے اور ان کے پاؤں اور ہاتھ جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس کی گواہی دیں گے اب انسان گھبراکر پوچھے گا لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ہ (تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی) وہ کہیں گے قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ (حم السجدہ ۴۱/۲۱) ہمکو اس خدا نے ناطق کیا ہے جس نے ہر شئے کو گویائی عطا فرمائی ہے) سُن لیا آپ نے ؎

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

یہ دنیوی بادشاہوں کا دربار نہیں یہ مالک الملک کی سرکار ہے۔ جن اعضا کو ہم اپنا سمجھتے تھے وہ درحقیقت ہمارے نہ تھے۔ وہ خدا کے جاسوس بن کر ہمارے ایک ایک عمل کے گواہ بنتے جارہے تھے۔ جو زبان یہاں گویا ہے وہ وہاں خاموش ہوگی اور جو اعضا یہاں خاموش ہیں وہ وہاں چہکتے ہوں گے۔ ایسی صورت میں کتنا غافل اور دشمن عقل ہے وہ انسان جو ان اعضا کو اپنا سمجھ کر ان سے وہ کام لیتا ہے جو مرضی الہیٰ کے خلاف ہیں۔

ابتدائے کلام میں جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں خصوصیت کے ساتھ تین چیزوں سے سوال کئے جانے کا ذکر ہے۔ اوّل کان، دوسرے آنکھ، تیسرے دل۔ اس مادّی دُنیا میں تو یہ تینوں گونگے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان سے سوال کرکے جواب کی اُمید کرنا حماقت ہے۔ کیونکہ ان کے نہ زبان ہے نہ ان میں قوت بیان مگر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے خصوصیت کے ساتھ سوالات ہوں گے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کانوں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے ہمارے رسولوں اور نبیوں کی ہدایت کو سُنا تھا یا نہیں، وہ جواب دیں گے ضرور سُنا تھا، پھر آنکھوں سے سوال ہوگا کہ تم نے آثار قدرت کو دیکھا تھا یا نہیں۔ ہماری مخلوق کو دیکھ کر ان کے پیدا کرنے والے کا پتہ چلایا تھا یا نہیں۔ پھر قلب سے سوال ہوگا کہ جو کچھ کانوں نے سُنا اور آنکھوں نے دکھایا تھا تو نے اس میں تدبر کیا تھا یا نہیں۔ اگر کیا تھا تو پھر کیا وجہ کہ سب دیکھ کر ہمارے وجود سے انکار کیا یا ہمارے احکام کی خلاف ورزی کی بتا اس کا کیا جواب ہے۔

یہ تو وہ تفسیر ہے جو مفسرین عامہ نے بیان کی ہے۔ ہمارے لئے یہ قابلِ قبول نہیں۔ اس قسم کے سوالات تو ہاتھوں سے بھی کئے جاسکتے ہیں کہ تم نے ہمارے حکم کے خلاف کسی مظلوم کو کیوں مارا تھا، کسی کا مال کیوں چرایا تھا۔ پیروں سے بھی سوال ہوسکتا ہے تو تم نے سرقہ یا زنا یا قتل کے لئے کیوں چلے تھے، رُک کیوں نہ گئے۔ دماغ سے بھی یہ سوال ہوسکتا تھا کہ تو نے وہ باتیں کیوں سوچیں جو میری مرضی کے خلاف تھیں، زبان سے بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ تو نے لقمہ حرام کیوں کھایا تھا۔ ان سوالات کے لئے کان اور دل کو کیوں مخصوص کیا اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (سورہ بنی اسرائیل ۳۶) میں عنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال کسی ایک خاص کے متعلق ہوگا نہ کہ تمام اعمال کے متعلق۔ اس کی گواہی تو جیسا ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں دیں گے ہی۔ یہ تو کوئی بہت ہی خاص چیز ہے جس کے متعلق ان ہی تین اعضا سے سوال ہوگا۔

اب ہم کو یہ غور کرنا ہے کہ کوئی خاص سوال یہاں ہم سے ایسا کیا گیا ہے جس کا جواب دینا وہاں لازم ہوگا اور اس سلسلے میں کان اور آنکھ اور دل تینوں کی جواب دہی کرنا ضروری ہوگا۔ اگر یہ سوال تمام اعمال سے متعلق ہوتا تو عنہ کی بجائے عنھا ہوتا۔ جمع بصورت مونث۔ لیکن یہاں ایسا نہیں یہ سوال تو صرف ایک اکیلی بات ہی سے متعلق ہے۔

بھول جائیں بھولنے والے یہ دوسری بات ہے لیکن ایک سوال رسولؐ نے اپنی تمام اُمت سے کیا تھا اور وہ رسولؐ کی طرف سے نہ تھا۔ بلکہ خدا کی طرف سے تھا جیسا کہ قرآن میں اس کا ذکر ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۔ (سورہ الشوریٰ ۲۳/۴۲) یعنی میں تم سے کوئی اجر رسالت نہیں چاہتا مگر یہ کہ میرے ذوی القربیٰ سے محبت کرو۔ اس کے متعلق اُمت نے جو کچھ کیا ہوگا قیامت میں اسی کی باز پرس ہونی ہے۔ یہ سوال صرف عہد رسولؐ کے مسلمانوں ہی سے متعلق نہ تھا بلکہ قیامت تک ہونے والے تمام مسلمانوں سے اس کا تعلق تھا۔

یہ معمولی سوال نہیں کہ اس کے متعلق سختی سے باز پرس نہ ہو بلکہ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کو اجر رسالت قرار دیا گیا ہے یعنی جس نے یہ اجر ادا نہ کیا اس نے گویا رسولؐ کی رسالت سے یا تو انکار کیا یا اس کی توہین و تحقیر کی۔

رسول اللہؐ نے یہ بھی بتادیا تھا کہ خدا نے جن کی محبت کو واجب کیا ہے وہ کون لوگ ہیں۔ ان کے نام ایک ایک کرکے بتادیئے تھے کہ یہ علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ اور نو امام اولاد حسینؑ سے ہیں ان ہی کی محبت پر میری رسالت کا اجر موقوف ہے۔

اگر کہا جائے کہ ذوی القربیٰ سے مراد ہر شخص کے رشتہ دار ہیں جن سے صلہ رحم کرنے کی شریعت میں اس وجہ سے تاکید ہے کہ بغیر اس کے تمدن و معاشرت میں امن و امان برقرار نہیں رہ سکتا اور احکام دین کے معطل ہوجانے کا اندیشہ ہے لہذا خدا نے اس کو اجر رسالت قرار دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صلۂ رحم کی ضرورت تو ہر زمانہ میں رہی ہے۔ لوگوں کے ذوی القربیٰ بھی ہر زمانہ میں رہے ہیں

کیا وجہ کہ کسی نبی یا رسول کی نبوت و رسالت کا یہ اجر معین نہیں کیا گیا۔ ہر نبی کے زمانہ میں صلہ رحم کی تاکید ہوتی رہی، توریت میں اس کا ذکر، انجیل میں اس کا ذکر۔ لیکن آدم سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک لوگوں کے رشتہ داروں کی محبت کو کسی رسولؑ کا اجر رسالت قرار نہیں دیا گیا۔ یہ تو مخصوص حکم ہمارے رسولؐ ہی کے لئے ہے۔

اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہر نبی کے رشتہ دار ختم ہو گئے۔ اور وہ سب معصوم بھی نہ تھے۔ برخلاف ذوی القربیٰ رسولؐ کے کہ ان کا سلسلہ قیامت تک چلنے والا ہے اور وہ سب کے سب معصوم ہیں چونکہ شریعت محمدی قیامت تک باقی رہنے والی ہے لہٰذا ہر زمانے میں اس کا محافظ بھی ہونا ضروری ہے اور پھر اس محافظ کی اطاعت بھی لازم ہے اور اطاعت بغیر محبت نہیں ہو سکتی برخلاف اور انبیاء کے کہ ان کی محبت واجب کیوں ہو۔

رسولؐ خدا نے حدیث ثقلین بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمادیا تھا کہ میں تم سے روز قیامت جب کہ قرآن اور میری اہلبیت میرے پاس آئیں گے تو میں تم سے یہ سوال کروں گا کہ تم نے ان دونوں کے ساتھ کیا کیا۔

رسول کا کلام وحی ہے جو کچھ آپ نے فرمایا ہے غلط نہیں ہو سکتا۔ آپ ضرور سوال کریں گے چنانچہ مفسرین نے لکھا ہے کہ جب لوگوں کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو جائے گی حساب کتاب کے بعد جنت والے جنت کی طرف اور دوزخ والے دوزخ کی طرف چلنے لگیں گے تو ایک آواز آئے گی وَقِفُوهُمْ إِنَّهُم مَّسْئُولُونَ (سورہ الصافات ۲۴/۳۷) ان کو روک لو ابھی ان سے کچھ سوال کرنے ہیں) یہ کہنے والے حضرت رسولؐ خدا ہوں گے اور کوئی خاص سوال کرنے کے لئے ان کو روکا جائے گا کیونکہ تمام اعمال کے متعلق تو حساب کتاب ختم ہو چکا تھا۔ اب نئے سوال کی ضرورت کیوں پیش آئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ سوال ایسا اہم ہے کہ بغیر اس کا صحیح جواب دیئے جنت میں داخلہ ممکن نہ ہوگا۔

یہ وہی سوال ہوگا جس کا ذکر اوپر ہو چکا یعنی اجر رسالت تم نے ادا کیا یا نہیں اگر کیا تو کس صورت سے اور نہیں کیا تو کیوں آیا وہ تم پر بار تھا تمہاری طاقت سے زیادہ تھا یا تم نے اس حکم ربانی کو ذلیل و حقیر سمجھا تھا یا مجھ سے تم کو عداوت تھی کہ میرے احسان کا بدلہ اُلٹا دیا۔

اب یہ سوال کان سے ہوگا۔ آنکھ سے ہوگا اور دل سے ہوگا یعنی زبان سے جواب طلب نہ کیا جائے گا بلکہ مذکورہ اعضا سے پوچھا جائے گا کیونکہ حجت ان ہی کے جواب سے تمام ہوگی۔

پہلے کانوں سے سوال ہوگا کیا تم نے میری ان احادیث کو نہیں سُنا تھا جن میں میں نے بتایا کہ جو میرے ذوی القربیٰ کو دوست رکھے گا میں بھی اس کو دوست رکھوں گا اور خدا بھی دوست رکھے گا تم نے پوچھا تھا کہ ذوی القربیٰ کون ہیں تو میں نے کھلے لفظوں میں بتادیا تھا کہ وہ علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ اور نو امام حسینؑ سے ہیں۔

تم پر حجت تمام کرنے کے لئے میں نے ایک ایک کا نام لے کر بتادیا تھا کہ جو علیؑ کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے۔ جو فاطمہؑ کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے جو حسنؑ کا دوست ہے میرا دوست ہے جو حسینؑ کا دوست ہے میرا دوست ہے۔

اور جو ان کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔ میرے یہ کلمات میرے زمانوں والوں نے سُنے اور ان کے ذریعے سے دوسروں نے ان کے ذریعے سے ان کے کانوں نے سُنے اور قیامت تک سُنتے رہے۔ کیا اس سے انکار ہے۔ لیکن اس سے انکار کریں گے کیونکہ اس لئے کہ جن کانوں نے سُنا تھا وہ تصدیق کر رہے ہیں۔

اسی طرح آنکھوں سے سوال ہوگا کہ کیا تم نے مجھے اپنے ذوی القربیٰ سے محبت کرتے نہیں دیکھا تھا میں نے جب غدیرخُم میں علی کو اپنا جانشین بنایا تھا جب میں نے ان کا بازو پکڑ کر اُٹھایا تھا کیا تم نے ان آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا جب میں نے مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ کہا تھا تو کیا تم نے نہیں سُنا تھا۔ جب میں نے وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ کہا تھا تو کیا تم نہیں سُن رہے تھے۔ پس جب سُنا بھی تھا اور دیکھا بھی تھا تو بتاؤ میرے ذوی القربیٰ کو تم نے کیوں ستایا۔ بتاؤ بجائے محبت کے تم نے ان کی عداوت کو اپنے اُوپر کیوں واجب کیا تھا۔

اب دلوں سے سوال ہوگا تم پتھر یا لوہے کے تو نہ تھے۔ کیا تم نے اپنے احسان کو فنا کر دیا تھا کیا میرے قول و فعل سے تم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے تھے کہ رسول کا منشا یہ ہے کہ ان کے اہل بیت سے محبت کی جائے ان کی اطاعت کو دینی فریضہ سمجھا جائے۔

یہ ہیں وہ سوالات جو لوگوں کو ٹھہرا کر رسول کریں گے اور جنہوں نے اجر رسالت ادا نہ کیا ہوگا ان کو جنت کی بجائے دوزخ میں بھیجیں گے۔ کیونکہ نیکیاں اس وقت نیکیاں قرار پاسکتی تھیں جب کہ رسولؐ کی ہدایت پر عمل کیا جاتا ورنہ خالی خولی عبادت مستحق جنت نہیں بنا سکتی اسی لیے کسی نے کہا ہے۔

بے حُبِ اہل بیتؑ عبادت حرام ہے۔

قرآن کہتا ہے عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً (سورہ الغاشیۃ ۸۸/۳) سب سے سخت سے سخت عمل کرنے والے ہوں گے مگر وہ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے) یہ ایسے ہی لوگ ہوں گے۔ جنہوں نے اُجر رسالت نہ ادا کیا ہوگا۔ صرف کلمۂ توحید زبان پر جاری کرنا نجات آخرت کے لئے کافی نہیں۔

منقول ہے کہ جب مامون رشید نے امام رضا علیہ السلام کو اپنی ولی عہدی کے لئے بلایا اور حضور کی سواری خراسان میں پہنچی تو محمل پر ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ لوگوں نے خواہش کی کہ یابن رسولؐ اللہ بے شمار لوگ مشتاق دیدار ہیں اور زیارت کے شوق میں دُور دُور سے آئے ہوئے ہیں۔ جمال مبارک دکھا کر ہمارے شوق کو پورا کیجئے۔ حضرت نے محمل کا پردہ اُٹھا دیا۔ لوگوں نے درود و سلام کے نعرے بلند کئے اور خواہش کی حضور اپنی زبان مبارک سے اپنے جدّ کی کوئی حدیث بیان فرمائیں۔ لوگ معصوم کی زبان سے حدیث پاک سننے کو ترس گئے تھے۔ امام علیہ السلام نے ان کی خواہش کو قبول فرمایا۔ جب آپ نے بیان فرمانے کا ارادہ کیا تو بیس ہزار قلمدان حدیث لکھنے کے لئے کُھل گئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔

"لوگو، میرے جد رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔ قَالَ مَنْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ وَلَاكِنْ بِشَرْطِهَا وَشُرُوْطِهَا وَاَنَا مِنْ شُرُوْطِهَا۔

یعنی لوگو! جس نے لاالٰہ الا اللہ کہا جنّت اس پر واجب ہوئی لیکن کچھ شرطوں کے ساتھ اور ان شرطوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ اس اجمال کی تفصیل وہی ہے جس کا ذکر اُو پر ہوا یعنی جب تک ذوی القربیٰ رسول کی محبّت و اطاعت نہ ہوگی صرف لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ دینا کافی نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اقرار توحید کے بعد احکامِ الٰہیٰ کی تعمیل کا نمبر آتا ہے اور عمل کی صحت موقوف ہے معصوم کے عمل کی ناسی پر اور ایسا جب ہی ہوسکتا ہے۔ کہ ہر زمانے میں ایک معصوم کا وجود باقی رہے تاکہ وہ صحیح عمل لوگوں کو بتاتا رہے۔ جنّت اعمال ہی کی جزا ہے اور اعمال کی مقبولیت کا دارومدار ہے۔ علم صحیح پر اور علم صحیح ودیعت ہے کتاب خدا میں۔ پس جس کے سینے میں کتاب خدا کا علم ہوگا وہی صحیح عمل بتاسکے گا۔ اسی لئے رسولؐ نے فرمایا تھا کہ لوگو! میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک خدا کی کتاب اور دوسرے اپنے اہل بیت۔ جب تک تم ان دونوں سے میرے بعد تمسک رکھوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ اور یہ دونوں جدا نہ ہوں گے جب تک حوض کوثر پر میرے پاس نہ آجائیں۔ اس سے مقصد حضرت کا یہ ہی تھا کہ علم کے لیے کتاب کو چھوڑتا ہوں اور عمل کے لیے اپنے اہل بیت کو۔ جب تک ان دونوں کا تمسک نہ ہوگا۔ نجات حاصل نہ ہوگی۔

چونکہ سوائے اہل بیت رسولؐ اس اُمت میں کوئی معصوم ہوا اور نہ ہوگا لہٰذا قرآن کے ساتھ ان ہی کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ غیر معصوم سے سب کچھ ممکن ہے وہ آیات قرآن کی غلط تاویل بھی کرسکتا ہے وہ غلط مصداق بھی بتاسکتا ہے وہ اپنے غلط علم ہونے کی وجہ سے اپنے عمل میں بھی غلطی کرسکتا ہے اور عمل کی غلطی کھُلی گمراہی ہے۔ لیکن اگر ہادی قوم معصوم ہے تو یہ خطرے اس کی ذات سے خارج ہوں گے۔

خدا و رسولؐ نے جو ذوی القربیٰ کی محبّت کو واجب کیا تھا اس کا مقصد صرف یہی تھا کہ امت محمدی گمراہی سے بچی رہے مگر افسوس ہے کہ ان لوگوں نے رسولؐ کی اس ہدایت پر عمل نہ کیا اور ان کے اہل بیتؑ کے ساتھ وہ عمل کیا کہ اگر خدا نخواستہ ان کی عداوت کو واجب کردیا گیا ہوتا تو شاید اس سے زیادہ نہ کرتے۔

حجاج اور ایک سیّد علوی کی گفتگو سنیئے۔

حجاج :۔ میں نے سُنا ہے کہ تو لوگوں سے یہ کہتا ہے کہ علیؑ و حسنؑ و حسینؑ کو اُمت کے تمام مردوں پر فضیلت حاصل ہے۔

سیّد :۔ میں تو وہی کہتا ہوں جو خدا نے کہا۔

حجاج :۔ (غضب ناک ہوکر) اس کا ثبوت دے ورنہ ابھی تیری گردن اُڑا دوں گا۔

سیّد :۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا جو حق بات ہے وہ ضرور کہوں گا۔ یہ بتا کہ خدا نے رسولؐ کی رسالت کا اجر اُن کی محبّت کو قرار دیا ہے یا ذوی القربیٰ کی۔

حجاج :۔ ذوی القربیٰ کی مگر اس سے مراد نہ علیؑ ہیں نہ حسنؑ و حسینؑ بلکہ حضرت کے تمام رشتہ دار ہیں۔
سیّد :۔ حضرت کا رشتہ دار تو ابو لہب بھی تھا کیا اس کی محبت بھی واجب کی گئی ہے۔
حجاج :۔ تو بیوقوف ہے میری مراد ان رشتہ داروں سے ہے جو مسلمان تھے۔
سیّد :۔ نسبی رشتہ دار یا سببی۔
حجاج :۔ نسبی ہوں یا سببی اس میں کیا فرق ہے۔
سیّد :۔ سببی رشتہ دار حضرت عثمان تھے لوگوں نے ان کو کیوں قتل کیا نسبی رشتہ داروں میں کیا حضرت علیؑ شامل نہیں، تو ان کو کیوں برا کہتا ہے اور ان سے کیوں عداوت رکھتا ہے اور ان کے دوستوں کو کیوں قتل کرتا ہے۔
حجاج :۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جتنے بھی حضرت کے قرابت دار ہیں وہ سب مراد ہیں۔
سیّد :۔ یعنی ان کی محبت سب پر واجب ہے۔
حجاج :۔ ایسا نہیں ہے جو اچھا سلوک کرے اس سے محبت کی جائے گی۔
سیّد :۔ آیت تو یہ نہیں بتاتی۔ دوسرے پھر یہ خصوصیت ذوی القربیٰ رسولؐ ہی کی کیوں ہے۔ جو کوئی بھی اچھا سلوک کرتا ہے فطرتاً اس کی محبت ہو جاتی ہے۔
حجاج جب جواب سے عاجز ہوا تو اس سید زادہ کے قتل کا حکم دے دیا۔
افسوس صد افسوس رسولؐ کے وہ مخصوص قرابت دار جن کی محبت خدا نے واجب کی تھی۔ رسول نے جن کے تمسک سے نجات کو وابستہ کیا تھا ایک دن اس دنیا میں چین سے نہ رہنے پائے۔ رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی دنیائے اسلام کا رنگ بدل گیا اور یک لخت لوگوں کی نگاہیں ان سے پھر گئیں۔
دنیا کی کسی قوم نے اپنے ہادیٔ دین کی اولاد کے ساتھ یہ ظالمانہ طریقہ اختیار نہیں کیا جو مسلمانوں نے اپنے نبی کی اولاد سے کیا۔

بنی اسرائیل باوجودیکہ نہایت سرکش اور جہالت کے مجسمے تھے لیکن انہوں نے جناب ہارون کی اولاد کی وہ قدر کی کہ ان سے منسوب ہر شے کو تبرک سمجھا۔ تابوت سکینہ جس کا ذکر قرآن میں ہے اس کے اندر یہ تبرکات ہی تو تھے جیسا کہ قرآن میں ہے وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ (سورہ البقرہ ۲/۲۴۸) یعنی آل موسیٰ و ہارون نے جو چیزیں چھوڑی تھیں وہ اس صندوق میں تھیں۔ خدا فرماتا ہے تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ (سورہ البقرہ ۲/۲۴۸) اس صندوق کو ملائکہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ اللہ رے تبرکات انبیاء کی عظمت اس میں کسی کا جوتا کسی کا عمامہ کسی کی ردا تھی۔ بنی اسرائیل ہمیشہ اس صندوق کو اپنے ساتھ رکھتے تھے اور جس خیمے میں وہ رکھا جاتا تھا۔ بحالتِ نجاست اس کے اندر نہ جاتے تھے اس کی طرف پشت کرکے نہ بیٹھتے تھے۔ اس کی طرف پاؤں نہ پھیلاتے اس کے ذریعے سے ہر قسم کی خیر و برکت کے خواہاں ہوتے تھے۔ یہ صرف ان تبرکات کی تعظیم تھی۔ جو انبیاء یا اولاد انبیاء کی طرف نسبت

رکھتے تھے۔ رہی اولادِ جناب ہارون اس کی تعظیم کا تو ٹھکانا ہی کیا ہے۔ وہ اپنے تمام قضیئے ان سے فیصل کراتے تھے۔ ان کی خدمت کے لئے ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب زادے بیمار ہوئے تو تمام بنی اسرائیل میں کہرام مچ گیا ہر شخص بارگاہ باری میں دعا کرتا تھا کہ ان کے بدلے میں میری جان لے لی جائے لیکن اُمّتِ محمدیؐ نے جو کچھ آنحضرتؐ کی اولاد سے کیا وہ ظاہر ہے کسی ایک فرد کو چین سے نہ رہنے دیا۔

ایک بات یہاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ مذکورہ آیت میں وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسٰى وَآلُ هٰرُونَ (سورہ البقرہ ۲/۲۴۸) ہے۔ مسلمان مفسروں سے یہ بات قابلِ استفسار ہے کہ جناب موسیٰ کے جب اولاد ہی نہ تھی تو یہ آلِ موسیٰ کا ذکر کیوں کیا گیا۔ مفسرین نے اس پر بحث ہی نہیں کی کیونکہ یہ ایک چبھتی ہوئی بات تھی۔ بعض لوگوں نے ضرور یہ لکھا ہے کہ آلِ موسیٰ سے مراد آلِ ہارون ہے لیکن آگے کو خاموش رہے ہیں۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ اگر موسیٰ کے بھائی کی اولاد ان کی اولاد کہی جا سکتی ہے تو پھر علی علیہ السلام کی اولاد، اولادِ محمد مصطفےٰ کیوں نہیں بن سکتی۔ آلِ ہارون کو آلِ موسیٰ اسی لئے کہا گیا کہ وہ حضرت موسیٰ کے خلیفہ، جانشین اور شریک کارِ رسالت تھے۔ پس جب حدیث رسولؐ نے اس کی صراحت کر دی کہ علیؑ کی منزلت آنحضورؐ کے نزدیک وہی تھی جو ہارون کی منزلت موسیٰ کے نزدیک تھی تو اس مساوات کا لحاظ رکھتے ہوئے کیوں نہ کہا جائے کہ آلِ علیؑ آلِ نبیؐ تھی۔ بالخصوص جب کہ رسولؐ نے اس حدیث میں صراحت کر دی ہے اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ ذُرِّيَّةَ كُلِّ نَبِيٍّ فِيْ صُلْبِهٖ وَجَعَلَ ذُرِّيَّتِيْ فِيْ صُلْبِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍؑ

بنی اسرائیل کا ذکر چھوڑیئے۔ ذرا ان لوگوں کی احسان شناسی پر ایک نظر کیجئے جن کو ہم مشرک و کافر کہتے ہیں یعنی ہنود، ان کے اوتار، ان کے بھگوان رام چندر جی کی مدد لنکا کے فتح کرنے میں ایک بندر نے کی تھی جس کا نام ہنومان تھا۔ ہندوؤں نے اس کے احسان کو اتنا عظیم الشان سمجھا کہ اس کی پوجا کرنے لگے۔ اس کے بُت کے لئے علیحدہ مندر ہنومان گڑھی کے نام سے بنوا دیا۔ اس کی اولاد کی یہ تعظیم و توقیر لاکھوں برس گزر جانے کے بعد بھی اس حد تک اس فرقہ میں ہے کہ اگر کوئی بندر کو ستانے کا قصد کرے تو وہ مارنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ جب تک بندروں کو کھانا نہیں دے دیتے خود نہیں کھاتے جس کا دل چاہے اس بے پناہ عقیدت کو اجودھیا، بنارس، متھرا اور بندرابن جا کر دیکھ لے۔ بندر کی یہ عظمت محض اس لئے ہے کہ وہ اس بندر کی نسل سے ہیں جس نے ان کے دینی رہنما، رام چندر کی مدد کی تھی۔

افسوس صد افسوس کافروں کی احسان شناسی کا تو یہ عالم اور مسلمانوں کی بدخواہی اور سرد مہری کا یہ حال اولادِ رسولؐ کو کبھی محبت کی نظر سے دیکھا ہی نہیں۔

علیؑ اور حسنؑ و حسینؑ کو چھوڑ دو۔ اچھا وہ اولاد نہ سہی۔ لیکن جناب فاطمہ زہراؑ کی بیٹی ہونے سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کے ساتھ جو عمل درآمد ہوا۔ آج تک اس غم انگیز داستان کو لوگ نہیں بھولے۔ اور اہلِ دل جب کبھی اس کو سنتے ہیں دل پر قابو نہیں رہتا اور بے اختیار آنسو آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں۔

ہمارے نبی کے ایک ہی بیٹی تھیں جس سے حضورؐ کو ایک ایسی محبت تھی کہ اس کی نظیر نہیں ملتی اس کو اپنے کلیجے کا ٹکڑا کہا اس کی اذیت کو اپنی اذیت فرمایا۔ اس کے بچوں کو اپنی اولاد فرمایا۔ وہ لاڈلی بیٹی باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہو گئی جیسا کہ معصومہ عالم فرماتی ہیں ؎

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْاَنَّهَا صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

(میرے اوپر ایسے مصائب نازل ہوئے کہ اگر دنوں پر پڑتے تو راتیں بن جاتے)

جناب سیدہ صدیقہ طاہرہؑ ہیں نہ جھوٹ بول سکتی ہیں نہ مبالغہ سے کام لے سکتی ہیں۔ ضرور آپ کو کچھ ایسے شدید مصائب کا سامنا ہوا کہ ایسا فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ شہزادیؑ کونینؑ کے مصائب کی ایک طولانی فہرست ہے کس کی طاقت ہے کہ اس کو بیان کر سکے۔

پہلے تو شفیق باپ کی جدائی بجائے خود ایک مصائب و آلام کا پہاڑ تھی۔ پھر جنازہ رسول میں لوگوں کا شریک نہ ہونا پُرسے کے لئے نہ آنا امیر المومنینؑ کا خلافت سے محروم ہو جانا۔ سیدہ کا ترکہ پدری اور ہبہ پدری سے محروم ہو جانا۔ پھر امیر المومنینؑ کی گرفتاری کے لئے آپ کے گھر پر لوگوں کا چڑھ آنا۔ گھر کو پھونک دینے کی دھمکی دینا۔ دروازہ کا پہلوئے مبارک پر گرنا اور حمل محسن کا ضائع ہو جانا وغیرہ وغیرہ ایسے سخت مصائب ہیں کہ انسان تصور کرے تو کلیجہ پھٹ جائے لیکن ان کے صبر اُن ہی کے ساتھ تھے۔ جمیل تو گئیں مگر صحت سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ رحلتِ رسولؐ کے بعد ایک دن چین نصیب نہ ہوا۔ غموں کے ہجوم سے گھلتی ہی چلی گئیں کمزوری کا یہ عالم تھا کہ دن میں روتے روتے کئی بار غش ہو جاتی تھیں۔ بار بار حسنؑ و حسینؑ کو چھاتی سے لگا کر کہتی تھیں۔ بچو! تمہارے نانا جان کہاں گئے۔ آہ! تمہیں شفقت سے اپنی گود میں بٹھانے والا، تمہارا پیار سے منہ چومنے والا، تمہاری ہر ہٹ کو پورا کرنے والا اب کہاں۔

یوں تو ہر بیٹی کو اپنے باپ کے جدا ہونے کا صدمہ فطرتاً ہوا ہی کرتا ہے۔ اس حزن و ملال کی زیادتی کے خاص اسباب تھے اول یہ کہ خاتم المرسلین۔ سید النبین جیسا باپ ہمیشہ کے لئے چھوٹا۔ دوسرے وحی کا سلسلہ منقطع ہوا۔ تیسرے آنحضرتؐ کے انتقال کے بعد خلاف اُمید واقعات پیش آئے اور اپنا مستقبل اور اپنے شوہر اور بچوں کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا ایک نازک دل میں غم کے سو کانٹے چبھے ہوئے تھے۔ ان مصائب کو جھیلا جہاں تک جھیلا گیا آخر تابکے یہی صدمات خاتون جنت کی جان لیوا بن گئے۔ اور آخر چھ ہی ماہ بعد وہ وقت آگیا کہ سیدہ عالمؑ دنیا سے گزر گئیں۔

سیدہؑ کی زندگی میں جو تھوڑا سا پاس لحاظ لوگوں کو اس گھر کا تھا وہ بھی رخصت ہوا اور لوگ امیر المومنینؑ سے اپنی عداوت کا اظہار کھلم کھلا کرنے لگے۔

سیدہؑ عالم کے ساتھ جو برتاؤ مسلمانوں نے کیا وہ اس نتیجہ تک پہنچ رہا تھا کہ اس گھر کا روحانی اقتدار ختم ہوا جب۔ نبی

بنی زادی اس ماحول میں چین سے زندگی کے چند دن نہ گزار سکی تو بھلا آنحضرتؐ کے اور رشتہ دار تو کیا سکون اور اطمینان سے زندہ رہ سکتے۔ یہ اندیشے روز بروز تقویت پکڑتے چلے گئے اور ذوی القربیٰ رسولؐ سے عداوت نئے سے نئے رنگ بدل کر اپنے ظالمانہ انداز دکھاتی رہی۔ حضرت رسولؐ خدا نے جو جو پیشن گوئیاں کی تھیں اپنے اپنے وقت پر وہ سب پوری ہوتی چلی گئیں اب تک ان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی تدبیر خفیہ کی جاتی تھیں۔ سازشوں سے کام لے کر ان کو ہلاک کیا جاتا تھا۔ دبی چوٹیں دے کر مارا جاتا تھا اور حکومت صحیح اسباب کو چھپانے اور مصنوعی اسباب پیدا کرنے میں اپنے خزانوں کا منہ کھول دیتی تھی اور کسی کو پتہ نہ چلتا تھا کہ زہر آلود تلواریں اور زہر ہلاہل سے بھری پڑی کہاں سے آئی ہیں اور کن ہاتھوں تک پہنچتی ہیں۔

یزید کے وقت میں جو لوگ ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیل رہے تھے وہ چہرے سے نقاب اُلٹ کر کھلے منہ سامنے آگئے۔ اب صاف لفظوں میں ولید حاکم مدینہ کو لکھ رہا تھا کہ حسینؑ کو بلا کر میری بیعت لے اور در صورت انکار ان کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دے۔ اب حسینؑ کا رسولؐ سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ اب ذوی القربیٰ سے محبت کرنے کے معنی ان سے شدید عداوت کرنے کے تھے۔ اب ان کے روحانی اقتدار میں کوئی وزن نہ تھا۔ ان کے گھر والوں کا کوئی احسان حکومت اسلامی کی گردن پر نہ تھا اسلامی فتوحات میں اس گھر کا کوئی ہاتھ نہ تھا اور اسلامی سلطنت کی داغ بیل بنی اُمیہ نے ڈالی تھی اس لئے ان کو ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہو گیا تھا۔

دُنیا یہ سب تماشے دیکھ رہی تھی اور خاموش تھی۔ بنی اُمیہ کی قہرمانی سلطنت اور باطل پرستوں کی سینہ زوریاں اور تشدد پسندیاں اپنے آہنی شکنجے میں ہر اس شخص کو کھینچنا چاہتی تھیں۔ جس سے مخالفت کا ہلکا سا بھی اندیشہ تھا۔ روز روز کی مار نے بڑے بڑے نامور سرداروں کی شیخی کرکری کر دی تھی اور اکڑی ہوئی گردنوں کی رگیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔

یزید اپنے اس فرعونی خیال میں مست تھا کہ قتل کی دھمکی حسینؑ کی گردن کو میرے قدموں پر جھکا دے گی۔ اس نے حسینؑ کی شخصیت کے سمجھنے میں بڑی سخت غلطی کی تھی۔

ولید حاکم مدینہ کا پیغام جب امام علیہ السلام کے پاس پہنچا تو آپ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ آپ سمجھ گئے کہ اس وقت میری یہ طلبی بیعت یزید کے سلسلے میں ہے۔ آپ نے ولید کے سپاہی سے فرمایا۔ جا کر کہہ دینا میں آرہا ہوں۔ واقعات جس شان سے نشو و نما پاتے چلے آرہے تھے ان سے چونکہ زندگی خطرے میں نظر آرہی تھی۔ لہذا اختیاری تدابیر کرنا ضروری تھیں۔ آپ مسجد سے گھر میں تشریف لائے مگر نہایت مغموم و محزون۔ جناب زینبؑ نے سبب پوچھا تو آپ نے ولید کی طلبی کا حال بیان کر کے کہا کہ اب وہ وقت قریب آ گیا ہے۔ جس کی پیشین گوئی میرے بچپن میں نانا جان نے کی تھی۔ یہ داستان غم زینبؑ بھی سن چکی تھیں۔ یکایک گھبرا کر کہنے لگیں۔ بھیا! میں آپ کو تنہا ولید کے پاس نہ جانے دوں گی۔ آپ اپنے خاندانی جوانوں کے ساتھ تشریف لے جائیں مجھے آپ کی جان خطرے میں نظر آرہی ہے۔

امام نے اس رائے کو پسند کیا اور جوانانِ بنی ہاشم کو بلا کر کہا جلد ہتھیار بدن پر سجا کر میرے ساتھ چلیں ماشاء اللہ اس وقت بھرا ہوا خاندان تھا بات کہتے اٹھارہ بیس اور ایک روایت کے مطابق تیس شہ زور جوان جو بیشۂ شجاعت و بسالت کے بے باک شیر تھے حسینؑ کے سامنے سینے تان کر آ کھڑے ہوئے ولید کی کیا مجال کہ حضورؑ کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ سکے۔ بات کہتے اس کا سر تن سے اُتار دیا جائے گا۔ امامؑ نے فرمایا ابھی صبر و ضبط سے کام کرنا ہے۔ ہم جنگ کی ابتدا اپنی طرف سے نہیں کرنا چاہتے۔ جب میں دارالامارہ میں داخل ہوں تم سب دروازے پر ٹھہر جانا۔ اگر وہاں گفتگو میں تلخی پیدا ہو اور میری آواز بلند ہو تو تم سب اندر آجانا، پھر جیسا مناسب ہوگا کیا جائے گا۔

امام حسینؑ جب ولید کے پاس پہنچے تو اس نے یزید کا خط سنایا اور بیعت کا طالب ہوا۔ آپ نے فرمایا یہ وقت شب کا ہے کل جلسۂ عام میں اس مسئلہ کو رکھنا جیسا مناسب ہوگا جواب دیا جائے گا۔ ولید نے یہ بات مان لی۔ مروان جو اس کے پہلو میں بیٹھا تھا برہم ہو کر ولید سے کہنے لگا کیا کرتا ہے یا تو ابھی حسینؑ سے بیعت لے ورنہ ان کا سر کاٹ کر یزید کے پاس بھیج دے۔ اگر حسینؑ اس وقت تیرے پنجے سے نکل گئے تو پھر ان پر قابو پانا ناممکن ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی حضرت کو غصہ آگیا۔ فرمایا او ولدالزنا تیری یا ولید کی کیا مجال ہے کہ اپنے اس ارادے کو پورا کر سکے۔ حضرت کی آواز کا بلند ہونا تھا کہ جوانانِ ہاشمی و علوی تلواریں سونت کر دارالامارہ کے اندر درّانہ داخل ہو گئے۔ جناب عباسؑ نے چاہا بڑھ کر دونوں کا خاتمہ کر دیں مگر امام علیہ السلام نے روکا کہ برادر ابھی اس کا وقت نہیں ہے۔ یہ فرما کر آپ مع اپنے ساتھیوں کے باہر نکل آئے۔ ولید یا مروان کی ہمت نہ ہوئی کہ پھر کچھ کہہ سکیں۔ بلکہ مروان تو خوف زدہ ہو کر اسی وقت کسی گوشہ میں جا چھپا۔

بادشاہان وقت کی عداوت جس قدر جان و مال و آبرو کے خطرے اپنے دامن میں لیے ہوئے ہوتی ہے اس کو کون نہیں جانتا۔ پھر ایسی سلطنت کی مخالفت جو انسانی حدود سے کوسوں دُور نکلی ہوئی ہو۔ جب سے امام ولید کے پاس گئے تھے، علیؑ کے گھرانے کی تمام بی بیاں بدحواس تھیں۔ بالخصوص امام علیہ السلام کی بہنوں، جناب اُم البنین اور جناب اُم سلمہ کا غیر حال تھا۔ بار بار بارگاہ الٰہی میں دُعا کر رہی تھیں خداوندا تو ہی فرزند رسولؐ کا حافظ و نگہبان ہے تو ہی ظالموں کے شر سے اپنے نبی کے گھرانے کو بچانے والا ہے۔ جب امام واپس آئے تو جناب زینبؑ نے آبدیدہ ہو کر پوچھا۔ بھیا کیا صورت رہی۔ امام نے بڑے ضبط سے فرمایا اے بہن! اب ہم سے مدینہ چھوٹ رہا ہے بنی اُمیہ مجھ سے بیعت یزید کے طلبگار ہیں اگر میں یہاں رہوں گا تو دو حال خالی نہیں یا گرفتار کر کے دمشق بھیج دیا جاؤں گا یا مدینہ میں کشت و خون ہوگا اور حرمت حرم رسولؐ برباد ہوگی اور ان باتوں میں سے مجھے ایک بھی گوارا نہیں۔ لہٰذا تم سب جلد از جلد سامانِ سفر درست کرو اب تاخیر کرنا خلافِ مصلحت ہے۔

کسی محبِ وطن کے لئے وطن چھوڑنا جیسا روح فرسا اور دل شکن ہوتا ہے محتاج بیان نہیں پھر وطن بھی مدینہ جیسا حرم رسولِ خدا ہے جہاں رسولؐ کی قبر مبارک ہے۔ جہاں سیدہ عالمؑ کا مزار ہے۔ جہاں امام حسن علیہ السلام کا مدفن ہے یہ وہ قبریں ہیں جو اس خاندان کے لئے جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ یہ وہ قبریں ہیں جن کی زیارت روز کی جاتی ہے اور اپنا درد دکھ

بیان کیا جاتا ہے۔ پھر مدینہ وہ شہر ہے جہاں اسلام نے نشوونما پائی۔ جہاں حسن پلے بڑھے۔ جہاں وحی کی آوازیں سنیں جہاں فرشتوں کا نزول ہوا جہاں جنت کے میوے کھائے جہاں سارا خاندان آباد ہے اس تصوّر سے کہ اب یہ شہر چھوٹنے والا ہے جو دل پر گزری ہوگی اس کو وہی سمجھ سکتے ہیں جن کو اس مصیبت کا سامنا ہوا ہوگا۔

جب معلوم ہوا کہ فرزند رسول آمادۂ سفر غربت ہیں تو بیبیوں نے کہا اور فاطمہ صغریٰ کا کیا ہوگا یہ تو شدید تپ میں مبتلا ہیں۔ کمزوری حد سے بڑھ گئی ہے ان کو اس گرمی کے موسم میں تکلیف سفر دینا ہلاکت کا مترادف ہے فرمایا صغریٰ کا لے جانا تو کسی طرح ممکن نہیں لیکن جہاں تک ممکن ہو اس خبر کو بیمار سے چھپائے رکھو۔

رات آئی تو امام علیہ السلام پہلے قبر رسولؐ پر آئے اور قبر کو چھاتی سے لگا کر فرمایا۔ نانا جان میں آپ کا نازپروردہ نواسہ حسین بنی اُمیہ کے مظالم کا شکار ہو رہا ہوں نانا بنی اُمیہ میری جان و آبرو کے دشمن ہیں۔ اب میں آپؐ کی قبر مبارک سے جبراً جُدا کیا جا رہا ہوں۔ نانا جان! مجھے اب دُنیا میں رہنا پسند نہیں مجھے اپنی قبر میں لے لیجے۔ یہ کہتے کہتے غنودگی طاری ہوئی خواب دیکھا۔ رسول اللہؐ سینے سے لگا کر زار زار رو رہے ہیں اور فرما رہے ہیں۔

اس سفر میں تجھ کو چھوڑوں گا نہ اے دلخواہ میں
پیٹتا روتا چلوں گا کربلا ہمراہ میں

اے مرے نورِ نظر ایسی جگہ ہے کربلا!
رنج اٹھاتے آئے ہیں جس جا پہ خاصان خُدا

حضرت آدمؑ نے ٹھوکر کھائی خوں پا سے بہا
آگیا ہے یاں تلاطم میں سفینہ نوحؑ کا

مورد آفات یہ جا اے مرے دل خواہ ہے!
اور ازل کے روز سے تیری تو وعدہ گاہ ہے

خواب سے بیدار ہوئے تو قبر کو رو رو کر رخصت کیا۔ یہ قبر رسولؐ کا آخری دیدار ہے۔ پھر اب یہاں آنا نصیب نہ ہوگا۔ وہاں سے ماں کی قبر پر آئے اور فریاد کی۔ اماں جان آپ کا حسینؑ آوارہ دشتِ غربت ہو رہا ہے آہ ظالم مجھے آپ کی قبرِ انور کی زیارت سے محروم کر رہے ہیں۔ قبر سے آواز آئی بیٹا حسینؑ میری زینب سے خبردار میری کلثوم سے خبردار۔ آہ ظالم مجھے قبر میں بھی چین نہیں لینے دیتے۔ بیٹا! میں بھی تیرے ساتھ قبر چھوڑ رہی ہوں۔

تو جہاں جائے گا پیارے وہیں چلتی ہوں میں
خاک اُڑاتی ہوئی مرقد سے نکلتی ہوں میں

ماں کی قبر کو رخصت کر کے بھائی کی قبر پر آئے اس طرح قبر سے لپٹ کر روئے جیسے بھائی بھائی سے جُدا ہوتے وقت دھاڑیں مار کر روتا ہے۔ بھیا خدا حافظ آپ کا حسین ملکِ غیر میں سر کٹانے جا رہا ہے۔

الغرض امام نے سامان سفر درست کیا، اور چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ فاطمہ صغریٰ کو جب پتہ چلا کہ سب کنبہ مدینہ چھوڑ کر جا رہا ہے تو ایک بی بی سے لپٹ کر رونے لگیں کہ میں بھی ساتھ چلوں گی۔ سب نے سمجھایا کہ بی بی تم بیمار ہو

سفر کی سختیاں جھیلی نہ جائیں گی مگر فاطمہ صغریٰ کسی طرح نہیں مانتیں۔ آہ بھرے گھر کی جدائی معمولی صدمہ تو نہ تھا کہ برداشت کرلیں۔ اس قافلے کے جانے کے بعد اس گھر میں کون رہے گا فرزند رسولؐ بیمار پر دعائیں کہاں دم کریں گے۔ عباس چھاتی سے لگا کر کیسے پیار کریں گے۔ علی اکبرؑ بہن کے پاس بیٹھ کر باتوں سے دل کہاں بہلائیں گے۔ یہ بیماری کا عالم اور کوئی پرستار پاس نہ ہوگا نہ ماں نہ بہنیں۔ نہ پھوپیاں۔ بھرا گھر سائیں سائیں کرتا ہوگا۔ یہ خیالات تھے جو فاطمہ صغریٰ کو ماہیِ بے آب کی طرح تڑپا رہے تھے۔ ایک ایک سے گلے مل کر زار زار رو رہی تھیں۔ کسی طرح صبر نہ آتا تھا۔ آخر فرزند رسولؐ نے سمجھایا بی بی تم بیمار ہو۔ لاغر ہو ناتواں ہو پہاڑوں اور بیابان کا سفر ہے کوسوں راہ میں پانی نہیں، گرمی کا موسم دشمن مکار کا خطرہ ایسی صورت میں تمہیں لے جانا کسی طرح مناسب نہیں سمجھتا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جس وقت اطمینان نصیب ہوگا علی اکبر کو بھیج کر تمہیں بلالوں گا۔

الغرض قافلہ کی روانگی کا وقت آیا۔ ہر طرف راستوں پر پہرے دار بیٹھے کہ کوئی ادھر سے گزرنے نہ پائے۔ علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹیاں سوار ہونے کو آرہی ہیں۔ مزید احتیاط کے لئے قناتیں بھی کھڑی کردی گئیں۔ دور باش، دور باش کی صدائیں بھی بلند ہوئیں۔ جناب عباسؑ اور علی اکبرؑ نے ایک ایک بی بی کا بازو پکڑ کر سوار کیا۔

ہائے اس اہتمام کو اس پردہ کو کس کی نظر کھا گئی۔ ابتدا اس سفر کی یہ تھی اور انتہا یہ کہ نہ کسی بی بی کے سر پر مقنعہ تھا، نہ چادر، سر کھلے راہوں میں، بازاروں میں، درباروں میں بندیاں ترک و دیلم کی طرح لائی جارہی تھیں۔ کہاں تھے عباسؑ کہاں تھے قاسمؑ۔ کہاں تھے حسینؑ جن سے فریاد کریں۔

قافلہ گیا تھا کس شان سے اور آہ لوٹا کس شان سے نہ کوئی بوڑھا ساتھ تھا نہ جوان۔ نہ کسی کے سر پر شوہر کا سایہ رہا نہ مدد کے لیے بھائی کا سہارا رہا۔ ماؤں کی گودیں بچوں سے خالی ہوگئی تھیں۔ بھرے کنبے کے ساتھ لوٹیں اس طرح جناب ام کلثوم کی زبان سے سنیئے ؎

مَدِینَۃُ جَدِّنَا لَا تَقْبَلِینَا ۔۔۔ فَبِالْحَسَرَاتِ وَالْاَحْزَانِ جِئْنَا
خَرَجْنَ مِنْكَ بِالْاَهْلِینَ جَمْعًا ۔۔۔ رَجَعْنَا لَا رِجَالَ وَلَا بَنِینَا

اے نانا کے مدینے! ہم تجھ میں آنے کے قابل نہ رہے۔ ہم حسرتوں اور رنج و غم کے مارے تجھ میں آئے ہیں۔ جب تجھ سے نکلے تھے تو بھرا کنبہ ساتھ تھا اب لوٹے ہیں اس حال میں نہ کوئی مرد باقی ہے نہ کوئی بچہ۔

ہائے اس خاندان کو کس کی نظر کھا گئی کہ کربلا میں سارا گھر برباد ہوگیا، اور ایسے بچھڑے کہ پھر ملے ہی نہیں۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

مجلس سوم

آلِ محمدؐ کے فضائل

مدینے سے امام حسین علیہ السلام کا کوچ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِی کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ج فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْھُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِہٖ وَمِنْھُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْہُ ط وَکَفٰی بِجَھَنَّمَ سَعِیْرًا ﴿۵۵﴾ (سورۂ نساء ۴/۵۵)

کیا خدا نے جو اپنے فضل سے تم لوگوں کو عطا فرمایا ہے اس پر رشک کرکے چلے جاتے ہیں ہم نے ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور عقل کی باتیں عطا فرمائی ہیں۔ اور ان کو بہت بڑی سلطنت بھی دی پھر کچھ تو اُن میں سے اس پر ایمان لائے اور کچھ لوگوں نے اس سے انکار کیا اور ان کی سزا کے لئے جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کافی ہے۔

اس آیت میں چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

۱۔ وہ کون لوگ ہیں جن پر حسد کیا گیا۔ ۲۔ جس چیز پر حسد کیا گیا وہ کیا ہے۔ ۳۔ آلِ ابراہیم سے مراد کون لوگ ہیں۔ ۴۔ کتاب و حکمت سے کیا مراد ہے۔ ۵۔ مُلک عظیم سے کون سی حکومت مراد ہے۔

حسد وہ خبیث بیماری ہے کہ جس کو آلپٹی ہے پھر عمر بھر اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

حاسد کو ایک دم نہیں راحت جہان میں
رنج حسد ہے جان ہے جب تک کہ جان میں

حاسد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی طور سے نعمت کا زوال ہو جائے، چاہے حاسد کو ملے یا نہ ملے۔ یوں اخلاقی بیماریاں بے شمار ہیں لیکن ان میں سب سے بدتر بیماری حسد کی ہے۔ جس طرح جسمانی بیماریوں میں تپ دق جان لیوا ہے۔ اسی طرح نفس کی بیماریوں میں حسد روحانیت کو فنا کر دینے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خصوصیت کے ساتھ اس بیماری سے پناہ مانگنے کے لئے خدا نے حکم دیا ہے۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (سورہ الفلق ۵/۱۱۳)

اب دیکھنا یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں حسد کرنے والے کون تھے اور محسود کون تھے

ابوالحسن مغازلی نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ اس آیت میں الناس سے مراد عام لوگ نہیں بلکہ مخصوص ہم اہلبیت پیغمبر ہیں جن پر لوگ رشک و حسد کرتے ہیں (صواعق محرقہ علامہ ابن حجر عسقلانی۔ آیت ۲۔ فضائل اہل بیتؑ)

اب اس کی جستجو کرنی ضروری ہے کہ اہل بیتؑ کے پاس وہ کیا چیز تھی جس پر لوگ حسد کرتے تھے یہ ظاہر ہے کہ حسد کرنے والے عہد رسالت ہی کے لوگ تھے۔ کیونکہ حسد محسود اور نعمت دونوں کی موجودگی میں ہوتا ہے نہ کہ مرنے کے بعد۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اہل بیتؑ کے پاس مال و دولت تو تھا نہیں جس پر لوگ حسد کرتے وہ تو زاہدانہ زندگی گزارنے والے لوگ تھے پیسہ جمع کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ جب بادشاہت کے زمانے میں جمع نہ کیا تو بھلا اس کے قبل یا بعد یہ صاحب دولت کیسے ہو جاتے۔ امیر المومنینؑ اپنے عہد سلطنت میں جب تک ہر روز بیت المال کے سرمایہ کو صاحبان حق پر تقسیم نہ کر دیتے چین نہ آتا۔ وہ چاندی اور سونے اور سونے کو مخاطب کرکے فرمایا کرتے تھے۔ یا صفراء و یا بیضاء غُرِّی غَیْرِی (اے سونے اور چاندی میرے سوا کسی اور کو دھوکا دینا۔ دنیا کو مخاطب کر کے کہتے۔ یا دُنْیَا اِلَیْکِ عَنِّیْ طَلَّقْتُکِ ثَلَاثًا (اے دنیا مجھ سے الگ ہو میں نے تجھے تین طلاقیں دے دیں ان کا تعلق مالِ دُنیا سے کیا۔ عام لوگوں کی نظر میں سب سے بڑی چیز یہی ہے لیکن یہ اہل بیت کے پاس تھی ہی نہیں تو پھر سوچئے کہ

وہ کیا چیز تھی جس پر لوگوں نے حسد کیا۔

عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ سے معلوم ہوا کہ یہ حسد اس چیز پر ہے جو خدا نے اپنے فضل سے دی ہے۔ جزا و فضل میں یہ فرق ہے کہ جزا کسی عمل کا صلہ ہوتا ہے اور فضل منعم کی طرف سے انعام۔ مال کو فضلِ خدا نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ مایۂ غرور و تجبّر ہے۔ فرعون اسی کی بدولت فرعون بنا۔ قارون اسی کی بدولت خدا سے برگشتہ ہوا، ظالموں نے ہمیشہ اسی کے زور پر لوگوں کو ستایا۔ دوسرے جس چیز میں سب کا فرد مشترک شریک ہوں اس کو فضلِ خدا نہیں کہتے۔ قرآن میں جس چیز کو فضل کہا گیا ہے وہ یہ ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗٓ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (سورہ المائدہ ۵۴)

اے ایمان والو جو کوئی تم میں سے اپنے ایمان سے پلٹ جائے گا (تو پلٹ جائے) اللہ ان کی جگہ ایسی قوم کو لے آئے گا جس سے وہ محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔ وہ مومنین سے تواضع سے پیش آتے ہوں گے اور کافروں کے مقابل عزت والے ہوں گے۔ راہِ خدا میں جہاد کرنے والے ہوں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خیال نہ کرتے ہوں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ اور اللہ بڑا صاحب وسعت اور حکیم ہے۔)

اس آیت میں حسب ذیل صفات کو فضل کہا گیا ہے۔

۱۔ محبت خدا کی ۲۔ لوگوں کی محبت خدا سے ۳۔ مومنین سے تواضع ۴۔ کفار کی نظروں میں وقار ۵۔ راہ خدا میں جہاد ۶۔ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنا۔

پس جن میں یہ صفات ہوں گی وہی اس زمانے میں محسود ہوں گے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو لوگوں کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں۔ جب تک فضلِ خدا شامل حال نہ ہو ان کے علاوہ اور چیزیں بھی فضلِ الٰہی ہوں۔

پارہ ۱۹ سورہ نمل میں ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِہِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ وَاُوْتِیْنَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ ۭ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْفَضْلُ الْمُبِیْنُ ۝ (سورہ نمل ۱۶، ۱۵/۲۷)

ہم نے داؤد و سلیمان کو علم عطا کیا ہے ان دونوں نے کہا حمد ہے اس خدا کی جس نے فضیلت دی ہم کو اپنے بہت سے مومنین بندوں پر اور سلیمان داؤد کے وارث ہوئے اور کہا لوگو ہمیں پرندوں کی بولی بھی سکھائی گئی ہے اور ہر چیز عطا

کی گئی ہے یہ خدا کا کھلا ہوا فضل ہے۔

اسی سورہ کے رکوع ۳ میں ہے قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ (سورہ نمل ۲۷/۲۷، ۲۷) یعنی جب آصف برخیا پلک جھپکتے میں بلقیس کا تخت لے آئے تو جناب سلیمانؑ نے کہا: یہ میرے رب کا فضل ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ علم وراثت انبیاء پرندوں کی بولی سمجھنا، غیر معمولی طاقت و قوت دینا۔ یہ سب فضل میں داخل ہیں چونکہ یہ تمام امور روحانی اقتدار میں داخل ہیں۔ لہذا فضل الہیٰ کے تحت میں وہی باتیں آسکتی ہیں جو نفسِ انسانی کے کمال پر دال ہوں۔

خدا نے خود بتا دیا ہے کہ لوگوں کو جس چیز پر حسد ہے وہ کیا چیزیں ہیں۔

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (سورہ نساء ۵۴/۴)

اس سے معلوم ہوا کہ تین چیزیں ہیں اوّل کتاب، دوسرے حکمت اور تیسرے ملک عظیم۔ ان کی وضاحت کرنے سے پہلے اس پر غور کرنا ہے کہ اس آیت میں آلِ ابراہیم سے مراد کون لوگ ہیں۔ مفسرین عامہ کا خیال ہے کہ اس سے مراد بنی اسرائیل کے انبیاء ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہزاروں برس پہلے جو انبیاء گزر چکے ہیں ان پر حسد ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ حسد تو محسود کی موجودگی اور اس کی نعمت کے زوال کو چاہتا ہے۔ بنی اسرائیل کے انبیاء عہد رسالت میں کہاں موجود تھے کہ ان پر اُمتِ محمدی حسد کرتی۔

جب محمدؐ و آل محمدؐ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں داخل ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس آیت کے مصداق قرار نہ دیئے جائیں جبکہ یہ ثابت ہے کہ روئے زمین پر ان حضرات سے بہتر کوئی دوسرا ان صفات کا مستحق قرار نہیں پاتا۔ ایک روایت میں ہے کہ آلِ ابراہیمؑ آلِ محمدؐ ہیں اور کتاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد نبوت ہے اور ملکِ عظیم سے مراد امامت ہے۔

ہمارے پاس کافی ثبوت اس کا موجود ہے کہ اس آیت میں آلِ ابراہیمؑ سے مراد انبیائے بنی اسرائیل نہیں ہیں بلکہ صرف محمدؐ و آل محمدؐ ہیں۔

پہلا ثبوت اس کا یہ ہے کہ کتابیں جو انبیائے بنی اسرائیل کو ملیں ان کے احکام ایک زمانے کے بعد منسوخ ہوگئے دوسرے ان میں کوئی کتاب بھی ایسی نہیں تھی جس سے تحدّی کی گئی ہو۔

دوسرے حکمت عملی کی صورتیں انبیائے سابقین کی شریعتوں میں اتنی مکمل نہ تھیں جتنی شریعت محمدیہ میں پائی جاتی ہیں۔ سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ملک عظیم جس کا ذکر اس آیت میں انبیائے سابقین میں سے کسی کو حاصل نہیں خدا جس کو ملک عظیم کہے تو پھر اس سے بڑا ملک کسی اور کو نہ ملنا چاہیے۔ جناب سلیمان، داؤد و یوسف علیہم السلام کو جو سلطنتیں ملیں وہ ملک

عظیم کہلانے کی مستحق نہیں کیونکہ ان سے کہیں زیادہ بڑی سلطنتیں ان کے فرمانروا دمالک کفار اور مشرکین رہ چکے ہیں۔ اس زمانے میں جن حصوں پر اسلامی حکومت تھی وہ بہت محدود تھی اب ان کی دسعت بہت زیادہ ہے لہٰذا خلائق عالم ایسی سلطنتوں کو ملک عظیم نہیں کہہ سکتا جن سے سلاطین روزگار کی حکومتیں کہیں بڑھ چڑھ کر ہوں یہ مُلک عظیم تو وہی ہوسکتا ہے کہ اس کی حدود میں کسی دوسرے کی حکومت ہو ہی نہیں۔ تمام روئے زمین کا ایک حکمران ہو اور ایک ہی قانون ہو تو وہ دُنیا کو عدل و داد سے اسی طرح بھر دے جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہو۔ یہی چیز خصوصیت سے لوگوں کے لئے باعث حسد ہو سکتی ہے۔

آیہ زیر غور کا ایک حصہ یہ ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۚ (سورہ نساء ۴/۵۵) یہاں بہ اور عنہ میں واحد کی ضمیریں ہیں۔ یعنی ایک ہی چیز ایسی ہے کہ جس پر بعض ایمان لائے اور بعض نے روگردانی کی ہے۔ اس سے پہلے تین چیزیں ذکر ہوئی ہیں ایک کتاب، دوسرے حکمت، تیسرے ملک عظیم۔ اگر لوگوں کو حسد تینوں پر ہوتا تو بجائے واحد کی ضمیر کے جمع لائی جاتی اور یوں کہا جاتا کہ بعض ان پر ایمان لائے اور بعض نے از روئے حسد روگردانی کی اس سے معلوم ہوا کہ روگردانی اور حسد کا تعلق سب سے نہیں ہے بلکہ صرف ایک چیز سے ہے اور وہ مُلکِ عظیم ہے کتاب اور حکمت سے تو اس لئے تعلق نہیں کہ ان کو حاصل کرنا انسانی جد و جہد سے دُور ہے۔ خدا جس کو چاہتا ہے صاحب کتاب بناتا ہے اور جس کو چاہتا ہے صاحبِ حکمت بنا دیتا ہے۔ جیسے لقمان کو اس نے حکمت دی۔ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ (سورہ البقرہ ۲/۲۶۹) یا انبیائے بنی اسرائیل کو اس نے اپنے لطف و کرم سے کتاب و حکمت کا مالک بنا دیا۔ لیکن ملک پر حکومت ایک ایسی چیز ہے جس پر دندانِ حرص دراز ہو سکتے ہیں کیونکہ ابنائے روزنہ اس کو اپنی سعی و کوشش اور زور بازو سے حاصل کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے پس باعث حسد خصوصیت سے وہ ملک عظیم ہوا جس کے مالک حضرت حجت ہونے والے ہیں۔ اور اسی بنا پر لوگوں کو آپ کے وجود سے عداوت ہوئی اور قبل از وقت اس کا خاتمہ کر دینا چاہا مگر

چراغے را کہ ایزد برفروزد اگر کس پف زند ریشش بسوزد

اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا وہ اس آیت کے مصداق کے متعلق تھا۔ اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ یہ تینوں باتیں اہل بیت علیہم السلام میں کس شان سے پائی جاتی تھیں اور کس طرح یہ لوگوں کے لئے باعث حسد بن گئیں اور اس حسد نے لوگوں کو کیا کیا نقصان پہنچائے۔

سب سے پہلی چیز کتاب ہے جس سے مُراد قرآن ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہر شے کا بیان ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (سورہ الانعام ۶/۵۹) یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی نظیر کوئی نہیں لا سکتا۔ اُمّتِ محمدی میں اس کا پورا پورا علم سوائے اہل بیت طاہرین کے اور کسی کو حاصل نہ تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شروع ہی سے اس کی تعلیم حضرت علی علیہ السلام کو دی اور چونکہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

رسول اللہ نے مجھے اس طرح تعلیم دی جس طرح ایک طائر اپنے بچے کو بھراتا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ جب میں نے رسول اللہ سے کوئی بات پوچھی تو انہوں نے مجھے بتایا اور جب میں چُپ رہا تو خود حضور نبی اکرم نے تعلیم دی اِذَا سَأَلْتُهُ فَاَجَابَنِیْ وَاِذَا سَکَتُّ فَابْتَدَأَنِیْ ۔ چنانچہ پوری کتاب کا علم آپ کو حاصل تھا اس کا ثبوت یہ آیت ہے قُلْ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ وَمَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ (سورہ الرعد ۱۳/۴۳) مفسرین عامہ میں بعض نے اور مفسرین شیعہ نے بالاتفاق یہ لکھا ہے کہ وَمَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ (سورہ الرعد ۱۳/۴۳) کا مصداق حضرت علی علیہ السلام ہیں یہی وجہ تھی کہ کتاب باری کے متعلق جب کوئی سوال کیا جاتا تھا۔ تو آپ بے تامل جواب دے دیتے تھے۔ ہر قضیئے کا فیصلہ آپ قرآن سے اس طرح فرما دیتے تھے کہ کسی کو اعتراض کا موقعہ نہ ملتا تھا۔

آپ خطبہ شقشقیہ میں فرماتے ہیں یَنْحَدِرُ عَنِّیَ السَّیْلُ وَلَا یَرْقٰی اِلَیَّ الطَّیْرُ میرے سینے سے علم کا سیلاب نکلتا ہے اور میں اتنی بلندی پر ہوں کہ کسی کا طائر وہم وخیال بھی اُڑ کر وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایک اور موقع پر آپ اہلِ بیت رسول کا تعارف اس صورت سے کراتے ہیں ھُمْ مَوْضِعُ سِرِّہٖ وَلَجَاءُ اَمْرِہٖ وَعَیْبَۃُ عِلْمِہٖ وَمَوْئِلُ حُکْمِہٖ وَکُھُوْفُ کُتُبِہٖ وَجِبَالُ دِیْنِہٖ بِھِمْ اَقَامَ انْحِنَاءَ ظَھْرِہٖ وَاَذْھَبَ ارْتِعَادَ فَرَائِصِہٖ ۔ (وہ اسرار الہیہ کے رہنے کی جگہ ہیں وہ امر الٰہی کے پناہ کا مقام ہیں وہ اس کے علم کا خزانہ ہیں۔ وہ حکمت کے رجوع کرنے کی جگہ ہیں وہ آسمانی کتابوں کے لئے مثل غار ہیں وہ دین الٰہی کی پہاڑ ہیں۔ ان کی وجہ سے دین کی ٹیڑھی کمر سیدھی ہوئی ان کی وجہ سے اس کے کانپتے ہوئے کندھوں کو سکون ملا۔

وہی کتاب خدا سے اس کے حلال وحرام۔ فرائض وفضائل، ناسخ ومنسوخ، رخصت واجازت وعزائم وخاص وعام وعبرت وامثال، مرسل ومحدود، محکم ومتشابہ۔ مفسر ومجمل کے بتانے والے تھے۔ وہی اس کی تاویلات کے صحیح طور پر جاننے والے تھے وہی راسخون فی العلم تھے۔ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کے مصداق تھے۔

رسول اللہ نے فرمایا تھا یَا عَلِیُّ اِنَّکَ تُقَاتِلُ عَلٰی تَاْوِیْلِ الْقُرْاٰنِ کَمَا قَاتَلْتُ عَلٰی تَنْزِیْلِہٖ اے علی! تم تاویل قرآن پر اسی طرح جہاد کرو گے جس طرح میں نے اسی کی تنزیل پر کیا ہے۔ اگر یہ خصوصیت جناب علی کے سوا کسی اور میں بھی پائی جاتی تو ضرور تھا کہ رسول اس کا بھی ذکر کرتے۔ اگر اہل بیت عالم علوم قرآن نہ ہوتے تو حضرت رسول خدا ہرگز حدیث ثقلین میں ان کو قرآن کے ساتھ نہ کرتے کیونکہ جو کسی قانون کا جاننے والا نہ ہو اس کے ساتھ قرآن کو کرنا اور گمراہی کو پھیلانا ہے ؎

او خویشتن گم است کہ را رہبری کند

قرآن کے معانی و مفاہیم کے جاننے والے دو طرح کے تھے۔ اوّل وہ جنہوں نے دوسروں سے سیکھ کر حاصل کیا تھا۔ چونکہ ان کے معلم غیر معصوم تھے۔ لہٰذا ان کی غلط بیانی کا امکان تھا اور جنہوں نے رسولؐ سے حاصل کیا تھا بسبب غیر معصوم ہونے کے ان کے بھول جانے اور بخواہش نفسانی غلط بیان کر دینے کا قوی امکان تھا۔ اہل بیت رسولؐ معصوم تھے لہٰذا ان سے سہو و نسیان کا خطرہ نہ تھا نہ خلاف منشائے خدا و رسولؐ بیان کرنے کا اندیشہ۔ ان کو علم قرآن زبانوں سے دل تک نہیں پہنچا تھا۔ بلکہ سینوں سے سینوں میں پہنچا تھا۔ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (سورہ العنکبوت ۴۹/۲۹) وہ تو خدا کی روشن آیتیں ہیں جو سینوں سے سینوں میں پہنچی ہیں۔

ایک بار امیرالمومنینؑ نے ایک مشکل قضیہ کا فیصلہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے قرآن سے ثبوت مانگا۔ آپ نے فوراً آیت پڑھ کر سنائی۔ انہوں نے کہا آپ ہر فیصلہ بے تامل کر دیا کرتے ہیں ذرا احتیاط سے کام لیجئے ممکن ہے غلطی ہو جائے۔ فرمایا تمہارے ہاتھ میں کتنی انگلیاں ہیں انہوں نے کہا پانچ۔ فرمایا تم نے جواب دینے میں جلدی کی۔ وہ بولے اس میں سوچنے کی کیا بات تھی۔ انگلیاں میری آنکھوں کے سامنے ہیں فرمایا بس اسی طرح قرآن پاک کے علوم اور کائنات کا ورق میری نظر کے سامنے ہے چونکہ اس علم کی بناء پر ان لوگوں کو بسا اوقات ندامت کا سامنا ہوتا تھا جو قرآن کا علم لیا دیا رکھتے تھے لہٰذا ان کو علیؑ کی ذات سے حسد ہوا۔

اب دوسری فضیلت لیجئے۔ جو لوگوں کے لئے باعث حسد بنی۔ وہ حکمت ہے یہ بھی افضال الہیٰہ میں سے ایک فضل ہے۔ شیعہ مفسرین نے حکمت سے مراد نبوّت لی ہے یہ خاص شرف تھا جو حضرت محمد مصطفےٰؐ کو حاصل ہوا۔ یہ نبوت اور انبیاء کی نبوتوں کی طرح نہ تھی بلکہ یہ وہ نبوت تھی جو اس سلسلہ کا ابتدائی نقطہ بھی تھا كُنْتُ نَبِيًّا وَّ اٰدَمُ بَيْنَ الْمَآءِ وَالطِّيْنِ اور آخری نقطہ بھی وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ

لیکن ہم اس خاص تفسیر کو چھوڑ کر حکمت کے وہ معنی بیان کرتے ہیں جو فلاسفہ اسلام اور علمائے اخلاق نے لئے ہیں۔

نفسِ انسانی کی فضیلتوں کو چار جنسوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حکمت، عفّت، عدالت اور شجاعت ان کو علمائے اخلاق کی اصلاح میں فضائل چہارگانہ کہتے ہیں۔ حکمت کا درجہ ان میں سب سے مقدم ہے۔ اس کے تحت میں سات نوعیں ہیں یعنی ان سات پر حکمت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اوّل ذکاوت، دوسرے سرعت فہم، تیسرے صفائے ذہن چوتھے سہولت تعلّم، پانچویں حسن تعقل، چھٹے تحفظ۔ ساتویں تذکر۔ ہم ان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ مجلس کو طول ہو جائے گا۔ صرف اتنا ہی کہہ کر بس کرتے ہیں کہ جس خوبی سے یہ سب فضیلتیں اہل بیت رسولؐ میں پائی جاتی تھیں وہ دوسروں میں نہیں پائی گئیں۔

حکمت کو فلاسفہ نے دو قسموں میں منقسم کیا ہے ایک نظری، دوسرے عملی، نظری کا تعلق علم سے ہے اور عملی کا تعلق افعال انسانی سے سوائے معصوم کے ہر ایک سے ان دونوں باتوں میں افراط و تفریط کا امکان ہے اور یہ افراط و تفریط یقیناً اس کے علم و عمل کو درجۂ فضیلت سے گرادے گی۔ یہ راستہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ سوائے اہلبیت علیہم السلام اور لوگوں نے ان دونوں راستوں میں بے شمار ٹھوکریں کھائی ہیں عمل کی صحت کا دارومدار علم پر ہے اور علم بلا عمل وبال ہے۔ لہذا ان ہی لوگوں کا عمل قابلِ تاسی اور لائق تفوق ہو سکتا ہے جن کے علم میں غلطی کا امکان نہ ہو۔ اگر رسولؐ کے بعد لوگ علم قرآن و حدیث کو ان کے صحیح مرکز سے لیتے تو عمل میں ایسا ہولناک افتراق پیدا نہ ہوتا کہ ایک نماز مسلمانوں میں سترہ طریقے سے پڑھی جا رہی ہے اور کوئی ایک عمل بھی ایسا نظر نہیں آرہا جس میں مسلمانوں کا اختلاف نہ پایا جاتا ہو۔ یہ اختلاف بتا رہا ہے کہ عمل صحیح کے ساتھ غلط، اعمال بھی خلط ملط ہو گئے ہیں۔ کیونکہ صحیح صورت تو ایک ہی ہو سکتی ہے۔ رسولؐ خدا نے اس کی پیشین گوئی کر دی تھی کہ میرے بعد میری اُمت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی جن میں ایک ناجی ہوگا۔ باقی ناری۔ کیونکہ سیدھا راستہ تو صرف ایک ہی ہوگا نہ کہ بہتر۔ ناجی فرقے کے متعلق بھی حضور نبی اکرمؐ نے بتا دیا تھا۔ مَثَلُ اَھْلِ بَیْتِیْ کَمَثَلِ سَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَھَا نَجٰی وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْھَا غَرِقَ وَھَوٰی (میرے اہل بیت کی مثال کشتیٔ نوحؑ کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جس نے روگردانی کی وہ ڈوب گیا اور ہلاک ہوا) اس حدیث نے تعین کر دیا کہ نجات اہل بیت کے ساتھ ہے۔ اہل بیت کون ہیں جن کو خدا نے ہر رجس سے پاک کر دیا ہے اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا (سورہ الاحزاب ۳۳/۳۳) ان اہل بیتؑ کو رسولؐ خدا نے اپنے ساتھ مباہلہ میں لے جا کر مسلمانوں کو پہچنوا دیا۔

ایک اور حدیث میں حضور نبی اکرمؐ نے اس سے زیادہ وضاحت فرما دی ہے۔ یَا عَلِیُّ اَنْتَ صِرَاطُ الْمُسْتَقِیْمِ وَمِیْزَانُ الْاَعْمَالِ (اے علیؑ! تم صراطِ مستقیم اور میزانِ اعمال ہو) یعنی تمہارے ہی عمل کو انصاف کے ترازو میں رکھ کر دوسرے لوگوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ گویا جناب علیؑ کے عمل کو رسول خدا نے دوسروں کے عمل کے لئے نمونہ قرار دیا بہر حال بحث حکمت کی تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس حکمت کا بڑا جزو کس کے پاس ہے یوں تو حکمت کا مدعی کوئی بھی ہو جائے لیکن رسول پاکؐ نے اپنی نظر میں کس کو صاحب حکمت سمجھا ہے فرماتے ہیں۔ اَنَا دَارُ الْحِکْمَۃِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔ یہ تو علیؑ کے عمل کی تصدیق ہوئی۔ اب حکمت علمی یا علم کی تصدیق سن لیجئے۔ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا حکمت کی دو ہی قسمیں تھیں۔ ایک نظری دوسری عملی۔ رسولؐ نے دونوں کا صحیح مرکز بتا دیا۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ معاویہ کے دسترخوان پر ایک الوان نعمت کے کھانے والے نے جب علیؑ کے پیچھے نماز پڑھی تو صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ دین یہاں ہے دنیا وہاں۔ لوگوں کو اس پر حسد تھا کہ اہل بیتؑ کے روحانی اقتدار میں اتنی کشش کیوں ہے کہ

لوگ ان کے قدموں پر سر رکھنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ اس حسد نے کبھی ان مقدس ہستیوں کو دنیا کی فضا میں اطمینان اور چین سے سانس نہ لینے دیا اور حکومتیں ہمیشہ ان سے بدظن رہیں۔

اب تیسری فضیلت پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا (سورہ النساء ۵۴/۴) ہم نے ان کو ملک عظیم دیا اس ملکِ عظیم پر حکومت کرنے کا وقت بھی آ رہا ہے اِنَّھُمْ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِیْبًا (سورہ المعارج ۷، ۶/۷۰) (لوگ اس کو دور سمجھے بیٹھے ہیں مگر ہم اس کو قریب دیکھ رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس مُلکِ عظیم دینے کا اہل بیتؑ رسولؐ سے وعدہ کر لیا ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا (سورہ النور ۵۵/۲۴) اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور عملِ صالح کئے کہ وہ ان کو روئے زمین کا خلیفہ بنائے گا اسی طرح جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا۔ اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا تاکہ وہ میری عبادت کریں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں) صرف وحدہٗ لاشریک کی عبادت اسی وقت دنیا میں ہوگی جبکہ شرق سے غرب تک صرف ایک دین ہوگا، اور تمام ادیان فنا ہو جائیں گے۔

یہ حکومت حضرت حجت عجل اللہ فرجہ کی ہوگی۔ اس وقت لِیُظْھِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ (سورہ التوبہ ۳۳/۹) کا مطلب لوگوں پر واضح ہوگا۔ اسی کو ملکِ عظیم کہا گیا ہے۔ معمولی حکومتیں تو دنیا میں ہزاروں ہوتی رہتی ہیں پوری دنیا پر صرف یہی ایک اکیلی حکومت ہوگی اس کے بعد پھر قیامت میں وہ حکومت ہوگی جس کے متعلق پکار کر کہا جائے گا لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ (بتاؤ آج کس کی سلطنت ہے جب کوئی جواب نہ دے گا تو خود لبِ قدرت سے آواز آئے گی۔ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ (سورہ المومن ۱۶/۴۰) (آج اس خدائے واحد کی حکومت ہے جو سب پر غالب ہے)

دنیا والوں سے اہل بیتؑ کے یہ فضائل دیکھے نہ گئے، اور حسد کی آگ نے سینوں کے اندر شعلے بھڑکا دیئے۔ وہ علیؑ جو اسلام کے سب سے بڑے حامی و مددگار تھے، وہ علیؑ جن کے زورِ بازو سے سلطنت اسلامی کی داغ بیل پڑی تھی۔ وہ علیؑ جنہوں نے کفر و شرک کا خون پانی کی طرح زمین پر بہا کر ان کی تمام قوت کو توڑ کر رکھ دیا وہ علیؑ جس نے خود فاقے کر کے غریب مسلمانوں کا پیٹ بھرا تھا۔ زمانے کے انقلاب سے اپنی زندگی کو اس طرح گذارنے پر مجبور ہوا۔ وَفِی الْعَیْنِ قَذًی وَفِی الْحَلْقِ شَجًی (آنکھ میں کھٹک تھی اور حلق میں اچھو لگا تھا)

اسلام پر علیؑ کے جس قدر احسان تھے۔ وہ سب نظرانداز کر دیئے گئے، اور کسی کوشش کو قابلِ پذیرائی نہ سمجھا گیا خلافت کی بنیادیں استوار کرتے وقت ان کی بات نہ پوچھی گئی۔ فدک کے معاملے میں ان کی گواہی معتبر نہ سمجھی گئی دو سال کی جانگداز محنت کے بعد جو قرآن جمع کیا تھا اس کو حکومت نے رد کر دیا۔ امورِ سلطنت کے لبست و کشود میں ان کے مشورہ کی ضرورت نہ سمجھی

برسوں کے بعد حق نے اپنے مرکز کی طرف رجوع کی تو لوگوں نے ایک دن چین سے حکومت نہ کرنے دی۔ ہر طرف بغاوت کی آندھیاں چل پڑیں۔ سازشوں کے جال بچھ گئے۔ آج جمل کا معرکہ ہے تو کل صفین کا پرسوں نہروان کا۔ علیؑ ہی تھے کہ ایسے پُرآشوب فتنہ پرور ضلالت آگیں دور میں صحیح راستہ پر قدم جمائے رہے اور نظام حکومت و جہاں بانی کو برقرار رکھا۔

جو لوگ تر لقمے کھانے کے عادی ہو رہے تھے ان کو ایمان کے دستر خوان پر سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے کیا بھلے لگتے۔ آخر قوانین ہوا پرستی کے آگے حکومت الہیہ کے آئینے بے جوہر بن کر رہ گئے۔

ایک عاقبت برباد نے عین سجدہ کی حالت میں شہید کر کے اپنے انتقام کی پیاس بجھائی اور دنیائے اسلام کو اس نورانی اور روحانی حکومت کے سائے سے محروم کر دیا جہاں رحمت و برکت کے بادل جھوم جھوم کر برستے تھے۔

علیؑ کے احسان کیوں بھلائے گئے۔ مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت ان کے خون کی پیاسی کیوں بنی۔ صرف اس لئے کہ علیؑ نے بدر و احد و خندق وغیرہ میں جن مشرکوں کو قتل کیا تھا اور ان کے زور کو توڑ کر اسلام کا بول بالا کیا تھا۔ ان مشرکوں کی اولاد جو شوکت اسلام سے مرعوب ہو کر بظاہر مسلمان تو ہو گئی تھی مگر اس کے دل میں علیؑ اور اولادِ علیؑ سے انتقام کا جذبہ تڑپ رہا تھا لہذا جب اور جس طرح اس کو موقعہ ملا، دل آزاری سے نہ چوکی۔ یہ آگ جو برسوں سے سینوں میں دبی چلی آرہی تھی۔ یزید کے دل میں اس شدت سے بھڑکی کہ وہ ضبط نہ کر سکا اور بھرے دربار میں کہہ بیٹھا کہ میں بنی خندف سے نہیں ہوں اگر بنی ہاشم سے بدر و احد کا انتقام نہ لوں۔ کاش بدر میں قتل ہونے والے میرے بزرگ آج زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے ان کے خون کا کس طرح بدلہ لیا ہے۔

اس کے باپ نے علیؑ اور امام حسنؑ سے جی کھول کر بدلہ لیا اور اس نے امام حسینؑ سے اور یہ بدلہ اس طرح لیا کہ خاندان بنی ہاشم کو ایسا تباہ و برباد کیا کہ پھر وہ کبھی دنیا میں اطمینان کی زندگی بسر ہی نہ کر سکے۔

بیعت کا تو صرف ایک بہانہ تھا ورنہ اس کا مقصد اصلی تو امام حسین علیہ السلام کو قتل کر دینا ہی تھا۔ شریعت اسلام میں بیعت سے انکار کرنے والے کا قتل لازم نہیں۔ لیکن وہ شریعت اسلام پر عمل کرنے والا ہوتا تو اس پر غور کرتا اس نے تو تخت سلطنت پر قدم رکھتے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں حسینؑ کو بغیر قتل کئے نہ رہوں گا۔ چنانچہ جو خط اس نے ولید کو عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور امام حسین علیہ السلام سے بیعت لینے کے متعلق لکھا تھا بروایت طبری اس میں چوہے کے کان کی برابر ایک پرچہ اس مضمون کا بھی رکھ دیا تھا کہ حسین علیہ السلام کو بغیر قتل کئے نہ چھوڑنا اسی لئے تو مروان نے ولید پر زور دیا تھا کہ یا تو اسی وقت بیعت لے لے ورنہ اس کا سر تن سے جدا کر کے یزید کے پاس بھیج دے۔ مروان نے یزید کے معانی الضمیر کو پہلے ہی سے سمجھا ہوا تھا۔

واقعات جس رفتار سے سامنے آرہے تھے امام حسین علیہ السلام نے ان سے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ میں بغیر قتل ہوئے نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ لوگ مانع سفر تھے۔ آپؑ نے کھلے لفظوں میں ان سے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر میں سوراخ موروما رملیں بھی پناہ

وں گا تو بنی اُمیہ مجھے قتل کئے بغیر نہ رہیں گے۔ لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ امام حسین علیہ السلام مدینہ میں رہتے تو بچ جاتے کیونکہ وہ حرمِ رسولؐ تھا۔ یزید کو اس میں کشت و خون کی ہمت نہ ہوتی۔ دو سال بعد ہی لوگوں نے دیکھ لیا کہ اس حرمِ رسولؐ میں یزیدی فوجیوں نے جنگِ حرا کے موقع پر کیسا کشت و خون کیا۔ مدینے کے گلی کوچوں میں خون کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ چار سو صحابی رسولؐ بے دریغ تہِ تیغ کر ڈالے گئے اور کسی جوان عورت کی عصمت باقی نہ رہی۔

امام حسین علیہ السلام نے حرمِ رسولؐ کی حُرمت کے ضائع ہونے کا الزام اپنے اُوپر نہ لیا اور بہت سے غور و تامل کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ مدینہ رسولؐ سے جلد از جلد باہر چلا جاؤں۔

جب اہلِ مدینہ کو پتہ چلا کہ فرزندِ رسولؐ عازمِ سفرِ غربت ہیں تو ایک ہل چل مچ گئی۔ ہر طرف سے جوق در جوق زن و مرد آنے لگے۔ ہر ایک رو رو کر کہتا تھا کہ "فرزندِ رسولؐ آپؑ نہ جائیے، آپ کے جانے سے مدینہ ویران ہو جائے گا۔ مسجدِ رسولؐ کی رونق جاتی رہے گی۔" عورتوں کا جنابِ زینبؑ سے اصرار تھا کہ "بھائی کو جانے سے روکئے، یہ سفر ہمیں خطرے سے خالی نظر نہیں آتا۔" امام علیہ السلام نے تلقینِ صبر فرما کر کہا "بھائیو! بغیر مدینہ چھوڑے چارۂ کار نہیں۔ بنی اُمیہ میری جان کے دشمن ہیں وہ مجھے یہاں چین سے نہ رہنے دیں گے۔ اگر زندگی ہے تو پھر آپ لوگوں سے آکر ملیں گے۔ ورنہ ہم آوارہ وطنوں کو یاد کر لیا کرنا۔"

لکھا ہے کہ جب جناب اُمِ سلمہ کو پتہ چلا کہ سارا کنبہ آمادۂ سفر ہے تو غم سے بُرا حال ہوا آپ نے حضرت امام حسینؑ کو بُلا کر فرمایا بیٹا! کیا تم عراق جانے کا ارادہ کر رہے ہو۔ عرض کی نانی جان! بنی اُمیہ درپے آزار ہیں۔ یزید مجھ سے طالبِ بیعت ہے اگر میں نہیں جاتا تو ذلت و خواری کے ساتھ گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ مجبوراً آپ لوگوں سے جُدا ہو رہا ہوں۔ نانا کی قبر، بھائیؑ کی لحد اور ماں کا مزار چھوڑنا میرے اُوپر سخت شاق ہے مگر کیا کروں یہاں اطمینان سے رہنا ممکن نہیں۔" انہوں نے فرمایا! بیٹا! عراق کی طرف جانے کا قصد نہ کرنا۔ میں تمہارے نانا جان سے سُن چکی ہوں کہ میرا حسین سرزمینِ عراق پر دشتِ کربلا میں بھوکا پیاسا قتل کیا جائے گا۔ مجھے انہوں نے اس سرزمین کی تھوڑی سی خاک بھی دی تھی جو میں نے ایک شیشہ میں رکھ چھوڑی ہے لہذا ایسی صورت میں عراق جانا مناسب نہیں۔" حضرت نے فرمایا "نانی جان! جو کچھ میرے جدّ نے فرمایا ہے وہ حکمِ قضا و قدر ہے اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ میرا وہاں جانا اور قتل ہونا ناگزیر ہے۔" فرمایا "اچھا جاتے ہو تو اس خوفناک سفر میں عورتوں کو ساتھ نہ لے جاؤ۔ تمہارے بعد ان کا پُرسانِ حال کون ہوگا۔" آپ نے فرمایا "نانی جان! میرے محضرِ شہادت میں یہ بھی ہے کہ اس گھر کی بیبیاں میری شہادت کے بعد برہنہ سر دیار و امصار میں تشہیر کی جائیں۔ نانی جان اگر یہ میرے ساتھ نہ جائیں گی تو میری شہادت کو بنی اُمیہ اسی طرح چھپا دیں گے جس طرح بھائی حسنؑ کی شہادت کو چھپا دیا اور اصلی قاتل کا پتہ نہ چلنے دیا۔ میری بہنیں، میرا بیٹا سجاد جا بجا لوگوں سے واقعاتِ کربلا بیان کرتے جائیں گے اور بنی اُمیہ کے مظالم سے لوگوں کو آگاہ کریں گے۔" جناب اُمِ سلمہؓ یہ سُن کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں اور آہیں بھرتے ہوئے کہا "بیٹا حسینؑ! کاش میں بھی تمہارے

مصائب و آلام میں شریک ہوتی اور زینب و اُم کلثوم کی ان بلاؤں میں ڈھارس بنتی"۔ حضرت نے فرمایا" نانی جان! اول تو آپ کا نام اسیروں کی فہرست میں نہیں دوسرے آپ سے یہ مصائب و آلام نہ جھیلے جائیں گے۔ اس کی سزاوار تو میری بہنیں زینب و اُم کلثوم ہی ہیں۔ اگر آپ فرمائیں تو میں آپ کو کربلا کا درد فرسا منظر دکھادوں۔ یہ فرما کر آپ نے اپنی دو انگلیاں اُٹھائیں اور اُم سلمہ سے کہا ان کے درمیان دیکھئے۔

اب جو اُم سلمہ نے نظر کی تو واقعہ کربلا نظر کے سامنے تھا ہر طرف خون کے بہاؤ ہیں اور جابجا جوان اور بوڑھے سر کٹائے خون میں نہائے۔ زخموں سے چور خاک پر پڑے ہیں پوچھا بیٹا میں تو ان کو پہچان نہیں سکتی کیونکہ ان میں سے کسی کے جسم پر سر نہیں" فرمایا: نانی جان! یہ دو بچے جو گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچلے پڑے ہیں۔ یہ میری بہن زینبؑ کے نونہال ہیں۔ یہ نوجوان جس کا ایک ایک عضو جدا ہے میرا یتیم بھتیجا قاسمؑ ہے۔ نہر کے کنارے جو لاش آپ کو بازو کٹی نظر آرہی ہے۔ یہ میری فوج کا علمدار میرا شیر دل بھائی بنی ہاشم کا چاند، میری بیٹی سکینہ کا سقّہ، میرا عباس ہے۔ ظالموں نے اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے ہیں۔ اُم سلمہ نے رو کر پوچھا بیٹا یہ کس جوان کی لاش ہے جس کے سینے میں نیزہ کی انی پیوست ہے۔ فرمایا نانی جان یہ میرا کڑیل جوان اٹھارہ برس کا نازوں پر وردہ علی اکبرؑ ہے آہ! اس کے مرنے کے بعد میرے لشکر کا خاتمہ ہے۔

اس کے بعد یکایک اُم سلمہ کی نظر ایک ننھی سی لاش پر پڑی۔ گھبرا کر پوچھنے لگیں" بیٹا! یہ کس ماں کی کوکھ اُجڑی ہے یہ کس باغ کی کلی ہے" فرمایا" یہ میرا بچہ علی اصغر ہے۔ آہ! رباب کی گود اس سے خالی ہو گئی۔ نانی جان یہ سب تین دن کے بھوکے پیاسے دُنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ میں اپنے اس بچے کو پانی طلب کرنے کے لئے دشمن کی فوج کے سامنے لے گیا تھا ان ظالموں نے بجائے پانی دینے کے ایسا تیر اس معصوم بچے کے گلے پر مارا کہ اس نے میرے ہاتھوں پر منقلب ہو کر دم توڑ دیا"۔ اب ایک اور ہولناک منظر اُم سلمہ کے سامنے آیا۔ دیکھا کہ ایک بے کس و مظلوم کو جس کے بدن میں سینکڑوں تیر پیوست ہیں جس کے ہر بُن مُو سے خون کی دھار پھوٹ رہی ہے جو اپنے گھوڑے سے گر چکا ہے کچھ اشقیا گھیرے کھڑے ہیں اور اس کا سر کاٹنے کی تدبیر ہو رہی ہے ایک طرف دیکھا کہ ایک ٹیلہ پر ایک دُکھیا بی بی فریاد کر رہی ہے۔ واہ جدّاہ وا محمداہ۔ ارے کوئی میرے مظلوم بھائی کو بچاؤ۔ پھر فوج کے سردار سے مخاطب ہو کر کہا۔ او پسر سعد خدا تیری نسل کو منقطع کرے۔ میرا بھائی قتل کیا جا رہا ہے اور تو دیکھ رہا ہے"۔ پوچھا بیٹا یہ کون مظلوم ہے" فرمایا" نانی جان! یہ تمہارا حسینؑ ہے جسے لوگ قتل کرنا چاہتے ہیں اور یہ تمہاری بیٹی زینبؑ ہے جو میرے قتل کے وقت خیمہ سے نکل کر ایک ٹیلہ پر آگئی ہے اور فریاد کر رہی ہے اور کوئی اس کی فریاد سننے والا نہیں یہ ہولناک مناظر دیکھ کر جناب اُم سلمہ کو غش آگیا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

مجلس چہارم

انسان کی فضیلت

محمدؐ و آل محمدؐ کے فضائل، شہادت امام حسین علیہ السلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا

(سورہ بنی اسرائیل ۱۷/۷۰)

(ہم نے اولادِ آدم کو بزرگی دی اور اس کو (سواریوں کے ذریعے سے) خشکی اور تری میں لیے لیے پھرے اور ہم نے اس کو پاک (صاف چیزوں کا رزق دیا اور فضیلت دی اپنی بکثرت مخلوق پر پوری پوری فضیلت) یہ بزم کائنات جس کے حاشیہ نشین اس کثرت سے ہیں کہ کسی کو طاقت نہیں کہ ان کو شمار کر سکے۔ اور پھر ہر جنس کی نوعیں جداگانہ ہر نوع کے افراد جداگانہ ہر فرد میں اس کی قدرت کے کرشمے نرالے۔ اس کی خصوصیات الگ۔ اگر تمام دریا سیاہی بن جائیں۔ اگر تمام اشجار قلم بن جائیں تب بھی اس کی قدرت کی کرشمہ سازیاں اور نکتہ آفرینیاں شمار میں نہیں آسکتیں۔

صاحب تفسیر کبیر نے مخلوق الہٰی کی کثرت کے متعلق ایک قیاسی خاکہ بنایا ہے کہ جتنے انسان ہیں ان سے دس گنا زیادہ چوپائے ہیں اور ان دونوں سے دس گنا زیادہ پرندے ہیں، اور ان تینوں سے دس گنا زیادہ کیڑے مکوڑے ہیں اور ان چاروں سے دس گنا زیادہ دریائی جانور ہیں، اور ان پانچوں سے دس گنا زیادہ فرشتے ہیں اور ان سب کا سرتاج مطلق العنان حاکم انسان ہے یہی چمنستان عالمین کا گل سرسبد ہے یہی بزم آفرینش کا مسند نشیں ہے یہی اشرف المخلوقات عالم ہے۔ جو کچھ تمام عالموں کے اندر ہے وہ اس اکیلے کے اندر ہے۔ قدرت ایزدی کے قربان کہ اس نے ایک عالم کبیر کو اس عالم صغیر میں ایک سمندر کو اس ایک قطرہ میں ہزارہا آفتابوں کو ایک ذرہ میں سما دیا ہے۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں ؎

اَتَزْعَمُ اَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيْرٌ وَفِيْكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْاَكْبَرِ

یعنی اے انسان کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ کوئی چھوٹا سا جسم ہے درآں حالیکہ تیرے اندر ایک عالم اکبر چھپا ہوا ہے) مشین چھوٹی سی ہے مگر کل پرزے اتنے زیادہ کہ ان کے کام آج تک انسان کی سمجھ میں نہیں آئے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک وہ اس چھوٹے سے جسم کی ادھیڑ بن میں لگا ہوا ہے۔ مگر آج تک وہ اس کے اسرار پر بالکلیہ اطلاع نہیں پا سکا کتم عدم سے منصۂ شہود پر جو بچہ آتا ہے اس کی آنکھ جدا۔ آواز جدا رنگ و روپ جدا۔ چال ڈھال جدا۔ مزاج جدا خصوصیات جدا کس کی طاقت ہے کہ بتا سکے کہ فلاں خصوصیت کس وجہ سے ہے۔ نقاش فطرت کا قلم قدرت ہے کہ خاکی سطح پر نقش پر نقش بنائے چلا جا رہا ہے مگر کیا ممکن ہے کہ ایک نقش دوسرے سے مل جائے۔ انسانی انگوٹھا کون سی بڑی سطح ہے ایک انچ سے زیادہ نہیں لیکن آغاز آفرینش سے آج تک اس چھوٹی سی جگہ میں جو نقوش بنائے جاتے ہیں کیا ممکن ہے کہ ایک دوسرے سے مل جائے۔

خلاق عالم نے اپنی اس عجیب و غریب مخلوق کی تسخیر میں تمام عالم کو دے رکھا ہے هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا (سورہ البقرہ ۲/۲۹) جو کچھ روئے زمین پر ہے سب تمہارے ہی لئے پیدا کیا گیا ہے۔)

ابر و باد و مہ و خورشید در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ وہ کیا انوکھی ادائیں اور البیلی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے افضلیت و اشرفیت کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا ہے۔

بلحاظ قد پہاڑوں سے اونچا نہیں۔ درختوں سے بلند نہیں، دریاؤں سے لمبا نہیں بلحاظ حسن دیکھو تو بے شمار مخلوق حسن میں ڈوبی ہوئی ہے ؎

الہٰی کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں
ہر اک صورت کلیجے سے لگا لینے کے قابل ہے

چھوٹی سی تتلی کو دیکھو کیا حسن کا پیکر نہیں۔ نازک چڑیوں کو دیکھو کہ کیسے رنگ برنگ کے گلدستے ہیں۔ مور کو دیکھو اس کے پروں کی خوش نمائی پر نظر کرو۔ چوپاؤں میں ہرنوں کو دیکھو کیسا نظر فروز اور دلکش بدن لئے پھرتی ہیں۔

طاقت کے اعتبار سے دیکھو تو شیر کے سامنے اس کی کیا حقیقت۔ ہاتھی سے اس کا مقابلہ کیا البتہ ایک چیز پر اس کو ناز ہے وہ اس کی عقل ہے غالباً یہی وجہ فضیلت ہے۔

لیکن غور کرو تو خدا کی اور مخلوق بھی اس زیور سے آراستہ ہے۔ خدا کی اس رحمت سے فیض یاب ہے۔ انسان کی ساری انزاہٹ فخر و مباہات کی ساری ترنگ آلات اور اوزاروں کے سہارے سے ہے۔ اگر اس سے تمام اوزار چھین لئے جائیں تو اس کی صنعت و حرفت اور ایجادی و اختراعی کیفیت کا اسی وقت بھانڈا پھوٹ جائے۔ شہد کی مکھی بغیر پرکار بغیر مسطر اور جیومیٹری بکس کے اپنے چھتے میں جو ایک ہی سائز کے خوشنما گھر موم جیسی نرم چیز سے بناتی ہے۔ انسان کی طاقت ہے کہ بغیر اوزاروں کے ایک خانہ بھی بنا سکے اور پھر ایسا مضبوط کہ نہ سورج کی گرمی اسے پگھلا سکے نہ بارش کا پُر زور جھالا اسے بہا سکے۔

ایک چھوٹا سا پرندہ بیّا اپنا گھر بغیر کرنی۔ بسولی، گنیا اور سہول کے بغیر چھری قینچی کے کیسا شاندار اور خوش نما گھر گھاس کے تنکوں سے بناتا ہے کہ انسان دیکھ کر عش عش کر جاتا ہے، کمرہ کے اندر کمرہ نہایت صاف ستھرا۔ پھر شاخ درخت میں اس مضبوطی سے لٹکا ہوا کہ سخت سے سخت آندھیوں کے جھونکے اسے اُڑا نہیں سکتے۔ موسلا دھار بارش اسے بہا کر نہیں لے جا سکتی۔ انسان سے کہو کہ بے آلات کے ایسا گھر بنا دے۔ کیا یہ فطری عقل کے کرشمے نہیں۔

ہر جاندار اپنی بقائے حیات کے لئے ضروری سامان مہیا کرنے کی تدبیر جانتا ہے۔ اپنے دوست دشمن کو پہچانتا ہے اپنے مضار و منافع سمجھتا ہے۔ اپنی اولاد کی پرورش کے قاعدے جانتا ہے اپنے رزق کے حاصل کرنے کے مقامات سے واقف ہے کیا اس کا نام عقل نہیں۔

کیا ایسا انسان بھی اشرف المخلوقات ہے جو ماچس رگڑنی بھی نہیں جانتا جو اپنا رزق خود پیدا کرنے کی تدبیر نہیں کر سکتا جو ایک دست پناہ بنانے کی قابلیت بھی نہیں رکھتا۔ کیا صرف اس کا پیکر دلیل اشرفیت ہے پیکر بھی ایسا جس کی ابتدا نطفہ گندیدہ اور انتہا ایک سڑا ہوا جسم ہر جانور کے بدن کا کوئی نہ کوئی حصہ کسی نہ کسی کام میں آتا ہے سوائے حضرت انسان کے اس کے بدن کی کوئی چیز ہی قابل استعمال نہیں۔ سوائے زمین میں دبا دینے یا آگ میں جلا دینے کے اس کا اور کوئی مصرف نہیں۔ یہ ہے جناب اشرف المخلوقات کی ساری کائنات۔ باقل اور ہبنقہ جیسے لوگ بھی آدمی تو ہیں لیکن کیا ان کو مخلوقات عالم پر کوئی فضیلت و شرف ہے انسان تو ہزار بار کہے گا کہ ہے لیکن ایک باخبر مکھی اور چھوٹی سی چیونٹی۔ حقیر سا مچھر بھی اس کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا۔

مخلوقات الٰہی کو اس طرح تقسیم کیا گیا ہے۔ اوّل خدا کی نورانی مخلوق یعنی فرشتے۔ غلمان اور حوریں وغیرہ دوسری آتشی مخلوق جیسے جن پریاں۔ تیسرے اثیری مخلوق۔ جیسے اجرام فلکی۔ چوتھے عنصری مخلوق۔ یہ چار طرح کی ہے اوّل جمادات، دوسرے نباتات تیسرے حیوان چوتھے انسان۔

مخلوقات ارضی میں انسان کے سوا سب کو لا یعقل کہا جاتا ہے اور جنس حیوان کے علاوہ نباتات و جمادات کو بے جان سمجھا جاتا ہے۔

یہ تقسیم اور امتیازی خطوط آج سے نہیں قرنوں سے چلے آرہے ہیں لیکن جدید سائنٹیفک تحقیقات نے اس عقیدے کو غلط ثابت کر دیا ہے جدید تحقیق یہ ہے کہ امواج زندگی (RAYES OF LIFE) ہر مادی پیکر کے اندر موجود ہے۔ خواہ اس کا تعلق نفس جمادی سے ہو یا نباتی سے ہو یا حیوانی سے صورت ان کی یہ ہے کہ نفس انسانی چونکہ زیادہ شفاف ہے لہٰذا اس میں زیادہ تیزی سے بھی اور زیادہ چمک دمک کے ساتھ نفوذ کرتی ہوئی جاتی ہیں اور نفس حیوانی چونکہ نفس انسانی کی نسبت غلیظ ہے۔ لہذا اس منزل میں بہ نسبت پہلے کے ان کی رفتار بھی دھیمی پڑ جاتی اور تابندگی میں بھی نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے نفس نباتی چونکہ اور زیادہ تاریک اور غلیظ ہے لہذا اس میں جا کر اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ نفس جمادی میں جا کر وہ بالکل مُردہ سی بن جاتی ہیں مگر رہتی ضرور ہیں۔ اگر کسی ذریعے سے نفس کے اندر صفائی پیدا کر دی جائے تو ان کی رفتار اور چمک تیزی سے بڑھ جاتی ہے اس کے لئے زبردست محرک کی ضرورت ہوتی ہے۔ تجربہ بتا رہا ہے کہ گراموفون کی پلیٹوں سے نقل صوت کا کام لیا جا رہا ہے۔ ریڈیو اور وائرلیس انسان کی طرح بول۔ لاؤڈ اسپیکر نعرے لگا رہا ہے۔ ٹیلی ویژن تصویر کشی کر رہا ہے۔ فوٹو گرافک کا کیمرہ آنکھ کا کام دے رہا ہے۔ برقی قوتوں نے ان سوئی ہوئی قوتوں کو جگایا اور ان میں امواج حیات کی موجودگی کا ثبوت دیا۔ یہ بات دوسری ہے کہ زندگی کی صورت دوسری ہے اسی طرح اب بندوں سے ٹائپ کرایا جا رہا ہے۔ مشینوں پر بٹھا کر محاسبہ کا کام لیا جا رہا ہے۔ درختوں کے پتوں اور شاخوں سے وہ آوازیں کھینچی جا رہی ہیں جو انہوں نے اپنے نیچے بیٹھنے والوں کی جذب کر رکھی تھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حیاتیات سے ان چیزوں کا بھی تعلق ہے مگر ان پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ انسان یہ نہ سمجھے کہ یہ سب بے جان اور لا یعقل محض ہیں۔ خدا نے اپنی عظیم الشان مصلحت کے تحت ان کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی ہے ورنہ یہ انسانی قوتیں ان سے بالکلیہ سلب نہیں کر لی گئیں۔

جب وقت آتا ہے اور کسی ایسے انسان سے ان کا تعلق پیدا ہوتا ہے جو واقعی اشرف المخلوقات کہے جانے کا سزاوار ہے تو یہ سوئی ہوئی مخلوق یکایک جاگ اٹھتی ہے جو پتھر تعمیر کعبہ میں مقام ابراہیم بنا تھا وہ سمجھ گیا کہ مجھ پر کس کا قدم ہے لہذا اس نے اپنے سینے پر خلیل باری کے قدم کا نقش لے لیا۔ نبوت کی اس قدر شناسی اور رتبہ دانی کا بارگاہ [illegible] سے صلہ ملا کہ اس کو حرم خدا میں جگہ مل گئی اور وہ حضرت اشرف المخلوقات یعنی بنی نوع انسان کا مصلیٰ بن لیا۔ [illegible] وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (سورہ البقرہ ۲/۱۲۵)

حجر اسود بھی تو ایک پتھر ہی ہے جنت میں حضرت آدم اسی پتھر پر بیٹھ کر ذکر الٰہی کیا کرتے تھے جب وہاں سے چلے تو یہ پتھر رو دیا۔ خطاب رب العزت ہوا کیوں روتا ہے۔ اس نے کہا تیرا ذکر کرنے والا اب جا رہا ہے۔ مجھے تیرا ذکر اب اس شان سے کون سنائے

گا۔ خدا کو اس کا عرفان پسند آیا۔ حضرت آدمؑ کے ساتھ زمین پر اسے بھی اُتار دیا اور اپنے گھر میں جگہ دے کر حاجیوں کو اس کے استیلام کا حکم دیا کیا یہ کچھ کم فضیلت ہے۔

ایک بار حضرت عمرؓ نے بوسہ دیتے وقت فرمایا اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تو کسی مصرف کا نہیں مگر چونکہ رسول کریمؐ کو بوسہ دیتے دیکھا ہے لہٰذا میں تجھے بوسہ دے رہا ہوں۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ اے عمر ایسا نہ کہو یہ روزِ قیامت لوگوں کے اعمال نیک و بد کی گواہی دے گا۔ سن لیا آپ نے اب یہ نہ کہیئے گا کہ یہ مخلوق بے جان اور بے حس ہے۔

جب امام زین العابدین علیہ السلام اور محمد بن حنفیہ میں دوبارہ خلافت نزاع ہوا تو اسی حجر اسود کو حکم بنایا گیا اور جب امام زین العابدینؑ نے پوچھا کہ بتا امام کون ہے تو اسی سے تو آواز آئی تھی۔ اَنْتَ الْاِمَامُ ابْنُ الْاِمَامِ

یہی بے جان لا یعقل پتھر تو تھے جنہوں نے عصائے موسٰیؑ کو پہچان کر اپنے اندر سے پانی کے بارہ چشمے نکال دیئے تھے۔

یہی پتھر تو تھے کہ محمد مصطفےٰ کے ہاتھوں پر آکر کلمہ پڑھنے لگے تھے اگر یہ شرف و ارزل کو نہ پہچانتے ہوتے تو ہمارے اور آپ کے ساتھ بھی یہی عمل ہوتا۔ ہم تو اگر انہیں بُت بنا کر پوجیں بھی تو بھی یہ بات کرنے والے نہیں ایسی حالت میں ان کی قوتِ تمیز سے انکار کیا جا سکتا ہے۔

نباتات کی فہم و فراست پر نظر ڈالو۔ درخت ہم سے کلام نہیں کرتے مگر جب موسیٰ علیہ السلام کوہ طُور پر جاتے ہیں تو ان سے بولتے ہیں۔ عصائے موسٰیؑ اگر موسٰیؑ کے ہاتھ سے زمین پر گرے تو سانپ بن جاتا ہے اگر دوسرا چاہے تو اپنی ہیئت بدلنے پر تیار نہیں ہوتا۔ بنی اسرائیل کے ایک عالم نے عصائے موسٰیؑ اپنے ہاتھ میں لے کر یہ کام کرنا چاہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ شل ہو گیا۔

امام رضا علیہ السلام جب مامون کے طلبیدہ مرو تشریف لے جارہے تھے تو ایک مقام پر آپ نے نماز پڑھنے کے لیے ایک سُوکھے ہوئے درخت کے نیچے وضو کیا وہ فوراً ہرا بھرا ہو گیا اور پھل لے آیا ہم ایسا کریں تو کچھ نہیں ہوتا مریم صدیقہ نے ایک کھجور کے سُوکھے ہوئے درخت کا تنا پکڑ کر ہلایا تو تازہ تازہ خرمے اس سے گرنے لگے۔

هُزِّيٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (سورہ مریم ۱۹/۲۵)

جب جناب زکریاؑ کو لوگوں نے قتل کرنا چاہا تو آپ ایک سُوکھے درخت کے پاس آئے اور فرمایا مجھے پناہ دے وہ کُشادہ ہوا اور خدا کے برگزیدہ بندہ کو اپنے اندر لے لیا اور اپنے پہلو سمیٹ کر اس طرح محفوظ کر لیا جیسے بچہ بطن مادر میں رہتا ہے کیا یہ درختوں کی بے عقلی کی دلیل ہے۔

اب حیوانوں کو لیجئے چھوٹی سی چیونٹی جناب سلیمانؑ سے کلام کرتی ہے۔ ہُدہُد جناب سلیمانؑ کا پیغام لے جاتا ہے۔ کبوتر حضرت داؤدؑ کے پاس فیصلہ کرانے آتے ہیں۔ کبوتر خون حسینؑ میں اپنے پروں کو تر کر کے مدینہ آتا ہے اور دیوار خانہ جناب اُم سلمہ

پر بیٹھتا ہے۔

اثدہا منبر پہ رسولؐ سے کلام کرتا ہے۔ ہرنی اپنا بچہ لے کر آتی ہے۔ ناقہ غضبا حضورؐ کی وفات کے بعد قبر اقدس پر سر پٹک کر مر جاتا ہے۔ حسینؑ کا گھوڑا سیدانیوں کو پُرسا دینے کے لئے آتا ہے۔ امام محمد تقی علیہ السلام کو جب برکتہ السباع درندوں کا گھر کے اندر داخل کیا جاتا ہے تو وہ آپ کے قدموں پر آنکھیں ملنے لگتے ہیں۔ امام حسن عسکری کو دیکھتے ہی متوکل کا سرکش گھوڑا رام ہو جاتا ہے۔

اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں کیا ان کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے یہ خدا کی سب مخلوق بے جان ہے بے عقل ہے اور صرف انسان ہی عقل والا ہے اسی لئے وہ اشرف المخلوقات ہے خدا فرماتا ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ (سورہ بنی اسرائیل ۱۷/۴۴) (کوئی شئے ایسی نہیں جو خدا کی تسبیح نہ کرتی ہو مگر لوگ اس کو سمجھتے نہیں ہیں)

نتیجہ یہ نکلا کہ یہ صرف عقل انسانی جو ایجادات و اختراعات میں کام دیتی ہے جو معاشرت و تمدّن کے مسائل حل کرتی ہے افضلیت و اشرفیت کے لئے کافی نہیں۔ اگرچہ یہ بھی دیگر مخلوقات سے انسان کو ایک بڑی حد تک ممتاز بناتی ہے۔ ان کو مسخر کرنے میں مدد دیتی ہے کائنات کے بہت سے سربستہ رازوں کو حل کرتی ہے۔ پھر بھی اتنی جلا اس کی کافی نہیں مخلوقاتِ الٰہی اس کو افضل تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اب امامؑ کی زبان سے سنیئے کہ عقل کی تعریف کیا ہے۔ اصول کافی کتاب العقل میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے کسی نے پوچھا عقل کیا ہے فرمایا: مَاعُبِدَ بِہِ الرَّحْمٰنُ وَاکْتُسِبَ بِہِ الْجِنَانُ (جس سے خدا کی عبادت کی جائے اور جنت حاصل کی جائے۔)

معبود کی عبادت صحیح نہیں ہو سکتی جب تک اس کی معرفت نہ ہو۔ اور معرفت اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی جب تک اس مخلوقات پر غور و تدبّر نہ کیا جائے۔ اپنے نفس کے سربستہ رازوں کو سمجھا نہ جائے جس قدر اس کے متعلق غور و فکر زیادہ ہوگا اسی قدر معرفت کے پاؤں میں جان آئے گی اور جس قدر معرفت بڑھتی جائے گی، ذوقِ عبادت میں ترقی ہوتی جائے گی۔ پھر عبادت نہ کسی لالچ سے ہوگی نہ کسی خوف سے بلکہ معبود کو معبود سمجھ کر ہوگی۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: اِلٰھِیْ مَاعَبَدْتُکَ طَمَعًا فِیْ جَنَّتِکَ وَلَاخَوْفًا مِّنْ نَّارِکَ بَلْ وَجَدْتُکَ مُسْتَحِقًّا لِّلْعِبَادَۃِ فَعَبَدْتُکَ (خداوندا! میں نہ طمع جنّت میں تیری عبادت کرتا ہوں نہ دوزخ کے خوف سے بلکہ تجھ کو مستحق عبادت سمجھ کر کرتا ہوں۔ اصلی عبادت اسی کا نام ہے مرزا غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبین کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اگر جنّت کے لالچ میں عبادت ہے تو یہ تاجرانہ ذہنیت ہے اور اگر دوزخ کے خوف سے ہے تو یہ غلامانہ ذہنیت ہے اور

اگر بے لاگ ہے تو یہ آزادانہ ذہنیت ہے۔

دوسرا فقرہ اس حدیث کا یہ ہے کہ جنّت اس سے حاصل کی جائے یعنی عبادت الٰہی کے ساتھ ساتھ ایسا عمل بھی ہو جو اس کو مستحق جنّت بنادے۔ لہٰذا اب عقل کے لئے دو دائرے معین ہوں گے پہلے معرفت حاصل کر کے خدا کی عبادت کی جائے دوسرے اعمال صالحہ بجالاکر استحقاق جنّت پیدا کیا جائے۔ اسی کا دوسرا نام ایمان اور عمل صالح ہے۔ جس کا ذکر قرآن میں جا بجا ہے عمل صالح بدون ایمان مقبول نہیں اور ایمان بدون عمل صالح استحقاق جنّت پیدا نہیں کرتا اسی لیے اسلام نے رہبانیت کو منع کردیا ہے کیونکہ اس میں عبادت تو ہوتی ہے مگر دُنیا سے قطع تعلق کرنے کی بناء پر اعمال صالحہ کا موقعہ نہیں ملتا۔

پس اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی کثیر مخلوق پر صرف ان ہی لوگوں کو فضیلت حاصل ہے جن کے درجات ایمان و عمل صالح میں بلند ہیں۔ اور یہ خدا کے برگزیدہ بندوں کا ایک خاص گروہ ہے جن کے تسخیر میں تمام عالم ہے۔ وہ سورج سے کہیں تو غروب ہونے کے بعد پلٹ آئے۔ چاند کو اشارہ کردیں تو دو ٹکڑے ہو جائے۔ ستارے ان کے گھر میں اتر آئے۔ جنّت کے میوے فرشتے ان کے لئے لے کر آئیں۔ جبریل جیسا فرشتہ ان کی گہوارہ جنبانی کرے حوریں ان کی دایہ گری کی خدمت انجام دیں۔ روز عید جنّت سے ان کے لئے لباس آئے۔ جنگ کرنے کے لئے تلوار بھیجی جائے جن ان کے غضب سے پناہ مانگیں۔ ہوا اپنے بساط پر بیٹھا کر کوہ رقیم پر لے جائے۔ مردے زندہ ہو کر ان سے کلام کریں قالین کے شیران کے حکم سے مجسّم ہو کر ان کے دشمن کے ٹکڑے کردے۔

دنیا کا ہر ذرّہ کائنات کا ہر پیکر ان کے شرف کا معترف اور ان کے فضل کا مقر ہے۔ اگر وہ خوش ہیں تو تمام دنیا خوش ہے اگر ان پر مصیبت آئے تو قلب عالم ہل جائے کائنات میں ہل چل پڑ جائے۔

یہ نہ کہنا کہ جب دُنیا کی ہر شے ان کے تحت تصرّف ہے تو پھر کوئی مصیبت ان پر آئی کیوں ہے بے شک اگر وہ نہ چاہیں تو کوئی چیز ان کو ضرر پہنچانے کے لئے آگے نہیں بڑھ سکتی مگر وہ چاہتے اس لئے ہیں کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ یہ خدا ہیں یا ان کی صنفِ نوع انسان سے جدا ہے چاہتے اس لئے ہیں تاکہ ان کے اخلاقی کمالات لوگوں پر ظاہر ہوں۔ چاہتے اس لئے ہیں کہ اپنے عمل سے دوسروں کو سبق دیں۔

واقعہ کربلا نے تمام دنیا کو سمجھا دیا کہ اہل بیت کے فضل و شرف کو کائنات کے ہر ذرّے نے کس طرح پہچانا تھا۔ اور امام علیہ السلام کے قتل ہوتے ہی دُنیا کی ہر شے کس طرح سوگوار بن گئی تھی ادھر کربلا کے میدان میں اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَآءِ کی صدا بلند ہوئی آثار حزن و ملال چہرہ کائنات سے ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ آفتاب کو گہن لگا۔ دن میں تارے دکھائی دینے لگے۔ سیاہ آندھی اُٹھی، جنگلوں میں وحشی تڑپے۔ ہوا میں پرندے لرزے۔ فرشتوں میں بے چینی پیدا ہوئی، حوروں میں ہلچل مچی۔ جنوں نے نوحہ خوانی کی۔

فرشتے اگرچہ نورانی مخلوق ہیں۔ معصوم ہیں۔ بڑے فضل و شرف کے مالک ہیں لیکن جب کبھی خاصانِ خدا کسی مصیبت میں

مبتلا ہوتے ہیں تو وہ بارگاہ باری میں مدد کی درخواست کرتے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق میں رکھ کر شعلہ فشاں آگ کی طرف پھینکے جا رہے تھے تو جبرائیل علیہ السلام نے بارگاہ باری میں عرض کی خداوندا ابراہیمؑ ایک اکیلا تیرا توحید پرست بندہ ہے کیا تو اسے آگ میں جل جانے دے گا۔ خطاب ہوا تو کیا چاہتا ہے۔ عرض کی اگر اجازت ہو تو میں اس وقت بے کسی میں مدد کروں۔ حکم ہوا جا اگر ابراہیمؑ تیری مدد چاہیں تو ضرور کر۔ جب جناب خلیلؑ منجنیق سے جدا ہو کر آگ کے شعلوں کی طرف جا رہے تھے۔ جبرئیلؑ نے اُن کو آلیا۔ اور عرض کی یا ابراہیمؑ کوئی حاجت ہو تو بیان کرو۔ فرمایا اس سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔" یہ ہوتا ہے ایمان باللہ خدا کے برگزیدہ بندوں کا۔

جب جناب یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا تو اس وقت بھی ملاء اعلیٰ نے شور مچایا اور جبرئیلؑ نے مدد کی خواہش ظاہر کی۔ جبرئیلؑ نے یوسف سے کہا اگر کہو تو تمہارے بھائیوں کو ہلاک کر دوں، فرمایا "یہ مجھے منظور نہیں"۔ جناب جرجیس کو جب کھولتے تیل میں ڈالا جا رہا تھا۔ فرشتے تڑپ اُٹھے۔ ایک فرشتے نے آکر کہا۔ حکم ہو تو یہ کھولتا تیل ان گمراہوں پر چھڑک کر ہلاک کر دوں۔" فرمایا مجھے یہ منظور نہیں۔ میرا یہ وقت امتحان ہے۔ میری موت بہت سے لوگوں کے لئے ہدایت کا باعث ہوگی۔

اسی طرح جب میرا مظلوم آقا، آہ غریب بینوا مظلوم کربلا صبح سے عصر تک اپنی ساری کائنات لٹا چکا۔ یہاں تک کہ اپنے شش ماہہ بچہ کو بھی فدیہ راہِ خدا بنا چکا اور کوئی مدد کے لئے باقی نہ رہا تو خود بنفس نفیس میدان میں آئے ٹوٹا ہوا دل۔ پیاس سے دل وجگر کباب۔ عزیزوں کی لاشیں سامنے۔ دل پر مرنے والوں کے داغ۔ سیدانیوں کے بے وارث رہ جانے کا غم۔ پھر بھی لڑنے پر آمادہ ہوئے اور ایسی جنگ کی کہ دشمن بدحواسی سے ہر طرف بھاگتے پھرتے تھے۔ جب بہت سے دشمنوں کو تہ تیغ کر چکے تو مابین آسمان وزمین ایک آواز پیدا ہوئی۔ حسینؑ اب لڑتے ہی جاؤ گے، کیا اپنا وعدہ طفلی دفانہ کرو گے۔ یہ سنتے ہی علیؑ کے شیر نے اپنی تلوار نیام میں کر لی۔ تلوار کا نیام میں آنا تھا کہ دشمن ہر طرف سے حملہ آور ہوئے۔ بکھرے ہوئے پرے جم گئے۔ وار پر وار ہونے لگے۔ کوئی تلوار مارتا تھا کوئی نیزہ، کوئی خنجر لگاتا تھا کوئی تیر برساتا تھا۔ سارا بدن امام مظلوم کا گھائل ہو گیا۔ ہر بن مو سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ آہ جس کے بدن پر ایک ہزار نو سو زخم ہوں اس کا کیا حال ہوگا۔ میرا مظلوم آقا اب گھوڑے پر سنبھل نہیں سکتا قریب ہے کہ زمین پر آرہے۔ یہ حال فرشتوں سے نہ دیکھا گیا۔ کہرام بپا ہو گیا۔ جبرئیلؑ نے بارگاہِ باری میں عرض کی کہ پالنے والے یہ وہی حسینؑ ہے جس کے لئے میں جنت کے میوے لے جاتا تھا یہ وہی حسینؑ ہے جس کی میں گہوارہ جنبانی کرتا تھا۔ یہ وہی حسینؑ ہے جس کے لئے تو نے روزِ عید لباس جنت بھجوایا۔ یہ وہی حسینؑ ہے جس کو تیرا حبیب اپنے شانوں پر سوار کرتا تھا۔ مجھ سے اس کا یہ حال نہیں دیکھا جاتا اجازت دے کہ میں اس غریب کی مدد کروں۔ حکم ہوا کہ جبرئیلؑ جا اگر حسینؑ تیری مدد کا خواہاں ہو تو مدد کر۔ جبرئیلؑ نے سر حسینؑ پر اپنا سایہ کر لیا۔ جب امام مظلومؑ نے سایہ کی خنکی محسوس کی تو نہایت کمزور آواز میں فرمایا: اے مخلوقِ خدا تو کون ہے کہ اس وقت بیکسی میں تو میرے اوپر سایہ کر رہا ہے۔ جبرئیلؑ یہ سن کر تڑپ گئے۔ عرض کی اے حسینؑ

میں تیرا خادم جبریلؑ ہوں۔ مولاؑ نے فرمایا اس وقت کس غرض سے میرے پاس آئے ہو؟ انہوں نے کہا مجھے حکم دو کہ ابھی ایک پَر مار کر قوم جفا کار کو ہلاک کر دوں۔ فرمایا جبریلؑ! اب کس لئے ایسا کرو گے۔ انہوں نے کہا تاکہ آپ کو ان ظالموں سے بچا لوں۔ فرمایا "اب میں جی کر کیا کروں گا۔ دیکھتے نہیں یہ میرے کلیجے کے ٹکڑے سر کٹائے خون میں نہائے خاک پر پڑے ہیں۔ شیر سا بھائی کھو چکا، کڑیل جوان بیٹے کو رو چکا۔ شیر خوار بچہ تیرِ ستم کا نشانہ بن چکا۔ بہن کا گھر لٹ گیا، بھاوجیں۔ بھتیجیاں، بھانجیاں بے وارث ہو چکیں۔ زخموں سے چور چور ہوں، زندگی کا نہیں موت کا آرزومند ہوں۔ جبریلؑ نے کہا اجازت ہو تو پانی لاؤں۔ فرمایا: آہ! جس کے سامنے بہتر جوان پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر گئے ہیں ان کے بعد میں پانی پیوں گا۔ جبریلؑ بس اب بات چیت ختم کرو۔ یہ میرے امتحان کا وقت ہے مجھے ثابت قدم رہنے دو۔ جبریلؑ یہ سُن کر محزون و مغموم واپس آئے۔

منقول ہے کہ جب جنوں کو واقعہ کربلا کا حال معلوم ہوا تو ان میں اضطرابی کیفیت پیدا ہوئی بالخصوص جب میرے مظلوم امام نے آوازِ استغاثہ بلند کی۔ جنوں کے دل سینوں میں ہل گئے۔ ان کے سردار زعفر جن نے اپنی قوم سے کہا۔ کیا آرام سے بیٹھے ہو نبیؐ کا نواسہ آوازِ استغاثہ بلند کر رہا ہے۔ شرطِ ایمان یہ ہے کہ اس کی مدد کرو۔ زعفر جن نے جنوں کی ایک فوج اپنے ہمراہ لی اور کربلا کا رُخ کیا لیکن آہ زعفر اس وقت پہنچے جب کربلا میں یہ آواز ہر طرف گونج رہی تھی — قُتِلَ الحُسَيْنُ بِكَرْبَلَاءِ ذُبِحَ الحُسَيْنُ بِكَرْبَلا سورج کو گہن لگ رہا تھا سیاہ آندھی نے تمام میدانِ کربلا کو تیرہ و تار بنا دیا تھا۔ یہ حال دیکھ کر زعفر ناکام واپس ہوئے۔ میں عرض کرتا ہوں زعفر آپ کو نہ جانا چاہیے تھا۔ اگر آپ میدانِ کربلا میں رہتے تو خیامِ حسینی کو آگ نہ لگتی۔ سیدانیاں لوٹی نہ جاتیں۔ سروں سے چادریں نہ چھنتیں شہیدوں کے لاشے پامال نہ ہوتے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

پانچویں مجلس

ابنیاءؑ کے مصائب کا مقابلہ مصائب حسینؑ سے

زنانِ اہل حرم کے مصائب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِی کِتَابِہِ الۡمَجِیۡدِ وَفُرۡقَانِہِ الۡحَمِیۡدِ

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ۙ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ

(سورہ البقرہ ۲/۱۵۵)

(بشارت دے دو ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو کہتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ

ہر وہ چیز جو انسان کے لئے باعث تکلیف یا نقصان ہو مصیبت کہلاتی ہے۔ راحت کی منفی صورت کا نام مصیبت ہے۔ خوشی اور غم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے جہاں خوشی ہے وہاں غم ضرور اور غم لازمہ مصیبت ہے مصیبت کی کتنی صورتیں ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ جتنی خوشی اور راحت کی صورتیں ہیں اتنی ہی مصیبت اور غم کی ہیں۔

مصیبت کی دو صورتیں ہیں ایک وہ جو انسان کے کرموں کا نتیجہ ہوتی ہے جیسے جواری کا مفلس ہو جانا شراب خوار کا اپنی صحت کھو بیٹھنا، مسرف کا تہی دست ہو جانا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خدا کی طرف سے کسی بندہ کا امتحان ہو اسے ابتلا کہتے ہیں یہ کسی گناہ کی سزا نہیں ہوتی بلکہ اس کے درجات تقرب بلند کرنے اور مراتب و فضائل میں زیادتی کے لئے ہوتی ہے۔

مصیبت کی پہلی صورت عام ہے کہ دوسری صورت خاص اس کا تعلق خدا کے مخصوص بندوں سے ہوتا ہے اَلۡبَلَاءُ مُوَکَّلٌ عَلَی الۡاَنۡبِیَاءِ ثُمَّ الۡاَوۡصِیَاءِ ثُمَّ الۡاَمۡثَلُ فَالۡاَمۡثَلُ لیعنی پہلے مقام امتحان میں انبیاء آتے ہیں

پھر اولیاء و اوصیاء ان کے بعد جو ان کی مثل ہوتے ہیں، ان کے بعد جو اُن جیسے ہوں نیز ان منزلوں میں عام لوگ ثابت قدم نہیں رہ سکتے۔

عام لوگ کسی مصیبت میں مبتلا ہو کر گھبرا جاتے ہیں اور خدا کی شکایتوں کا دفتر کھول دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے ان پر ظلم کیا ہے لیکن اس کے برگزیدہ بندے ہجوم مصائب میں صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں اور ابتلا کا وزن جتنا بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی ان کی معرفت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور رجوع الی اللہ میں زیادتی ہوتی جاتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہماری بہتری کا سامان ہے۔

اَلْاِبْتِلَاءُ لِلْوَلَاءِ مشہور ہے جتنی خدا کو کسی سے محبت زیادہ ہے اتنی ہی اس کی ابتلاء سخت ہے اور جتنا کسی کو کسی سے بعد ہے اتنی ہی اس کی ابتلا کم ہے۔

سب سے بڑی مصیبت ہلاکت کا خوف ہے اچھے اچھے بہادر پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ فرعون باوجود اپنی انتہائی سرکشی کے جب اپنے کو موت کے پنجے میں پھنستا دیکھتا ہے تو چیخ چیخ کر کہنے لگتا ہے اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ (سورہ الاعراف ۱۲۲/۷) یعنی اپنے دعوئے خدائی سے ہٹ جاتا ہے۔ لیکن ابراہیم علیہ السلام آگ کے شعلوں کو دیکھ کر نہیں گھبراتے اور نمرود کی خدائی کا اقرار نہیں کرتے۔ جناب یحیٰؑ سے ظالم بادشاہ کہتا ہے یا تو میری مرضی کے مطابق فتویٰ دو ورنہ میں تم کو قتل کر دوں گا آپ فرماتے ہیں قتل ہونا گوارا ہے مگر حکم خدا کے خلاف کرنا گوارا نہیں۔ قاتل تلوار سونت کر سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ یحیٰ کیوں ناحق اپنی جان دیتے ہو۔ فرماتے ہیں حق پر جان دینا میرے لئے نافرمانی خدا میں زندگی گزارنے سے بہتر ہے اس کے بعد سر جھکا دیتے ہیں کہ شوق سے سر کاٹ لے۔

انسان دو وقتوں میں خدا کو بھول جاتا ہے۔ ایک انتہائی عیش میں، دوسرے انتہائی تکلیف میں۔ انتہائی عیش میں بھول جانے والے بہت زیادہ ہیں اور انتہائی مصیبت میں بھول جانے والے بہت ہی کم ہیں۔

مصیبت انسان کے سخت دل کو نرم بناتی ہے پچھلی غلط کاریوں سے بچانے میں تازیانہ عبرت ہوتی ہے۔ بسا اوقات خدا کی طرف سے ہٹے ہوئے دل اس کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اگر انسان کبھی کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہو تو عبدیت کے جادہ سے اس کے قدم کے ہٹ جانے کا قوی خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ سمجھنے والے دنیا میں بہت کم لوگ ہیں کہ جو مصیبتیں ہم پر آتی ہیں وہ ہمارے ہی کرتوت ہیں۔ خدا فرماتا ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (سورہ البقرہ ۲/۲۸۶) جو نفع انسان کو پہنچ رہا ہے وہ اسی کے نفس سے ہے اور جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ اسی کی طرف سے کیوں کہ وہ فاعل مختار ہے۔ خدا اسے کسی عمل پر مجبور نہیں کرتا اس نے عقل اسی لئے دی ہے کہ انسان اپنے نفع اور نقصان کو سمجھے اور ایسا کوئی عمل نہ کرے جو اس کو کسی مصیبت کے جال میں پھانس دے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح راحت اور خوشی دوامی نہیں مصیبت بھی ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں۔ وقت آتا ہے

اور نکل جاتا ہے۔ مصائب و آلام کے بادل چھاتے ہیں اور ہوائیں انہیں اُڑا لے جاتی ہیں۔ صابر آدمی صبر و ضبط سے کام لے کر ان دشوار گزار منزلوں سے باآسانی گزر جاتا ہے اور بے صبرا چیخ پکار اور ہائے واویلا کرکے اپنا اجر کھو بیٹھتا ہے۔

انبیائے علیہم السلام پر جو مصائب نازل ہوئے وہ وقتی تھے۔ امتحان ختم ہوتے ہی غم خوشی سے اور مصیبت راحت سے بدل جاتی ہے۔

دُنیا میں سب سے پہلے مصیبت میں مبتلا ہونے والے حضرت آدم علیہ السلام تھے کیسی سخت مصیبت تھی کہ ایک بیٹے نے دوسرے کو بے جرم و قصور قتل کر ڈالا لیکن یہ مصیبت حضرت آدمؑ تک محدود ہو کر آگے کو نہ بڑھی۔ کچھ روز رونے کے بعد جناب آدمؑ کو صبر آگیا۔

اس کے بعد حضرت نوحؑ کا زمانہ آیا اس میں شک نہیں حضرت نوحؑ کو بڑے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا برسوں صبر سے کام لیتے رہے۔ آخر عنانِ صبر ہاتھ سے چھوٹ گئی اور قوم کی ہلاکت کی دُعا ان الفاظ میں مانگنے لگے۔ وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا (سورہ نوح ۷۱/۲۶) (خداوندا روئے زمین پر ان کافروں کو کہیں آباد نہ رکھ) دُعا قبول ہوگئی۔ پانی کے طوفان نے سوائے ان چند ایمان والوں کے جو نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار تھے باقی سب کو ڈبو دیا۔ مصیبت کے بادل کھل گئے۔ رنج خوشی سے بدل گیا۔ ظالموں کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ٹوٹے دل کو تسلی ہوگئی جذبۂ انتقام اپنی کامیابی کی منزلیں طے کر چکا۔

خداوند عالم نے یہ دیکھ کر مصائب کے تحمل سے نوح علیہ السلام عاجز آچکے ہیں امتحان ختم کر دیا اور ابتلا کو ان سے ہٹا لیا تاکہ ایک نبیؑ کا روحانی اقتدار باقی رہے۔

اب وقت کی تیز رفتار موجیں آستان ابراہیمؑ سے ٹکرا رہی ہیں۔ مصائب کی فہرست بن کر جناب ابراہیمؑ کے سامنے آگئی۔ کیا کہنا خُدا کے اس صابر و شاکر بندے کا ایک ایسی قوم کے نرغے میں راہ ایمان پر ثابت قدم ہے جو بندہ کو خدا سمجھے بیٹھی ہے جو بُتوں کی پرستار ہے۔ یہی روحانی تکلیف کچھ کم نہ تھی کہ ایک اور ہولناک منظر سامنے آیا۔

اس قوم کا منصوبہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ کے سر بفلک شعلوں میں پھینک کر خاکستر بنا دے۔ دوسرا ہوتا تو اس مصیبت کے تصوّر سے چیخ اُٹھتا اور قوم سے رحم و کرم کی درخواست کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ کے ثباتِ قدم میں بال برابر فرق نہیں۔ اضطراب و بے چینی نے ان کے دل میں جگہ نہ پائی۔ یہ وہ دشوار گزار اور صبر شکن منزلیں ہیں کہ خاصانِ الٰہی کے سوا دوسروں کے قدم یہاں رُک نہیں سکتے۔ وہ وقت بھی آگیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو منجنیق میں رکھ دیا گیا، مگر استقلال وہی ہے۔ منجنیق سے آگ کی طرف پھینکے گئے۔ مگر دل میں دھڑکن نام کو نہیں۔ ملاءِ اعلیٰ کے ساکنین تڑپ تڑپ گئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تمام روئے زمین پر خدائے واحد پر ایمان لانے والا صرف ایک ابراہیمؑ ہے۔ آج وہ بھی نذرِ آتش ہو رہا ہے۔ جبرئیلؑ مدد کی اجازت لے کر آ پہنچے۔ عرض کر رہے ہیں یا ابراہیمؑ کوئی حاجت ہو تو بیان کرو۔ فرماتے ہیں حاجت تو ہے مگر تم سے نہیں عرض

کی پھر جس سے ہے اسی سے کہو تاکہ وہ تمہیں اس بلا سے نجات دے۔ فرمایا اس سے کہنے کی ضرورت نہیں وہ دانائے حال ہے۔ امتحان اس منزل پر آکر ختم ہوگیا قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ (سورہ الانبیاء ۲۱/۶۹) کی آواز نے شعلہ ہائے نار کو آتشِ گل بنا دیا۔ لیجئے مصیبت راحت سے رنج خوشی سے بدل گیا۔ جناب ابراہیمؑ شاد و خرم ہیں اور ان کے دشمن اپنی ناکامی پر ملول و رنجیدہ۔

کچھ روز بعد حضرت یعقوبؑ کی ابتلاء کا وقت آگیا، وہ حسین و خوب رو بیٹا جس کو تمام اولاد سے زیادہ محبوب رکھتے تھے نگاہوں سے اوجھل ہے۔ بھیجا تھا بھائیوں کے ساتھ جنگل میں کھیلنے کو وہ کہہ رہے ہیں یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا خون آلود قمیص جگر سوختہ اور مصیبت رسیدہ باپ کے سامنے رکھ دی۔ دیکھا اور تعجب سے کہنے لگے کہ یہ کیسا عجیب بھیڑیا تھا کہ اس نے میرے یوسفؑ کو تو چیرا پھاڑا مگر اس کی قمیص پر آنچ نہ آئی۔ یہ سب مکر ہے۔ میں بھیڑیئے کو بلا کر مفصل حال معلوم کرتا ہوں۔ نبیؑ کی آواز پر ایک بھیڑیئے نے لبیک کہی اور سامنے آکر عرض کی کہ یا نبی اللہ۔ انبیاء کا گوشت ہم پر حرام ہے راز کھل گیا مگر دردِ فراق کا یہ کوئی علاج نہ تھا۔ یوسفؑ کہاں ہیں کچھ خبر نہیں کب ملیں گے کچھ پتہ نہیں۔ دل کی تڑپ نے آہیں نکالیں۔ سوزشِ جگری نے آنسو بہائے۔ روئے اور اتنا روئے کہ بصارت زائل ہوگئی۔ بدن کی طاقت جواب دے رہی ہے فراق کی مدت بڑھتی جا رہی ہے۔ سالہا سال گزر گئے یوسفؑ کی کوئی خبر نہیں۔ قادر مطلق نے یہ سمجھتے ہوئے کہ صبر کی باگ یعقوبؑ کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے ابتلا کا دور ختم کر دیا۔ مصر کی طرف سے آنے والی ہوا نے یوسفؑ کی بو مشام جناب یعقوبؑ کو پہنچا دی۔

لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (سورہ یوسف ۱۲/۹۴)

(اگر تم مجھے سٹھایا ہوا نہ سمجھو تو میں یوسفؑ کی بو سونگھ رہا ہوں) امید کے سوکھے درخت میں کونپلیں پھوٹ نکلیں بشیر نے یوسفؑ کا کرتا آنکھوں سے لگا دیا۔ گئی بینائی واپس آگئی۔

مصائب و آلام نے رخصتی سلام کیا۔ خوشی نے سامنے آکر مبارک بادی کا ترانہ گایا۔ اگر خدانخواستہ یہ مصیبت جم جاتی تو شاید یعقوبؑ امتحان میں فیل ہو جاتے۔ خدا نے اپنے نبیؑ کی بات نیچی نہ کی یہ اس کا فضل تھا۔

حضرت ایوبؑ کا زمانہ بھی بڑا صبر آزما تھا۔ ایک وقت میں بہت سی مصیبتیں آپڑی تھیں۔ صبر کیا اور بہت کیا آخر ایک وقت ایسا آیا کہ کہنا پڑ گیا۔

رَبَّہٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ (سورہ الانبیاء ۲۱/۸۳)

(خداوندا مجھے نقصان پہنچ گیا۔ بس اس کے بعد دورِ ابتلا ختم ہوگیا اور گئی نعمتیں واپس آگئیں۔

وقت کا تیز رو دھارا سلسلہ انبیاء سے گزرتا ہوا اب موسیٰ علیہ السلام تک پہنچ گیا ہے۔ امتحانات کی ایک لمبی چوڑی فہرست قضا و قدر کے فرشتوں نے جناب موسیٰ کے سامنے لا رکھی۔ ان سب پرچوں میں کامیابی حاصل کرنا ضروری ہے۔

عالم وجود میں آتے ہی اس مصیبت سے دوچار ہونا پڑا کہ ماں کی آغوش شفقت سے جدا ہو کر اس ظالم کے گھر پہنچے جو اُن کے خون کا پیاسا تھا جس نے ان کی جستجو میں اب تک بنی اسرائیل کے دس ہزار بچوں کو ذبح کرا کے بھی دم نہ لیا تھا۔ قدرت کو منظور یہی تھا کہ اسی دشمن جان کے گھر میں رہ کر پرورش پائیں۔ سالہا سال اس دشمنِ خدا کی تربیت میں گزارے مگر اس کی خدائی کا اقرار نہ کیا، آخر موقع پاکر محل فرعون سے نکل بھاگے۔ برسوں جناب شعیبؑ کی خدمت میں بکریاں چرائیں وہاں سے بی بی کو ساتھ لے کر چلے تو وادی ایمن میں اپنے نبی بنائے جانے کا مژدہ سنا اس کے ساتھ ہی یہ پیغام ملا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اسے ہدایت کرو۔ معمولی کام نہ تھا۔ تمام ملک میں اس کی خدائی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ایسے ظلمت آگیں ماحول میں کسی فردِ واحد کا مخالفانہ نعرہ مارنا فرعون پرستوں کو خدا پرستی کی طرف دعوت دینا اپنی جان و مال و آبرو سے کھیلنا تھا۔ موسیٰ نے اہمیت کو سمجھا اور عرض کی کہ پالنے والے میرے دل میں جو تنگی اور گھبراہٹ ہے اُسے دور کر اور جو خدمت میرے سپرد کی ہے اس میں آسانی پیدا کر میری زبان کی لکنت کو دور کر تاکہ لوگ میری بات کو سمجھیں اور چونکہ میں تنہا اس عظیم الشان بار کو نہیں اٹھا سکتا لہذا میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے۔ اور اس سے میرے بازو کو قوی کر دے (مصیبت میں بھائی ہی کام آتا ہے۔ جگر جگر است دگر دگر)

اب ہارون و موسیٰ علیہم السلام فرعون کے دربار میں ہیں۔ خدا کا وہ مغرور بندہ جو لوگوں کے سامنے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (سورہ النازعات ۲۴/۷۹) کے نعرے مارنے کا عادی ہے۔ یہ دو خدا کے نیک بندے اس کو خدا پرستی کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس نے غصّے میں بھر کر حکم دیا کہ ان دونوں کو دھکّے دے کر نکال دو۔ موسیٰ کا عصا اژدہا بن کر دوڑا۔ ید بیضا نے اپنی چمک دکھائی ۔ جھوٹا خدا لرزتا کانپتا تخت سے اُٹھ کر بھاگا۔

اب حضرت موسیٰؑ کے مقابلے کے لئے ملک کے چیدہ چیدہ ساحر بلائے جانے لگے۔ فرعون نے سمجھا کہ حضرت موسیٰ جادوگر ہیں۔ لہذا جادوگروں کو بلا کر ان کو شکست دی جائے۔ نتیجہ میں موسیٰ علیہ السلام جادوگروں پر غالب آئے اور وہ سب موسیٰ و ہارون علیہم السلام پر ایمان بھی لے آئے۔ کیسے سخت وقت گزر رہے تھے دوسرا ہوتا تو خوف سے پتّہ پانی ہو جاتا لیکن موسیٰؑ تو موسیٰ ہی تھے۔ موقع پاکر انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا۔ جلد مصر سے نکل چلو اب آگے آگے موسیٰؑ و ہارون ہیں اور پیچھے تمام قوم جب دریائے نیل کے پاس پہنچے تو فرعون ان کے پیچھے مع فوج آ لگا۔ بنی اسرائیل کے لئے وہ کیسا سخت وقت تھا آگے دریا پیچھے خون کا پیاسا دشمن۔ مگر خدا نے اس مصیبت سے نجات دی۔

فرعون مع لشکر غرق ہو گیا اور موسیٰ مع اپنی قوم کے دریا کو پار کر گئے۔ اس منزل سے پہلے بے شمار مصائب کا سامنا جناب موسیٰؑ کو کرنا پڑا۔ مگر وہ ثابت قدم رہے آخر اُن کا دورِ ابتلا بھی ختم کر دیا گیا اور رنج خوشی سے اور پریشانی سکون قلب سے بدل گئی۔ سلامتی پر مبارک بادی کی صدائیں فضا میں گونجنے لگیں۔

اسی طرح انبیاء کرام پر مصائب نازل ہوتے رہے اور وقت پر ختم ہوتے رہے۔ جناب زکریاؑ شہید ہوئے۔ جناب

یحییٰؑ شہید ہوئے۔ مگر مصیبت ان ہی پر ختم ہو کر رہ گئی۔ اس کا سلسلہ ان کے کنبے تک نہ پہنچا۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام پر ایسی سخت مصیبت آئی کہ انہوں نے گھبرا کر کہنا شروع کیا اِیْلِیْ اِیْلِیْ لِمَا سَبَقْتَنِیْ (اے میرے معبود تو نے مجھ ہی کو اس بلا کے لئے کیوں آگے بڑھا دیا ہے) ان کا دورِ ابتلا بھی جلد ختم کر دیا گیا اور یہودیوں کے مظالم سے نجات دینے کے لئے اُن کو آسمان پر بُلا لیا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا زمانہ آیا۔ کیسا سخت دورِ ابتلا تھا کہ اس کے تصور سے روح چیخیں مارتی ہے۔ خود حضرتؐ نے اس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔ مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ مِثْلَ مَا اُوْذِیْتُ (کوئی نبی اتنا نہیں ستایا گیا جتنا میں ستایا گیا ہوں) لیکن حضور نبی اکرمؐ کا دورِ ابتلا بھی آخر اپنی حد پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔ دشمن زیر ہوئے۔ شرک و کفر کی طاقت کے پرخچے اڑ گئے بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں آپ کے قدموں پر جھک گئیں۔

آپ کے بعد آپ کے اہل بیت کے مصائب و ابتلا کا دور آیا۔ یہی وہ دور تھا جس کا سلسلہ دامن قیامت سے جا ملا۔ یہی وہ مصیبت کی رات تھی جس کے لیے سحر نہ تھی۔ یہی وہ طولانی غم تھا جس کے بعد ان کے دلوں میں کبھی خوشی کی لہر نہ دوڑی۔ یہی وہ جان کاہی و دل خراشی تھی جس کے زخموں پر کبھی مرہم نہ رکھا گیا۔ یہی وہ رونے والے تھے جن کے آنسو کبھی خشک نہ ہوئے۔ یہی وہ مظلوم گروہ تھا جس پر نسلاً بعد نسل مصائب و آلام کے پہاڑ گرتے رہے۔ تعزیت کے سوا تہنیت کی آوازیں جن کے پردہ گوش سے کبھی ٹکرائیں ہی نہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو مرنے کے بعد چین سے قبروں میں سونا بھی نصیب نہ ہوا۔ یہ ان ہی کے جگر اور کلیجے تھے کہ اس سیلابِ ابتلاء میں ہمیشہ ثابت قدم رہے اور خدا سے کبھی یہ دعا کی کہ ان مصیبتوں کو ہم سے ہٹا لے۔

اس نامساعد دور کا آغاز حضرت رسول خدا کی وفات کے بعد ہی شروع ہو گیا اور جو سکون و اطمینان کی گھڑی گزری۔ وہ پھر واپس نہ آئی۔ حق یہ ہے کہ ان کے صبر ان ہی کے ساتھ تھے۔ دوسرا ہوتا تو کلیجہ پھٹ جاتا اور بے موت مر جاتا۔ مصائب پر مصائب تھے خدا کی پناہ۔

بیٹی باپ کے ترکہ سے محروم ہو گئی۔ روئی مگر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ شکایت کا حرف زبان پر نہ آیا۔ امتحان کا پورا پرچہ کامیابی کے ساتھ کر کے دنیا سے رخصت ہو گئی۔

علیؑ اپنے حق سے محروم ہوئے۔ کیسا سخت امتحان تھا۔ دوسرا ہوتا تو لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ مگر دینی مصالح پر نظر رکھ کر اُف نہ کی۔ صبر و ضبط کے ساتھ ایک طولانی وقت گزارا۔ بندوں کی خوشی پر اللہ کی رضا کو مقدم رکھا۔ یہ ایک طولانی ابتلا تھا جس نے مرتے دم تک علیؑ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

اس کے بعد امام حسنؑ کا زمانہ آیا۔ ہر طرف سازشوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ ظلم و تشدد کی ہر طرف گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ چند سال زندگی کے دن اس مصیبت میں گزارے کہ ایک دن بھی اطمینان کا سانس لینا نصیب نہ ہوا

آخری مصیبت اس زہر کی تھی۔ جس نے کلیجے کے ٹکڑے منہ سے نکال کر طشت میں ڈال دیئے۔ صبر و ضبط کا یہ عالم کہ قاتل سے انتقام نہ لینے کی وصیت کر دی۔

حضرت امام حسن علیہ السلام کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کا زمانہ آیا۔ اب وقت کے دامن میں آدم سے لے کر ختم المرسلین تک تمام انبیاء و مرسلین کے مصائب جمع تھے اور سب امتحانات سے پوری کامیابی کے ساتھ امام حسین علیہ السلام کو گزرنا تھا اور یہ بشارت سننی تھی۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

(سورہ البقرہ ۲/۱۵۵)

مدینے سے نکلتے وقت جو مصائب و آلام کے بادل چھائے تھے وہ کسی وقت اس خاندان کے سر سے ہٹے ہی نہیں، اس گھر میں خوشی کا دور آیا ہی نہیں۔ ان رونے والوں کو کبھی کسی نے ہنستے دیکھا ہی نہیں۔ کیا ہنستی کھیلتی ان لبوں پر کیا خوشی آتی ان دلوں پر جو اپنی ساری کائنات کربلا میں لٹا بیٹھے تھے جن کو ظالموں کے ظلم و ستم نے اس بری طرح کچلا تھا کہ ان کی رگ رگ میں درد تھا، کون سی مصیبت تھی جو ان غریبوں پر نازل نہ ہوئی۔ چالیس ہزار خون کے پیاسوں کے نرغے میں خدا کے چند خاص بندے گھرے ہوئے تھے۔ زندگی کی تمام امیدیں قطع ہو گئی تھیں۔ ماؤں نے اپنے پیارے بچوں کو پیاس سے تڑپتے دیکھا۔ بہنوں نے بھائیوں کو تلواروں سے کٹتے دیکھا۔ خاک و خون میں لوٹتے دیکھا۔ عورتوں نے اپنے وارثوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے دیکھا۔ عزیزوں نے عزیزوں کو خون سے چور چور خاک پر گرتے دیکھا۔ دل شکستہ کنبہ موئی بی بیوں نے لاشوں کو پامال ہوتے دیکھا۔ نبی زادیوں نے بوسہ گاہ نبوی خنجر سے کٹتی دیکھی۔ شہیدوں کے سروں کو نیزوں پر نصب دیکھا۔ سیدانیوں کو نبی زادیوں کو اس بیدردی سے لوٹا گیا کہ کسی نے ان کے سر پر چادر تک نہ چھوڑی۔ خیموں میں آگ لگتے دیکھی۔ بازوؤں میں رسیاں بندھیں، بیمار کے گلے میں طوق اور پیروں میں بیڑیاں دیکھیں۔ سر برہنہ بازاروں میں تشہیر ہوئی، درباروں میں بلائی گئیں۔ قید خانوں میں بند کی گئیں۔ مصیبتیں ہی مصیبتیں تھیں۔ ازل سے قیامت تک کسی قوم پر اتنے مصائب بیک وقت نہ نازل ہوتے ہوں گے۔

اب یہ گھر غم کا گھر تھا۔ اب یہ خاندان مصیبت کا مارا خاندان تھا۔ قیامت تک کے لئے اس گھر سے خوشی رخصت ہو گئی۔ اب یہ کبھی نہ ہنسیں گے، اب یہ کبھی سکون کی فضا میں سانس نہ لیں گے۔

امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں۔

يَا اَرْضَ كَرْبَلَاءِ لَقَدْ اَوْرَثْتَنَا الْكَرْبَ وَالْبَلَاءَ اِلٰى يَوْمِ الْقَضَاءِ

اے زمینِ کربلا تو نے قیامت تک ہمارے لئے کرب و بلا کا سامان کر دیا۔ آہ واقعہ کربلا کی یاد ایسی نہ تھی کہ اس کو بھلایا جا سکتا۔ امام زین العابدین علیہ السلام واقعہ کربلا کے بعد چالیس سال زندہ رہے۔ لیکن کوئی وقت رونے سے خالی نہ رہا۔ اتنا روئے کہ رُخسار تک گل گئے۔ یعقوب بڑے رونے والے تھے مگر ان کے آنکھوں کے آنسو ایک وقت میں ختم ہو گئے تھے۔ لیکن یہاں تو ختم ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہاں ایک بیٹے کا غم تھا جو بعد میں مل گیا۔ یہاں تو ایسے بہتّر کا رونا تھا جو کبھی نہ ملیں گے۔

اس گھر کی بی بیوں کا یہ حال کہ جب تک زندہ رہیں نہ سروں میں کنگھی کی، نہ بالوں میں تیل ڈالا نہ آنکھوں میں سُرمہ لگایا، نہ کسی نے آہوں کے سوا چولہے کا دھواں بلند ہوتے دیکھا۔ دن رات نوحہ وزاری سے کام واحسینا، واحسینا کی فریاد بستروں کو چھوڑ کر خاک پر بیٹھنا اختیار کیا۔ دن کی دھوپ اور رات کی اُوس ان کبیدہ خاطروں کے اُوپر تھی۔ انہیں اپنے تن و سر کا ہوش نہ تھا۔ ملنا جلنا بند۔ ہنسنا، مسکرانا ختم۔

سب کی مصیبتیں ختم ہو گئیں۔ مگر اس گھر کی مصیبتیں آج تک ختم نہ ہوئیں۔ اس غم کا سلسلہ عزیزوں سے آگے دوستوں تک پہنچا۔ جہاں محبّانِ حسینؑ آباد ہیں وہاں محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی حسینؑ کی صفِ ماتم بچھ جاتی ہے مجالسِ عزا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ عورت ہو یا مرد، بچہ ہو یا بوڑھا ہر ایک کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح بنے مجلسِ حسینؑ میں شریک ہو۔ ہر طرف سے خیال ہٹا ہوا، نہ گرمی کی پرواہ نہ سردی کا خوف، نہ دوری کا وسوسہ، نہ بیماری کا احساس، عاشقانِ حسینؑ ہیں کہ کھچے چلے آ رہے ہیں، وہ درد ہے کہ گھر میں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ وہ مزہ غم کا ہے کہ کسی وقت اس سے دل نہیں اُکتاتا۔ صبح سے شام تک، شام سے صبح تک حسینؑ کا ذکر سنتے ہیں مگر شوق کی آگ میں ذرّہ برابر کمی نہیں آتی۔

آہ اس مصیبت کو کوئی فاطمہ زہرا سے پوچھے جنہوں نے چکیاں پیس پیس کر حسینؑ کو پالا تھا۔ جنہوں نے حسینؑ کی شہادت کی خبر رسولؐ سے سُن کر فرمایا تھا۔ بابا میں اپنے اس شہید مظلوم پر دل کھول کر گریہ کروں گی سر کے بال کھولوں گی سر و سینہ پیٹوں گی۔ حضورؐ نے فرمایا بیٹی! یہ وہ وقت ہوگا جب دُنیا میں نہ میں ہوں گا نہ تم، نہ علیؑ ہوں گے نہ حسنؑ دُکھیا ماں نے پوچھا "پھر میرے حسین کو روئے گا کون"؟ فرمایا خدا ایک قوم ایسی پیدا کرے گا کہ وہ تیرے حسین کی صفِ ماتم بچھائیں گے۔ ان کے مرد ہمارے مَردوں پر ان کی عورتیں ہماری عورتوں پر، ان کے بچے ہمارے بچوں پر گریہ کریں گے۔ یہ سن کر سیّدہ عالم کے دل کو تسکین ہوئی۔ فرمایا بابا جان جو لوگ ایسے ہوں گے میں بھی بغیر ان کے جنّت میں داخل نہ ہوں گی۔

حضرات! جہاں کہیں مجلسِ حسینؑ برپا ہوتی ہے معصومۂ عالم سلام اللہ علیہا وہاں تشریف لاتی ہیں ان کے دستِ مبارک میں رُومال ہوتا ہے اس سے رونے والوں کے آنسو پوچھتی ہیں اور فرماتی جاتی ہیں۔ خوشا نصیب تمہارا! اے میرے دوستو! کہ تم میرے اس مظلوم فرزند پر رو رہے ہو جس کا دُنیا میں نہ ماں ہے نہ باپ ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس مجلس میں شہزادیٔ عالمؑ کو پُرسہ

دیں مظلوم نبی زادیؑ! ہم آپ کو بہتّر شہیدوں کا پُرسہ دیتے ہیں اور معذرت کرتے ہیں کہ آپ کے مظلوم فرزند کی عزاداری جس طرح کرنی چاہیئے تھی نہ کر سکے۔ عزادارہ معصومہ عالم کے ساتھ ہماری شہزادی جناب زینبؑ بھی ہیں ہمارا فرض ہے کہ ان کو بھی پُرسہ دیں اور کہیں کہ "اے اُم المصائب، اے شریکۃ الحسینؑ، آپ نے بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھائیں ہم عزاداروں کا پُرسہ قبول کیجئے۔ کس کس کا پُرسہ آپ کو دیں، آپ کے مظلوم بھائیؑ کا، آپ کے کڑیل جوان بھتیجے کا جس کو آپ نے اٹھارہ برس پالا تھا۔ آہ ۳۲ برس کے اس شیر دل بھائیؑ کا جو فوج حسینیؑ کا علمدار تھا جو بالی سکینہ کا سقّہ تھا آپ کے اس یتیم بھتیجے کا جس کے لاشے کو دشمنوں نے بُری طرح کچلا تھا۔ آپ کے دونوں بیٹوں کا جن کو آپ نے اپنے بھائیؑ پر قربان کیا تھا۔ آخر میں اس چار سالہ بچی کا پُرسہ بھی لیجئے جس نے شمر کے طمانچے کھائے جس کے کان چیر کر گوشوارے اُتار لیے گئے۔ جس نے زندانِ شام میں یاد پدر میں اپنی جان دے دی۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ،
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

چھٹی مجلس

تزکیۂ نفس کا بیان

حُر کے لشکر کو پانی پلانا حضرتِ حُر کی شہادت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۝
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (سورہ الشمس ۱۰،۹،۸،۷/۹۱)

قسم ہے نفس کی اور اس کے تسویہ کی پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کردی بے شک جس نے اسے صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے مٹی میں ملایا وہ ناکام رہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تزکیۂ نفس پر انسانی نجات موقوف ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت رسولؐ خدا کی غرض بعثت یہی تھی جیسا کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اِنِّیْ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (میں اخلاقی بزرگیوں کی تکمیل کے لئے آیا ہوں) یہی چیز تھی جس نے انسانی فطرت کو حضورؐ کی طرف کھینچا۔

منقول ہے کہ اسلام لانے سے پہلے جناب ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو مکہ بھیجا کہ ذرا اس کی تحقیق کرو کہ جس شخص نے دعوئے نبوت کیا ہے اس کی خصوصیات کیا ہیں۔ ابوذر کے بھائی چند روز مکہ میں رہے جب واپس گئے تو بیان کیا کہ ان میں اخلاقی اوصاف اس شان سے پائے جاتے ہیں کہ خود بخود طبیعت ان کی طرف کھنچتی ہے۔

حبشہ کی طرف جناب جعفرؑ کی قیادت میں مسلمانوں نے ہجرت کی اور قریش نے وہاں جاکر نجاشی بادشاہ حبشہ سے کہا کہ ہمارے کچھ غلام آپ کے پاس بھاگ آئے ہیں ان کی واپسی کا حکم دیجئے۔ بادشاہ نے مسلمانوں کو بلاکر جب دینِ اسلام کی حقیقت

پوچھی تو انہوں نے سب سے پہلے اخلاق محمدیؐ پر روشنی ڈالی۔ فرمایا:

اے بادشاہ! ہم لوگ جاہل تھے بتوں کو پوجتے تھے مردار کھاتے تھے بدکاریاں کرتے تھے۔ ہمسایوں کو ستاتے تھے۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا زبردست زیر دستوں کو کھائے جاتے تھے اس عرصے میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا جس نے ہم کو سکھایا کہ پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں۔ سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں یتیموں کا مال نہ کھائیں ہمسایوں کو آرام دیں۔ عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔

اللہ تعالیٰ نے سرور دوعالم کی غرض بعثت یہی بیان فرمائی وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورہ البقرہ ۲/۱۵۱) تاکہ وہ لوگوں کے نفسوں سے میل کچیل دور کر کے ان کو آئینہ کی طرح چمکا دیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تعلیم محمدی نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھایا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ عبادات خدا کے فرائض میں ہیں وہ ارحم الراحمین ہے۔ شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ بخش سکتا ہے۔ لیکن حقوق عباد کے بخشنے کی ذمہ داری اس نے اپنے اوپر نہیں کی۔ اس کو ان بندوں سے متعلق رکھا ہے جن پر ظلم ہوا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہو سکتی جو ارحم الراحمین کی ذات سے ہے لہذا انسانی حقوق کی حفاظت کے لئے ہر شخص کو اپنے نفس کے تزکیہ کی ضرورت ہے۔

حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو اس کو چاہیے کہ یہیں اس سے معاف کرالے ورنہ وہاں تاوان کے لئے درہم و دینار نہ ہوں گے صرف اعمال ہوں گے۔ نتیجے میں ظالم کی نیکیاں مظلوموں کو مل جائیں گی۔

ایک حدیث میں ہے کہ روز قیامت بندوں کے نامۂ اعمال کی فردیں تین طرح کی ہوں گی ایک وہ جس کی خدا کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔ دوسری وہ جس سے خدا ایک حرف بھی نہ چھوڑے گا۔ تیسری وہ جس میں سے کچھ بھی معاف نہ کرے گا۔ جس فرد کے گناہ معاف نہ ہوں گے وہ شرک ہے۔ جس کی کوئی پروا اس کو نہ ہوگی وہ ظلم ہے جو بندے نے اپنے اوپر کیا ہے۔ فرائض خدا ترک کرکے اللہ چاہے گا تو وہ اس کو معاف کردے گا۔ تیسرے جس فرد کا ایک حرف بھی نہیں چھوٹ سکتا وہ ظلم ہے جو بندے نے بندے پر کیا ہے۔

اسلام میں جو عبادات ہیں ان کی بنیاد پر بھی غور کیجئے تو تزکیۂ نفس پر ہے مثلاً نماز، قرآن کہتا ہے إِنَّ الصَّلَوٰةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ۔ (سورہ العنکبوت ۲۹/۴۵) (نماز بدکاریوں اور بری باتوں سے بچاتی ہے) اگر نماز پڑھنے والا فواحش میں مبتلا ہے تو اس کی نماز بے کار ہے، روزہ اس لئے ہے کہ غرور و تکبر کا دھواں انسان کے دل و دماغ سے نکل جائے۔ ایمان بھی اس وقت تک فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب تک اس کے آثار اخلاق حسنہ کی صورت میں ظاہر نہ ہوں خدا فرماتا ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰۤی اَزْوَاجِھِمْ اَوْمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْعٰدُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوٰتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ (سورہ المومنون ۲۳/۹ تا ۱)

فلاح ان ہی مومنوں کے لیے ہے جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں جو لغو باتوں سے بچتے ہیں جو زکوٰۃ دینے والے ہیں جو اپنے فروج کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بی بیوں یا زر خرید لونڈیوں سے پرہیز نہ کرنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں اور جو شخص کسی اور طریقے سے (ازالۂ شہوت پرستی) ایسا کرے تو یہ لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہیں اور جو لوگ اپنی امانتوں اور عہدوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور اپنی نمازیں پابندی سے پڑھا کرتے ہیں

انہی تمام چیزوں کی حفاظت کا نام اصطلاح اسلام میں تقوےٰ ہے اور ان ہی متقیوں سے کتاب خدا کی ہدایت کا تعلق ہے۔ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ایمان سے زیادہ پیاری اسلام میں کوئی چیز نہیں لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے جیسا کہ رسولِ خدا نے فرمایا ہے اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا (مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے۔ جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔) یعنی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔

اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا رہے۔ حدیث میں ہے خِیَارُکُمْ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا (تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں)

ایک مرتبہ حضور سرورِ انبیاءؐ کے سامنے لوگوں نے دو قسم کی بی بیوں کا ذکر کیا ایک وہ عورات کو نمازیں پڑھتی ہیں۔ دن کو روزہ رکھتی، صدقہ دیتیں مگر زبان درازی سے پڑوسیوں کا دل دکھاتیں۔ دوسری وہ عورتیں ہیں جو صرف نماز پنجگانہ پڑھتیں اور معمولی صدقہ لوگوں کو دیتیں مگر کسی کو اپنے عمل یا زبان سے تکلیف نہ پہنچاتیں۔ پہلے گروہ کے لئے فرمایا کہ ان کے لئے نیکی نہیں وہ اپنی بد خلقی کی سزا بھگتیں گی۔ دوسرے گروہ کے متعلق فرمایا کہ وہ جنتی ہیں۔

ایک بدوی عورت نے حضرتؐ سے عرض کی کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنّت میں لے جائے۔ فرمایا انسان کو غلامی سے آزاد کر۔ مقروض کا قرض ادا کر۔ اپنے رشتہ داروں کو ظالم کے ظلم سے بچا۔ اگر یہ نہ کر سکے تو بھوکے کو کھلا۔ پیاسے کو پانی پلا۔ نیکی بتا برائی سے روک اگر یہ بھی نہ کر سکے تو اپنی زبان کو روک اور اس سے کسی کو ایذا نہ دے۔

جتنے انبیاء و مرسلین دنیا میں آئے وہ سب اخلاقی معلّم تھے لیکن ان میں سے ایک کو بھی ہم متمم مکارم اخلاق نہیں کہہ سکتے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پیغمبر خدا کی طرح جامع کمالات نہیں تھے کوئی پیغمبر یا بانی مذہب ہم کو ایسا نظر نہیں آتا جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو بے نقاب ہو کر لوگوں کے سامنے اس طرح آگیا ہو گویا وہ خود ہمارے لئے ہے۔ حضرت

نوح سے لے کر حضرت موسیٰ تک توریت کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ کیا ان کی معصوم زندگیوں کے مکمل حالات ہمارے سامنے آجائیں گے۔ کیا ان کے اخلاقی محاسن کا مکمل نقشہ ہم دیکھ سکیں گے۔ حضرت عیسیٰ کی ۳۳ سالہ زندگی میں ہم کو صرف تین سال کا حال معلوم ہے۔ ان میں تین برسوں کے حالات میں بھی معجزات وخوارق عادات کے سوا کوئی حال بہت کم معلوم ہے بس کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں یہی حال ہندوستان و چین و ایران کے بانیان مذہب کا ہے۔ برخلاف اس کے اسلام کے اخلاقی معلّم کی شان ان سب سے جداگانہ ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا پہلے اس کو خود کر کے دکھایا۔ ان کا جو قول تھا وہی ان کا عمل تھا۔ اسلام یہودیوں کو اسی لئے طعنہ دیتا ہے۔ اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (سورہ البقرہ ۴۴/۲) (کیا تم اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔

مسلمانوں کو تنبیہ کی جارہی ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۞ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (سورہ الصف ۳ و ۶۱/۲) (تم وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں بڑی بیزاری ہے اللہ کو اس سے جو کہو وہ خود نہ کرو)

چونکہ آپ کے اخلاقی پہلو تمام انبیاء سے نمایاں تھے اسی لیے آپ کی شان میں کہا گیا ہے۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۞ (سورہ القلم ۶۸/۴) بیشک اے محمد تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو)

اخلاقی معلم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں اتنی تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے یعنی خود کامل ہو اور دوسروں کو بھی کامل بنانے والا ہو اور دوسروں کی ناپاکی دور کر کے ان کو بھی پاک بنادے تعلیم کی یہ شان سوائے ختم المرسلینؐ کے دوسرے اخلاقی معلموں میں نظر نہ آئے گی۔

موسیٰ علیہ السلام قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلا کرتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہیں اترتے۔

جناب موسیٰ کی تربیت گاہ میں فوجی تربیت کے سوا اور کوئی فن نمایاں نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی مکتب میں عفو و درگزر کے سوا اور کوئی سبق نہیں۔ بودھ کی خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا اور کوئی چیز موجود نہیں۔ لیکن حضرت محمد مصطفےٰ کی درس گاہ میں آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشو و نما پارہی ہے۔ خود معلّم کی ذات ایک یونیورسٹی ہے جس میں ہر جنس و ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق کمال حاصل کرتے ہیں۔

آپ کی حیثیت ایک انسان۔ ایک باپ۔ ایک شوہر۔ ایک دوست، ایک خانہ دار ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ ۔ ایک مرشد، ایک عابد، ایک زاہد اور ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے۔ یہاں علیؑ و ابن عباس جیسے فقیہ و محدث بھی ہیں۔ ابوذر اور سلمان جیسے خرقہ پوش بھی اصحاب جیسے توکل پسند

بھی۔ عمار و مقداد جیسے زہد پرست بھی، علیؑ جیسے جرنیل بھی، فاطمہؑ جیسی تارک الدنیا بھی ہیں۔

اسلام کی شریعت میں نفس عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض و غائت صحیح ہو۔ اور وہ بغیر ایمان کے ممکن نہیں۔ پہلے اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ۔ پھر جو عمل کرو۔ خوشنودی خدا کے لئے کرو۔ تو ایسا عمل قابل جزا ہوگا ورنہ منہ پر مار دیا جائے گا۔ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلَىٰ نَارًا حَامِيَةً (سورہ الغاشیۃ ۳/۸۸) (سب سے سخت سے سخت عمل کرنے والے ہوں گے کہ جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے) ایک سچے مسلمان کو اپنے ہر کام کی غرض اللہ کی خوشنودی اور رضامندی قرار دینی چاہیئے۔ اس کے ساتھ ضمناً ایک دوسرے اغراض بھی ہوں تو مضائقہ نہیں۔

اسلام نے قبول اعمال کا انحصار ہی حسن نیت اور خلوص نیت پر رکھا ہے اس سے غرض نہیں کہ عمل بڑا ہو یا چھوٹا۔ جو کام خلوص سے کیا جاتا ہے اس کی قدر ہوتی ہے۔ جناب یوسف علیہ السلام جب بادشاہ مصر ہوئے تو لوگوں نے بڑے بڑے گرانقدر تحفے آپ کی خدمت میں پیش کئے۔ ان کے مجمع کو چیرتی پھاڑتی ایک بڑھیا بھی سوت کی ایک اٹیا لیے ہوئے ہانپتی کانپتی پہنچی۔ اور حضرت یوسفؑ کی خدمت میں پیش کی۔ جہاں اور بہت سے تحفے رکھے تھے۔ حضرت یوسفؑ نے اس کو بھی رکھ دیا۔ بڑھیا دعائیں دیتی چلی گئی۔ وحی ہوئی اے یوسفؑ! تم نے اس بڑھیا کے ہدیہ کی کچھ قدر نہ کی امراء و روساء نے جو تحفے تم کو دیئے ہیں وہ تمہاری سلطنت سے فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے دیئے ہیں۔ وہ مقام محبت میں نہیں۔ مقام حاجت میں پیش کئے گئے ہیں لیکن اس غریب بڑھیا کی تم سے کوئی حاجت وابستہ نہ تھی۔ بلکہ تمہارے بادشاہ ہونے سے اس کو روحانی مسرت ہوئی اور جذبۂ محبت جوش میں آیا۔ اس جوش میں جو اس کی کائنات تھی تمہارے سامنے لا رکھی۔ عرض کی بار الٰہا پھر میں اس محبت کا کیا صلہ دوں۔ فرمایا اس کا صلہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ تم اپنی ساری سلطنت اس کو دے دو۔ جس طرح اس نے اپنا سارا سرمایہ تم کو دیا ہے۔ لیکن تمہاری سلطنت کی اس کو حاجت نہیں۔ تاہم تم اس کے پاس جاؤ شکریہ ادا کرو اور اپنی سلطنت پیش کرو۔ جناب یوسف علیہ السلام گئے اور شکریے کے بعد کہا اے ضعیفہ! اگر تو چاہے تو میں یہ سلطنت تجھے دے دوں۔ اس نے کہا "اے نبی اللہ، مجھے اس کا کیا کرنا ہے میری سلطنت میرا چرخہ ہے اور میرا خزانہ میری وہ اٹیا ہے جو دن بھر محنت کے بعد تیار کرتی ہوں۔

اہل بیت رسولؐ کے جتنے عمل تھے وہ اسی خلوص پر مبنی تھے اور اسی وجہ سے وہ بارگاہ خدا میں مقبول ہوئے اور قرآن میں ان کے ہر عمل کو سراہا گیا جب انہوں نے حالت رکوع میں انگوٹھی دی تھی تو اسی خلوص کی بنا پر ان کو ولایت کی سند مل گئی، ورنہ راہ خدا میں لوگوں نے خزانے لٹائے ہیں۔ ان کے مقابل ایک انگوٹھی کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے لیکن وہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کیا دیا جا رہا ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس نیت سے دیا جا رہا ہے۔

راہ خدا میں دینے والے کیا کچھ نہیں دیتے محتاجوں کو کھانا دیتے ہیں۔ برہنہ تنوں کو لباس پہناتے ہیں مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں۔ یتیموں کی پرورش کرتے ہیں۔ قیدیوں کو رہا کرتے ہیں۔ ان سب کو بلحاظ خلوص خدا سے اجر ملتا ہے خلوص

کے بے شمار درجات ہیں۔ جس کا خلوص جس درجے پر ہے اسی کے مطابق اس کو اجر ملتا ہے۔ دیکھو ایک کارِ خیر اہلِ بیت رسولؐ کے گھر اس شان سے ہوتا ہے کہ وہ روزے کے بعد جب افطار کو بیٹھتے ہیں، تو ایک مسکین دروازے پر سوال کرتا ہے وہ اپنا کھانا اُٹھا کر اس کو دے دیتے ہیں، اور پانی سے افطار کر کے دوسرے دن پھر روزہ رکھ لیتے ہیں پھر ایک یتیم عین کھانے کے وقت آپکارتا ہے اور وہ کھانا سب کا سب اُسے دے دیا جاتا ہے۔ اور پھر پانی سے افطار کر کے تیسرا روزہ رکھتے ہیں۔ جب پھر افطار کا وقت آتا ہے پھر ایک قیدی آپکارتا ہے وہ اپنا کھانا پھر اسے دے دیتے ہیں۔ یہ روزہ دار علیؑ حسینؑ حسنؑ فاطمہ زہراؑ اور ان کی کنیز فضہ تھیں۔ ہر روز پانچ روٹیاں دی جاتی تھیں۔ تین دن کی پندرہ روٹیاں ہوتی ہیں وہ بھی جَو کی کوئی بڑی خیرات نہیں۔ لوگوں کے ہاں لنگر خانوں میں سینکڑوں آدمی شب و روز کھاتے ہیں لیکن یہ پندرہ روٹیاں کچھ اس خلوص سے دی گئیں کہ خدا نے ان کی تعریف ان الفاظ میں کی۔ يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (سورہ دہر ۷۶/۷)

جس خلوص سے یہ کام کیا گیا تھا اس آیت میں دو جگہ اس کا ذکر ہے عَلٰی حُبِّہٖ یعنی محض محبّت الٰہی میں یہ کام کیا گیا تھا اور دوسرے ان کا یہ کہنا کہ ہم نے لِوَجْہِ اللّٰہ یہ نیکی کی ہے نہ کہ کسی بدلہ یا شکر گزاری کے لئے اسی طرح جو کام انہوں نے کیا چونکہ مبنی بر خلوص تھا۔ لہٰذا خدا نے اس کی تعریف کی۔ رسولؐ نے اس کی مدح کی۔

رسولؐ کی ایمانی اور اخلاقی تعلیم کا یوں تو ہزار ہا مسلمانوں پر اثر تھا لیکن مکمل نمونے اہل بیت علیہم السلام ہی تھے۔ نیکی کا کوئی میدان ایسا نہ تھا جہاں انہوں نے سبقت حاصل نہ کی ہو۔ شجاعت کے موقع پر وہ شجاعت دکھائی کہ دُنیا حیران ہو کر رہ گئی۔ عہدِ رسولؐ میں جتنے معرکے ہوئے سب میں علی ابن ابی طالبؑ کفار و مشرکین کے قتل کرنے میں پیش پیش رہے۔ جاں بازیاں کرنے والے بے شمار تھے۔ مگر شجاعت کی سند حاصل کرنے والے علیؑ ہی تھے۔ اُحد میں لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ کی سند لی۔ خندق میں ضَرْبَةُ عَلِیٍّ یَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَیْنِ کی سند لی۔ خیبر میں رَجُلًا کَرَّارًا غَیْرَ فَرَّارٍ یُحِبُّ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَیُحِبُّہُ اللّٰہُ وَالرَّسُوْلُ کی سند حاصل کی۔ وجہ یہ تھی کہ اپنے نفس کی کوئی چیز، غرض پیش نظر نہ تھی۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپ ایک دشمن کے سینے پر سوار تھے کہ اس نے اپنا لعاب دہن آپ کی طرف پھینکا۔ آپ فوراً سینہ پر سے ہٹ گئے کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا اگر میں ایسی حالت میں اس کو قتل کرتا تو میرا نفس شامل ہو جاتا۔ سخاوت کی منزل میں آئے تو کبھی اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ (سورہ المائدہ ۵/۵۵) کی سند لی کبھی يُوفُونَ بِالنَّذْرِ (سورہ دہر ۷۶/۷) کی کبھی يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورہ الحشر ۵۹/۹) کی۔

ایثار نفسی کا موقع آیا تو فرش رسولؐ پر سو کر وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي (سورہ البقرہ ۲/۲۰۷) کی سند حاصل کی۔ اظہار ایمان کا وقت آیا تو بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّہٗ اِلَی الْکُفْرِ کُلِّہٖ۔ کا تمغہ لے لیا۔ ثبات قدم دکھایا تو صَفًّا کَاَنَّہُمْ

بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (سورہ الصف ۴/۶۱) کا سرٹیفکیٹ لے لیا۔ طہارت نفس کے لئے اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (سورہ الاحزاب ۳۳/۳۳) کو گواہ بنالیا۔

علم کی منزل میں وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (سورہ الرعد ۱۳/۴۳) نے علم کامل کی تصدیق کردی۔

عمل کے میدان میں اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (البقرہ ۲/۲۵) کے مصداق بن گئے۔

صلاح پسندی میں وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورہ التحریم ۶۶/۴) کہلائے۔

الغرض کوئی منزل ایسی نہ تھی جس میں سبقت حاصل کرنے والے اہل بیت نہ تھے پھر عمل کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جس پر ترک اولیٰ کا بھی اطلاق ہوسکتا ورنہ یہ سخت منزلیں ہیں کہ انبیاء کے قدم ڈگمگا گئے ہیں اور ترک اولیٰ کی پاداش میں مقام ابتلا میں ان کو آنا پڑا ہے۔

جناب سلیمان کے لشکر میں جن بھی تھے اور انسان بھی اور اس پر ان کو ناز تھا ایک مرتبہ جنوں نے سرکشی کی، آپ نے فرمایا مجھے تمہاری پروا نہیں میری ستر بی بیاں ہیں سب کے پاس جاؤں تو ستر بیٹے پیدا ہوں اس کے ساتھ انشاء اللہ نہ کہا۔ انبیاء کی تو ذرا ذرا سی بات پکڑی جاتی ہے۔ انشاء اللہ نہ کہنا اس کی دلیل بنا گویا ولاد پیدا کرنا وہ اپنے اختیار میں سمجھتے ہیں۔ خدا کو یہ بات پسند نہ ہوئی اور مقام امتحان میں آگئے۔ باوجود تمام بی بیوں سے صحبت کرنے کے ایک بچہ بھی کسی کے پیدا نہ ہوا۔ اور ایک ہوا بھی تو مُردہ اس کو لوگوں نے تخت پر لاکر ڈال دیا کہ لیجئے یہ ہے آپ کے تخت کا وارث۔ اب آپ کو انشاء اللہ کہنے کا خیال آیا۔ اور توبہ کی ترک اولیٰ ہونا تھا ہوگیا۔

جناب داؤد علیہ السلام کے متعلق ہے کہ ایک بار ان کو خیال آیا کہ میں بہت اچھا فیصلہ کرنے والا ہوں اتنا خیال آنا تھا کہ امتحان میں آگئے۔ دو فرشتے انسانی صورت میں ایک فرضی مقدمہ بناکر آئے۔ ایک نے کہا ہم دو بھائی ہیں۔ ایک کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک۔ یہ چاہتا ہے کہ وہ ایک بھی میں اسی کو دے دوں۔ یہ اس معاملہ میں مجھ سے سخت بات چیت کرتا ہے۔ آپ نے مدعا علیہ کے بیان سُنے بغیر یہ فیصلہ کردیا کہ یہ تیرے اوپر ظلم کرتا ہے۔ ان کے جانے کے بعد جب خدا کی طرف سے باز پرس ہوئی تو سمجھے میں مقام امتحان میں تھا اور فیل ہوگیا اتنے روئے کہ زمین پر گھاس اُگ آئی۔

حضرت سلیمانؑ کو ملک شام پر فوج کشی کرنی تھی۔ کہیں سے گھوڑے نذر لانے میں آئے تھے۔ آپ شام کے وقت ان کو دیکھ رہے تھے اس کام میں ایسے منہمک ہوئے کہ سورج غروب ہوگیا، اور جو اوراد و وظائف شام کو پڑھتے تھے قضا ہوگئے جب خیال آیا تو بہت روئے اور اس کے کفارہ میں آپ نے سب گھوڑوں کی قربانی کردی۔

اس قسم کے واقعات تاریخ انبیاء میں جابجا ملتے ہیں لیکن علی علیہ السلام نے ایسے نازک موقعے اپنی زندگی میں نہیں آنے دیئے۔

کیسی ہی مشکل پیش آتی وہ انسانی فریضے کو بھولنے والے نہ تھے۔ صفین میں جب تیروں کی موسلادھار بارش برس رہی تھی علیؑ

نے نماز کا وقت آتے ہی اپنا مصلےٰ میدانِ جنگ میں بچھا دیا۔ لوگوں نے عرض کی حضورؑ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ ہلاکت کا قوی اندیشہ ہے۔ فرمایا تو کیا ہلاکت کے خوف سے فریضۂ الٰہی کو ترک کر دوں۔ آخر یہ جنگ اسی لئے تو کی جا رہی ہے کہ لوگوں کے بھولے ہوئے سبق یاد دلائے جائیں۔ اور اس فرض کی طرف متوجہ کیا جائے جو اللہ نے ان پر عائد کیا ہے۔

امیر معاویہ نے صفین میں دریا کے گھاٹ پر پہرہ بٹھا کر لشکر امیرالمومنینؑ پر پانی بند کر دیا تھا لیکن جب علی علیہ السلام کا اس پر قبضہ ہوا تو آپ نے حکم دیا گھاٹ کھول دو پہرہ ہٹا لو۔ مالک اشتر نے کہا جیسا عمل معاویہ نے ہمارے ساتھ کیا تھا ہم کیوں نہ کریں۔ فرمایا پھر علیؑ میں اور معاویہ میں کیا فرق رہے گا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کسی موقعہ پر اخلاقی قدروں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ چاہے اس سلسلہ میں کتنی ہی تکلیف ہو وہ اسلام کی صحیح تعلیم کو ہر موقعہ پر پیش کر دیتے ہیں۔

غور کیجئے اگر انتقامی جذبے کے تحت امیرالمومنینؑ بھی لشکر معاویہ پر پانی بند کرا دیتے تو جنگی قوانین کے مطابق کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہوتی لیکن بدی کا بدلہ بدی سے دینا احکامِ اسلامی کی سنہری فہرست میں داخل نہیں۔ رسولِ اسلام نے ایسے ہی موقعوں پر ایک سچے مسلمان کا نمونہ عمل پیش کرنے کے لئے اپنے اہلِ بیت کو آگے بڑھایا تھا۔ حسنِ سلوک کی تصویر کا اب ایک دوسرا رُخ دیکھو یہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے پہلے رُخ سے اور زیادہ شاندار ہے۔

امام حسین علیہ السلام عراق کی طرف جا رہے ہیں، راہ میں ایک منزل پر حُر اور اس کی فوج سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہ سب امام علیہ السلام کے دشمن ہیں۔ امام نے دیکھا کہ پیاس سے ان کی حالت غیر ہے تھوڑی دیر اگر پانی نہ ملے گا تو سوار اور مرکب سب تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے۔ جنگی قوانین کی رُو سے اور متشددانہ آئین کے مطابق ان کو ایک قطرہ پانی کا نہیں دینا چاہئے تھا بلکہ ان کے مرنے کا تماشہ خندہ پیشانی سے دیکھنا چاہیے تھا مگر حسین علیہ السلام رحمۃ للعالمینؐ کے فرزند ہیں۔ سیاست نبویہؐ اور حکومت الٰہیہ کے قوانین کے محافظ ہیں۔ وہ انسانیت کے اس کمزور طرزِ عمل کا نمونہ اپنے روحانی اقتدار ایمانی وقار کے ماتھے پر کالک کا ٹیکہ لگانا نہیں چاہتے۔ اگر کسی عمل میں کفار و مشرکین اور اہلِ بیتِ رسولؐ برابر کے شریک سمجھے جائیں تو اسلام کے روحانی معلمؐ کی تعلیم بے اثر ثابت ہو کر رہ جائے گی۔ حسین علیہ السلام اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے، انہوں نے حکم دے دیا کہ فوج کے ایک ایک سپاہی اور ایک ایک گھوڑے کو اچھی طرح سیراب کرو۔ اس منزل پر پانی کا کوئی چشمہ نہ تھا۔ یہ دریا کا کوئی کنارہ نہ تھا کہ اس حکم کی تعمیل آسانی سے کی جا سکتی۔ جو پانی پکھالوں میں اس قافلے کے ساتھ تھا وہ آئندہ منزل تک پہنچنے کے لئے شاید اہلِ قافلہ کی ضروریات کو بھی مشکل سے پورا کر سکتا تھا۔ اصحابِ حسینؑ پر اس کی حکم کی تعمیل شاق گزرنی چاہیئے تھی۔ انہوں نے خدمتِ امامؑ میں عرض کی یا ابن رسول اللہؐ یہ سب ہمارے دشمن ہیں۔ ابن زیاد کے بھیجے ہوئے ہیں۔ ہماری راہ روکنے اور ہم سے جنگ کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ ان کو سیراب کرنا قرینِ مصلحت نہیں۔ ان ظالموں کو تڑپ تڑپ کر مر جانے دیجئے۔ تاکہ ان ایک ہزار کے شر سے ہم محفوظ ہو جائیں اور آگے بڑھنے میں ان کی مزاحمت کا خطرہ باقی نہ رہے، دوسرے ہمارے ساتھ عورتیں ہیں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ موجودہ پانی شاید ان ہی کی

ضرورت کے لئے کافی ہو۔ اگر یہ سب پانی ان کو پلا دیا گیا اور اگلی منزل پر پانی نہ ملا تو ان سب کا کیا حشر ہوگا۔ یہ ہمدردانہ مشورہ عاقبت بینی کی رو سے قبول کرنے کے قابل تھا۔ لیکن اس کو قبول کر لینے کے بعد اہلبیتؑ رسولؐ کی امتیازی شان برطرف ہو جاتی اور حسینؑ حسینؑ نہ رہتے۔ آپ نے فرمایا چاہے ہم پر کوئی مصیبت گزرے لیکن یہ ناممکن ہے کہ یہ لوگ ہماری آنکھوں کے سامنے پیاسے مر جائیں۔ ہماری طرح یہ بھی جاندار ہیں اور اپنے کو مسلمان بھی کہتے ہیں۔

آخر پکھالوں کے منہ کھلے اور سقوں نے مشکیزے بھر بھر کر خون کے پیاسے دشمنوں کو سیراب کرنا شروع کر دیا۔ اب امام علیہ السلام خلق رسولؐ کا ایک بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ایک مشک خود اپنے کندھے پر اٹھاتے ہیں۔ کٹورا ہاتھ میں لیتے ہیں ایک ایک سپاہی سے جا کر پوچھتے ہیں اگر تشنگی فرد نہ ہوئی ہو تو اور پانی پلا دوں۔ جب سب سوار اچھی طرح سیراب ہو گئے تو امام علیہ السلام نے فرمایا اب ان گھوڑوں کو بھی سیراب کرو۔ کہ یہ بھی خدا کی مخلوق ہے۔ ہر جاندار کی مصیبت میں کام آنا اسلامی آئین میں داخل ہے۔ گھوڑوں کے سامنے بھی طشت رکھے گئے۔ اور ایک ایک کو پانی پلا دیا گیا۔ ان پانی پینے والوں کے سینوں میں دل تھے پتھر تو نہ تھے کہ اس احسان عظیم کا احساس نہ کرتے مگر آہ کتنے جلد یہ لوگ اس احسان کو بھول گئے۔ بہت فرق ہے عام مسلمانوں میں اور رسولؐ کے اہل بیتؑ میں۔

جب فوج دشمن کے ہوش و حواس ٹھکانے ہوئے تو آپؑ نے ان کے سردار حُر سے پوچھا ادھر کیسے آنا ہوا اس نے کہا کہ ابن زیاد کا حکم ہے کہ جہاں آپ کو پائیں سدِ راہ ہو کر کوفہ چلنے پر مجبور کریں۔ آپ ادھر کس ارادے سے تشریف لائے ہیں۔ فرمایا میں از خود نہیں آیا بلکہ تم لوگوں نے خط پر خط لکھ کر مجھے بلایا ہے۔ حُر نے کہا مجھے اس کا علم نہیں۔ آپ نے عقبہ بن سمعان سے فرمایا وہ خطوں سے بھری ہوئی خرجینیں لے آؤ۔ انہوں نے دو تھیلوں میں بھرے ہوئے کئی ہزار خط حُر کے سامنے رکھ دیئے۔ اس نے کہا کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ نماز ظہر کا وقت آیا۔ موذن نے اذان کہی۔ امام علیہ السلام کے پیچھے دونوں لشکروں نے نماز پڑھی۔ بعد فراغ نماز آپ نے قافلہ کو کوچ کا حکم دیا۔ حُر نے راہ روکی۔ آپ نے فرمایا تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے تو کیا چاہتا ہے۔ اس نے کہا اگر دوسرا کوئی میری ماں کا نام لیتا تو میں اس کو بتا دیتا۔ لیکن آپ کی والدہؑ گرامی کے متعلق سوائے کلمۂ خیر کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں آپ کو یہاں سے آگے نہ بڑھنے دوں گا۔

یہ سنتے ہی اصحاب حسین بگڑ گئے۔ جناب زہیر نے عرض کی یا بن رسول اللہ ہمیں ان سے لڑنے دیجئے ابھی ان کی تعداد کم ہے ہم آسانی سے ان کو تہ تیغ کر لیں گے۔ آئندہ چل کر جب فوجوں کی کثرت ہو جائے گی تو ان کا مقابلہ دشوار ہو جائے گا۔ فرمایا صحیح ہے مگر میں جنگ کی ابتدا اپنی طرف سے ہرگز نہ کروں گا۔ یہ اہل بیتؑ کا دوسرا خصوصی عمل تھا جو اسلامی اخلاق کا بہترین نمونہ تھا۔

حُر زبان سے چاہے کتنی ہی مخالفت کر رہا تھا مگر دل پر احسان حسینؑ کی چوٹ کھا چکا تھا اس کی تڑپ کو مٹانا اس کے قابو سے باہر ہو گیا۔ اس کے سینے میں وہ دل تھا جس پر اولاد رسولؐ کے روشن کردار کا نقش تھا۔ اس کے سینے میں وہ دل تھا

جو حسینؑ کی بے گناہی کا کلمہ پڑھ رہا تھا۔

وہ حسینؑ کو گھیر کر کربلا تک لے تو آیا مگر اس کا دماغ اس خیال سے چکرا رہا تھا کہ اس معاملہ کا اختتام کس صورت سے ہوگا۔ بہت سے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ حسینؑ فرزند رسولؐ ہیں۔ یزید اور ابن زیاد کو ان پر دست درازی کی ہمت نہ ہوگی کسی نہ کسی منزل پر معاملہ رو برو ہو جائے گا۔ خطوط رکھے جائیں گے زبانی بات چیت ہوگی۔ حسینؑ کے اس ارادے سے ابن زیاد کو آگاہ کیا جائے گا۔ کہ ان کا ارادہ جنگ کرنے کا نہیں۔ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ مصالحت پر راضی ہو جائے۔ اور امام علیہ السلام کو واپس جانے یا کسی اور ملک کی طرف نکل جانے کی اجازت دے دے ایسی صورت سے میں ابن زیاد کے عتاب سے بھی بچ جاؤں گا اور خون امام حسینؑ کا دھبہ بھی میرے دامن پر نہ آئے گا۔

مگر جب کربلا میں بکثرت فوجیں آگئیں اور صلح کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اب اس کی بے چینی بڑھی۔ اس کے خیال و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ معاملہ اس حد تک طول پکڑ جائے گا کہ لوگ قتل امام پر کمر بستہ ہو جائیں گے۔ جب نہر فرات پر فوجوں کا پہرہ بیٹھا اور بندش آب ہوئی تو حُر کو حسینؑ کا احسان یاد آیا۔ اپنی فوج کے سپاہیوں کو وہ نازک موقعہ یاد دلا کر پوچھا کیا ارادہ ہے۔ ان اشقیا پر طمع دُنیا غالب تھی۔ تسکین بخش جواب نہ دے سکے۔ حُر نے سمجھ لیا شقاوت ان پر غالب ہے۔ میرا کہنا ان پر کارگر نہیں ہو سکتا۔

۹ محرم کی شام کو جب یہ طے ہو گیا کہ کل جنگ کا آغاز ہو ہی جائے گا تو اب حُر نے اپنے متعلق یہ فیصلہ کرنا تھا کہ فوجِ یزید کے ساتھ رہ کر جہنّم میں جائے یا حسینؑ کے ساتھ ہو کر نجات آخرت کا سامان کرے۔ اسی تشویش میں شب عاشور کی تاریکی میدانِ کربلا میں چھا گئی۔ اور حسینؑ کے پیاسے بچوں کی صدائے العطش العطش سے تمام فضائے کربلا گونج اٹھی۔

حُر اپنے خیمے میں سر نہوڑائے بیٹھا ہے۔ چہرہ کا رنگ اُترا ہوا ہے۔ سرد آہیں لب پر ہیں۔ جنّت و دوزخ نظر کے سامنے ہیں کہ یکایک غلام خیمہ میں آیا دیکھا آقا بدحواس ہے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ ہونٹ خشک چہرہ اُداس پانی لے کر سامنے آیا کہ شاید پیاسے ہوں۔ حُر نے وہ آب لے کر زمین پر پٹک دیا۔ غلام یہ حال دیکھ کر گھبرایا اور حُر کے بھائی کے پاس جا کر کہا کہ ذرا بھائی کا حال تو دیکھئے لڑائی کا خوف اس قدر غالب ہے کہ ہوش و حواس درست نہیں۔ بھائی دوڑا ہوا آیا دیکھا کہ حُر کی حالت غیر ہے۔ کہنے لگا اے حُر تو کوفہ کا نامور شہسوار ہے۔ شہرۂ آفاق بہادر ہے۔ اس مٹھی بھر فوج کا اتنا خوف، اتنا ہراس کہ تیرے ہوش بجا نہیں۔ یہ ہیں کیا پہلے ہی حملہ میں ان کو کچل کر رکھ دیا جائے گا۔ حُر نے کہا ہوش میں آ۔ لشکریوں کو اس حالت کا پتہ چلے گا تو تیرا مذاق اُڑائیں گے بزدلی کا طعنہ دیں گے۔ یہ حالت ایک سپاہی کے لیے باعث ننگ و عار ہے۔

حُر نے ایک آہ سرد کھینچی اور بھائی سے کہا کچھ دُور میرے ساتھ چلیے تو میں اپنی پریشانی کی وجہ بتاؤں۔ دونوں گھوڑوں پر سوار ہوکر خیام حسینی کی طرف چلے، کچھ دُور جاکر حُر نے گھوڑا روک لیا اور بھائی سے کہا ذرا سنیئے۔ اس سنسان فضا میں یہ آوازیں کیسی آرہی ہیں اس نے کان لگایا اور ایک مرتبہ ملال انگیز لہجہ میں کہنے لگا۔ یہ تو معصوم بچوّں کی آواز العطش العطش ہے۔ حُر نے کہا ان آوازوں نے میرے کلیجے کو برما دیا ہے۔ میرے ہوش و حواس کو گم کر دیا ہے۔ آہ! میں اگر جانتا ہوتا کہ اولادِ رسولؐ پر یہ ظلم و ستم ہوں گے۔ اس طرح ان کو پانی کے ایک ایک قطرہ کے لئے تڑپایا جائے گا، تو میں ہرگز حسینؑ کو اس طرف نہ لاتا۔ اور ان کا راستہ کہیں اور جانے کے لئے کھول دیتا۔ بھائی نے کہا پھر کیا ارادہ ہے۔ حُر نے کہا میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ مجھے آتشِ جہنّم میں جلنا منظور نہیں۔ حسینؑ نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں اس کو بھولنے والا نہیں۔ حسین علیہ السلام بے گناہ ہیں۔ نواسۂ رسولؐ ہیں۔ ان کے خون میں اپنے ہاتھ رنگ کر رسولؐ خدا کے سامنے روزِ حشر نہیں جانا چاہتا۔

بھائی نے کہا پھر دیر کیا ہے گھوڑوں کو بڑھاؤ۔ اور اس فوج اشقیا سے نکل چلو۔ الغرض دونوں بھائی اور حُر کا بیٹا اور غلام، چار ایمان نواز حق شناس بہادر گھوڑے دوڑائے لشکرگاہ حسینؑ کی طرف بڑھے۔

امامؑ نے نماز صبح سے فارغ ہوکر جناب عباسؑ اور علی اکبرؑ سے فرمایا۔ حُر ہماری طرف آرہا ہے اس کے استقبال کے لئے جاؤ۔ جناب عباسؑ فوراً گھوڑے پر سوار ہوکر بڑھے۔ جب حُر نے علمدار لشکر حسینی کو آتا دیکھا تو گھوڑے سے اُتر پڑا۔ اور جناب عباسؑ کے قدموں پر گر کر زار زار رویا اور عرض کی۔ آپ فرزند رسولؐ سے میری تقصیر معاف کرا دیجیئے۔ جناب عباسؑ نے حُر کو سینے سے لگایا اور فرمایا میرے آقا رحمۃ للعالمینؐ ہیں اور صاحبِ خلق عظیم کے فرزند ہیں۔ ضرور تیری خطا معاف کریں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ حُر نے کہا اے ابوالفضل العباسؑ میرے ہاتھ باندھ کر مجرموں کی طرح فرزند رسولؐ کے سامنے لے چلیے مجھے یوں کھلے ہاتھ مولا کے سامنے جاتے شرم آتی ہے۔

الغرض حضرت عباسؑ حُر کو لے کر حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے سپیدۂ سحری نمودار ہو چکا تھا امام مظلومؑ نے اس وفادار جاں نثار کو چھاتی سے لگانا چاہا مگر حُر نے گر کر قدموں کو بوسہ دیا اور عرض کی مولا اس وقت تک یہ قدم نہ چھوڑوں گا جب تک حضورؑ عفو کا مژدہ نہ سنادیں گے۔ حضرت نے فرمایا اے حُر! تیری خطا معاف ہے غم نہ کر انشاء اللہ تو ہمارے ساتھ جنّت میں ہوگا۔ تیری ماں نے تیرا نام ٹھیک رکھا ہے تو یقیناً آتشِ جہنّم سے آزاد ہے۔

عزادارو! جب یہ خبر خیمہ میں پہنچی کہ حُر لشکر یزید سے نکل آیا ہے تو دل شکستہ سیدانیوں کو انتہائی خوشی ہوئی جناب زینبؑ نے سلام کہلا کر بھیجا۔ آہ وقت بے کسی میں جب کوئی ہمدرد مل جاتا ہے تو کیسی خوشی ہوتی ہے۔

عفو تقصیر کے بعد حُر نے خدمت امامؑ میں عرض کی مولا اب مجھے اجازت کارزار مرحمت فرمائیے۔ حضرت نے آبدیدہ ہوکر فرمایا اے حُر تو ہمارا مہمان ہے آہ میں تیری کوئی خاطر نہ کر سکا انتہا یہ ہے کہ تجھے ایک جرعہ آب پلانے پر بھی قادر نہیں۔ جو بیکسی اور بے بسی کا عالم ہے تجھ پر ظاہر ہے۔ حُر نے کہا مولا اب مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں۔ بس آخری تمنّا یہ ہے کہ میرا سر آپ کے قدموں پر نثار ہو جائے اور میں آپ کے

جا نا مدار بزرگوار اور مادر عالی مقدار کے روبرو شرمسار نہ جاؤں۔ الغرض بہادر حُر شیرانہ ہمہمہ کے ساتھ میدان میں آئے جوش میں آکر رجز پڑھا اور لشکر اعدا میں اس دلیری سے حملہ کیا کہ دشمنوں کو سامنے آنے کی تاب نہ رہی۔ ہر طرف بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ تا دیر اسی طرح لڑتے رہے۔ آخر دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر کر وار پر وار کرنے شروع کر دیئے۔ جب گھوڑے پر نہ ٹھہر سکے آواز دی **یَابْنَ رَسُولَ اللّٰہ اَدْرِکْنِی** امام مظلوم یہ صدا سنتے ہی چند جوانان ہاشمی کے ساتھ حُر کے پاس پہنچے۔ دیکھا کہ وہ وفادار جانباز خاک پر ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ حسینؑ نے حُر کے سر کو اٹھا کر اپنی آغوش میں لیا فرمایا حُر کچھ کہنا چاہتے ہو۔ حُر نے عرض کی مولا وقت آخر ہے پھر یہ مژدہ سنا دیجئے کہ حُر تیری ہر خطا معاف ہے۔ حضرت نے رو کر فرمایا اے حُر تیری خطا معاف ہے۔ یہ سنتے ہی حُر کی روح پرواز کر گئی۔ کیسا خوش نصیب تھا حُر جس کے ماتم میں علیؑ فاطمہؑ کی بیٹیوں حسینؑ کی بہنوں نے اپنے سر کے بال کھولے نوحہ و ماتم کیا۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

ساتویں مجلس

دُعا کے فضائل اور اس کی قبولیت کی شرائط

عبدیت کا بیان

امام علیہ السلام کا کربلا میں ورود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِی کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ لا فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ (سورہ البقرہ ۱۸۶/۲)

(اے رسول! جب میرے بندے میرا حال تم سے پوچھیں تو کہہ دو کہ میں ان کے پاس ہی ہوں اور جب وہ مجھ سے کوئی دُعا مانگتا ہے تو میں ہر دُعا کرنے والے کی دُعا کو سُن لیتا ہوں (اور جو مناسب ہو تو) قبول کرتا ہوں پس اُنہیں چاہیے کہ میرا بھی کہنا مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ سیدھی راہ پر آجائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قبولیت دُعا کے لئے شرط یہ ہے کہ خدا کے احکام کو مانا جائے۔ اور اس کی ذات واجب پر ایمان لایا جائے پس جو لوگ احکامِ الٰہی کو بجا نہیں لاتے ان کو دُعا کرنے کا کوئی حق نہیں اور اگر وہ دعا کریں اور خدا اس کو قبول نہ کرے تو شکایت کا کوئی حق نہیں۔

جب دُعا کرنے والا دعا کرتا ہے تو خدا فرماتا ہے میں اس سے قریب ہوں۔ اس نزدیکی سے مراد قرب مکانی نہیں۔ اس

لئے کہ اگر ہم اس کی طرف اشارہ کر سکیں تو وہ قابل تقسیم ہو جائے گا اور جب منقسم ہوگا تو محتاج الی الغیر ہوگا اور یہ ایک قدیم ذات کے لئے محال ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ قرب مکانی مراد نہیں ورنہ ایک چیز سے قریب ہوگا دوسرے سے بعید۔ حالانکہ آیت یہ بتاتی ہے کہ وہ ہر ایک سے قریب ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرماتا ہے۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (سورہ ق ۵۰/۱۶) (ہم رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں) پس معلوم ہوا کہ قربت سے مراد قربت معنوی ہے یعنی وہ اُن کی دعاؤں کو سنتا اور ان کی تضرع زاری کو دیکھتا ہے۔ اس کا علم چونکہ ہر شے کو محیط ہے لہٰذا وہ اپنے علم سے ہر شے کا جاننے والا اسی طرح ہے جیسے کوئی کسی کے ہر وقت پاس ہو خود فرماتا ہے وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (سورہ الحدید ۵۷/۴) دوسری جگہ فرماتا ہے مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (سورہ المجادلہ ۵۸/۷) جہاں کہیں تین آدمی بات کرتے ہیں وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے۔

ایک بار حضرت رسولؐ خدا سے کچھ لوگوں نے سوال کیا تھا۔ هَلْ يَسْمَعُ رَبُّنَا دُعَاءَنَا کیا خدا ہماری دعاؤں کو سنتا ہے اس کے جواب میں کہا گیا: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ، اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ (سورہ البقرہ ۲/۱۸۶)

دُعا کے بارے میں سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ مطلوب بالدعا اگر معلوم الوقوع ہے تو اس کا واقع ہونا واجب ہوگا ایسی حالت میں دُعا کی حاجت نہیں۔ دوسرے جو چیز اس دُنیا میں حادثات ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق ایک موثر قدیم وواحد سے ہے کیونکہ کوئی شے بغیر موثر کے وجود میں نہیں آسکتی۔ پس جس امر کا ارادہ اس موثر قدیم نے کیا ہوگا اس کا واقع ہونا واجب ہوگا۔ اور جس کا ارادہ نہ ہوگا اس کا وجود میں آنا ناممکن ایسی صورت میں دُعا بے کار۔

تیسرے جو امور روز ازل مقدر ہو چکے ہیں دُعا ان کو بڑھا سکتی ہے نہ گھٹا سکتی ہے۔ رسولؐ نے فرمایا ہے قَدَّرَ اللّٰهُ الْمَقَادِيْرَ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ الْخَلْقَ خدا نے ہر شے کی مقدار کو مخلوق کے پیدا ہونے سے خلق فرما دیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ (جو ہونے والا تھا قلم اس کو لکھ کر خشک ہو گیا۔ اور وہ چار چیزیں ہیں عمر، رزق، خلق، خلق۔

چوتھے جب خدا جو کچھ دلوں کے اندر ہے اس کو جانتا ہے تو پھر دُعا کی ضرورت کیا ہے اکثر جن باتوں کا وہ بندوں کے لئے بہتر سمجھے گا ان کو ترک نہ کرے گا اور اگر اس کے مصالح کے خلاف ہے تو کرے گا نہیں۔

پانچویں خاصانِ الٰہی کا اجل مقام اور ارفع درجہ یہ ہے رِضًا بِقَضَائِهٖ وَتَسْلِيْمًا لِاَمْرِهٖ یعنی ہر امر میں راضی برضائے خدا تھا اور دُعا اس کے منافی ہے کیونکہ وہ نفس کی خواہش کو مرادِ الٰہی پر ترجیح دیتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ عقلا کا اس پر اتفاق ہے کہ دُعا اہم مقام عبودیت ہے یعنی اس سے عبدیت کی شان ظاہر ہوتی ہے۔ بندہ اپنے کو خدا سے سوال کر کے اپنے کو صاحب احتیاج اور معبود کا بے نیاز ہونا ظاہر کرتا ہے نیز یہ کہ غیر وقت دُعا میں بندہ واسطہ کا محتاج ہوتا ہے اور وقت دُعا عبد و معبود کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ دُعا کا مانگنا اس کی دلیل ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اس کی دلیل ہے کہ وہ بندہ کا رب ہے۔

اس میں ایک لطیف نکتہ ہے خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ بندہ مجھ سے قریب ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ میں اس سے قریب ہوں۔ کیونکہ بندہ ممکن الوجود ہے اس کا مرکز عدم ہے۔ فنا اس پر طاری ہوتی ہے وہ وجود واجب سے قریب نہیں لیکن خدا قادر ہے اس پر کہ وہ اپنے فضل و رحمت سے بندہ کے قریب ہو۔

دُعا میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جب تک بندہ کا دل غیر اللہ کی طرف مشغول رہے گا وہ بہ رجوع قلب اس سے دعا ہی نہ مانگے اور جب ماسویٰ اللہ سے الگ ہو کر ایک ہی کی معرفت میں مستغرق ہو جائے گا تو ایسی حالت میں وہ اپنے حق کی طرف دیکھے ہی گا نہیں۔ اپنے لئے کسی چیز کا طالب ہی نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں وسائط کا پردہ بیچ میں سے اُٹھ جائے گا اور اس کی قربت ایزدی حاصل ہو جائے گی لہٰذا معلوم ہوا کہ دعا قربت الٰہی کا فائدہ دیتی ہے۔ لہٰذا وہ افضل عبادات ہے۔

اگر دُعا کرنا مفید نہ ہوتا تو خدا نے کیوں فرمایا اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (سورہ المومن ۴۰/۶۰) (تم مجھ سے دُعا کرو میں قبول کروں گا) بلکہ ترکِ دُعا پر خدا نے اظہارِ غضب فرمایا ہے۔

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (سورہ الانعام ۶/۴۳) (جب ان پر مصیبت آئے تو خدا کی بارگاہ میں تضرع نہیں کرتے ان کے دل سخت ہو گئے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظر میں زینت دے دی ہے۔

رہا یہ اعتراض کہ جو معلوم الوقوع ہے اس کے متعلق دعا سے فائدہ کیا جواب یہ ہے کہ علم الٰہی کی کیفیت اور قضا و قدر کے معاملات کو سمجھنا ہماری عقول سے باہر ہے حکمت الٰہیہ کا مقتضا یہ ہے کہ بندہ اُمید و بیم کی حالت میں رہے کیونکہ ان ہی دونوں باتوں سے عبودیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

قضاء و قدر سے متعلق دو لوحیں ہیں اوّل لوح محفوظ جس کا تعلق اُمور تکونیہ سے ہے۔ دوسری لوح محو و اثبات جس کا تعلق افعال عباد سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں جو تبدیلی چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہ قادر مطلق ہے اس کے تفضلات بے پایاں ہیں، ان کا سمجھنا عقول انسانی سے باہر ہے وہ ان دعاؤں کو ضرور قبول کر لیتا ہے جس میں دُعا کرنے والے کے لئے مضرت نہیں دیکھتا۔ وہ مجبور نہیں، مختار کل ہے ہر وقت جیسا چاہے کر سکتا ہے۔ مقصود دُعا سے اظہار عبدیت ہے اور رجوعِ الی اللہ ہے نہ کہ خدا کو اپنے حال سے آگاہ کرنا ممکن ہے دُعا کرنے سے وہ چیز مصلحت ہو جائے جو پہلے مصلحت نہ تھی۔

دوسرے جب بندے کو معلوم نہیں کہ قضاء و قدر کیا ہے تو یقیناً اس کو اپنی بہتری کے لئے دُعا کرنی چاہیے اس کا دُعا نہ کرنا اس کا دلیل ہوگا کہ وہ خدا سے مستغنی ہے۔

دُعا کا قبول کرنا یا نہ کرنا اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ لیکن بندہ کا فرض ہے کہ اس سے مانگے ضرور۔ وہ فرماتا ہے۔

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (سورہ الانعام ۶/۴۱)

اگر دُعا کرنے والا اپنی مُراد کو پالیتا ہے تو سمجھو اس کی دُعا موافق قضا و قدر تھی اور اگر نہیں پاتا تو اس کے عوض خدا اس کے دل میں سکون پیدا کر دیتا ہے اور اس کے سینے سے تنگی دُور کر دیتا ہے اور مصیبت میں صبر و تحمّل کی قوت دیتا ہے کیا یہی فائدہ دعا کا کم ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی استجابت ہے۔

حضرت رسولِ خدا نے فرمایا کہ مسلمان کی دُعا رد نہیں ہوتی۔ مگر اس صورت میں کہ وہ گناہ سے متعلق ہو یا قطع رحم سے کبھی خدا دُعا کرنے والے کو یہیں دے دیتا ہے اور کبھی بمصلحت اس کے لئے آخرت میں ذخیرہ کرتا ہے یا اس سے کسی بُرائی کا بقدر دعا دُور کر دیتا ہے اس نے اَسْتَجِبْ لَكُمْ کہا ہے میں دُعا قبول کروں گا۔ یہ نہیں فرمایا کہ فی الحال قبول کروں گا اگر آخرت میں وہ اس کے لئے نیکیوں کا ذخیرہ کر دے تو اس کا وعدہ سچا ہے۔

دُعا کرنے والے دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو دنیوی فلاح و بہبود کے لئے دُعا کرتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو آخرت کی فلاح و بہبود کے لئے دُعائیں مانگتے ہیں۔ یہ دوسرا گروہ انبیاء و اولیاء کا ہے ان کی دُعائیں اگرچہ ظاہر ہیں اُمورِ دنیا سے متعلق معلوم ہوتی ہوں مگر ان کا مقصد ان سے اس کی مرضی کے مطابق کام کرنا ہے اور اس کے دین کی خدمت بجالانا ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام سلطنت مانگتے ہیں تو یہ غرض نہیں ہوتی کہ وہ عیش و راحت کی زندگی بسر کریں گے۔ بلکہ یہ مقصد تھا کہ وہ بکثرت بندگانِ خدا کو خدا کا فرمان بردار بندہ بنائیں گے اور خدا کے احکام کی ان کو تلقین کریں گے۔ جناب سلیمان اگرچہ بادشاہ تھے، مگر دن میں اکثر روزہ رکھتے تھے۔ اور رات کو معمولی غذا کھاتے اور عبادتِ خدا بجالاتے تھے۔

جناب زکریا علیہ السلام نے بیٹا مانگا تو اس لئے نہیں کہ وہ صاحب جاہ و ثروت ہو بلکہ اس لئے کہ وہ انبیاء کا وارث ہو خدا کی مرضی کے مطابق عمل کرے۔

محمدؐ و آلِ محمدؐ کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ خدا سے وہ چاہتے تھے جو اس کی مشیت ہوتی تھی وَمَا تَشَاۤءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (سورہ الدہر ۳۰/۷۶) صحیفہ علویہ کو پڑھو، صحیفہ کاملہ کو پڑھو۔ ان میں خدا کی تعریفوں کے بعد جو دعائیں کی گئیں ہیں وہ یا تو نجات آخرت کے لئے ہیں یا عفوِ تقصیر کے لئے، یا دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے یا اس کی عبودیت کے فرائض انجام دینے کے لئے۔ وہ اس طرح گڑگڑا کر دُعائیں مانگتے ہیں جیسے کوئی انتہائی گناہ گار انسان مانگے حالانکہ وہ معصوم تھے۔ صدورِ گناہوں سے کوسوں دُور مگر مقامِ عبدیت میں آکر اسی طرح التجائیں کرتے تھے، جس طرح ایک گناہ گار کرتا ہے۔ اور یہی ان کی قربت کی دلیل تھی۔

انہوں نے کبھی خدا سے یہ دُعا نہیں مانگی کہ ان کو کثیر دولت دے دے، خزانوں کا مالک بنا دے۔ ساز و سامان سے ان کا گھر بھر دے۔ حکومت کی عنان ان کے ہاتھ میں دے دے۔ وہاں تو دُعا میں دُعا یہ تھی کہ تو ہم سے راضی رہ ہم کو اپنی مرضی پر چلنے کی توفیق دے۔ ان کی یہ دُعائیں رد ہونے کے قابل ہی نہ تھیں کیونکہ وہ خدا پر ایمان رکھتے تھے اس کے احکام کو کما حقہ بجالاتے تھے۔

ایک رات کو امام زین العابدین علیہ السلام زنجیرِ درِ کعبہ کو پکڑے ہوئے اس طرح درد سے دُعا کر رہے تھے اور اتنا بے قرار ہو کر رو رہے تھے کہ سننے والوں کے دل ہل رہے تھے۔ ایک شخص نے جو آپ سے واقف نہ تھا دریافت کیا کہ اے شخص تو نے ایسا کون سا بڑا گناہ کیا ہے۔

کہ اس قدر تڑپ تڑپ کر رو رہا ہے اور خدا سے طلب گار عفو ہے۔ یہ سن کر امام علیہ السلام نے پھر رونا شروع کیا اور فرمایا میری عبدیت کا تقاضا ہی یہ ہے، کہ میں اپنے خالق و معبود کے سامنے اپنے عجز کا اپنی درماندگی کا اقرار کروں۔ اور اس کے رحم و کرم کے لئے دعا کروں اے شخص! ایک دنیوی بادشاہ کے سامنے جاتا ہوا آدمی کانپتا ہے اور میں اس جلیل القدر بادشاہ کی بارگاہ میں فریادی تھا، جو کل عالم کا بنانے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ نے جس قدر زیادہ اپنی عبدیت کو نکھارا۔ خدا نے اتنا ہی ان کا رتبہ بلند کیا، نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی دونوں جگہ۔ انتہا یہ ہے کہ ان کو تمام کائنات کا مالک بنا دیا۔

بارگاہ باری میں عبدیت سے بلند درجہ کسی چیز کا نہیں۔ انتہا یہ ہے کہ رسالت سے بھی اس کا درجہ بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو یہ کہنے کا حکم ہے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ یعنی عبدیت کی گواہی پہلے دیتے ہیں پھر رسالت کی وجہ یہ ہے کہ رسولؐ وہ ہے جو خدا کی طرف سے بندوں کی طرف آئے اور عبد وہ ہے جو بندوں کی طرف سے خدا کی طرف جائے۔ بہت فرق ہے اوپر سے نیچے آنے والے اور نیچے سے اوپر جانے والے میں۔

انبیاء علیہم السلام کو بڑے بڑے خطاب بارگاہ باری سے عطا ہوئے۔ کوئی صفی اللہ تھا کوئی نجی اللہ، کوئی خلیل اللہ کوئی کلیم اللہ کوئی روح اللہ لیکن اپنے حبیب خاص جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کس مخصوص خطاب سے نوازا وہ عبدیت تھی۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (سورہ بنی اسرائیل ۱/۱۷) (پاک ہے وہ اللہ جو اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا۔ وہ مسجد اقصیٰ جس کی گرد کو ہم نے برکت دی ہے۔ تاکہ ہم اپنی نشانیوں میں سے کچھ خاص نشانیاں اس کو دکھا دیں۔

اس عبدیت کے زور کو اس کے مقام کی بلندی کو۔ اس کی خصوصیات کو کوئی کیا سمجھ سکتا ہے۔ شبِ معراج اس عبدیت کی بلندی کا کچھ پتہ چلا۔ جبرئیلؑ جیسا مقربِ فرشتہ سدرۃ المنتہیٰ پر جا کر رُک جاتا ہے اور کہتا ہے اب اگر میں بقدر ایک انگشت کے آگے کو پرواز کروں گا تو جل کر رہ جاؤں گا۔

یہ تھی مَلکیت لیکن عبدیت آگے بڑھ کر کہاں تک پہنچی فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی (سورہ النجم ۹/۵۳) کس کی طاقت ہے کہ اس مرتبہ کو سمجھ سکے۔ یہ وہ مقام ہے جس سے آگے عالم امکان نہیں بلکہ وجوب ہے۔

آدمؑ صفی اللہ تھے مگر جنت سے نکالے جانے کے بعد لیکن عبدیت زمین سے اٹھی اور جنت کی سیر کر کے واپس آگئی اپنے دامن پر ترک اولیٰ کا دھبہ لے کر نہ پلٹی۔

نوحؑ نجی اللہ تھے مگر کتنی بلندی انہیں نصیب ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ جودی پہاڑ تک۔ ابراہیمؑ خلیل اللہ کو منجنیق سے نکال کر کرۂ ہوا کے نیچے حصہ تک۔ موسیٰؑ کلیم اللہ کو کوہ طور تک۔ جناب سلیمانؑ کو ہوا کے ایک حصہ تک۔ ادریسؑ کو پہلے آسمان تک، عیسیٰؑ روح اللہ کو چوتھے آسمان تک اور عبدیت محمد مصطفےٰ کو قاب قوسین او ادنیٰ تک۔

اس عبدیت کے وزن کو امیرالمومنینؑ نے اچھی طرح سمجھا تھا۔ انہوں نے بھی اپنے لیے اسی چیز کو پسند کیا اور سرِ منبر فرمایا:

اَنَا عَبْدُ اللّٰہِ وَاَنَا اَخُو رَسُوْلِ اللّٰہِ (میں اللہ کا بندہ ہوں میں رسولؐ کا بھائی ہوں۔)
اخو رسولؐ کہنے میں ایک لطیف نکتہ ہے وہ یہ کہ جس طرح رسولؐ اللہ عبداللہ بن عبداللہ ہیں۔ میں بھی اسی نور کی ایک ضیا اور اسی نسل طیب و طاہر کی ایک شاخ ہونے کی حیثیت سے عبداللہ ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس اخوت پر عبدیت کا سایہ ہے اور یہ بھی اتنی بلند ہے جتنی عبدیت محمدؐ مصطفےٰ۔ شب معراج پتہ چل گیا کہ اس عبدیت کا پرتو بھی سرادق جلال ایزدی پر پڑ رہا ہے۔ ایک کچھ بول رہا تھا، ایک کچھ سن رہا تھا۔ کلیم اللہ نے طور پر جو آواز سنی وہ عبدیت علویہ کا ایک پرتو تھا۔ وہاں درخت سے ہمکلامی تھی۔ یہاں لسان اللہ سے۔ وہاں درخت کی شاخیں موسیٰ کے سامنے تھیں یہاں یداللہ کا ہاتھ محمدؐ مصطفےٰ کی نظر کے سامنے تھا۔ طور کے جلوے اور ہیں نور کے جلوے اور ہیں وہ فرش تھا یہ عرش ہے۔ وہ پہاڑ تھا یہ قاب قوسین ہے۔

عبدیت محمدؐ مصطفےٰ کی عظمت و جلالت کا کیا کہنا کہ علیؑ جیسا ولیٔ خدا فخر یہ کہتا ہے اَنَا عَبْدٌ مِنْ عَبِیْدِ مُحَمَّدٍ (میں محمدؐ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں) محمد کی عبدیت کا کیا کہنا نصیری کا خدا اپنے کو اس کا عبد کہہ رہا ہے اس سے اندازہ کرو کہ محمدؐ کا مقام کا کہاں ہے۔ ادھر علیؑ نے کہا میں عبد محمدؐ ہوں۔ محمدؐ نے کہا تو سہی کہ تجھے لوگوں کا آقا بنا دوں۔ غدیر خم کا منبر ہے اور علیؑ کی مولائیت کا اعلان۔

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاهُ

خدا نے اپنے عبد کو تمام نفوس سے اولیٰ بنایا۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ۔ اور نبی نے اپنے عبد کو مولا یا ایک اولیٰ ایک مولا۔

علیؑ کی عبدیت اگر اور زیادہ بلند دیکھنا ہو تو خانہ کعبہ میں دیکھو۔ وہ بلند مرتبت ذات جس کے قدم کو قاب قوسین او ادنیٰ ایک دن بوسہ دے رہا ہے۔ کعبہ میں ایک روز علیؑ اس کے شانوں پر بلند ہیں اور مہر نبوت ان کے پائے اقدس کو بوسہ دے رہی ہے ؎

زہے نقش پائے کہ بر دوش احمدؐ
ز مہر نبوت مقدم نشیند!

اس عبدیت نے باطل معبودوں کی خدائی چھین لی۔ اس عبدیت نے مشرکوں کی رگوں سے شرک اور کفر کا خون کھینچا۔ اس کے بغض نے منافقوں کے چہروں سے نقابیں الٹیں۔

جب یہ عبدیت میدان رزم میں آئی تو عمرو بن عبدود۔ مرحب و عنتر جیسے بہادروں کے سر خیارِ تر کی طرح کاٹ کر رکھ دیئے۔ فوجوں کے پرے کے پرے کچل کر رکھ دیئے۔

جب یہ عبدیت میدانِ رزم میں آئی تو بہادروں کا رنگ اُڑا۔ اعضا میں تھرتھری پڑی۔ جب بزمِ فصاحت و بلاغت میں آئی تو خطیب منبر سلونی کہلائے۔ مسند قضا پر بیٹھی تو اَقْضَاکُمْ عَلِیٌّؑ کی صدائیں گونجیں لَوْلَا عَلِیٌّؑ کے نعرے لگے۔ جب حصیر فقر پر بیٹھی تو جو کی سوکھی روٹیاں کھائیں۔ جب سخاوت کے جوش میں آئی تو اپنے منہ کے لقمے دوسروں کو کھلائے خود پیٹ پر پتھر باندھے اور دوسروں کو سیر کیا۔

جب زہد کی منزل میں آئی تو کپڑوں میں اتنے پیوند لگائے کہ رفوگر سے شرم آنے لگی۔

جب تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہوئی تو مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کی سرپرستی کی۔ یہی عبدیت تھی جو میدانِ کربلا میں اپنے کمالات دکھا رہی تھی اور تین دن کی بھوک پیاس میں ہزارہا دشمنوں کے نرغے میں انصار قلت اور رنج و غم کی کثرت میں اپنے فرائض کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کیا۔ اپنی طرف سے کسی شر کی ابتدا نہ ہونے دی دشمن کے مقابلہ میں کون ساحربہ ہے جس کو لوگ استعمال نہیں کرتے۔ الحرب خدعۃ مشہور مقولہ ہے مگر حسینؑ نے جس فضا میں پرورش پائی تھی۔ اس میں مکر و فریب کی موجوں نے کبھی دخل نہیں پایا۔ خود غرضیوں اور ہوس رانیوں کے بادل کبھی اس پر نہیں چھائے۔

حسینؑ اپنے سفر کا انجام اچھی طرح جانتے ہیں، ہر منزل پر اپنے ساتھیوں کو اس سے آگاہ کرتے جاتے ہیں تاکہ کوئی دھوکے میں نہ رہے۔

منقول ہے کہ حسینی قافلہ حدود کربلا میں پہنچا تو یکایک حسین علیہ السلام کا گھوڑا چلتے چلتے رُک گیا۔ آپ نے دوسرا گھوڑا بدلا۔ ہر چند مہمیز کی مگر اس نے بھی قدم آگے نہ بڑھایا۔ تیسرا گھوڑا بدلا۔ جب وہ بھی نہ چلا تو آپ گھوڑے پر سے اتر پڑے اور اس سرزمین کی تھوڑی سی خاک اُٹھا کر سونگھی اس کے بعد اپنی بہن جناب زینبؑ سے فرمایا۔ ذرا تم بھی اس کو سونگھو جوں ہی انہوں نے سونگھی چیخ اُٹھیں۔ اور خاک کو ہاتھ سے گرا کر کہا بھیا مجھے تو اس میں آپ کے خون کی بو آتی ہے۔

ایک دشمن اولاد رسولؐ خبیث الدہر اس روایت کا مذاق اُڑاتا ہے اور کہتا ہے۔ شیعوں کو روایت بنانے میں کمال حاصل ہے۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز کیا روایت ہو سکتی ہے کہ خاک سے خون کی بو سونگھی جا رہی ہے۔ اس سفاہت کردار کو کوئی سمجھائے کہ جس طرح ہوا کی موجوں سے حضرت یعقوبؑ نے جناب یوسفؑ کی بو سونگھ لی تھی۔

اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (سورہ یوسف ۱۲/۹۴)

(میں یوسفؑ کی سونگھ رہا ہوں) کہاں مصر سے آنے والی ہوا کہاں یوسف کی بوئے بدن۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔

جناب اویس قرنی جب مدینہ میں آئے اور حضورؐ کو وہاں نہ پایا تو واپس گئے۔ حضرتؐ کئی دن کے بعد تشریف لائے

تو فرمایا یہاں کون آیا تھا کہ میں اس کی خوشبو سے فضا کو بسا ہوا پاتا ہوں۔
حسینؑ اسی رسولؐ کے نواسے تھے۔ اگر اپنے خون کی بو خاکِ کربلا سے سونگھ لی تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ بہر حال امام مظلوم نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔ ہمارا سفر تمام ہوا۔ اونٹوں کو بٹھاؤ۔ سواریوں کو اتار دو۔ خیموں کو لبِ نہر نصب کر دو یہی وہ جگہ ہے جہاں تین دن کی بھوک پیاس کے بعد ہمارا خون گوسفندان قربانی کی طرح بہایا جائے گا۔ ابدالآباد تک بس یہیں ہم کو بسنا ہے یہیں ہم غریبوں کے مزار بنیں گے۔ دیکھا آپ نے کس صفائی کے ساتھ لوگوں کو اپنے سفر کا انجام بتا رہے ہیں کسی سے چھپاتے نہیں تاکہ دھوکہ میں کوئی نہ رہے۔
خیمے لبِ فرات نصب ہو رہے ہیں امام حسین علیہ السلام مختلف مقامات پر قبروں کے لئے نشان بنا رہے ہیں۔ بریر ہمدانی نے پوچھا یا ابن رسول اللہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آبدیدہ ہو کر فرمایا۔ اے بریر یہ وہ مقامات ہیں جہاں ہم زخموں سے چُور چُور ہو کر گھوڑوں سے گریں گے۔ جہاں ہماری قبریں بنیں گی۔
یہ معمولی باتیں نہیں انسان تصور کرے تو کلیجہ پھٹ جائے۔ موت کا یقین دلایا جا رہا ہے۔ عورتوں، مردوں، جوانوں اور بڈھوں، اپنوں اور غیروں سب کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ میرے ساتھ رہ کر زندگی کی توقع چھوڑ دیں اور ابھی سے مرنے پر کمر کس لیں۔ فوجوں کے جرنیل بڑے بڑے سبز باغ دکھا کر ساری فوج کٹوا دیتے ہیں اور آخر وقت تک اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہونے دیتے، تاکہ سپاہی بھاگ نہ کھڑے ہوں۔ نامردی ان پر غالب نہ آئے لیکن حسینؑ ایسا نہیں کر رہے وہ ہر ہر قدم پر جو حقیقت ہے اس کی نقاب کشائی کرتے چلے آ رہے ہیں مگر واہ رے وفادار ساتھیو کہ ذرا ماتھے پر شکن نہیں آتی۔ ہلکی سی گھبراہٹ دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ بال برابر وفاداری میں فرق نہیں آتا۔ جون ایک حبشی غلام ہے پہلے ابوذرؓ کے پاس تھا اس کے بعد امام زین العابدین علیہ السلام کے پاس آگیا تھا۔ مدینہ سے قافلہ چلا تھا تو یہ بھی ساتھ ہو لیا تھا۔ جب امام حسین علیہ السلام کربلا میں پہنچے اور اپنے ساتھیوں کو ان کے قتل ہونے کی جگہیں بتلانے لگے تو جون نے آگے بڑھ کر عرض کی یا ابن رسول اللہ میں کہاں قتل ہوں گا۔ حضورؑ نے وہ جگہ بتا دی قربان ہوں ہماری جانیں اس غلام حبشی کی وفاداری پر کہ تھوڑی اسی خاک اپنے چہرہ پر مل لی اور کہا کاش جلدی وہ وقت آجائے کہ نصرتِ حسینؑ میں قتل کیا ہوا یہاں پڑا ہوں۔
آگے چل کر ایک اور نازک موقعہ آیا۔ دشمن کا اصرار ہے کہ لبِ فرات سے خیمے ہٹا کر یہاں سے دور ریتی پر نصب کرو امیر عبید اللہ ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ گھاٹ پر پہرہ بٹھا دیا جائے اور حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کر دیا جائے۔ یہ سنتے ہی اصحاب حسینؑ بگڑ گئے اور غیظ میں آکر تلواریں نیام سے نکال لیں۔ جناب عباسؑ نے بڑھ کر کہا کسی کی کیا مجال کہ ہمیں یہاں سے ہٹا سکے۔ اس ارادے سے آگے قدم نہ بڑھانا۔ ورنہ تم میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ جائے گا۔ تم نے ہمیں کیا سمجھا ہے۔ ہمارا سردار فرزند رسول الثقلین امام حسینؑ ہے۔ ہماری رگوں میں ہاشمی خون ہے۔ ہماری شجاعت کی تمام عرب پر دھاک ہے۔ زہیر قین نے للکار کر کہا ہم یہاں سے ہرگز نہ ہٹیں گے ہمارے ساتھ عورتیں اور بچے ہیں او بے حیاؤ! تم کو شرم نہیں آتی کہ ایک سگِ دنیا کی اطاعت کا دم بھر کے اولادِ رسولؐ کو

پیاس سے مارنا چاہتے ہو۔ تمہارا یہ بدارادہ ہرگز ہرگز پورا نہ ہوگا۔ قریب تھا کہ تلوار چلنے لگے۔ امام علیہ السلام نے جناب عباسؑ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بھیا عباسؑ غیظ میں نہ آؤ۔ اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا نہ کرو۔ زہیرقین نے عرض کی یا ابن رسول اللہ ابھی یہ تھوڑے ہیں ان سے لڑنے دیجئے بہت جلد ہم ان کا خاتمہ کر دیں گے۔ اس کے بعد جب کوفہ اور شام کی فوجیں آئیں گی تو ان کا مقابلہ دشوار ہو جائے گا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا یہ سب کچھ سہی مگر اے زہیر! میں یہ الزام اپنے اوپر لینا نہیں چاہتا کہ جنگ کی ابتدا حسینؑ کی طرف سے ہوئی۔

یہ ہے حسینؑ کی حیثیت جو سمجھ سکتے ہوں وہ سمجھ لیں اور یہ ہیں امام حسینؑ کے وفادار سپاہی دیکھنے والے دیکھ لیں۔ دنیا داروں ملکی فتوحات کے دیوانوں کا لشکر ہوتا تو اپنے سردار سے بگڑ جاتا کہ ہم بھوکے پیاسے مرنے کے لئے آپ کے ساتھ نہیں آئے ہیں اگر یہاں ہمارا پڑاؤ نہ رہے گا تو ہم ساتھ چھوڑ دیں گے۔ کتنا فرق ہے دنیا پرستوں اور راہِ خدا میں سر دینے والوں میں۔

حسینؑ کی پرخلوص عبدیت اور اسلامی حدود کی نگہداشت کا صرف ایک موقع آپ کے سامنے اور پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ پوری طرح واضح ہو جائے کہ حسینؑ کس مقصد کو لے کر اُٹھے تھے اور ان کے اندر خدا ترسی اور ایمان داری کا جذبہ کس حد تک تھا۔ ربتی پر خیمے نصب ہو گئے تو آپ نے حکم دیا کہ یہاں کے زمینداروں کو بلاؤ اور ان سے کہو کہ اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی ساتھ لائیں۔ مجھے ان سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ یہاں کے زمیندار قبیلہ بنی اسد کے لوگ تھے وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان سے فرمایا ہمارا ارادہ اس سرزمین پر آباد ہونے کا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زمین تم سے خرید کر لوں۔ انہوں نے کہا یا ابن رسول اللہ آپ ہرگز یہاں آباد ہونے کا قصد نہ فرمائیں۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ جو کوئی خاصانِ خدا میں اس زمین پر وارد ہوا ہے اسے کچھ نہ کچھ اذیت ضرور پہنچی ہے۔ آپ نے فرمایا مرضی الٰہی یہی ہے کہ ہم قیامت تک یہیں رہیں۔ الغرض ساٹھ ہزار دینار میں ارض کربلا کو آپ نے ان سے خرید فرمایا اور پھر وہ زمین تین شرطوں پر ان ہی کے نام ہبہ کر دی۔ پہلی شرط یہ تھی کہ جب ہمارے دشمن ہمیں یہاں قتل کر دیں اور بے دفن کئے ہماری لاشوں کو چھوڑ جائیں تو تم ہمیں دفن کر دینا۔ اس کے بعد ان کی عورتوں سے فرمایا اگر ابن زیاد کے خوف سے تمہارے مرد یہ خدمت انجام نہ دے سکیں تو ان کو غیرت دلانا اور یہ کام کر کے چھوڑنا۔ آپ پھر ان کے بچوں سے مخاطب ہوئے اور فرمایا دیکھو اگر تمہارے ماں باپ ہمیں دفن کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ تم کھیلتے کھیلتے یہاں چلے آنا، اور مٹھی مٹھی بھر خاک ہماری لاشوں پر ڈال کر ان کو چھپا دینا۔ ذرا دیکھیں دنیا والے اس احتیاط کو کہ حسینؑ اپنی شرعی ذمہ داری کو کس طرح پورا کر رہے ہیں۔ وہ زمین غیر میں دفن ہونا نہیں چاہتے۔ کیا دنیا کے جنگجو معرکہ آرائیوں میں ایسی باتوں کا خیال رکھا کرتے ہیں۔ یہ امام حسین علیہ السلام کی مقدس زندگی کا ایک نمایاں پہلو ہے جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

دوسری شرط بنی اسد سے یہ تھی کہ جب ہمارے زائر یہاں آئیں تو ان کو ہماری قبروں کے نشان بتا دینا۔

تیسری شرط یہ کی کہ ہمارے زائروں کو تین دن اپنا مہمان رکھنا امام مظلوم کو بعلمِ امامت معلوم تھا کہ لوگ ہماری زیارت سے روکے جائیں گے کوئی ہماری قبروں کے نشان بنانے کی جرأت نہ کرے گا اور تین دن کی مہمان کی شرط اس لئے کی کہ محبان حسینؑ

کو یہ پتہ چل جائے کہ ان کا مظلوم امام تین روز کا بھوکا پیاسا اس سرزمین پر قتل کیا گیا تھا۔

مرحبا قبیلہ بنی اسد کو کہ انہوں نے ابن زیاد کی تشدد پسندی اور جابرانہ فرمانروائی کو نظر انداز کر کے بے کسوں کی لاشوں کو سپرد خاک کیا۔ آج تک وہ اس رسم کی یاد تازہ کرنے کے لئے روز عاشور کربلا میں آتے ہیں تو وہ جگر پاش منظر ہوتا ہے کہ لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں۔ یہ قبیلہ اپنی عورتوں اور بچوں کو سر و پا برہنہ لے کر جب کربلا میں داخل ہوتا ہے تو ان کے مرد اور عورتیں کدال اور بیلچے ہاتھ میں لئے ہوتے ہیں اور حدود کربلا میں داخل ہوتے ہی وہ **اَیْنَ الْحُسَیْنُ اَیْنَ الْحُسَیْنُ** (کہاں ہیں حسینؑ، کہاں ہیں حسینؑ) کے نعرے مارتے، سروں پر خاک ڈالے ہوئے روضہ مبارک تک چلے آتے ہیں ان کی آوازوں میں کچھ ایسا درد ہوتا ہے کہ سننے والے کو تاب ضبط باقی نہیں رہتی۔ در و دیوار سے سر ٹکراتے ہیں۔ یہ لوگ حرم امام مظلوم میں داخل ہو کر جب ضریح کے گرد ماتم اور نوحہ خوانی کرتے ہیں تو دیوار و در ہل جاتے ہیں۔ عورتیں اور بچے ضریح کو پکڑ کر بلبلا بلبلا کر کہتے ہیں مولا حسینؑ! مولا حسینؑ!! آپ کے غلام اور کنیزیں حاضر ہیں۔ مولا حسینؑ! اگر کوئی خطا ہم سے ہوئی ہو تو معاف فرما دیجئے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

آٹھویں مجلس

اسلامی احکام کی خوبیاں۔ اسلامی زندگی
امیرالمومنینؑ کے فضائل۔ کربلا سے اہلِ حرم کی روانگی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

(سورہ آل عمران ۱۹/۲)

(بے شک اللہ کے نزدیک اسلام ہی دین ہے) خدا نے جس دین کو اپنا دین کہا ہے وہ اسلام ہے جس کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوا اور حضرت خاتم الانبیاءؐ پر آکر ختم ہوگیا۔ شریعتیں بدلتی رہیں لیکن دین کے اصول کبھی نہیں بدلے۔ شریعتوں کو بدلنے کی ضرورت بھی اس لئے پیش آئی کہ انبیاء سابقین کی امتوں نے احکامِ الٰہیہ میں ناروا تصرف کرکے ان کی صورت مسخ کی۔ اس لئے ان کی درستی کے لئے دوسری شریعت کو جاری کرنا ضروری ہوا۔

اسلام کے دو بڑے جزو ہیں۔ ایک ایمان دوسرے عمل صالح۔ اسی لئے جابجا قرآن مجید میں ان دونوں کا تذکرہ ہے بلکہ پورا قرآن ان ہی دونوں چیزوں کو صحیح حالت میں باقی رکھنے پر زور دے رہا ہے۔ ایمان کے بعد عمل صالح کا نمبر ہے اگر ایمان نہیں تو عملِ صالح بیکار ہے۔ بارگاہ الٰہی میں ایسے عمل کی کوئی گنجائش نہیں، وقعت نہیں کرنے والے کی کوششیں رائیگاں جاتی ہیں جیسا کہ فرماتا ہے۔ قُلْ ھَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ وَلِقَآئِہٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فَلَا نُقِیْمُ لَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ

وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ (سورہ الکہف ۱۰۳، ۱۰۴/۱۸) (کیا ہم خبر دیں خسارہ پانے والوں کی یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں حیات دُنیا میں ضائع ہو گئیں۔ اور وہ گمان کرتے رہے کہ ہم نیکی کر رہے ہیں۔ ان کے اعمال سب کے سب حبط کر لیے گئے ہیں اور قیامت کے روز ان میں کوئی وزن نہ ہوگا۔)

اسلام عملی دین ہے۔ عمل ہی پر نجات آخرت موقوف ہے اور عمل کا تعلق انسان کے باہمی تعلقات میں خوش بینی اور خوش خلقی سے ہے یعنی ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں ان کا ادا کرنا عمل صالح ہے یا اخلاقی معیار ہے اسی لئے اسلام نے رہبانیت کو تجرد کی زندگی کو سادھوا ور سنیاسی پن کو اپنے حلقے سے خارج کر دیا ہے ایک شخص گوشہ نشین رہ کر جب اپنے تعلقات بنی نوع انسان سے قطع کر لیتا ہے تو پھر عمل کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے اپنے اخلاق حسنہ کو بروئے کار لانے کے موقعے اسے نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلعم نے تجرد کی زندگی والے کی موت کو بدترین موت قرار دیا ہے۔

اَشْرَارُ مَوْتَاكُمُ الْعَذَّابُ (تمہارے مرنے والوں میں بدترین وہ ہیں جو بے شادی کے مرے) اس لئے کہ انہوں نے اپنے اوپر عمل خیر کے دروازوں کو بند کر لیا تھا۔ اسلام نے نکاح کا مقصد یہی قرار دیا ہے کہ نسل بڑھے اور لوگ قلت سے کثرت میں تبدیل ہوں۔ جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا ہے تَنَاكَحُوْا وَتَنَاسَلُوْا تَكْثُرُوْا فَاِنِّیْ اُبَاهِیْ بِكُمُ الْاُمَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَوْ بِالسِّقْطِ (نکاح کرو، نسل بڑھاؤ، کثرت میں آجاؤ میں روز قیامت اُمتوں پر فخر کروں گا اس حمل کی وجہ سے بھی جو ساقط ہو گیا ہے۔) دوسری حدیث میں فرماتے ہیں: اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَيْسَ مِنِّیْ (نکاح میری سنت ہے جو میری سنت سے نفرت کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے) لم اس میں یہی ہے کہ جو شخص بیک بینی دو گوش رہنا چاہتا ہے تو وہ اپنی اخلاقی خوبیوں کے نمایاں کرنے کا موقع کہاں پائے گا اور عمل صالح کر کے کیسے دکھائے گا۔ جس کے بی بی نہیں وہ حقوق زوجیت ادا کیوں کرے گا۔ جس کے بچے نہیں وہ تربیت اولاد کے قواعد پر کیسے عمل کرے گا۔ ان کی خدمت کا صلا کیسے پائے گا وہ ان کی وجہ سے دوسروں کو اپنے اوپر مہربان کرنے کی کوشش کیوں کرے گا۔ جو رہبان یا سادھو بن کر جنگلوں یا پہاڑوں میں جا بیٹھا ہے وہ اپنے اہل و عیال کے فرائض کیا انجام دے گا۔ حق ہمسایہ کو کیا پہچانے گا مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کی امداد کر کے اس کا اجر کیسے پائے گا۔ مسافروں کی مہمان نوازی کیسے کرے گا۔ بیماروں کی عیادت کا ثواب کیونکر پائے گا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیسے کرے گا۔ لوگوں کے باہمی جھگڑوں کو چکا کر اس کا اجر کیسے حاصل کرے گا۔

وہ درحقیقت معاشرہ کا دشمن اور تمدنِ انسانی کا تباہ کرنے والا ہے۔

ایک عورت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی جس نے شادی اس وجہ سے نہ کی تھی کہ اس کی عبادت میں فرق آئے گا آپ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا جا تیرا کوئی عمل مقبول نہیں۔ اسلام کا کھلا اعلان یہ ہے لَا رُهْبَانِيَّةَ فِی الْاِسْلَامِ (اسلام میں رہبانیت نہیں) درحقیقت نیک عمل تو وہی ہے کہ جب انسان کا دامن دل ہزار طرف کو کھینچ

رہا ہو اور قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آ رہی ہوں اور پھر وہ نیکی کا دامن نہ چھوڑے۔ یہودیوں اور نصرانیوں میں رہبانیت کا دور دورہ تھا وہ راہبوں اور قسیسوں کی بڑی قدر کرتے تھے اور دین داری کی بہترین صورت اسی طرز زندگی کو جانتے تھے۔ اسی طرح ہندو اور بدھ دھرم میں بھکشوں اور سنیاسیوں کا بڑا احترام کیا جاتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ طرز زندگی اسی لئے اختیار کیا گیا تھا کہ عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر بادشاہوں کی طرح اپنا رعب داب قائم کر سکیں۔ بالاتر ہستی خیال کئے جائیں بیز ملامت کا نشانہ بننے سے محفوظ رہیں۔ اعزا و اقارب دوست و احباب اور قوم و ملت کے فرائض اور حقوق کے بجالانے کی زحمت سے بچ جائیں لیکن چونکہ ایسی زندگی احمقانہ زندگی تھی۔ لہذا اسلام نے اس کو دائرہ عمل سے خارج کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نبوت کا ۲۳ سالہ دور انسانی مجمع میں رہ کر اور ہر قسم کی انسانی جدوجہد میں شریک ہو کر گزاری اور آپ نے اپنے اہلبیت کو اور اپنی تمام امت کو ایسی ہی زندگی گزارنے کی تعلیم دی۔

یہ تو بالکل واضح بات ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا کئے جا سکتے ہیں ان سے ہٹ کر نہیں پہاڑوں کی کھوؤں میں تپ کرنے والے دریا کے کناروں اور جنگلوں میں ننگ دھڑنگ وقت گزارنے والے جماعتی مشکلات کا کیا حل پیش کر سکتے ہیں اور لوگوں کی اخلاقی نگرانی کا فرض کیوں کر انجام دے سکتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (سورہ التحریم ۶/۶۶) (تم اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ) یعنی انسان کا فرض صرف اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بچانا ہے۔

دنیا درحقیقت جدوجہد اور دار و گیر کا میدان ہے جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کرتے ہیں۔ سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہوتی ہیں۔ اسی لئے جو شخص جماعتی تکلیفوں سے گھبرا جاتا ہے اور اپنا بوجھ اپنے کندھے پر لے کر الگ کھڑا ہوتا ہے دنیا کے معرکے کا وہ نامرد سپاہی ہے۔

تعلیم محمدی میں ہر ایک پر دوسروں کی نگرانی فرض کر دی گئی ہے اخلاقی فرض کا شرعی نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اسی فرض کی ادائیگی کے لئے اس امت کو خیر الامم کا خطاب دیا جا سکتا ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورہ آل عمران ۱۱۰/۳) حضورؐ نے فرمایا ہے۔ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ (تم میں ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے سوال کیا جائے گا) لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل کا اور ریاکار کا فرض نہیں ورنہ وہ اس کے بہانے سے فتنہ و فساد پیدا کر دے گا۔ یہ حق صرف اسی کو ہو سکتا ہے جو خود برائیوں سے بچے۔ پھر نصیحت کے موقع و محل کو پہچاننا بھی ضروری ہے۔ نہایت خوش اسلوبی اور مصلحت کے ساتھ سمجھائے۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (سورہ النحل ۱۲۵/۱۶) حضرت موسیٰ اور ہارون سے کہا گیا تھا فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (سورہ طہ ۴۴/۲۰) رسولؐ کے متعلق فرماتا ہے فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (سورہ آل عمران ۱۵۹/۳) معلوم ہوا کہ جو کوئی غلط اور غلیظ القلب ہو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اس سے تعلق نہیں۔ اسی طرح جو برائیاں

سے خود نہ بچتا ہو اسے بھی حق نہیں۔

جو جس قدر برائی سے بچتا ہوگا اسی قدر اس کو ہدایت کا حق زیادہ حاصل ہوگا اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہدایت کا بالکلیہ تعلق اسی ذات سے ہو سکتا ہے جو معصوم ہو من المہد الی اللحد۔ جس کے کسی فعل اور قول پر خواہ وہ زمانہ سے متعلق ہو یا حال سے کسی کو انگشت نمائی کا موقع نہ ملے۔ ورنہ اس کی ہدایت بے اثر رہے گی۔

قدرت نے حضور کے ہدایت مطلقہ کا کام ان ہی لوگوں کے سپرد کیا جن کا دامن ہر قسم کے داغ ودھبہ سے پاک تھا اور بمصداق آیۂ تطہیر ان کو ہر قسم کے رجس سے پاک کر دیا گیا تھا۔ ان کی ہدایت کے طریقے پر ایک نظر ڈالو۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے ایک اعرابی کو دیکھا وہ وضو غلط کر رہا تھا۔ دونوں بھائیوں نے اس سے فرمایا اے اعرابی ہم دونوں میں ترکیب وضو میں اختلاف ہے لہٰذا ہم تجھ کو قرار دے کر تیرے سامنے وضو کرتے ہیں۔ تو ہم کو آگاہ کر کہ ہم میں سے کس کا وضو صحیح ہے اور کس کا غلط۔ دونوں شہزادوں نے اس کے سامنے صحیح وضو کیا وہ سمجھ گیا کہنے لگا کہ شہزادو! آپ دونوں کا وضو صحیح ہے۔ وضو میرا ہی غلط تھا۔

ایک روز امام حسنؑ کو ایک مرد شامی گالیاں دینے لگا۔ آپ نے ضبط و تحمل سے کام لیا اور جب وہ اپنی بکواس ختم کر چکا تو فرمایا اے شخص اگر تو بھوکا ہے تو میں تیرے لئے کھانا لاؤں اور اگر کپڑا درکار ہو تو تجھ کو کپڑا دوں اگر تو مقروض ہے تو تیرا قرض ادا کر دوں، اگر کسی مصیبت میں گرفتار ہے تو تیری مصیبت کو دور کر دوں۔ اگر سواری تیرے پاس نہ ہو تو سواری دوں۔ آ میرے ساتھ چل میرا مہمان ہو۔ وہ آپ کے ساتھ چلا آیا۔ آپ نے عمدہ عمدہ کھانے اس کو کھلائے اور چار ہزار درہم اس کو دیئے۔ وہ رونے لگا۔ حضرت نے فرمایا کیا اس رقم کی کمی کی وجہ سے روتا ہے۔ اس نے کہا یہ بات نہیں بلکہ اپنی غلطی پر روتا ہوں کہ میں نے آپ کو پہلے سے کیوں نہ سمجھا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ بیشک آپ خلق کے امام ہیں۔ پہلے میں آپ کا اور آپ کے پدر بزرگوار کا سب سے بڑا دشمن تھا اور اب آپ کا اور ان کا سب سے بڑا دوست ہوں۔ میری خطا کو معاف کیجئے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کا ایک ہمسایہ آپ کو تکلیف پہنچایا کرتا تھا آپ تحمل سے کام لیتے تھے ایک شخص کا اس پر قرضہ تھا وہ بار بار اس سے مانگتا تھا مگر اس کے پاس ادا کرنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ قرض خواہ نے ایک روز اس کو دھر پکڑا۔ اور اس کو مارنے پیٹنے لگا اس کی فریاد سن کر امام حسن علیہ السلام گھر سے باہر نکلے۔ قرض خواہ سے پوچھا تیرا کتنا قرضہ ہے اس نے بتایا فرمایا اسے چھوڑ دے میں تیرا قرضہ ابھی چکاتا ہوں اس کے بعد وہ رقم اس کو لا کر دے دی۔ یہ حال دیکھ کر وہ پڑوسی آپ کا بہترین دوست بن گیا۔

اسامہ بن زید اہل بیت کے مخالفین میں سے تھا۔ جب وہ بیمار ہوا تو امام حسینؑ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اس کو واغماہ واحزناہ کہتے پایا۔ فرمایا اے بھائی! تجھے کیا غم ہے؟ اس نے کہا چار ہزار دینار کا مقروض ہوں۔ اگر اسی عالت میں مر گیا تو یہ بار اپنے سر پر لے جاؤں گا۔ فرمایا غم نہ کر تیرا قرضہ میرے اوپر ہے اس نے کہا مجھے اندیشہ ہے کہ جب تک آپ یہ قرضہ ادا کریں میں مر نہ جاؤں۔ یہ قرضہ ابھی ادا ہوگا چنانچہ آپ اپنے گھر تشریف لائے اور چار ہزار درہم اس کو لا کر دے دیئے۔

اس کا نام ہے اسلامی زندگی۔ صرف زبانی جمع خرچ کا نام اسلام نہیں۔

افسوس ہے کہ اس زمانہ میں عمل کا فقدان ہے اور برائیاں نیکیوں کی صورت اختیار کرتی جاتی ہیں انسانی اخلاق میں جھوٹ سب سے زیادہ مہلک مرض ہے مگر اب وہ فیشن میں داخل ہے اور جو سچ بولتا ہے اس سے زیادہ کوئی بے وقوف نہیں۔

غیبت اخلاقی رذائل میں بدترین رذیلت ہے خدا فرماتا ہے۔ یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (سورہ الحجرات ۴۹/۱۲) (اے ایمان والو! بہت سے گناہوں سے بچتے رہو۔ بے شک بعض گمان گناہ ہے اور کسی کا بھید بھی نہ ٹٹولو۔ کسی کو پیٹھ پیچھے اس کو برا بھی نہ کہو۔ بھلا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ سو تم کو گھن آئے اللہ سے ڈرو۔ بے شبہ معاف کرنے والا مہربان ہے) اس آیت میں جن چند خاص باتوں سے روکا گیا ہے اس زمانہ میں اس کی طرف بال برابر بھی توجہ نہیں۔ بدگمانی خدا کی پناہ۔ بیٹا باپ سے اور بھائی بھائی سے بدگمان ہے معمولی معمولی باتوں پر بدگمانی بڑھ کر اچھا خاصہ جھگڑا اٹھا کھڑا کرتی ہے تجسّس احوال کا یہ حال کہ ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگا ہوا ہے کہ ذرا سا موقع ملے تو کیچڑ اچھال دوں۔ غیبت کا حال تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ بہت کم لوگ ہوں گے جن کے دانتوں اور داڑھیوں میں مُردہ بھائی کا گوشت نہ ہو۔ ہمارے جلسوں کی رونق ہی غیبت سے ہے۔ ہمارے زنگ کھائے دلوں کو راحت ہی غیبت کرنے اور سننے سے حاصل ہوتی ہے۔ کتنا عظیم الشان گناہ ہے جس کو قدرت نے مُردہ بھائی کے گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے جو لوگ ان امراض میں خود مبتلا ہوں وہ کیا دوسروں کو ہدایت کریں گے۔

اسی طرح خداوند عالم عدل و احسان کا حکم دیتا ہے اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ (سورہ النحل ۱۶/۹۰) عدل و احسان ہی ایسی چیز ہے جس نے دُنیا کے نظام کو قائم کر رکھا ہے اور رفق و ملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوشنما بنا دیا ہے۔

اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جزو الگ الگ تھے اسی وجہ سے نظام غیر مکمل تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت مجسم عدل ہے اس میں احسان و درگزر کی گنجائش کم نظر آ رہی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام مجسم رحمت کا پیغام بن کر آئے۔ ان کی شریعت میں عدل و انصاف قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے۔ لیکن اسلام نے اپنے یہاں دونوں کو برابر کا درجہ دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اسلام کا دیگر ادیان کے مقابل جو طرۂ امتیاز تھا اس زمانہ میں مسلمان اس سے کوسوں دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر تمدنِ اسلامی میں دونوں چیزیں باقی رہتیں تو یقیناً اسلامی معاشرہ اور تمدن تمام دُنیا کے تمدن سے الگ نظر آتا اور خیر و برکت کے بادل اس پر چھائے رہتے۔

یہی دو چیزیں تھیں جن کو دنیائے اسلام میں باقی رکھنے کی اہلبیت رسولؐ نے پوری پوری کوشش کی اور بار ہا اپنی جان کو جوکھوں

میں ڈالا۔ بلکہ اپنی جانیں قربان کردیں۔

امیرالمومنینؑ نے جب سلطنت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو اپنے عمالوں پر پوری سختی کے ساتھ ان دونوں محاسن پر باقی رہنے کا زور دیا لیکن افسوس کہ زمانہ ان باتوں کو برسوں سے بھولا پڑا تھا اور یہ چیزیں ابنائے روزگار کی بدمزاجی سے کسی طرح سازنہ کرتی تھیں۔ اس لئے امراء اس سے خوش نہ تھے اور ایسے لوگوں سے سازش کرنے لگے تھے جہاں ان دونوں باتوں کا فقدان تھا۔

تاہم امیرالمومنینؑ ان لوگوں کی غداری اور ایمان فروشی سے قطعاً مرعوب نہیں ہوئے اور جو اپنا فریضہ تھا اس کو ادا کرتے رہے۔ علیؑ کے عدل و احسان کو کس نے پایا اور کس نے سمجھا وہ اپنے دورِ حکومت میں جس شان سے ان کی عملی صورتیں دکھا گئے۔ وہ اسلامی حکمرانوں یا قوموں کے سربراہوں سے بن ہی نہ پڑیں۔

ابورافع ناقل ہیں کہ ایک بار کہیں سے خراج میں بہت سا سامان آیا جو بیت المال میں رکھا ہوا تھا۔ اس میں ایک موتیوں کا ہار بھی تھا عید کے موقع پر امیرالمومنین علیہ السلام کی صاحبزادی ام کلثومؑ نے خواہش کی کہ ایک دن کے لئے مجھے عاریۃً دے دو۔ میں نے شہزادی کا کہنا نہ ٹالا، اور وہ ہار دے دیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے جب وہ ہار صاحبزادی کو پہنے ہوئے دیکھا تو غضب ناک لہجے میں کہا یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا۔ انہوں نے کہا میں نے ابورافع سے عاریۃً لیا ہے کل کو واپس کردوں گی۔ فرمایا تمہیں اس کے پہننے کا کیا حق تھا عرض کی میں نے تو عاریۃً لیا ہے۔

فرمایا عاریۃً لینے کا حق ہر مسلمان کی بیٹی کو ہے۔ تم میں کیا فوقیت ہے کہ تم اسے استعمال کرو اور دوسری لڑکیاں نہ کریں ابھی واپس دو، اور آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا یہ تو انصاف کے سراسر خلاف ہے۔

ایک بار کہیں سے شہد آیا بیت المال میں رکھا تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے یہاں کچھ مہمان آ گئے۔ ابورافع سے انہوں نے کہا تھوڑا سا شہد مجھے قرض دے دو۔ جب مجھے حصہ ملے گا تو اتنا ہی شہد واپس دے دوں گا ابورافع نے دے دیا۔ جب امیرالمومنینؑ تقسیم کرنے کو بیٹھے تو ایک مشک میں کچھ کم پایا۔ ابورافع سے جواب طلبی ہوئی۔ انہوں نے کہا میں نے حسینؑ کو قرض دے دیا ہے فرمایا: تم حق مسلمین میں تصرف کرنے والے کون تھے۔ اس کے بعد امام حسینؑ کو بلا کر سختی سے باز پرس کی۔ انہوں نے کہا میں نے قرض لیا ہے۔ جب آپ میرا حصہ دیں گے میں واپس کردوں گا۔ فرمایا یہ مال تمہارے باپ کا نہیں عام مسلمانوں کا حق ہے جس طرح تم کو قرض لینے کا حق تھا۔ دوسروں کو بھی تھا دیکھو آئندہ ایسا نہ کرنا اور جتنا شہد لیا ہے ابھی بازار سے منگوا کر اس مشک میں ڈالو۔

جناب عقیلؑ کے اولاد زیادہ تھی اور آزوقہ کم۔ بڑی سختی سے گزر بسر ہوتی تھی۔ ایک روز امیرالمومنین علیہ السلام سے عرض کی مجھے کس قدر افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس کا بھائی بادشاہ ہو اس کے بال بچے شکم سیر ہو کر کھانا بھی نہ کھائیں۔ آپ نے فرمایا جو تمہارا حق ہے وہ میں تم کو دے دیتا ہوں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ دوسروں کا حق مار کر تم کو دیتا رہوں ہاں یہ ممکن ہے کہ مجھے ملتا ہے اس میں سے کچھ تمہیں بھجوا دیا کروں۔ اگر میرے بچوں کو فاقہ ہوگا تو مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ عقیل نے دل گرفتہ ہو کر کہا مجھے آپ کے حصے کی ضرورت نہیں آپ عقیل کا ہاتھ پکڑ کر دارالامارہ کے بالائی حصے پر لے گئے اور بازار میں دکانوں میں سامان کے بھرے ہوئے صندوق رکھے تھے۔ ان

کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ آج رات کوان میں سے کسی دکان کا تالا توڑ دو اور یہ مال نکال کرلے جاؤ۔ انہوں نے غصے میں بھر کر کہا کیا خوب آپ مجھے چور بنانا چاہتے ہیں۔ فرمایا کیا خوب تم اپنے لئے تو اس کو گوارا نہیں کرتے اور میرے لئے گوارہ کرتے ہو کہ میں مال مسلین میں سے چرا کر تمہیں دے دوں۔ یہ کہہ کر نیچے اترے اور غلام سے فرمایا۔ لوہے کی ایک سلاخ گرم کرکے لا۔ جب وہ لایا تو آپ نے عقیل کا ہاتھ پکڑ کر وہ سُرخ لوہا اس پر رکھ دیا۔ انہوں نے کہا آپ یہ کیا کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ مجھے جلادیا۔ فرمایا کیوں عقیل تم تو اس دنیا کی آگ کی تاب نہ لاسکے اور مجھے جہنم کے شعلوں میں پھینکنا چاہتے ہو۔

یہ تھا امیرالمومنینؑ کا عدل، ایسے ہی لوگوں کی ہدایت کا اثر دوسرے لے سکتے ہیں۔ نہ ان لوگوں کی جو مال غیر کو اس طرح کھا رہے ہوں جیسے بھوکا اونٹ فصل ربیع میں نرم ونازک گھاس کو لپ لپ کھاتا ہے۔

کیا ایسے عدل کی مثالیں اہل بیت کے سوا کہیں اور بھی ملتی ہیں ؟

اب تھوڑا سا حال امیرالمومنین کے احسان کا بھی سُن لیجئے۔

احسان کی خوبی یہ ہے کہ اسے ضائع ہونے سے بچایا جائے۔ خداوند عالم فرماتا ہے۔

لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِكُمۡ بِالۡمَنِّ وَالۡاَذٰى (سورہ البقرہ ۲/۲۶۴) (اپنے صدقات کو احسان اور ایذا رسانی سے برباد نہ کرو۔ یعنی نیکی کے بعد احسان رکھ کر اور طعنہ زنی کرکے اس کو ضائع نہ کرو۔) احسان کرنے والے تو بہت سے ہیں مگر اس طرح لوجہ اللہ احسان کرنے والے نہ کسی سے بدلے کے خواہشمند ہوں اور نہ شکرگزاری کے بہت ہی کم لوگ ہیں۔ یہ اہل بیت علیہم السلام ہی تھے کہ جب احسان کرتے تو یہ بھی کہہ دیتے لَا نُرِیۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا (سورہ الدہر ۷۶/۹) (ہم نہ بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ) اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ (سورہ الدہر ۷۶/۹) (ہم تو خوشنودی خدا کے لئے تمہیں کھانا بھی دیتے ہیں)

امیرالمومنین علیہ السلام اپنی خلافت کے زمانہ میں اسی طرح خیرات کرتے تھے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ کون دے گیا پردۂ شب میں خُرمے اور روٹیوں کے تھیلے پشت پر رکھ کر نکلتے تھے اور یتیموں اور بیواؤں اور محتاجوں کو آواز دے کر پسِ در سے دے دیتے تھے۔ یہ پتہ اس وقت ان غریبوں کو چلا جب امیرالمومنین علیہ السلام ۱۹ رمضان کو زخمی ہوئے۔ چنانچہ جب حضرت کا پتہ چلا تو بے شمار عورتیں اور یتیم بچے وَا اَبَتَاهُ وَا اَبَتَاهُ کے نعرے مارتی ہوئی جنازے کے ساتھ ہوئیں۔

کسی نے آپؑ سے پوچھا کیا وجہ ہے کہ آپ اکثر فاقے ہی سے رہتے ہیں۔ فرمایا كَيۡفَ اَشۡبَعُ وَحَوۡلِىۡ بُطُوۡنٌ غَرۡثٰى۔ میں کیونکر شکم سیر ہو کر کھاؤں درانحالیکہ میرے گرد کچھ لوگ بھوک سے تلملا رہے ہوں۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے احسانات سے اسلام کی گردن خم ہے کس کی طاقت ہے کہ ان کو بیان کرسکے۔

ایک مرتبہ امیرالمومنین علیہ السلام کے گھر میں فاقہ تھا آپ تلاش معاش میں نکلے۔ ایک یہودی کے باغ کو پانی دے کر کچھ خرمے حاصل کئے۔ ان کو لے کر چلے راستے میں سلمان رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ اس طرح چلے آرہے ہیں کہ چہرہ اُداس ہے اور کمزوری سے قدم ڈالتے کہیں

ہیں اور پڑتا کہیں ہے۔ سمجھ گئے سلمان کئی وقت کے فاقے سے ہیں۔ آپ نے فرمایا سلمانؓ میں نے فلاں باغ کو پانی دیا اور وہاں سے تازہ تازہ خرمے حاصل کئے ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ اس میں سے تمہیں بھی کھلاؤں۔ سلمان سمجھ گئے کہ گھر میں کئی روز کا فاقہ ہے جب ہی امیرالمومنینؑ مزدوری کو نکلے ہیں کہنے لگے مجھ سے زیادہ آپ کے بچے ان کے مستحق ہیں۔ آپ نے فرمایا سلمان اس کی پروانہ کرو۔ اور میری خواہش کو پورا کرو۔ عرض کی لائیے مجھے دے دیجئے۔ امیرالمومنینؑ سمجھ گئے کہ یہ مجھ سے لے کر سیدہ عالمؑ کو جاکر دے دیں گے اور خود بھوکے رہیں گے۔ فرمایا سلمان آج میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے ہاتھ سے تم کو کھلاؤں تاکہ میرا اجر زیادہ ہو۔ آپ نے وہ تمام خرمے بڑی خندہ پیشانی سے ان کو کھلادیئے۔

جب گھر میں آئے تو جناب سیدہ نے دریافت کیا یا علیؑ آج کچھ کام اُجرت پر نہیں ملا۔ آپ نے سارا حال بیان کیا۔ جناب سیدہؑ کے چہرہ پر بشاشت کے آثار نمودار ہوئے۔ حضرت رسول خداؐ پر وحی ہوئی کہ اپنے اہل بیت کو یہ آیت جاکر سنادو یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورہ الحشر ۵۹/۹) ایسے نیکی کرنے والے دنیا میں کہاں ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام اپنی حکومت کے زمانے میں بازار کوفہ کی طرف سے گزر رہے ہیں کہ ایک ضعیفہ کو دیکھا کہ ایک گٹھری لئے چلی آرہی ہے مگر بوجھ زیادہ ہے اس لئے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بیٹھ جاتی ہے۔ آپ نے اس سے کہا لا یہ تیرا بوجھ میں تیرے گھر پہنچا دوں۔ وہ حضرت کو پہچانتی نہ تھی سمجھی کوئی مزدور ہے۔ کہنے لگی اے شخص میرے پاس مزدوری دینے کو کچھ نہیں۔ فرمایا پروانہ کر مجھے مزدوری کی ضرورت نہیں، وہ راضی ہوگئی اور دعائیں دینے لگی۔ آپ نے اس کے سامان کو گھر پہنچا دیا اور فرمایا اگر کوئی اور خدمت ہو تو بجالاؤں۔ اس نے کہا میں بیوہ ہوں۔ چند یتیم بچے رکھتی ہوں آج وہ فاقے سے ہیں میں یہ سامان لے کر آئی ہوں، تاکہ ان کو کھانا پکاکر کھلاؤں اگر ہوسکے تو تھوڑی دیر ان بچوں کو بہلا دے تاکہ میں جلدی سے کھانا تیار کرلوں۔ آپ نے بخوشی یہ خدمت قبول کی اور اس کے بچوں کو اس پیار سے تادیر بہلاتے رہے جیسے باپ اپنے بچوں کو بہلاتا ہے۔ جب وہ کھانا پکا چکی تو آپ نے اس سے اجازت چاہی۔ اس نے دعائیں دیں اور شکریہ ادا کیا۔ آپ نے فرمایا شکریہ کی ضرورت نہیں۔ جب گھر سے باہر نکلے تو اس عورت کی پڑوسن جو امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمات کو دیکھ رہی تھی دوڑی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔ اری تو ان کو نہیں پہچانتی یہ امیرالمومنین علیہ السلام ہیں۔ وہ روتی ہوئی آئی اور حضرت کے قدموں پر گر کر کہنے لگی۔ امیرالمومنین آپ مجھے معاف فرمادیں کہ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ اور آپ سے میں نے یہ خدمت لی۔ آپ روئے اور فرمایا اے ضعیفہ خدا سے دعا کر کہ وہ علیؑ کی اس خطا کو بخش دے کہ اس کی سلطنت میں یتیم بچے بھوکے پیاسے سوئے اس کے بعد آپ نے اس کا روزینہ معین فرمادیا۔ اور آپ کا یہ معمول رہا کہ روز رات کو اس کے لئے کھانا لے کر آتے۔

افسوس صد افسوس جو خاندان ایسا غریب پرور ایسا یتیم نواز تھا ایک دن اس کے یتیم بچوں پر کوئی ترس کھانے والا نہ تھا۔

سکینہؑ بنت الحسینؑ اسی خاندان کی چار سالہ بچی تھی جس نے یتیم ہونے کے بعد کون سی آفت تھی جو نہ دیکھی کون سا ظلم تھا جو نہ اُٹھایا جھڑکیاں کھائیں طمانچے کھائے۔ ظالموں نے کان چیر کر گوشوارے اُتارے۔

مروی ہے کہ جب فوج اشقیا سیدانیوں کو گرفتار کرکے کربلا سے کوفہ کو روانہ ہوئی تو ظالموں نے ان مصیبت زدہ بی بیوں کو ایسے

اُونٹوں پر بٹھایا جن پر نہ ہودج تھا نہ عماری۔ قدم قدم پر بی بیوں کے گر جانے کا اندیشہ تھا پھر ستم بالائے ستم یہ کہ پہنچنے کی جلدی میں اور انجام پانے کے شوق میں اُونٹوں کو جلدی جلدی چلا رہے تھے۔ جناب سکینہؑ جناب زینبؑ کے پاس بیٹھی تھیں کہ یکایک بے قابو ہو کر گر پڑیں اوّل تو چار برس کی بچی۔ پھر تین دن کی بھوکی پیاسی۔ باپ اور کنبہ سے چھوٹی ہوئی کربلا کا ردح فرسا منظر دیکھے ہوئے غش پر غش چلے آرہے تھے۔ پھر اونٹوں کی تیز رفتاری نہ گرتی تو کیا ہوتا۔ سکینہؑ کا اونٹ سے گرنا تھا کہ سیدانیوں نے شور مچایا ظالمو! اونٹوں کو روکو ہماری بچی گر پڑی ہے۔ مگر ان پتھروں کو کیا جونک لگتی۔ ان ظالموں کے دل میں کیا تڑپ پیدا ہوتی، برابر اونٹوں کو دوڑاتے چلے گئے بی بیوں نے چاہا کہ اپنے کو اُوپر سے گرا دیں، لیکن امام زین العابدینؑ نے روکا۔ سر حسینؑ خولی کے نیزہ پر تھا نیزہ اس کے ہاتھ سے گر کر زمین پر گر گیا ہر چند اس نے زور مارا لیکن جگہ سے نہ ہلا شمر تازیانہ لے کر امام زین العابدینؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا اپنے باپ سے پوچھو کہ کیوں نہیں چلتے۔ فرمایا او ظالم کیسے چلیں میری بہن اونٹ سے گر گئی ہے۔ اس شقی نے کہا اچھا آؤ اسے ڈھونڈھ کر لاؤ۔

جناب زینبؑ نے کہا او ظالم سید سجادؑ بیمار ہیں ان میں اتنی طاقت کہاں کہ جائیں اور بچی کو تلاش کر کے لائیں۔ اونٹ کو بٹھا دے تاکہ میں پتہ لگاؤں۔ الغرض اونٹ بٹھایا گیا اور جناب زینبؑ وام کلثوم اس پر سے اُتریں اور اس دشت سنسان میں جا کر جا بجا ریت کے ٹیلے تھے آواز دیتی پھر رہی تھیں سکینہ بی بی جہاں کہیں ہو اپنی آواز سناؤ۔ آخر ایک طرف کو جو گئیں تو دیکھا ایک بی بی برقعہ پوش سکینہ کو لئے بیٹھی ہیں۔ جناب زینبؑ نے کہا بی بی! تم نے بڑا احسان کیا ہے کہ میری بچی کو ہلاکت و پریشانی سے بچا لیا تم کون ہو ان بی بی نے نقاب چہرے سے ہٹا کر کہا۔ زینبؑ! تم نے مجھے نہ پہچانا میں تیری ماں فاطمہ ہوں۔ آہ ظالموں نے مجھے قبر میں بھی آرام سے نہ رہنے دیا۔ عزادارو! اس وقت جناب زینبؑ کا کیا حال ہوا ہو گا ضرور کہا ہو گا اماں ہمارا گھر لُٹ گیا آپ کا پھلا پھولا باغ کٹ گیا آہ! میں نے پیارے بھائی حسینؑ کو اپنی آنکھوں کے سامنے ذبح ہوتے دیکھا ہے۔ امّاں ہم پر بڑی بڑی مصیبتیں گزر گئیں۔ آہ! پوری داستان کہنے بھی نہ پائی تھیں کہ شمر نے غُل مچانا شروع کر دیا جلدی چلو ورنہ قافلہ روانہ ہوتا ہے۔ جناب سکینہؑ کو گود میں لے کر قافلہ سے آملیں

منقول ہے کہ جناب سیّدہؑ جب سے یہ قافلہ مدینہ سے چلا تھا اس کے ساتھ تھیں جب کربلا میں یہ قافلہ پہنچا اور ریتی پر یہ خیام نصب ہوئے تو جناب زینبؑ نے امام حسینؑ سے کہا بھیّا میں کئی راتوں سے ایک بی بی کے رونے کی آواز سنتی ہوں۔ معلوم نہیں کہ یہ کس مصیبت زدہ کی آواز ہے۔ فرمایا بہن تم نے پہچانا نہیں یہ ہماری مادر گرامی ہیں۔ میں نے کل رات خواب میں با حال پریشان اماں جان کو دیکھا ہے ہماری اس مصیبت میں چین کہاں یقیناً وہ ہمارے ساتھ ساتھ ہیں۔

یہ بھی منقول ہے کہ بعد شہادت امام حسینؑ جب خولی ملعون نے بالی سکینہؑ کے کان چیر کر گوشوارے لئے تو وہ بچی زمین پر گر پڑی تمام کرتا خون آلود ہو گیا اور واابتاہ واابتاہ کے نعرے مارنے لگی۔ اس ظالم کو کیا رحم آتا۔ جب یہ قافلہ کوفہ پہنچا تو خولی وہ گوشوارے لے کر اپنے گھر آیا۔ رات زیادہ ہو گئی تھی اس خیال سے تکیہ کے نیچے رکھ کر سو گیا کہ کل صبح اپنی بی بی کو پہناؤں گا۔ رات کو اس کی بی بی نے خواب میں دیکھا کہ ایک نورانی تخت اس کے گھر میں اُترا ایک بی بی سیاہ لباس پہنے ایک چھوٹی سی بچی کو گود میں لئے بیٹھی تھی اور زار زار رو رہی ہیں۔ اس زن مومنہ نے یہ حال دیکھ کر پوچھا بی بی آپ کون ہیں، اور اس بچی کے کانوں سے خون

کیوں بہہ رہا ہے۔ اس کا کرتہ خون آلودہ کیوں ہے۔ فرمایا آہ میں محمد مصطفیٰ کی بیٹی فاطمہؑ ہوں، اور یہ میری پوتی سکینہؑ ہے کربلا میں تیرے شوہر نے اس کے کان چیر کر گوشوارے اُتارے اور اب اس کوئے کر گھر میں آیا ہے تاکہ صبح اپنی بیٹی کو پہنائے۔ آہ! اولادِ رسولؐ کے کان چیر چیر کر زیور اُتارا جائے۔ اور میرے باپ کے اُمتی وہ زیور اپنی اولاد کو پہنائیں۔ یہ خواب دیکھ کر وہ زن مومنہ بیدار ہوئی اور خولی کے پاس آکر زور سے اسے جھنجھوڑا اور کہنے لگی۔ ظالم کیا سو رہا ہے بیدار ہو اور مجھے بتا تو کربلا سے کیا لایا ہے۔ بتا تو نے کس بچی کے کان چیرے ہیں۔ خولی مبہوت سا ہو گیا۔ اس نے کہا تجھے اس سے کیا غرض کہ کیا کیا ہے۔ میں یہ گوشوارے بنت الحسینؑ کے کانوں سے اُتار کر لایا ہوں۔ کل صبح یہ میں اپنی بیٹی کو پہناؤں گا۔ اس نے کہا خدا کرے تجھے صبح نصیب ہی نہ ہو اور مر جائے۔ وہ بیٹی جوان گوشواروں کو پہنے۔ او شقی اب میرا اور تیرا سر کبھی ایک تکیئے پر جمع نہ ہو گا اور میں اب تیرے گھر میں ہرگز نہ رہوں گی آہ! میں نے اپنی بی بی فاطمہؑ کو تباہ حال دیکھا ہے اور اس بچی کو بھی جس کے گوشوارے تو لایا ہے۔ یہ کہہ کر وہ زن مومنہ اس گھر سے باہر نکل گئی۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

نویں مجلس

موسیٰ علیہ السلام اور حضرت رسولِ خداؐ کے واقعات میں مساواتی صورت و شہادت حضرت مسلمؑ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیۡ کِتَابِہِ الۡمَجِیۡدِ وَفُرۡقَانِہِ الۡحَمِیۡدِ

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۙ۬ شَاھِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا (سورہ المزمل ۷۳/۱۵)

(ہم نے تمہاری طرف ایک گواہ تم پر اس لئے بھیجا ہے۔ جیسے ہم نے فرعون کی طرف اپنے ایک رسولؑ کو بھیجا تھا)

چونکہ جناب موسیٰؑ اور حضرت رسولؐ خدا کے واقعات زندگی بہت کچھ ملتے جلتے ہیں لہذا یہ تشبیہ دی گئی ہے حضرت نے خود کو بھی فرمایا ہے کہ جو کچھ پہلے اُمتوں میں ہو چکا ہے وہ سب میری اُمت میں اسی طرح ہوگا جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے سے مشابہ ہوتا ہے۔

جناب موسیٰؑ کی ولادت ایک ایسے زمانہ میں ہوئی جب کہ قوم میں خدا پرستی کی بجائے عبد پرستی یعنی فرعون کو خدا مانا جاتا تھا۔ حضورؐ بھی ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے جہاں بجائے خدا کے بت پوجے جاتے تھے۔

جناب موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے ہی کاہنوں اور نجومیوں نے فرعون کو یہ خبر دے دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ

ایسا پیدا ہونے والا ہے۔ جو تیری خدائی کو باطل کر دے گا۔ اسی طرح آنحضرتؐ کی پیدائش سے پہلے۔ یہودیوں اور بُت پرست نجومیوں اور کاہنوں نے خبر دی تھی کہ بنی ہاشم میں ایک بچہ ایسا پیدا ہونے والا ہے جو بت پرستی کا قلع قمع کرے گا، اور اس کا دین ادیان سابقہ کا ناسخ ہوگا۔ پس جس طرح فرعون اس کا جویا تھا کہ موسیٰ کا پتہ چل جائے تو قتل کر ڈالے۔ اسی طرح قریش بھی بچپن ہی میں حضرت کے وجود سے دُنیا ہی کو خالی کر دینا چاہتے تھے جس طرح قدرت نے دشمنوں کے شر سے وہاں جناب موسیٰ کو بچایا یہاں حضورؐ کو بچایا۔

حضرت موسیٰؑ سے تین شخصوں کی سرکشی سب سے زیادہ تھی۔ فرعون، ہامان اور قارون۔ حضورؐ کے زمانے میں بھی تین ہی سرکشوں کے سردار تھے۔ ابو جہل، ابو لہب اور ابو سفیان۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ اور کافر تھے اور یہ کافر گر تھے۔

موسیٰ علیہ السلام نے مصر سے مدین کی طرف ہجرت کی اور حضرت نے مکہ سے مدینہ کی طرف۔ مدین میں جس طرح خدمت و جان نثاری کے صلے میں حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰؑ کو اپنا داماد بنایا۔ اسی طرح حضرت علیؑ کو رسولؐ خدا نے اپنا داماد بنایا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جناب موسیٰ کو اپنا عصا دیا جس سے جناب موسیٰؑ کے کفار کے مقابل فتح حاصل کی۔ حضرت رسولؐ خدا نے اپنے داماد کو تلوار دی جس سے علیؑ نے مشرکین کے مقابل فتح حاصل کی۔

حضرت موسیٰ کو وادی ایمن میں نبوت ملی۔ حضورؐ کو وادی حِرا میں۔ حضرت موسیٰ نے وادی ایمن میں ایک درخت سے آگ نکلتے دیکھی۔ حضورؐ نے غارِ حرا کو نور سے منور پایا۔

جناب موسیٰؑ نے نبوت ملنے پر خدا سے درخواست کی قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿۲۶﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿۲۸﴾ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ﴿۲۹﴾ هَارُونَ أَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ﴿۳۱﴾ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ﴿۳۲﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ﴿۳۳﴾ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ﴿۳۴﴾ (سورہ طہٰ ۲۰/۲۵) پالنے والے میرے سینے کو کشادہ کر دے۔ میرے امر کو آسان کر دے، زبان کی بستگی کو کھول دے۔ تاکہ لوگ میری بات کو سمجھیں۔ اور میرا ایک، وزیر میرے اہل سے میرے بھائی ہارون کو قرار دے اس سے میری کمر کو مضبوط کر دے، اور میرے امر نبوت میں اس کو شریک کر دے تاکہ ہم تیری بکثرت تسبیح کریں اور بکثرت تیرا ذکر کریں۔

خدا نے ان کی دُعا قبول کی اور یہ مژدہ سُنایا قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ (سورہ القصص ۲۸/۳۵) ہم عنقریب تمہارے بھائی سے تمہارا بازو مضبوط کر دیں گے) اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دُعا کی خداوندا! جس طرح میرے بھائی موسیٰؑ نے دُعا کی تھی میں بھی دُعا کرتا ہوں کہ میرے اہل سے میرے بھائی علیؑ کو میرا وزیر بنا دے۔ خدا نے حضورؐ کی دُعا قبول فرمائی اور علیؑ کو آپ کا جانشین بنا دیا۔

جناب موسیٰؑ نے شرح صدر کی درخواست کی تب شرح صدر ہوا لیکن حضورؐ کا شرح صدر بغیر درخواست کے ہوا أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔ (سورہ الم نشرح ۹۴/۱) (کیا ہم نے تمہارا سینہ نہیں کھول دیا) جناب موسیٰؑ نے امر نبوت کی آسانی کے لئے وزیر مانگا تھا حضورؐ سے خود خدا نے فرمایا وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ﴿۲﴾ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ (سورہ الم نشرح ۹۴/۲و۳) ہم نے تیرے اس بوجھ کو جس سے تیری کمر ٹوٹی جاتی تھی اس سے بچا لیا) وزیر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ

وِزْرَ کا اُٹھانے والا ہوتا ہے۔

جناب موسیٰؑ نے اپنا وزیر اپنی اہل میں سے مانگا۔ خدا نے حضورؐ کو بھی وزیر ان کی اہل ہی میں سے دیا۔ جناب موسیٰؑ نے ہارون کو شریک نبوت بنانے کی درخواست کی تھی۔ خدا نے امر رسالت میں علیؑ کو شریک قرار دیا۔ ثبوت یہ ہے کہ رسولؐ کو حکم تھا۔ یَآاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ (سورہ التحریم ۹/۶۶) (کفار و منافقین سے لڑو) اس حکم کی تعمیل بادشاہ اور وزیر دونوں نے کی۔ حضورؐ نے کفار سے جہاد کیا اور حضرت علیؑ نے منافقین سے۔ فرعون کے مقابلہ میں موسیٰؑ و ہارونؑ دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ کفار و مشرکین کے مقابلے میں نبی و علیؑ دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

ساحرانِ فرعون کے مقابلے کو جب موسیٰؑ نکلے تو ہارونؑ ساتھ تھے۔ دونوں نے ان پر فتح پائی اور ایمان لے آئے جب حضرت رسولؐ خدا مباہلہ کو نکلے تو آپ کے ساتھ علیؑ تھے دونوں نے نصارائے نجران کے مقابل فتح پائی اور اس کے دو سردار سیّد و عاقب ایمان لے آئے

موسیٰ علیہ السلام نے اوّل امر ہی میں وزیر کی خواہش کی۔ حضورؐ نے بھی بعثت کے آغاز ہی میں دعوت ذوالعشیرہ کے موقع پر وزیر بننے کی کنبہ سے خواہش کی اور جب علیؑ نے اپنے کو پیش کیا تو آپ نے ان کو وزیر بنا لیا۔

جناب موسیٰ کی قوم جہالت و ضلالت کی تیرگی میں لپٹی ہوئی تھی حضورؐ کی قوم بھی جہالت و ضلالت میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی حضرت موسیٰ کے متعلق خدا فرماتا ہے (الاعراف ۱۳) ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا (سورہ الاعراف ۷/۱۰۲) (پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے گروہ کی طرف اپنی آیات دے کر بھیجا ان لوگوں نے ان معجزات کے ساتھ بڑی بڑی شرارتیں کیں۔) اسی طرح مشرکوں نے حضرت رسولؐ خدا سے شرارتیں کیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو آیتیں دے کر بھیجا گیا تھا ایک عصا دوسرے ید بیضا جس پر فرعون اور اس کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام کو ساحر قرار دیا۔ اسی طرح جب حضورؐ نے اپنا معجزہ یعنی قرآن سنانے کے لئے لوگوں کے سامنے آئے تو انہوں نے بھی حضور نبی اکرمؐ کو ساحر اور مجنون کہا۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے مقابلہ کرنے کے لئے ملک کے بڑے بڑے باکمال ساحروں کو بلایا۔ کفار مکّہ نے قرآن کے اس دعوے کو باطل کرنے کے لئے کہ اس کی مثل ایک سورت ہی لے آؤ۔ عرب کے بڑے بڑے فصحا و بلغا کو بلایا جس طرح ساحرِ فرعون مقابلے میں ناکام رہے۔ فصحائے عرب قرآن کے مقابلے میں ناکام رہے۔ وہاں پر ساحروں کو موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کا اقرار کرنا پڑا۔ یہاں فصحائے عرب کو یہ کہنا پڑا۔ مَا هٰذَا کَلَامُ الْبَشَرِ (یہ بشر کا کلام نہیں)

خدا فرماتا ہے فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ (سورہ الاعراف ۷/۱۰۲) (دیکھو ان فسادیوں یعنی فرعون اور اس کے ساتھیوں کا انجام کیا ہوا یعنی ان کی مٹی کیسے پلید ہوئی۔ اسی طرح مشرکینِ عرب کو آنحضرتؐ کے مقابل کیسی شکست فاش اٹھانا پڑی اور خاکِ مذلت پر ان کی ناکیں کس طرح رگڑی گئیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے جاکر کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ مجھ پر واجب ہے کہ خدا پر سچ کے سوا (ایک حرف بھی جھوٹ) نہ کہوں میں تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے واضح اور روشن معجزہ لے کر آیا ہوں۔ اسی طرح حضورؐ نے اپنی قوم کو بُلا کر فرمایا جن میں ابوجہل مثیل فرعون بھی شامل تھا۔ میں خدا کا رسولؐ ہوں جو کچھ کہہ رہا ہوں خدا کی طرف سے کہہ رہا ہوں تم نے مجھے کبھی جھوٹ بولتے نہ پایا ہوگا۔ میں اس کے ثبوت میں کہ خدا کا رسولؐ ہوں بطور معجزہ قرآن لے کر آیا ہوں۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا تھا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔ اور اُن کے ستانے سے ہاتھ اُٹھا حضورؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی ایذا رسانی سے باز رہو۔

جو ساحر جناب موسیٰ علیہ السلام کے رَب پر ایمان لے آئے تھے فرعون نے ان کو سخت سے سخت ایذائیں دیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے اور سولی دینے کی دھمکی دی۔ مگر وہ اپنے ایمان پر قائم رہے یہاں تک کہ ان سب کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی دی گئی۔ اسی طرح مشرکین مکہ نے دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو کون سی اذیت تھی جو نہ دی۔ ان کو تپتی زمین پر لٹا کر پتھر کی بھاری سِل سینے پر رکھی۔ جناب یاسر اور ان کی بیوی کو نیزے مار مار کر ہلاک کیا گیا۔ ان کو بیڑیوں میں جکڑا گیا۔ ان کو جلا وطنی پر مجبور کیا گیا مگر وہ ایسے ایمان کے پکے تھے کہ کسی حالت میں بھی اسلام کو نہ چھوڑا۔ بنی اسرائیل کے بچوں کو قوم فرعون سے ذبح کرایا گیا اور ان کی عورتوں کو قید میں رکھا گیا۔ حضورؐ کی اُمت نے بنی ہاشم کے مردوں اور بچوں کو قتل کیا اور ان کی عورتوں کو قید کیا۔

فرعون اور اس کے گروہ کے تمام لوگ دریائے نیل میں غرق ہو کر ہلاک ہوئے۔ مشرکین و کفار کو تلوار کے گھاٹ اُتارا گیا وہ خون کے دریا میں غرق ہوئے۔

فرعون نے جس قوم کو کمزور بنایا تھا۔ خدا نے اسی قوم کو بعد میں برسر اقتدار کیا۔ اسی طرح کفار قریش نے جن لوگوں کو طرح طرح سے ستایا تھا جلاوطن کیا تھا۔ خدا نے کچھ دن بعد تمام عرب کا ان ہی کو مالک بنایا۔

موسیٰ علیہ السلام کی غیبت اپنی قوم سے چالیس روز رہی۔ آنحضرتؐ تین روز غار حرا میں پوشیدہ رہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم پر حضرت ہارونؑ کو جانشین بنایا تھا اور حضورؐ نے علی مرتضیٰؑ کو اپنا قائم مقام شب ہجرت اور جنگ تبوک کے موقعہ پر بنایا اور جب دُنیا سے جانے لگے تو حضرت علیؑ ہی کو اپنا جانشین بنا کر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام طور پر یہ کہہ کر گئے۔ اُخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ (سورہ الاعراف ۷/۱۴۲) (میری قائم مقامی میری قوم میں کرو۔ ان کی اصلاح کرنا اور فساد کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا) آنحضرتؐ نے بھی علی علیہ السلام کو یہی وصیت کی کہ جب میرے بعد فتنے برپا ہوں تو تمہاری نظر قوم پر رہے۔ فسادیوں کی پیروی نہ کرنا۔ چنانچہ جس طرح جناب ہارون نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ حضرت علیؑ نے بھی انتہائی صبر و ضبط کر دکھایا جب سقیفہ میں جُھک گیا تو حضرت علیؑ سے ابوسفیان نے آکر کہا۔ آپ اپنی بیعت لیجئے۔ اور دعویداران خلافت سے لڑیئے۔ میں مدینہ کے تمام میدان فوجوں سے بھر دوں گا۔ چونکہ اس کی نیت میں فساد تھا۔ آپ نے جھڑک کر کہا تو نے حالت کُفر میں بھی فتنہ پردازی کی اور اب اسلام میں بھی تفرقہ ڈالنا چاہتا ہے۔ مجھے تیری مدد کی ضرورت نہیں۔ آپ نے اپنے حقوق سے دستبرداری اختیار کی۔ مگر وصیت رسولؐ

کو بھلایا نہیں۔ دوسرا ہوتا تو خون کی ندیاں بہا دیتا اور اپنا حق دوسروں سے لے کر رہتا چاہے اسلام تباہ ہوتا یا رہتا۔

جناب موسیٰ علیہ السلام نے طور پر جانے کے لئے ستر آدمی چنے اور ان کے ایمان پر بھروسہ کر کے اپنے ساتھ طور پر لے گئے وہاں جاکر انہوں نے کہا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (سورہ البقرہ ۲/۵۵) (ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ آپ خدا کو ظاہر بظاہر نہ دکھادیں) یہ نبی کا انتخاب تھا جو غلط ثابت ہوا۔ عام لوگوں کے انتخاب پر ایسی حالت میں کیا اعتماد ہو سکتا ہے۔ دل کا حال تو سوائے خدا کے کوئی جانتا ہی نہیں۔ یہ جناب موسیٰ تھے جن کے ساتھی اپنے ایمان کا دم توڑ بیٹھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مباہلے کے لئے جن چار کو تجویز کیا تھا انہوں نے کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہ کہا جو ایمان کی کمزوری کی دلیل قرار پاتا۔ امام حسین علیہ السلام نے ستر اصحاب کا انتخاب قتل ہونے کے لئے کیا تھا۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی مخالفت نہ کی اور بڑی خوشی سے اپنی جانیں دیں۔ کتنا عظیم فرق ہے انتخاب موسیٰؑ اور انتخاب امام حسینؑ میں۔

جب حضرت موسیٰؑ نے دعا کی قَالَ رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ (سورہ الاعراف ۷/۱۴۳) تو خدا نے فرمایا قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ (سورہ الاعراف ۷/۱۴۳) (تم ہرگز مجھے نہ دیکھو گے لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ (تجلی چمکانے کے بعد) قائم رہ جائے تو تم عنقریب مجھے بھی دیکھ لو گے۔ لیکن جب خدا نے پہاڑ پر تجلی ڈالی تو اس کو چکنا چور کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام غش ہو کر گر پڑے اور قوم مرگئی۔

اس قسم کی بہت سی خواہشیں کفار قریش نے حضورؐ سے کیں۔ لیکن آپ نے ان سے مرعوب ہو کر کبھی غیر ضروری سوال خدا سے نہ کیا مگر موسیٰ علیہ السلام باوجود یہ جاننے کے کہ خدا قابل رویت نہیں قوم سے مجبور ہو کر یہ سوال کر بیٹھے۔

بجلی ایک تھی اثر مختلف جیسا جس کا ظرف تھا اس پر ویسا ہی اثر ظاہر ہوا۔ پہاڑ جل گیا قوم مرگئی اور موسیٰ علیہ السلام غش کھا گئے۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کی نظر تھی کہ خدائی مخلوق کے جلوے کی تاب نہ لا سکی اور بے ہوش ہو گئے اور یہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر تھی کہ قاب قوسین اوادنیٰ پر پہنچ کر جب سرادق عظمت وجلال پر نظر پڑی مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى آنکھ ذرا نہیں جھپکی دل ذرا نہیں گھبرایا کتنا فرق ہے کلیم اللہ اور حبیب اللہ میں۔ موسیٰ علیہ السلام کی معراج طور پر ہوئی اور حضرت محمد مصطفےٰ کی معراج قاب قوسین تک ہوئی غور کیجئے جس طور پر جو واقعہ ہوا اس کو آگے چل کر بیان کون کرے۔ طور جلا پڑا ہے قوم ہلاک ہے اور موسیٰ غش میں پڑے ہیں۔ راز اپنے مقام پر سربستہ راز ہی رہا۔ کچھ بات چیت نہ ہوئی لیکن حضور نبی اکرمؐ اپنے ہوش میں رہے خدا کی وحی سنی اور یاد رکھی۔ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى۔ یہ راز کی باتیں اپنے راز دار ولی عہد سے بھی بیان کر دیں۔

ہوش آیا تو جناب موسیٰ علیہ السلام نے کہا قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ۝ (سورہ الاعراف ۷/۱۴۳) تو یہ بھی اس بات کی دلیل تھی کہ میں نے غلط درخواست کیوں کی۔ اظہار تھا اس بات کا کہ اس قوم میں سب سے پہلے ایمان لانے والا میں ہوں۔ یہ ایمان کا اعلان تھا ایک عظیم الشان واقعہ کے بعد۔ اور آنحضرت صلعم سے جب کسی نے پوچھا کہ آپ افضل الانبیاء کیوں ہیں تو فرمایا میں یوم الست میں سب سے پہلے ایمان لانے والا تھا۔ ان دونوں ایمانوں میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو چکا تو خدا نے فرمایا قَالَ یٰمُوْسٰۤى اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِكَلَامِیْ ﳲ فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ

وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (سورہ الاعراف ۱۴۴/۷) موسیٰؑ میں نے تم کو اپنے لئے چن لیا تاکہ تم لوگوں کو میرے پیغام اور میرے کلام پہنچاؤ اور جو کچھ (توریت) میں نے تم کو دیا ہے اس کو لو اور شکر گزاروں میں سے ہو جاؤ۔) موسیٰ کا انتخاب پہلے فرعون کی طرف جانے کے لئے ہوا تھا۔ واقعہ طور کے بعد عام لوگوں کو پیغام پہنچانے کے لئے ہوا۔ اور اسی وقت کتاب دی گئی۔ یہ رسالت کی ایک محدود صورت تھی جس کا دائرہ صرف بنی اسرائیل تک محدود تھا لیکن محمد مصطفےٰ کا اصطفا تو اس وقت ہوا۔ جب کہ وہ عالم نور میں تھے۔ نیز یہ کہ وہ آپ کو کافۃ الناس کی طرف خواہ کسی زمانہ میں ہوں بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا اور وجود مادی میں آنے سے پہلے ہی ان کو تعلیم قرآن دے دی۔

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (سورہ الرحمٰن ۴/۳/۲/۱ ۵۵/) رحمٰن ہے وہ جس نے پہلے تعلیم قرآن دی۔ پھر ایک خاص انسان کو پیدا کیا اور خلقت کے بعد بیان کی تعلیم دی۔ پس علم قرآن وجود محمدی کے ساتھ عالم نور سے ہے۔ البتہ عالم ظہور میں اس کے بیان کی صورت بنائی گئی اور جبرئیل وقتاً فوقتاً اس کو بیان کرنے کے لئے لاتے رہے۔

جناب موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب ملی اس کے متعلق ارشاد ہے۔ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (سورہ الاعراف ۱۴۵/۷) (ہم نے الواح (توریت میں) ہر چیز از قسم نصیحت تفصیل وار لکھ دی ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ مواعظ کے متعلق توریت میں مفصل بیان تھا۔ لیکن قرآن میں ہر چیز موجود ہے دنیا سے متعلق ہو یا آخرت سے جزئی ہو یا کلی جیسا کہ فرماتا ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (سورہ الانعام ۵۹/۶) کوئی خشک و تر ایسا نہیں ہے جو کتاب مبین کے اندر نہیں ہے) پھر اس تحدی کے ساتھ ایک سورت تو ایسی لے آؤ۔ اور پھر اس زور کے ساتھ کہ اگر سب مل کر بھی یہ کوشش کریں تو اس کا جواب ممکن نہ ہو گا۔ بلکہ اس دعوے کے ساتھ کہ اگر تمام درخت قلم بن جائیں اور سات سمندر سیاہی بن جائیں تب بھی اللہ کے کلمات تمام نہ ہوں گے یعنی ان کا احصا کوئی کرنے والا نہ کر سکے گا۔ اور اس دعوے کے ساتھ اگر کوئی کتاب ایسی ہو سکتی ہے کہ اس سے پہاڑ چلائے جا سکیں زمین کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جا سکیں۔ مُردوں کو زندہ کیا جا سکے تو وہ یہی قرآن ہے۔ کتاب موسیٰؑ کو کتاب محمد مصطفےٰ اسے کیا نسبت۔ توریت کے احکام کچھ روز چل کر ختم ہو گئے۔ قرآن کے احکام قیامت تک جاری رہنے والے ہیں۔

جب جناب موسیٰؑ توریت لے کر آئے تو دیکھا قوم گمراہ ہو چکی ہے اور سامری نے اپنا شیشہ جادو مار کر ان کو بت پرست اور گوسالہ پرست بنا دیا ہے تو آپ کو غصہ آیا اور قوم سے فرمایا میرے جانے کے بعد تم نے بہت بری حرکت کی، تم اپنے پروردگار کے حکم (میرے آنے) میں کس قدر جلدی کر بیٹھے اور توریت کی تختیوں کو زمین پر پھینک دیا کیونکہ خدا کا نافرمان اپنی قوم کو آپے میں نہ رہے۔

یہی صورت حضورؐ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد پیش آئی۔ بنی اسرائیل سونے کے بچھڑے پر ریجھے امت محمدی زر پرستی کا شکار ہو کر ضلالت کے تاریک غار میں جا پڑی۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرح آنحضرتؐ بھی اپنی قوم سے روز قیامت مواخذہ کریں گے کہ میں نے اپنے بعد تمہاری ہدایت کے لئے دو چیزیں چھوڑی تھیں کتاب خدا اور اپنی عترت۔ بتاؤ تم نے ان دونوں کے ساتھ کیا

عمل کیا۔ بارگاہ باری میں عرض کریں گے وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (سورہ الفرقان ۲۵/۳۰) (خداوندا میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا یا بجو اس سمجھا) اور میری عترت کو قتل کیا۔

اس کے بعد جناب موسیٰ نے اپنے بھائی ہارونؑ کو سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اس پر جناب ہارون نے کہا میرے ماں جائے میں کیا کرتا قوم نے مجھے حقیر سمجھا بلکہ قریب تھا کہ مجھے مار ڈالیں۔ اگر میں ان سے لڑتا تو آپ کہتے کہ فرقت ہیں بنی اسرائیل (تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا) یہی صورت حضرت علی علیہ السلام کے لئے پیش آئی کہ ان کی قوم نے ان کو کمزور بنا دیا اور ان کے قتل کے درپے ہوئے ایسی صورت میں حضرت ہارونؑ کی طرح اگر حضرت علیؑ خاموش نہ رہتے تو کیا کرتے۔ لڑتے تو قوم میں تفرقہ پیدا ہو جاتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب بارہ اسباط تھے اور حضور نبی اکرمؐ کے نائب بارہ امامؑ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے پہاڑ سے بارہ چشمے پھوٹے جس سے ان کی قوم سیراب ہوئی اور حضور نبی اکرمؐ کے بارہ نائبوں سے علوم کے بے شمار چشمے پھوٹے۔ جن سے قیامت تک لوگ اپنی علمی پیاس بجھاتے رہیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اولاد نہ تھی۔ جناب ہارون کی اولاد ان کی اولاد کہلائی۔ تابوت سکینہ کے متعلق ہے کہ اس کے اندر بقیہ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ (سورہ البقرہ ۲/۲۴۸) وہ چیزیں تھیں (جو بطور تبرک) اولادِ موسیٰ و اولادِ ہارون نے چھوڑی تھیں۔

اسی طرح حضور نبی اکرمؐ کے اولاد ذکور میں سے کوئی نہ تھا اولاد علیؑ آپؐ کی اولاد کہلائی اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ حضرت ہارونؑ کے تین بیٹے تھے شبر و شبیر و مبشر۔ حضرت علیؑ کے تین فرزند تھے حسنؑ و حسینؑ و محسنؑ (جن کو شکم مادر میں شہید کر دیا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بی بی ان کے وصی جناب یوشع سے لڑیں۔ حضور کی ایک بی بی نے حضرت علیؑ سے جنگ کی۔ تابوت سکینہ بنی اسرائیل کے لئے باعث امان تھا جب تک وہ بنی اسرائیل کے پاس رہا وہ اطمینان کی زندگی بسر کرتے رہے جب جالوت اس کو اٹھا کر لے گیا تو طرح طرح کی بلائیں ان پر نازل ہوئیں۔ اسی طرح حضور کے اہل بیتؑ اہل زمین کے لئے باعثِ امن رہے

اَهْلُ بَيْتِيْ اَمَانٌ لِّاَهْلِ الْاَرْضِ كَمَا اَنَّ النُّجُوْمَ اَمَانٌ لِّاَهْلِ السَّمَاءِ۔

ایک تابوت بنی اسرائیل میں تھا جس کو ملائکہ اٹھاتے تھے۔ اس کو بستی بستی حصول برکت کے لئے گردش کرایا جاتا تھا اور لوگ اس کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ اسی لئے کہ اس میں تبرکات انبیاء اور اولاد انبیاء تھے اسی طرح ایک تابوت اس میں بھی ہے عشرہ محرم میں جو ہر بستی میں نکالا جاتا ہے اور لوگ اس کی تعظیم کرتے ہیں۔

جالوت اور اس کی قوم نے اس تابوت کی بے حرمتی کی نتیجے میں وہ قوم کی قوم تباہ ہوئی۔ یہاں بھی عزاداریٔ حسینؑ میں رکاوٹیں پیدا کرنے والے یہاں نہیں تو قیامت میں اس کی سزا ضرور بھگتیں گے۔

جب جناب موسیٰؑ عمالقہ سے لڑنے کے لئے بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر چلے۔ تو ان کی بستی کے قریب پہنچ کر بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام

سے کہا کہ یہ قوم بڑی طاقتور اور سرکش ہے۔ ہم میں اس سے لڑنے کی طاقت نہیں۔ جب یہ لوگ اس شہر سے نکل جائیں گے۔ تب البتہ ہم اس شہر میں داخل ہوں گے۔ ورنہ ہرگز نہیں۔ آپ اور آپ کا خُدا ان سے جاکر لڑیں ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ کالب اور یوشع نے جو مومنین کاملین سے تھے ان سے کہا ڈرو مت جس وقت ہم داخل ہوں گے انشاء اللہ وہ نکل جائیں گے مگر وہ ہٹی اور بزدل قوم کسی طرح نہ مانی۔ جناب موسیٰؑ نے مجبور ہوکر بارگاہ باری میں عرض کی قَالَ رَبِّ اِنِّي لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِي وَاَخِي (سورہ المائدہ ۵/۲۵) (خداوندا میں تو اپنے نفس کا اور اپنے بھائیؑ کے نفس کا ذمہ دار ہوں) یعنی جگہ جگہ ہے دگر دگر ہے میرا بھائیؑ تو کسی حالت میں میرا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ باقی کا میں ذمہ دار نہیں۔

ایسی ہی صورت جنگی معرکوں میں ہمارے رسولؐ کو پیش آئی خصوصاً اُحد میں کہ جو غیر تھے وہ حضرت سے جدا ہوگئے باوجودیکہ حضورؐ نے فتح کا یقین دلایا تھا لیکن جو بھائی اور خون شریک بھائی تھا اس نے کسی حالت میں ساتھ نہ چھوڑا۔

یوشع جناب موسیٰ کے چچازاد بھائی تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے ایک بار ان کو ایک سرکش قوم کے پاس پیغام بر بھیجنا چاہا۔ لوگوں نے ان کو روکنے کی کوشش کی۔ کیونکہ جان کا خطرہ تھا جناب یوشع نہ رکے اور موسیٰ علیہ السلام کے حکم کی تعمیل کر دی۔

اس وقت مجھے حضرت امام حسین علیہ السلام کا وہ چچازاد بھائی یاد آرہا ہے جس کا نام مسلم بن عقیل تھا جب اہل کوفہ کے بے شمار خط امام علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے۔ تو آپ نے اپنے معتمد خاص جناب مسلم بن عقیل کو کوفہ کی طرف روانہ کیا۔ تاکہ وہاں کے حالات چشم خود دیکھیں، اور اگر حالات سازگار ہوں تو حضرت کو اطلاع دیں۔

جناب مسلم مع اپنے دو فرزندوں کے کوفہ پہنچ گئے اور مختار ابن ابو عبیدہ کے یہاں قیام کیا، شیعیان علیؑ نے پُرجوش استقبال کیا اور چند روز کے اندر اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کرلی۔ جناب مسلم نے حالات کو موافق پاکر امام علیہ السلام کو خط لکھ دیا کہ آپ تشریف لے آئیں۔

ہوا خواہانِ یزید نے یزید کو خط لکھنے شروع کئے کہ مسلم بن عقیل کوفہ میں آئے ہوئے ہیں اور امام حسین علیہ السلام کے لئے اہل کوفہ سے بیعت لے رہے ہیں۔ موجودہ حاکم کوفہ کمزور دل اور امور سیاسی سے ناواقف ہے اگر تو کوفہ پر اپنی حکومت چاہتا ہے تو اس کی جگہ کسی سخت گیر حاکم کو بھیج۔

یزید نے عبیداللہ ابن زیاد کو جو اس وقت حاکم بصرہ تھا خط لکھا کہ بصرہ اور کوفہ دونوں پر تجھے حاکم مقرر کرتا ہوں۔ فوراً کوفہ روانہ ہو اور جس طرح بنے مسلم بن عقیل کو یا تو قید کرکے میرے پاس بھیج دے ورنہ قتل کر ڈال۔ ہرگز اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو۔ ابن زیاد نے کوفہ پہنچتے ہی اعیان شہر کو مسجد میں جمع کرکے خوب ڈرایا دھمکایا اور یزید کی طرفداری میں بڑے بڑے لالچ دے کر انعامات کا لالچ دے کر کہا جو شخص مسلم بن عقیل کو اپنے گھر میں چھپائے گا یا ان کا ہمدرد پایا جائے گا اسے بے محابہ قتل کر دیا جائے گا اور اس کا گھر بار لوٹ لیا جائے گا۔ ان احکام سے اہل کوفہ سخت خائف ہوئے۔ ابن زیاد نے جابجا محلوں کے ناکوں پر فوجی پہرہ بٹھا دیا کہ کوئی ادھر سے اُدھر نہ جاسکے۔ ان خاص شیعوں کو جو اس تحریک میں پیش پیش تھے اس نے قید خانہ میں بند کر

شروع کیا کچھ موقعہ پاکر کوفے سے باہر نکل گئے اور کچھ اپنے گھروں سے روپوش ہوگئے۔ کیونکہ اب ان کا ایک جا جمع ہوکر جناب مسلم کی مدد کرنا ناممکن نظر آرہا تھا۔

جناب مسلم نے ان حالات کے تحت مختار کے گھر سے منتقل ہوجانا مصلحت سمجھا کیونکہ مختار کا گھر محفوظ نہ تھا۔ آپ ہانی بن عروہ کے یہاں پوشیدہ ہوگئے۔ ہانی بڑے مومن پاک نفس اور عقیدت شعار انسان تھے اور ایک بڑے قبیلے کے سردار۔ ابن زیاد کو جب پتہ چلا کہ ہانی کے گھر میں مسلم پوشیدہ ہیں تو اس نے ہانی کو بلوا کر کہا کہ مسلم کو میرے سامنے حاضر کرو۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اپنے مہمان کو تیرے سپرد کردوں۔ میں نے ان کو بلایا نہیں وہ خود میری پناہ میں آئے ہیں ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ میں ان سے کہوں کہ میرے گھر سے کہیں اور چلے جائیں۔ یہ سُن کر ابن زیاد کو غصہ آگیا اور اس نے اپنی چھڑی اس زور سے ہانی کے چہرے پر ماری کہ چہرہ سے خون جاری ہوگیا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ ہانی کو قید کردو۔ جب ان کے قبیلے کو پتہ چلا تو آٹھ ہزار آدمیوں نے دارالامارہ کو گھیر لیا۔ ابن زیاد خائف ہوا لوگوں سے کہا کہ بالائے بام جاکر ان کو سمجھاؤ کہ ہانی زندہ ہیں وہ اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ چنانچہ وہ لوگ یہ معلوم کرکے کہ ہانی قتل نہیں کئے گئے واپس گئے۔

جب جناب مسلمؑ کو پتہ چلا کہ ہانی گرفتار ہوگئے تو آپ نے چار سو ساتھیوں کے ساتھ دارالامارہ پر حملہ کیا ابن زیاد نے دروازہ بند کرلیا۔ یہ لوگ محاصرہ کئے رہے۔ ابن زیاد کے آدمیوں نے بام پر جاکر اہل کوفہ کو ڈرایا دھمکایا۔ مغرب کی نماز کا وقت آگیا جناب مسلمؑ نے نماز ادا کی بعد نماز دیکھا تو دس آدمیوں سے زیادہ آپ کے پیچھے نہ تھے۔ عشا کی نماز کے بعد ان کو بھی نہ پایا۔ اب سرکار حسینؑ کا یہ ایلچی کوفہ میں تن تنہا ہے۔ کہاں جائیں کس کو مدد کے لئے بلائیں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا رات کی تاریکی میں ہر طرف مارے مارے پھر رہے تھے۔ کہ ایک دروازے پر ایک عورت نظر آئی۔ آپ نے اس سے پانی مانگا۔ وہ پانی لائی، آپ پانی پی کر اس کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ بُری طرح اوّل تو تھکے ہوئے تھے پھر کوئی جائے پناہ نظر نہ آتی تھی۔ اس عورت نے جس کا نام طوعا تھا۔ آپ سے کہا اے شخص پانی پی چکا اب اپنے گھر کو جا۔ جناب مسلمؑ نے اے کنیز خدا کہاں جاؤں، مرد مسافر ہوں کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی۔ اس نے کہا تم مسلمؑ بن عقیل تو نہیں ہو۔ فرمایا ہاں میں وہی ہوں۔ وہ زن مومنہ تھی رحم آیا اور جناب مسلمؑ کو اپنے گھر میں لے گئی۔ کچھ رات گئے اس کا لڑکا آیا۔ طوعا نے جناب مسلمؑ کا حال اس سے بیان کیا۔ وہ خاموشی سے پڑ کر سوگیا، صبح کو ایک منادی نے ندا کی۔ جو کوئی حاکم کے گناہ گار مسلم بن عقیل کو اپنے گھر میں چھپائے گا اس کو سر بازار سولی پر چڑھا دیا جائے گا اور گھر بار لوٹ لیا جائے گا۔ یہ ندا سُن کر لڑکا ڈرا اور اس نے سنان ابن انس کو جاکر اطلاع دی وہ ابن زیاد کے پاس گیا اور یہ حال بیان کیا۔ ابن زیاد نے محمد بن اشعث کی ماتحتی میں پچاس آدمی گرفتاری کے لئے بھیجے۔ جب گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی تو جناب مسلمؑ مسلح ہوکر گھر میں سے نکل آئے اور ہاشمی شجاعت کے جوہر دکھانے شروع کئے۔ جب بہت سے جوان مارے گئے تو محمد بن اشعث نے ایک اور کمک طلب کی۔ ابن زیاد نے غصہ سے کہا ایک آدمی کو پچاس آدمی گرفتار نہ کرسکے۔ تازہ سو سوار اس نے اور بھیجے۔ جب محمد ابن اشعث کو ابن زیاد کا قول معلوم ہوا تو اس نے کہا کیا اسے یہ معلوم نہیں کہ ہم کو کس کے مقابل بھیجا ہے۔ یہ شیر بیشۂ شجاعت ہے یہ ہاشمی جنگجو ہے۔ الغرض جناب مسلمؑ برابر ان اشقیا سے لڑتے رہے

ہر طرف سے آپ پر ان ظالموں نے تیر برسانے شروع کئے۔ جب لڑتے لڑتے تھک گئے تو ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے، وہ ظالم سوار تھے۔ یہ پیادہ یا تنِ تنہا کہاں تک لڑتے۔ پیاس کا غلبہ تھا ایک ظالم سے پانی مانگا۔ اس نے کوئی توجہ نہ کی۔ دوسرے سے مانگا اس نے بھی توجہ نہ کی۔ آخر ایک کو اس حالت پر رحم آیا اور ایک جرعۂ آب لے کر آیا۔ جناب مسلمؑ نے پینا چاہا تو سر کا خون پانی میں مل گیا اور اگلے دو دانت جن پر ضرب پڑ چکی تھی ٹوٹ کر پانی میں گرے۔ آپ نے پانی پھینک دیا۔

اور پھر لڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ محمد بن اشعث نے کہا اے مسلم میں تم کو امان دیتا ہوں لڑنا بند کرو۔ آپ نے فرمایا تجھ جیسے ظالم کی امان مجھے درکار نہیں۔ باوجودیکہ سخت زخمی تھے۔ مگر کسی کو قریب آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ آخر ان ظالموں نے ہر طرف سے گھیر کر وار پر وار کرنے شروع کئے۔ حضرت مسلمؑ زخموں کی تاب نہ لا کر گر پڑے، ان اشقیا نے آپ کو گرفتار کر لیا اور پھر ابن زیاد کے پاس لے گئے۔ ایک شخص نے کہا اے مسلمؑ! تم نے امیر کو سلام نہیں کیا۔ فرمایا! میرا امیر حسینؑ ابن علیؑ کے سوا کوئی نہیں۔ یہ سن کر ابن زیاد کو غصہ آیا اور حکم دیا کہ اسے بالائے بام لے جا کر قتل کرو۔ جناب مسلمؑ نے فرمایا۔ اگر تو میرے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تو کسی کو حکم دے کہ وہ میری تین وصیتیں سن لے۔ ابن زیاد نے عمر بن سعد سے کہا تو سن کیا کہنا چاہتا ہے آپ نے فرمایا میں ایک سو درہم کا اس شہر میں مقروض ہوں میری زرہ بیچ کر میرا قرضہ ادا کر دینا اس نے کہا ایسا کروں گا۔ فرمایا دوسری وصیت یہ ہے کہ میرے دو چھوٹے چھوٹے بچے یہاں ہیں۔ ان کو کسی طرح مدینہ میں ان کی ماں کے پاس پہنچا دینا۔ اس نے کہا میں بغیر حاکم کی اجازت کے ایسا نہیں کر سکتا۔ فرمایا تیسری وصیت ہے کہ میرے آقا امام حسینؑ علیہ السلام کو ایک خط لکھ دینا کہ وہ ادھر نہ آئیں۔ اس نے کہا میں یہ بھی بے اجازت ابن زیاد نہیں کر سکتا۔ ابن زیاد نے کہا صرف پہلی وصیت پوری کی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد اس نے غلاموں کو حکم دیا کہ اس کو کشاں کشاں بالائے بام لے جاؤ اور قتل کر کے لاش کو نیچے گرا دو۔ چنانچہ وہ جناب مسلمؑ کو کھینچتے ہوئے لے گئے اور آپ کو قتل کر کے لاش کو نیچے گرا دیا۔

ابن زیاد نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مسلمؑ کا سر کوفہ کے دروازے پر لٹکا دو اور لاش کو عبرت خلائق کے لئے گلی کوچوں میں کھینچتے پھریں۔ آہ خاندانِ رسولؐ کی یہ توہین کہ کفن و دفن تو ایک طرف لاش بے سر کو اس طرح تشہیر کیا جا رہا ہے۔

یہ واقعہ ۹ ذی الحجہ کا ہے ابھی حسینی قافلہ کربلا تک نہیں پہنچا۔ راستہ ہی میں جناب مسلمؑ کے شہید ہونے کا حال امام مظلومؑ کو معلوم ہوا۔ آپ صبر و ضبط کے ساتھ اس خیمے میں تشریف لائے جہاں مسلمؑ کی بیوہ اور چھوٹی سی یتیم بچی تھی۔ آپ نے بچی کو گود میں لے کر پیار کیا ضبط نہ ہو سکا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بچی نے عرض کی چچا جان آج تو آپ ایسی شفقت فرما رہے ہیں جیسے یتیم بچوں پر کی جاتی ہے۔ کیا میرے بابا جان کو ذبح شہید کر دئیے گئے۔ امام سے ضبط نہ ہو سکا دھاڑیں مار کر رونے لگے جب سیدانیوں کو یہ معلوم ہوا تو ایک کہرام بپا ہو گیا وا مسلماہ! وا غربتاہ! کے نعرے مارنے لگیں۔ ہائے عالم غربت کی موت کیسی سخت موت ہوتی ہے۔ سارا کنبہ دور تھا۔ جناب مسلمؑ نہ کسی سے کچھ کہہ سکے نہ کسی سے سن سکے۔ کاش بڑے کنبہ میں موت ہوتی تو لاش پر بہت سی رونے والیاں روتیں۔ یہ بچی اپنے باپ سے بڑی مانوس تھی کسی طرح فرقت پدری میں اسے چین نہ آتا تھا۔ راستے بھر باپ کو

یاد کرتی رہی۔ کربلا میں پہنچی تو باپ کی یاد اس ننھے سے دل سے دور نہ ہوئی جب قید ہوکر کوفہ پہنچی تو خیال کرکے کہ میرے باپ یہیں مارے گئے ہیں۔ بار بار اپنی ماں سے کہتی اماں جان یہی وہ کوفہ ہے جہاں میرے بابا جان قتل ہوئے ہیں۔ ماں کہتی۔ ہاں بیٹی یہ وہی کوفہ ہے۔

اسیروں کا قافلہ بازاروں اور عام راستوں میں ہوتا ہوا چلا جارہا تھا کہ قریب اس دروازے کے پہنچا جہاں جناب مسلمؑ کا سر لٹکا ہوا تھا اونٹ پر بیٹھی بچی نے ایک بار چلا کر کہنا شروع کیا۔ اماں جان میں اپنے بابا جان کی خوشبو سونگھ رہی ہوں۔ میرے بابا جان شاید مجھے لینے کے لئے آئے ہیں۔ دکھیا ماں کیا جواب دے۔ جب سیدانیوں کے اونٹ قریب سر مسلم کے پہنچے تو انہوں نے پہچانا مسلمؑ کا سر ہے۔ بی بیوں نے رونا شروع کیا۔ واہ مسلماہ، وامسلماہ کے نعرے فضا میں گونج اٹھے۔

ماں نے بیٹی سے کہا۔ بیٹی دیکھ یہ تیرے باپ کا سر ہے اس معصوم نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور رو رو کر کہنے لگی۔ بابا جان میرے پاس آیئے۔ بابا جان آپ ہمیں بھول گئے میرے اچھے بابا آپ میرے پاس کیوں نہیں آتے۔ آہ ہمیں دشمنوں نے بڑی بڑی تکلیفیں پہنچائی ہیں۔ کاش! آپ ہمارا حال دیکھتے۔ ابھی وہ بچی بین کررہی تھی کہ ظالموں نے اونٹوں کو آگے بڑھا دیا اور یتیم مسلمؑ تڑپتی رہ گئی۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

دسویں مجلس

آئمۂ اہل بیتؑ کا علم

شہادت حبیب ابن مظاہرؓ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِی کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ

قُلْ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ وَمَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ

(سورہ رعد ۴۳/۱۲)

"اے رسول کہہ دو کہ میری گواہی کے لئے میرے اور تمہارے درمیان اللہ کافی ہے اور وہ جس کے پاس علم کتاب ہے۔"

یہودیوں کا گروہ حضرت رسولؐ خدا کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا۔ آپ کی رسالت کا گواہ کون ہے تاکہ ہم اس سے آپ کی صداقت کے متعلق دریافت کریں۔ اس سوال کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی کہہ دو کہ میری رسالت کے دو گواہ ہیں ایک اللہ اور ایک من عندہ علم الکتاب۔ خدا کی کتاب اللہ کے گواہ ہونے کا ثبوت ہے اور اس کے ہر ہر حکم پر عمل کرنا من عندہ علم الکتاب کی گواہی کا ثبوت ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کی رسالت کے صرف دو ہی گواہ تھے۔ حالانکہ ہر وہ شخص جو آپ کی رسالت کا گواہ کہا جاسکتا ہے ہر مسلمان اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہتا ہے۔ لہٰذا اس کی گواہی کیوں معتبر نہیں۔

بات یہ ہے کہ حضرتؐ کی رسالت کی گواہی دینے والے تین قسم کے ہیں۔ مومنین۔ منافقین اور من عندہٗ علم الکتاب رکھنے والے منافقین کی گواہی تو معتبر ہی نہیں۔ خدا فرماتا ہے۔ اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَکٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾ (سورہ المنافقون ۱/۶۳) منافقین تمہارے پاس آکر یہ گواہی دیتے ہیں کہ تم اللہ کے رسولؐ ہو اور اللہ جانتا ہے کہ تم اس کے رسولؐ ہو۔ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں رہے مومنین تو ان کی گواہی معتبر تو ہے لیکن مکمل نہیں لیکن کتابِ خدا کا پورا علم ان کے پاس نہیں۔ اور جب کتابِ خدا کا پورا علم ان کے پاس نہیں۔ اور جب کتابِ خدا کا پورا علم نہ ہو رسالت کی پوری شان اور اس کے فرائض کی صحیح معرفت ہو نہیں سکتی۔ اسی لئے رسولِ خداؐ نے فرمایا ہے کہ اے علیؑ خدا کو نہیں پہچانا مگر تم نے اور میں نے اور مجھ کو نہیں پہچانا مگر خدا نے اور تم نے اور تم کو نہیں پہچانا مگر میں نے اور خدا نے۔ لہذا ضرورت ہے کہ جب تک رسولؐ کی رسالت کا زمانہ دُنیا میں باقی ہے یہ دونوں گواہ بھی موجود رہیں۔ یعنی کتاب خدا کے ساتھ جو درحقیقت خدا کی گواہی ہے۔ ایک ایسی ذات بھی ہونی ضروری ہے جو وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ (سورہ الرعد ۴۳/۱۳) کا مصداق ہو۔ تاکہ اگر شریعتِ محمدی کے کسی مسئلہ پر کسی کو اعتراض کرنا ہو یا کتاب خدا کی کوئی آیت کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ (سورہ الرعد ۴۳/۱۳) اس کو بتا دے ورنہ غلطی دور نہ ہونے کی صورت میں یا اعتراض کا جواب نہ ملنے کی حالت میں رسولؐ کی رسالت میں ضرور شبہ پڑ جائے گا۔ ان ہی دو گواہوں کو رسولؐ نے حدیثِ ثقلین میں خاص طور پر ذکر فرمادیا ہے یعنی میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری عترت۔ اگر تم ان سے تمسک رکھو گے تو ہرگز میرے بعد گمراہ نہ ہوگے، اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گی۔ تاوقتیکہ حوضِ کوثر پر میرے پاس نہ آجائیں جدا نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ جب تک کتاب خدا دُنیا میں موجود ہے میرے اہلبیت میں سے بھی ضرور کوئی ایک باقی رہے گا تاکہ وہ مفہوم کتاب کو سمجھا سکے اور لوگوں کے شُبہ کو دور کرسکے۔

چنانچہ ہر زمانہ میں لوگوں کے اعتراضات کا جواب ہمارے آئمہ دیتے رہے اور جو مسئلہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا اس کو بھی سمجھاتے رہے۔

بڑے بڑے علماء اور آئمہ حدیث و آئمہ فقہ آیات قرآنی کا غلط مفہوم سمجھنے کی وجہ سے خود بھی گمراہ ہو رہے تھے اور اپنے پیرؤوں کو بھی گمراہی کی طرف لے جاتے تھے۔ اگر آئمہ اہل بیت اپنے اپنے زمانے میں ان کی رہ نمائی نہ کرتے تو اسلام تباہ ہو جاتا۔

ایک روز امام ابو حنیفہ جن کو امام اعظم کا خطاب منصور دوانقی نے دیا تھا امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ مجھے یہ بتایئے کہ معصیت کس کی طرف سے ہوتی ہے جب بندہ اپنے افعال میں مجبور ہے تو پھر اسے گناہ کی سزا کیوں دی جاتی ہے۔ اتفاقاً اس وقت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام جو نہایت کم سن تھے اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ابوحنیفہ سے فرمایا اس مسئلے کا جواب میرے لڑکے سے دریافت کرو، انہوں نے اس بارے میں اپنی کچھ توہین سی محسوس کی کہ سن رسیدہ اور امام اعظم ہوتے ہوئے ایک صغیر السن لڑکے سے استفادہ کریں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا شرم نہ کرو۔ صَغِيْرُنَا

وَكَبِيْرُنَا سَوَاءٌ (ہمارے چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔)

ابو حنیفہ نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مسئلہ دریافت کیا آپ نے فرمایا تین حال سے خالی نہیں یا تو یہ فرض کیا جائے کہ معصیت خدا کی طرف سے ہے یعنی وہ بندے کو مجبور کر کے گناہ کراتا ہے اس صورت میں جائز نہیں کہ ربّ کریم گناہ تو کرلے خود اور اس کے بعد روز جزا بندے پر اپنا عذاب نازل کرے۔ یہ عدل الٰہی کے خلاف ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خدا کی طرف سے ہو اور بندے کی طرف سے بھی۔ اس صورت میں شریک قوی کے لئے جائز نہیں کہ وہ شریک ضعیف پر ظلم کرے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ بندے کی طرف سے ہو اور ایسا ہی ہے اگر خدا کسی بندے کو سزا دے گا۔ تو اس کے گناہ کی بدولت اور اگر معاف کرے گا تو اپنے کرم و جود کی بنا پر۔ یہ جواب سن کر ابو حنیفہ حیران ہو گئے اور کہنے لگے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ

ایک بار ایک عالم نے امام علی نقی علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا مراد ہے اس آیت سے قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (سورہ النساء ۷۸/۴) (اے رسولؐ کہہ دو کہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے) اس سے معلوم ہوا کہ بندہ اچھے یا برے جتنے کام کرتا ہے وہ سب خدا کی طرف سے ہے پھر تو بندہ مجبور رہے آپ نے فرمایا ایسا نہیں خدا نے ہر بندہ کو فاعل مختار بنایا ہے اگر وہ ان کے افعال میں دخل دے تو پھر وہ بجائے مختار ہونے کے مجبور ہوں گے۔ رہا یہ کہ سب اللہ کی طرف سے ہے تو وہ اس معنیٰ میں ہے جو کچھ انسان کرتا ہے۔ وہ ان ہی قوتوں کے ذریعے سے کرتا ہے جو خدا نے اس کو دی ہیں لیکن قوتیں اس کو کسی فعل کے بجالانے یا نہ بجالانے پر مجبور نہیں کرتیں۔ خدا کی نعمتوں کی وجہ سے اس کے فرائض ادا کرتا ہے اور انسان جو معصیت کرتا ہے وہ ان ہی قوتوں سے کرتا ہے جو خدا نے اس کے اعضا میں ودیعت فرما دی ہیں۔

پس غور کیا جائے تو حسنات کا تعلق خدا سے زیادہ ہے۔ بہ نسبت بندہ کے اور گناہوں کا تعلق ہمہ تن بندوں ہی سے ہے کیونکہ انہوں نے ان قوتوں کا غلط استعمال کیوں کیا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا اے شخص خدا جو کچھ کرتا ہے کسی کو اس میں سوال کرنے کا حق نہیں اور اسے یہ حق ہے کہ جس سے جو چاہے سوال کرے کیونکہ جن امور کے متعلق وہ سوال کرے گا وہ ان ہی قوتوں سے بجالائے گئے ہوں گے جو اس کی دی ہوئی ہیں یعنی اس نے صحیح استعمال کے لئے دی تھیں ان کا غلط استعمال کر کے منشائے الٰہی کے خلاف کیوں کیا۔

یہ سن کر اس عالم نے کہا یا بن رسول اللہ میں بہت بڑی گمراہی میں پڑا ہوا تھا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس گمراہی سے نکال دیا۔

ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ آیہ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (سورہ البقرہ ۲۶/۲) سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ کتاب خدا گمراہ کرنے والی بھی ہے آپ نے فرمایا یہ قول ان لوگوں کا ہے جو بہ سبب کفر ضلالت کی نسبت خدا کی طرف سے دیتے تھے پھر فرمایا وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (سورہ البقرہ ۲۶/۲) یعنی گمراہ تو اس سے فاسق ہوتے ہیں مطلب حضرت کا یہ ہے کہ گمراہ تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو قرآن کا صحیح مفہوم نہیں سمجھے۔

ہارون نے ایک مرتبہ امام موسیٰ کاظمؑ سے پوچھا کہ اگر خدا انسان کو بُرے کاموں پر قدرت نہ دیتا تو وہ بُرے کام کرتے ہی نہیں۔ فرمایا اگر ایسا ہوتا تو پھر ان کی عقل کی جانچ کیسے ہوتی۔ اگر یوسف علیہ السلام زلیخا کے دام فریب سے نہ بچتے اور وہ اپنی قوت کا غلط استعمال کر بیٹھتے تو اس قوت کا استعمال ان کے لئے باعثِ مذمت ہوتا چونکہ عقل صحیح سے کام لے کر بچ گئے لہذا قرآن میں ان کی مدح کی گئی جو شخص امر کے اخذ پر اور نہی کے ترک پر قادرت رکھتا ہے امتحان اسی کی عقل کا لیا جاتا ہے ورنہ مجبور سے باز پرس فضول ہے

ہشام نے امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا کہ خدا نے اپنے بندوں کو معصیت کی قوت کیوں دی فرمایا تاکہ وہ دیکھے کہ بندہ اس کے امر و نہی پر عمل کرتا ہے یا نہیں۔ آپ نے فرمایا توریت میں لکھا ہے کہ اے موسیٰ! میں نے تم کو پیدا کیا اور برگزیدہ کیا اور قوت دی پھر میں نے تم کو اپنی اطاعت کا حکم دیا اور اپنی معصیت سے منع کیا پس اگر تم میری اطاعت کروگے تو میں تمہاری اعانت کروں گا اور اگر نافرمانی کروگے تو مدد نہ کروں گا اور اطاعت میں میرا احسان تم پر ہوگا اور معصیت میں میری حجت تم پر تمام ہوگی۔

آپ نے غور کیا کہ جب اُمت محمدیہ کے سربراہوں کے دماغ مشکل مسائل میں اُلجھتے تھے تو اس وقت اہل بیتِ رسولؐ یاد آتے تھے اور ان ہی کے جواب سے تسکین ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ مامون کی محفل میں جبر و اختیار کا مسئلہ چھڑا۔ علمائے اسلام نے اپنے اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کئے۔ مامون ہر گروہ سے بحث کر کے اس کی دلیل کو قطع کرتا تھا لیکن وہ اپنے اپنے عقیدے پر جمے ہوئے نظر آتے تھے۔ جبریہ فرقہ اس آیت سے استدلال کر رہا تھا۔ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ (سورہ البقرہ ۲/۱۷) (خدا نے ان کو تاریکی میں چھوڑ دیا۔ پس وہ اندھے بنے ہوئے ہیں۔

مامون نے امام رضا علیہ السلام سے کہا یابن رسول اللہؐ آپ اس مسئلے پر روشنی ڈالیں۔ آپ نے فرمایا: اس آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ جب خُدا نے جان لیا کہ یہ کفر و ضلالت سے ہٹنے والے نہیں تو اس نے اپنے لطف و معاونت کو ان سے روک دیا وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ (سورہ البقرہ ۲/۱۷) سے یہ مراد ہے نہ کہ جیسا کہ اس شخص نے سمجھا ہے اس نے کہا اور خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ (سورہ البقرہ ۲/۷) کا مطلب کیا ہے۔ فرمایا قلوب کفار پر ختم کا مطلب یہ ہے کہ ان کے کفر پر خدا اپنا عذاب نازل کرتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا (سورہ النساء ۴/۱۵۵) خدا کی توفیقات کا ایسے لوگوں سے اُٹھا لیا جانا ان کو سزا اور عقوبت و عذاب بنا دیتا ہے۔ اس نے کہا اگر خدا بندوں کے معاصی پر راضی نہیں تو وہ اُن کو سزا کیوں نہیں دیتا۔

آپ نے فرمایا خدا نے ان کو نیکی اور بدی کے درمیان اختیار دیا ہے اور مہلت دے رکھی ہے تاکہ وہ توبہ کر لیں اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ خُدا ان کی معصیت پر راضی ہے اس نے کہا خدا بندوں کو تکلیف مالایطاق دیتا ہے۔ جس کام کو کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتے وہ ان سے کرانا چاہتا ہے۔ فرمایا یہ کیسے ہوسکتا ہے وہ فرماتا ہے وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (سورہ آل عمران ۳/۱۸۲) (اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا) بندہ بہت سی باتوں کو اپنی پست ہمتی سے تکلیف مالایطاق سمجھتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔

مامون یہ جواب سُن کر خوش ہوا۔

یہ چند واقعات ہم نے صرف مسئلہ جبر و اختیار کے متعلق مشتے نمونہ از خروارے بیان کر دیئے ہیں۔ ورنہ ہمارے آئمہ کرام نے الہیات کے بے شمار مسائل کو حل کر کے مسلمانوں کے غلط عقیدوں کو درست کر دیا ہے۔

کتاب خدا کا علم جس کے سینے میں ہو کس کی طاقت ہے کہ اس کے فضل و کمال اس کی لاہوتی قوت اور روحانی کیفیات کا اندازہ کر سکے۔ جناب آصف برخیا وزیر جناب سلیمانؑ کو صرف تھوڑا سا علم کتاب خدا کا تھا جس سے یہ قوت ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی کہ انہوں نے چشم زدن میں بلقیس کو مع تخت لا کر جناب سلیمانؑ کے سامنے رکھ دیا تھا پس جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے ان کی قدرت کا کیا ٹھکانا ہے۔ تمام عالم کی قوتیں ان کے اشارہ پر کام کرتی ہیں۔

آصف برخیا سے صرف ایک ہی بار اس خرق عادت کا ظہور ہوا اس کے سوا ان کی زندگی میں کوئی اور واقعہ اس قسم کا نہیں ملتا لیکن امیر المومنین علیہ السلام سے واقعات ظہور میں آئے جن کا شمار آپ کے معجزات میں ہوتا ہے۔ تمام کائنات کا یہ حلقہ اور یہ اثر پذیری اس وجہ سے تھی کہ آپ کتاب اللہ کے عالم تھے اور اس علمی فضیلت نے آپ کے عمل میں قوت دی تھی اور علم و عمل دونوں نے تقریب کے مرتبہ تک پہنچایا اور تقریب ایزدی نے الٰہی اقتدار کا جلوہ آپ کے اندر دکھایا۔

مروی ہے کہ ایک بار مدینہ میں ایسا سخت زلزلہ آیا کہ لوگ اپنے گھر چھوڑ چھوڑ کر باہر نکل آئے اور ہر طرف آثار و اضطراب ہویدا ہوئے لوگوں نے حضرت علیؑ سے فریاد کی۔ یہ واقعہ خلیفہ اول کے زمانے کا ہے۔ حضرت علیؑ ایک ٹیلے پر تشریف لے گئے اور لب ہائے مبارک کو جنبش دی اور زمین پر اپنا ہاتھ مار کر فرمایا مَالَكِ لَا تَسْكُنِيْ (تجھے کیا ہو گیا ساکن نہیں ہوتی) وہ ساکن ہو گئی۔ حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں سے فرمایا میں ہی وہ ہوں جس کے بارے میں خدا نے کہا ہے۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝۱ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝۲ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ۝۳ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝۴ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (سورہ الزلزلۃ ۹۹/۱)

آصف برخیا کے لئے طی الارض ہوا اور شہر سبا ملک شام سے بلکہ محل جناب سلیمانؑ سے آملا تھا لیکن زمین سے کوئی مکالمہ نہیں ہوا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کی بات کو زمین نے سمجھا اور سمجھ کر آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس مصداق وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (سورہ الرعد ۱۳/۴۳) کو زمین پر حق تصرف حاصل تھا۔ دوسرے قیامت کے دن جب تمام زمین سرتاپا زلزلہ بنی ہوگی اور جو کچھ اس کے اندر سمایا ہوا ہے۔ اسے نکال رہی ہوگی۔ اس وقت ایک خاص انسان اس سے مخاطب ہو کر کہے گا کہ یہ تیرا کیا حال ہے اس وقت زمین اپنی ساری خبریں سنانا شروع کر دے گی۔ کیونکہ خدا کی وحی اس کے لئے ہوگی۔ زمین کا خبریں سنانا ایسے ہی شخص سے متعلق ہو سکتا ہے جو اولین و آخرین سب کے حالات سے واقف ہو اور وہ ان تمام اخبار کی تصدیق بھی کرے اس لئے امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ میرے پاس علم اولین و آخرین ہے میرے پاس علم مرایا و منایا ہے میں جانتا ہوں کہ زمین کے نیچے کیا ہے اور اس کے اوپر کیا ہے یہ سب خصوصیت آپ کو اس لئے حاصل تھی کہ آپ کے سینہ میں علم کتاب تھا جس کتاب کے الفاظ میں یہ قوت پیدا ہو کہ اگر پہاڑ پر دم کر دیئے جائیں تو وہ چل نکلیں زمین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ مردے زندہ ہو کر بولنے لگیں اگر اس کا پورا علم رکھنے والا زمین کو ساکن ہونے کا حکم دے تو وہ کیوں نہ ساکن ہوں۔

سوال یہ ہے کہ زمین حضرت علی علیہ السلام سے کیا خبریں بیان کرے گی۔ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جو مظالم اس پر ہوئے

ہیں یا جو بدکاریاں اس پر ہوئی ہیں ان کو ایک ایک کر کے ابوتراب کو سنائے گی اور ان کو اپنے تمام واقعات کو گواہ بھی بنائے گی ہمیں یقین ہے کہ واقعۂ کربلا بھی بیان میں آئے گا۔

مناقب شہرآشوب میں ہے کہ ابوہریرہ نے اپنے بال بچوں سے ملنے کا شوق ظاہر کیا۔ آپ نے فرمایا آنکھیں بند کر۔ انہوں نے آنکھیں بند کیں۔ فرمایا اب کھول دو۔ اب جو دیکھا تو مدینے کے اندر اپنے گھر میں بیٹھے ہیں انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ علی علیہ السلام سامنے ہیں۔ فرمایا یہاں آنا چاہا تو آنکھیں بند کرو۔ آنکھیں بند کیں تو اپنے کو کوفہ میں پایا۔ ابوہریرہ کو بڑا تعجب ہوا۔ فرمایا آصف برخیا دو ماہ کی راہ سے تخت بلقیس کو لے آئے تھے وہ وزیر سلیمان تھے اور میں وزیر ہوں محمدؐ مصطفٰی کا۔

مناقب شہرآشوب میں خالد بن ولید سے یہ روایت ہے کہ حضرت علیؑ کو میں نے دیکھا کہ اپنی زرہ کی کڑیاں اپنے ہاتھ سے توڑ موڑ کر درست کر رہے تھے۔ میں نے کہا یہ تو اعجاز داؤدیؑ ہے۔ حضرت نے فرمایا داؤد کے لئے لوہا ہماری وجہ سے نرم کیا گیا۔ پھر ہمارے لئے کیوں نہ نرم ہو۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا اے علی جو تمام انبیاء کو دیا گیا تھا وہ تمہیں دیا گیا ہے۔ یہ اس کی تصدیق ہے۔

دُنیا کی کون سی چیز ہے جو اُن کو نہیں پہچانتی۔ خواہ جاندار ہو یا بے جان۔ چھوٹی ہو یا بڑی۔ ایک جماعت نے خالد بن ولید سے روایت کی ہے کہ عباس بن عبدالمطلب امیرالمومنینؑ کے پاس آئے اور حضورؐ کی میراث جو گھوڑا، زرہ، عمامہ اور تلوار تھی طلب کی اور کہا کہ میں ان چیزوں کا زیادہ مستحق ہوں۔ میں حضور نبی اکرمؐ کا چچا ہوں۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اگر آپ ان کے مستحق ہیں تو مسجد نبویؐ میں چل کر لے لیجئے۔ وہ اس پر راضی ہو گئے۔ دونوں مسجد میں آئے بہت سے لوگ اور ساتھ ہو گئے۔ حضرت علیؑ نے کہا آپ فرش مسجد پر بیٹھئے زرہ رسولؐ پہنیے، عمامہ سر پر رکھئے، تلوار حمائل کیجئے اور گھوڑے پر سوار ہو کر لے جائیے۔ عباس بیٹھ گئے۔ زرہ پہنی۔ عمامہ سر پر رکھا۔ تلوار حمائل کی لیکن اب جو اُٹھنا چاہا تو اُٹھ نہ سکے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا زرہ اُتار کر پھر اُٹھئے لیکن پھر نہ اُٹھ سکے۔ فرمایا تلوار کھول دیجئے۔ فرمایا اب عمامہ اُتار دیجئے۔ جب یہ سب چیزیں جسم سے الگ ہو گئیں تو پھر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عباس نے کہا تم بھی ایسا کر کے دکھاؤ۔ حضرت علیؑ نے ایسا ہی کیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے اور گھوڑے پر سوار ہو کر فرمایا اب دیکھ لیا کہ میں ان کا حقدار ہوں۔

ایک مرد بدوی نے عباس سے کہا تم نے دھوکا کھایا۔ تمہیں گھوڑے پر چڑھ کر بھی دیکھنا تھا حضرت علیؑ نے فرمایا آپ یہ بھی کر دیکھئے۔ جب گھوڑے نے عباس کو آتے دیکھا تو چیخا اور بھاگنے لگا۔ ایسی خوفناک آواز اس سے پہلے نہیں سنی گئی تھی۔ عباس غش کھا کر گر پڑے۔ لوگ جمع ہو گئے اور گھوڑے کو پکڑنے کا حکم دیا مگر وہ کسی کے قابو میں نہ آیا۔ تب حضرت علیؑ نے اسے بلایا۔ وہ دُم کو ہلاتے چلا آیا۔ اس کے بعد امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو بلایا اور باری باری ان کو بھی زرہ پہنائی عمامہ سر پر رکھا اور تلوار حمائل کی۔ دونوں شہزادے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر دونوں کو گھوڑے پر سوار کیا حضرت نے فرمایا هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ (یہ اللہ کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ آیا میں اور دونوں بچے شکر کرتے ہیں یا کفران نعمت کرتے ہیں) افسوس ہے خدا کے جن مقرب بندوں کو دُنیا کی ہر شئے پہچانتی تھی ان کو نہ پہچانا تو اُمت محمد مصطفٰی نے۔ اور ان میں سے ہر ایک کو اتنا ستایا کہ ان کی مصیبت پر زمین و آسمان روئے انسانوں کا ذکر ہی کیا ہے۔

امامِ مظلومؑ نے کوفہ و شام کی فوجوں کے سامنے ایک بار نہیں کئی بار اپنا تعارف اس طرح کرایا۔ اے قوم کیا میں تمہارے نبیؐ کا نواسہ نہیں ہوں۔ کیا میرے سر پر یہ عمامہ تمہارے نبیؐ کا نہیں ہے۔ کیا یہ زرہ میرے جسم پر تمہارے نبیؐ کی نہیں ہے۔ کیا رسولؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔ جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔ ظالمو! بتاؤ تم میرے قتل پر کیوں آمادہ ہو۔ کیا میں نے کسی کو قتل کیا ہے جس کے قصاص میں تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ کیا میں نے شریعت میں کوئی تبدیلی کی ہے۔ کیا میں نے کسی کا حق غصب کیا ہے۔ اس کا جواب ادھر سے یہ ملتا ہے کہ جب تک امیر یزید کی بیعت نہ کرو گے ہم تمہارے قتل کرنے سے باز نہ آئیں گے۔

یہ سُن کر حبیب ابن مظاہر کو غصہ آگیا۔ آپ صفِ اعدا کے سامنے جاکر کہنے لگے کہ اے قومِ جفاکار! تم پر خدا کی لعنت ہو۔ تم ایسے شخص کے حق کا انکار کر رہے ہو جس کی محبت کو خدا نے واجب کیا ہے اوبے حیاؤ! کل روزِ قیامت ان کے جد کو کیا منہ دکھاؤ گے حبیب کا کلام ختم نہ ہونے نہ پایا تھا کہ اُدھر سے تیروں کا مینہ برسنے لگا اور آوازیں آئیں! ہم تمہارا کوئی کلام سننے کے لئے تیار نہیں۔

امام علیہ السلام نے حبیب سے فرمایا اے حبیب واپس آؤ۔ ان شقاوت کرداروں پر کسی کے کہنے کا اثر نہ ہوگا۔

حبیب ابن مظاہر امام حسین علیہ السلام کے بچپن کے دوست تھے ان کے والد جناب مظاہر ایک مومن پاکباز تھے۔ اکثر رسولِ خدا کی خدمت میں اپنے اس کم سن بیٹے کو لے کر حاضر ہوا کرتے تھے۔ حبیب کو امام حسینؑ سے بڑی محبت تھی۔ جدھر حسینؑ جاتے تھے حبیب ان کے پیچھے پیچھے جاتے تھے۔ ایک دن حضرت رسولِ خداؐ نے دیکھا کہ حبیب حسینؑ کے پیچھے ہیں اور حسینؑ کے قدم کے نیچے کی خاک اُٹھا کر اپنے منہ پر مل لیتے ہیں۔ جناب مظاہر سے فرمایا کہ اس لڑکے کو میرے پاس لاؤ۔ جب حبیب ابن مظاہر کو مظاہر لے کر آئے تو حضرت رسولؐ خدا نے پیار کیا اور رونے لگے۔ مظاہر نے پوچھا نبی اللہ! آپ کے رونے کا سبب کیا ہے یہ فرمایا ایک دن یہ بچہ اپنی جان میرے حسینؑ پر قربان کرے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک بار مظاہر نے جناب رسولؐ خدا کی دعوت کی اور عرض کی کہ حضور اپنے ساتھ حسنؑ و حسینؑ کو بھی لائیں۔ حبیب کوٹھے پر کھڑے حسین علیہ السلام کے آنے کی راہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا پیر پھسلا۔ کوٹھے سے زمین پر گرے اور مر گئے۔ مظاہر نے اس خیال سے کہ اگر اس وقت گھر میں کہرام بپا ہوا تو حضورؐ کی دعوت سے محروم رہوں گا۔ حبیب کی لاش گھر میں لے جاکر رکھ دی۔ اور عورتوں سے کہہ دیا جب تک حضورؐ کھانے سے فارغ نہ ہوں کوئی گریہ نہ کرے۔ تھوڑی دیر بعد حضرت رسولؐ خدا دونوں شہزادوں کو ساتھ لے کر مظاہر کے گھر پہنچے۔ جب امام حسین علیہ السلام نے حبیب کو نہ پایا تو کہنے لگے۔ میرا حبیب کہاں ہے۔ انہوں نے کہا کہیں چلا گیا ہے آجائے گا۔ آپ غم نہ کریں اور کھانا کھائیں۔ امام حسینؑ نے فرمایا میں بغیر حبیب کے ہرگز نہ کھاؤں گا۔ اب مظاہر سے ضبط نہ ہوسکا۔ سارا واقعہ حضرت رسولِ خداؐ سے بیان کیا۔ حبیب کے مرنے کا حال سُن کر امام حسین علیہ السلام رونے لگے اور نانا سے کہنے لگے کہ نانا جان میرے حبیب کو زندہ کیجئے۔ ورنہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ حضرت رسولؐ خدا نے

مظاہر سے فرمایا بچّے کی لاش میرے پاس لاؤ۔ جب وہ لائے تو آپ نے خدا سے دعا کی۔ بارالہٰا اس بچّے کو جو میرے حسینؑ کا جاں نثار ہے زندہ کر دے۔ بقدرتِ خدا حبیب زندہ ہوگئے اور حسینؑ کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگے حسینؑ نے ان کو گلے لگا لیا۔

یہی حبیب تھے جو حسینؑ کو کربلا بلانے کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ جب امام مظلوم کربلا میں پہنچے اور کوفے سے فوجیں آنی شروع ہوگئیں تو جناب زینبؑ نے امام علیہ السلام سے کہا بھیّا آپ بھی اپنے دوستوں کو خط لکھ کر بلائیے۔ فرمایا بہن اس وقت بےکسی میں کون میری مدد کو آئے گا۔ اچھا تمہارے کہنے سے میں خط لکھتا ہوں۔

آپ نے حبیب ابن مظاہر کو اس مضمون کا خط لکھا کہ اے حبیب ہم کربلا میں آکر نرغۂ اعدا میں گھر چکے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو اس وقت مصیبت میں ہماری مدد کرو۔

جب امام علیہ السلام خط لکھ چکے تو جناب زینبؑ نے کہا جو کچھ آپ نے لکھا ہے مجھے بھی سنائیے حضرت نے مضمون خط سنایا تو جناب زینبؑ نے کہا ایک فقرہ بعد سلام میری طرف سے اور لکھ دیجئے کہ اے حبیب اگر آنا ہے تو جلد آئیے ایسا نہ ہو کہ تاخیر سے آنے میں ہمارا گھر تباہ ہو جائے۔

یہ خط ایک قاصد کو دے کر روانہ کیا۔ قاصد حبیب کے گھر پہنچا اور اس نے دق الباب کیا۔ حبیب اپنی زوجہ کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ پوچھا کون ہے اس نے کہا میں قاصد حسینؑ ابن علی علیہ السلام ہوں۔ آپ کے نام خط لے کر آیا ہوں۔ حبیب فوراً دروازے پر آئے خط کو لیا بوسہ دیا سینے سے لگایا۔ جب مضمونِ خط سے آگاہ ہوئے تو سکوت طاری ہوا۔ زوجہ نے پوچھا میرے مولا اور آقا حسین علیہ السلام خیریت سے تو ہیں۔ یہ خط کہاں سے آیا ہے۔ حبیب نے فرزند رسولؐ کربلا میں آکر دشمنوں میں گھر چکے ہیں اور مجھے مدد کے لئے بلایا ہے۔ اس زن مومنہ نے کہا۔ پھر کیا ارادہ ہے۔ حبیب نے کہا شہر کی ناکہ بندی ہو چکی ہے راستوں پر فوجوں کا پہرہ ہے پس اگر میں جاتا ہوں تو تمہارا کیا ہوگا۔ اس زن مومنہ نے کہا اے حبیب! وائے ہو تم پر، فرزند رسولؐ! تم کو نصرت کے لئے بلائیں اور تم جانے میں پس و پیش کرو۔ اگر تمہیں نہیں جانا تو اپنی تلوار مجھے دو اور میری چادر تم لو میں خود جا کر اپنے آقا کی مدد کروں گی۔ حبیب رونے لگے۔ اور فرمایا میں نے صرف تمہارا جذبۂ ایمانی دیکھنے کے لئے ایسا کہا تھا۔ ورنہ کیسے ممکن ہے کہ میں فرزند رسولؐ کی مدد کو نہ جاؤں۔ زوجہ نے کہا اے حبیب میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی اور اپنی بی بی زینبؑ کی خدمت کروں گی۔

الغرض حبیب سامان سفر کی تیاری میں مصروف ہوئے تو راہ میں مسلم بن عوسجہ سے ملاقات ہوئی مسلم نے کہا اے حبیب! تمہیں کچھ معلوم ہے کہ کوفہ سے یہ فوجیں کہاں بھیجی جا رہی ہیں۔ حبیب نے کہا مسلم فرزند رسولؐ کربلا میں

گھیر لئے گئے ہیں۔ یہ سب ان کے قتل کے سامان ہیں۔ یہ سننا تھا کہ مسلم نے جو خضاب خریدا تھا پھینک دیا اور کہا اے حبیب اب مجھے خضاب کی ضرورت نہیں۔ انشاءاللہ اب میری ڈاڑھی نصرت حسینؑ میں سر کے خون سے خضاب ہوگی۔ اے حبیب تمہارا کیا ارادہ ہے۔ انہوں نے کہا میں آج روانہ ہو رہا ہوں۔ مسلم نے کہا تم چلو میں شیعیانِ علیؑ سے مل کر انہیں کربلا جانے کی ترغیب دیتا ہوں۔

حبیب مسلم سے رخصت ہو کر اپنے گھر آئے۔ غلام سے کہا تو میرا گھوڑا لے جاکر وہاں مقام پر میرا انتظار کر میں بھی آتا ہوں غلام گھوڑا لے جاکر ناکہ پر منتظر رہا جب حبیب کو تاخیر ہوئی تو گھوڑے سے کہنے لگا اگر حبیب نہ آئے تو میں تجھ پر سوار ہو کر چلوں گا۔ حبیب پہنچے اور گھوڑے پر سوار ہو کر جس طرح بنا کربلا جا پہنچے جب جناب زینبؑ کو حبیب کے آنے کا حال معلوم ہوا تو بہت خوش ہوئیں فضہ سے کہا حبیب سے جاکر میرا سلام کہو، حبیب نے اپنا منہ پیٹ لیا۔ غلاموں کا یہ مرتبہ کہاں کہ نبی زادیاں سلام کہلا کر بھیجیں۔

حبیب کی وفاداری اور جاں نثاری کا کیا کہنا روز عاشورہ لشکر حسینی کے میسرہ کے علمدار آپ تھے۔ جنگ کا آغاز ہوا تو بار بار امام کی خدمت میں حاضر ہو کر اجازت کارزار طلب کرتے تھے۔ امام علیہ السلام فرماتے تھے۔ اے حبیب تمہارے ٹوٹے دل سے میری ڈھارس ہے۔ آخر حسین علیہ السلام اپنے اس وفادار کو موت کے منہ سے نہ بچا سکے اور حضرت کو بھی اجازت دیتے ہی بنی۔ حبیب نوجوانوں کی طرح ہمہمہ کرتے میدان میں آئے۔ پہلے تو اس فوج نابکار کو سمجھایا۔ لیکن جب کوئی اثر نہ دیکھا تو پھر ان روباہ صفتوں پر شیرانہ حملہ کیا اور اس بے جگری سے لڑے کہ کوفہ و شام کے سپاہی ہر طرف گھبرائے پھر رہے تھے۔ آخر اس عالم پیری میں کہاں تک لڑتے گھوڑے سے گرنے لگے تو آواز دی یابن رسولؐ اللہ ادرکنی امام مظلوم حضرت عباسؑ اور علی اکبرؑ کو ساتھ لئے جب حبیب کے قریب پہنچے تو رمقِ حیات باقی ہے۔ آپ قریب بیٹھ گئے اور رو رو کر فرمایا۔ حبیب میرے پیارے، حبیب تم ہمیں نرغہ اعدا میں تنہا چھوڑے جا رہے ہو۔

صاحب مصائب المعصومین لکھتے ہیں کہ ایک بار حبیب نے زمین سے سر اٹھایا اور چہرے سے آثار بشاشت نمایاں ہوئے۔ امام نے فرمایا اے حبیب کس امر نے اس وقت تمہارے چہرے کو شگفتہ کیا۔ عرض کیا یابن رسولؐ اللہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے جد نامدار اور پدر بزرگوار میرے سامنے ہیں اور فرما رہے ہیں اے حبیب جلد آؤ۔ حوران بہشتی تمہاری منتظر ہیں۔ آؤ ہم تم کو آب کوثر سے سیراب کریں۔ یہ کہا اور دم توڑ دیا۔

حبیب کتنے خوش نصیب تھے کہ بچپن میں بھی رسولؐ کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور مرتے وقت بھی۔ پھر یہ شرف کیا کم تھا کہ سیدانیوں نے ان کے ماتم میں سر کے بال کھولے سینہ زنی کی۔

منقول ہے کہ جب امام مظلومؑ حبیب کے پرسے کے لئے زوجہ حبیب کے خیمے کے پاس آئے اور اظہار حزن و ملال کیا تو اس زن مومنہ نے کہا یابن رسولؐ اللہ حبیب سے ہزار غلام آپ پر نثار۔ فرمایا مجھے اس کا خیال ہے کہ میری شہادت کے

بعد جب خیموں میں لوٹ مچے گی تو تم بھی اس بلا میں گرفتار ہو جاؤ گی۔ جب میرا کنبہ اسیر ہوگا تو تم بھی اسیر ہوگی۔ جب میرا کنبہ بازاروں میں تشہیر ہوگا تو تم بھی تشہیر ہوگی۔ جب زینبؑ و کلثومؑ قید خانہ میں جائیں گی تو تم کو بھی جانا پڑے گا۔ کاش حسینؑ اس قابل ہوتا کہ تمہیں کسی محفوظ جگہ پہنچا دیتا۔ یہ سنتے ہی اس زن مومنہ نے سر و سینہ پیٹا اور رو رو کر کہنے لگی۔ یا ابن رسولؐ اللہ کیا میری عزت، میری ناموس دختران علیؑ و فاطمہؑ سے زیادہ ہے۔ میں تو زینبؑ و ام کلثومؑ کی ادنیٰ کنیز ہوں۔ میرے لئے اس سے زیادہ شرف کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ رہ کر اپنی زندگی بسر کروں۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

گیارہویں مجلس

والدین کا حق۔ فضائلِ اصحاب حسینؑ

شہادت وہب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیۡ کِتَابِہِ الۡمَجِیۡدِ وَفُرۡقَانِہِ الۡحَمِیۡد

وَوَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ اِحۡسٰنًا ؕ حَمَلَتۡہُ اُمُّہٗ کُرۡہًا وَّ وَضَعَتۡہُ کُرۡہًا ؕ وَحَمۡلُہٗ وَفِصٰلُہٗ ثَلٰثُوۡنَ شَہۡرًا (سورہ احقاف ۱۵/۴۶)

ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ احسان کرے اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا اور اس کی حمل اور دودھ بڑھائی کی مدت تیس ماہ ہے۔

مفسرین عامہ نے اس آیت کو عام انسانوں سے متعلق کر رکھا ہے۔ لیکن انہوں نے اس خصوصیت پر غور نہیں کیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اکثر مقام پر قرآن میں اولاد کو ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بھی صحیح ہے حمل کی حالت میں اور وضع حمل کے وقت ہر عورت کو تکلیف ہوتی ہے لیکن عموماً حمل اور دودھ بڑھائی کی مدت ۳۳ ماہ یا اس سے کچھ بیش و کم ہوتی ہے۔ تیس ماہ صرف اسی حالت میں ہے۔ جب کہ حمل کا زمانہ صرف چھ ماہ ہو۔ کیونکہ دودھ بڑھائی کی مدت اسلامی شریعت میں دو سال یعنی ۲۴ ماہ قرار دی گئی ہے وَالۡوَالِدٰتُ یُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَہُنَّ حَوۡلَیۡنِ کَامِلَیۡنِ سورہ البقرہ

۲/۲۳۳) یعنی مائیں اپنے بچوں کو دو سال دودھ پلائیں۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ دو سال بعد دودھ بڑھائی کی جاتی ہے۔ لیکن چھ ماہ کے حمل سے پیدا ہونے والا کوئی بچہ زندہ ہی نہیں رہتا کیونکہ اس کی خلقت پوری طرح تکمیل نہیں ہو پاتی۔ مگر مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مخصوص انسان کو والدین سے احسان کی وصیت کی گئی ہے وہ چھ ماہ کے حمل بعد پیدا ہوا اور وہ زندہ رہا۔

تمام مورخین اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ جب سے نسلِ انسانی چلی ہے سوائے دو بچوں کے تیسرا بچہ چھ ماہ کے حمل والا زندہ ہی نہیں رہا۔ ان میں ایک جناب یحییٰؑ ابن ذکریاؑ ہیں اور دوسرے امام حسین علیہ السلام۔

پھر یہ خصوصیت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ حمل اور وضع حمل کے وقت کی یہ کوئی خاص تکلیف ہے جس کی طرف اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے اور اس خصوصیت کے بعد جناب یحییٰ کا اشتراک بھی ختم ہو جاتا ہے۔

حالانکہ حمل اور وضع حمل کی عام تکلیف عام ولادتوں کے ساتھ ہے لیکن یہ بچہ جو چھ ماہ کے حمل کے بعد پیدا ہوا اس کی ماں کی تکلیف ایک دوسری ہے۔ بسند معتبر منقول ہے کہ جب امام حسینؑ حالت حمل میں تھے تو جبرئیل امین نے یہ خبر سنائی کہ یہ بچہ تین دن کا پیاسا شہید کیا جائے گا۔ رسولؐ خدا نے یہ خبر جناب فاطمہؑ کو سنائی۔ ایسی روح فرسا خبر ماں کے دل پر جتنا بھاری قلق پیدا کر سکتی ہے اس کا اندازہ ایک صحیح فطرت کا انسان یقیناً کر سکتا ہے۔

والدین کی عزت، خدمت اور اطاعت کا حکم تمام شریعتوں میں رہا ہے۔ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا رشتہ ماں باپ ہی کا ہے۔ توریت میں قانوناً یہ حکم نافذ کیا گیا تھا جو کوئی اپنے ماں یا باپ پر لعن کرے گا۔ اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ یہی حکم جناب عیسیٰؑ کی انجیل میں دہرایا گیا ہے۔ اسلام نے اس اطاعت و فرمانبرداری کے ہر گوشہ پر تفصیلی روشنی ڈال دی ہے۔

ایک شخص نے حضرت رسولؐ خدا سے دریافت کیا میرے حسنِ سلوک کا مستحق کون ہے۔ فرمایا تیری ماں۔ اس نے پوچھا پھر کون۔ فرمایا تیری ماں۔ اس نے کہا پھر کون۔ فرمایا تیری ماں۔ تین دفعہ آپ نے یہی جواب دیا۔ چوتھی بار پوچھنے پر فرمایا تیرا باپ ماں کی بہ نسبت باپ کے حمل سے لے کر دودھ بڑھائی تک اور اس کے بعد تا طلوع البلوغ کی نگہداشت پر باپ سے زیادہ تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ایک بار حضورؐ نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور ان میں سب سے پہلے ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کر دی ہے۔

ایک شخص نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے میرے لئے کوئی توبہ ہے فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے اس نے کہا نہیں فرمایا خالہ ہے اس نے کہا ہے فرمایا اس کے ساتھ نیکی کر۔

ایک صحابی نے کہا میں نے جہاد کا ارادہ کیا ہے۔ آپ سے مشورہ چاہتا ہوں۔ فرمایا تیری ماں ہے۔ اس نے کہا ہے۔ فرمایا تو اسی

جنت کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ خلقت انسانی کی بنیاد ماں باپ دونوں سے پڑتی ہے۔ لیکن ماں وہ ہستی ہے جس نے اس کو خون پلا پلا کر پڑھایا۔ نو مہینے تک حمل کی سختی اٹھائی۔ پھر جلنے کی ناقابل برداشت تکلیف گوارا کی۔ پھر اسی نو پیدا مضغہ گوشت کو اپنی چھاتی سے لگا کر اور اپنا خون پانی کر کے اس کو پلایا۔ اور اس کی پرورش میں اپنے ہر راحت و آرام کو ترک کیا۔ اپنی ہر خواہش اس پر نثار کر دی ایسی حالت میں ماں سے بڑھ کر احسان کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے۔ ماں کے ساتھ تولید و تکوین و پرورش میں شریک دوسری ہستی باپ ہے۔ اس نے اولاد کی پرورش میں اپنے آپ کو انتہائی تعب میں ڈالا۔ طرح طرح سے کوششیں کر کے اس کو قوت بہم پہنچائی۔ لہٰذا اولاد پر فرض ہوا کہ ان احسانات کے بدلے میں وہ ان کی اطاعت کرے۔
اسلام نے پہلے صحیفوں کی طرح صرف ماں باپ کی عزت کا حکم نہیں دیا بلکہ ان کی خدمت ان کی اطاعت، ان کی دلدہی ہر چیز کو فرض قرار دیا بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اُف تک نہ کرو۔ ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو۔ ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو۔ ان ہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے۔ بلکہ ان ہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔ خدا نے اپنی عبادت کے بعد ماں باپ کے ساتھ احسان کو لازمی قرار دیا ہے۔
وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (سورہ البقرہ ۲/۸۳) ایسا حکم اور کئی آیتوں میں بھی ہے۔
سورہ بنی اسرائیل کی اس آیت میں بہت زیادہ توضیح ہے۔
وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَآ أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَآ أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (سورہ بنی اسرائیل ۱۷/۲۳)
اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے تک پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہو اور ان پر خفا نہ ہو اور ان سے ادب سے بولو اور ان کے لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکا دو۔ اور کہو اے میرے پروردگار تو ان پر رحمت نازل کر جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پالا۔
ایک موقع ایسا ہے جہاں اطاعت کا حکم نہیں۔ یعنی اگر ماں باپ مشرک بنانا چاہیں تو ان کا حکم نہ ماننا چاہیے لیکن پھر بھی احسان ان کے ساتھ کرنا چاہئے۔
ایک بار بہت سے صحابہ حاضر خدمت تھے۔ حضرت نے فرمایا وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا۔ لوگوں نے پوچھا حضور کون۔ فرمایا جس نے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے میں پایا اور ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کی۔

یہ تھا ان احسانات کا ذکر جو عام لوگوں کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کے لئے لکھا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عنوان کلام میں جو آیت لکھی گئی ہے اس میں جس احسان کا ذکر ماں باپ کے ساتھ ہے وہ کون سا ہے چونکہ یہ آیت امام حسین علیہ السلام کی شان میں ہے لہذا اس احسان کا تعلق بھی ان ہی سے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک وہ جس کا تعلق ان کے جسم مادی سے ہے مگر ان کے مصارف ضروریہ کی خبر رکھنا۔ دوسرے ان کو جسمانی راحت پہنچانے کا خیال رکھنا۔ ان کا ادب و لحاظ رکھنا، ان کے سامنے سخت آواز سے نہ بولنا۔ کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے ان کو ایذا ہو۔ دوسری نیکی یہ ہے کہ جس نیکی کا بیج انہوں نے بویا ہے۔ اس کو باقی رکھنا ان کے اعمال خیر کو رواج دینا۔ ان کے پند و نصائح پر عمل کرنا اور دوسروں کو ان کی طرف رغبت دلانا۔

حضرت رسولؐ خدا جس دین کو لے کر آئے تھے اس کی محافظت کے لئے آپ نے اپنے بعد اہل بیتؑ کو چھوڑا تھا حضور کے بعد حضرت علیؑ نے احکام الہیہ کی تبلیغ کرنے میں طرح طرح کی مصیبتیں اٹھائیں۔ امام حسنؑ نے تکالیف برداشت کیں لیکن باوجود اس کے بدعت و ضلالت کے طوفان اٹھتے رہے۔ یہاں تک کہ یزید کے دور حکومت تک معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ نیکی دبدی میں امتیاز نہ رہا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک صورت یہ پیدا ہوگئی کہ لوگ بدی کو نیکی اور نیکی کو بدی سمجھنے لگے۔ اس سے زیادہ مصیبت کا وقت دین اسلام کے لئے اور کون ہو سکتا تھا۔ سرمایہ دار غریبوں کے حقوق پامال کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ غریب اسی لئے ہیں کہ ان کی کھال کے جوتے بنائے جائیں۔ حکام رعایا پر طرح طرح کے مظالم کر کے خوش تھے کہ ہم نے بادشاہ وقت کے حکم کی تعمیل کی اور چونکہ وہ اولی الامر میں سے ہیں۔ لہذا ہم اس کی اطاعت میں مستحق جنت ہوئے۔ شراب پی پی کر لوگ نمازیں پڑھاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس میں کوئی گناہ نہیں۔ زناکار کا سر بھولے سے بھی ندامت کا پسینہ نہ ٹپکاتا تھا۔ رقص و سرور، لہو و لعب، اسراف و ہوس رانی زندگی کے محبوب مشغلے تھے۔ رسولؐ خدا کی ۲۳ سالہ محنت کے ضائع ہو جانے کا قوی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اسلام کی صورت مسخ ہوتی جا رہی تھی ارباب ایمان ذلیل و خوار تھے اور شرارت پسند و مفسدہ پرداز بغلیں بجاتے پھر رہے تھے۔

ایسے نازک وقت میں حسین علیہ السلام نے اسلام کی حمایت کا بیڑا اٹھایا اور اپنے نانا اور باپ اور ماں کی محنتوں کو برباد ہونے سے بچالیا۔ یہ وہ احسان ہے جس سے گردن اسلام ابدالآباد تک خم رہے گی۔

یزید کے دور حکومت میں اچھے اچھے نامور مسلمانوں اور تقدس کے لفافے میں لپٹے ہوئے مسلمانوں کے ایمان تختہ بازار پر آگئے تھے اور جس کو حسب خواہش ملتی جاتی تھی وہ سودا کر کے اپنی جھولی بھر لیتا تھا۔ بعض ایسے تھے جو حکومت کی فرعونی سطوت سے مرعوب ہو کر بجائے حضور کہنے میں اپنی جان کی اور مال کی سلامتی ڈھونڈ رہے تھے۔ بعض کو جاہ و منصب کی حرص نے ظلم و استبداد کی آستاں پر سر نیاز جھکانے پر مجبور کیا تھا۔ بعض مصلحت اندیشوں نے حکومت کی مخالفت میں جان کا خطرہ محسوس کر کے لبوں پر مہر سکوت لگا لی تھی اور دروازے بند کر کے بیٹھ رہے تھے۔

قوم کی بے حسی اور اسلامی احکام کی ناقدری سے یزید نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ عام مسلمانوں کی ذہنیت کا اندازہ کرتے ہوئے

اس نے بیعت کے متعلق امام حسین علیہ السلام سے چھیڑ چھاڑ کر دی۔ وہ سمجھتا تھا کہ حسینؑ کی مجھ سے ٹکر لینے کی قوت نہیں وہ مجبوراً یا تو مجھ سے بیعت کریں گے ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھوئیں گے۔ یزید کو دھوکا تھا اس نے امام حسین علیہ السلام کی شخصیت کو پہچانا ہی نہ تھا۔

جو لوگ عسکری نظام کو خزانوں کی بھرمار حکومت کی سطوت و ہیبت پر ایمان لانے والے ہوں جن کے نزدیک سلطنت کا نام قوت ہو وہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ صداقت کے بازوؤں میں کتنا زور ہے وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ مظلومیت کو ایک ظالم کی تباہی و بربادی میں کتنا بڑا دخل ہے شیطانی اور لاہوتی قوت میں کیا فرق ہے۔

حسینؑ نے یزید کی بیعت کو ٹھکرا دیا۔ اور ہر آنے والی مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

یہ تو ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ ایک منظّم سلطنت سے ٹکر لینا بغیر فوج اور خزانے کے ممکن نہیں ہوتا۔ حسینؑ چند آدمیوں کے زور پر ایسا غلط ارادہ کیسے کر سکتے تھے۔ وہ اس مقصد کو لے کر مدینے سے نکلے تھے کہ قوم کے خفتہ احساس کو بیدار کر دیں۔ اور اُن میں اتنی جرأت پیدا کر دیں کہ وہ باطل سے ٹکر لینے میں گھبرائیں نہیں حسینؑ اپنے مقصد میں یقیناً کامیاب ہو گئے۔

حسین علیہ السلام نبی اُمیہ کے عہد سلطنت کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے تک پہنچ گئے تھے کہ اخلاقی اور ایمانی پستی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ بغیر زبردست قربانی دیئے حق و باطل کے درمیان حد فاصل قائم نہیں ہو سکتی حسین علیہ السلام نے کربلا میں اپنی ساری بضاعت لا کر ڈال دی اور اس قوت کے ساتھ یزید کا مقابلہ کیا کہ دُنیا حیران ہو کر رہ گئی، اور یہ کہنے پر مجبور ہوئی ؎

از ہیچ ہیبت کہ نیا بد ایں کار
واللہ کہ اے حسین کار کردی

یزید کو شکست ہو گئی اس معنی سے کہ اس کا مقصد پورا نہ ہوا۔ اس کی ہٹ یہ تھی کہ حسینؑ سے بیعت لے کر رہوں گا حسین علیہ السلام اس پر تلے ہوئے تھے کہ ہرگز ہرگز ایک مرد فاسق کی بیعت نہ کروں گا یزید اپنی پوری قوت صرف کرنے کے بعد بھی حسین علیہ السلام سے بیعت نہ لے سکا تھا۔ اور حسینؑ رفقاء کے زور پر اپنے ارادے میں کامیاب ہو گئے۔

چالیس ہزار کا ۷۲ مجاہدوں کو قتل کر دینا کوئی بہادری کا کام نہ تھا۔ البتہ بہتر کا اتنی عظیم الشان فوج سے تین دن کی بھوک پیاس میں ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور ایک چوتھائی فوج کا صفایا کر دینا یقیناً ایک ایسا معجز نما کارنامہ ہے جس کی رہتی دُنیا تک لوگ خواہ وہ کسی قوم اور کسی ملک کے ہوں سراہتے رہیں گے۔

یزیدی فوج میں کرائے کے ٹٹو تھے ایمان سے بے نصیب، وہ زر کی ہوس میں جان دے رہے تھے۔ اور امام حسین علیہ السلام

اور ان کے انصار رضائے الٰہی کی خواہش میں ہتھیلی پہ سر رکھ کر اور سر سے کفن باندھ کر میدان میں آتے تھے۔ بوڑھوں میں جوانوں کا سا جوش تھا بچوں میں بڑوں کی سی ہمت تھی۔ موت کی آرزو میں شہادت کے شوق میں سر دھنتے تھے اور ہر ایک کی خواہش تھی کہ جلد سے جلد اجازت کارزار حاصل کر کے شرف شہادت حاصل کرے جتنی دیر ہوتی تھی اتنی ہی چہرے پر اداسی چھائی تھی۔

لَبِسُوا الْقُلُوْبَ عَلَى الدُّرُوْعِ كَاَنَّمَا يَتَهَافَتُوْنَ عَلٰى ذِهَابِ الْاَنْفُسِ

انہوں نے زرہوں پر دل پہن لیے تھے اور جان دینے کے لئے ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا۔

حوصلے تھے یہ جوانانِ حسینی کے فقط
ورنہ لاکھوں سے بہتر کی لڑائی کیسی

جناب عابس کا واقعہ مشہور ہے کہ ان کے غلام نے ان سے جا کر کہا کہ آپ مجھے فرزند رسولؐ سے اجازت کارزار دلوا دیجئے عابس نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تو مجھ سے پہلے جنت میں جائے اور سعادت شہادت کو مجھ سے پہلے حاصل کرے۔ حنظلہ نے کہا جانے دو شاید تمہارے لعد یہ شکستہ خاطر ہو کر اس شرف سے محروم ہو جائے۔ اس مومن نے کہا آپ نے یہ کیا فرمایا میں اس شرف سے محروم ہونے کے لئے نہیں آیا۔ میں جانتا ہوں کہ موت برحق ہے لیکن آج سے زیادہ مرنے کا اور کون سا دن ہوگا۔ عابس سے کہتا ہے میرے آقا غلاموں کا قاعدہ ہے کہ آگے جا کر اپنے آقا کے آنے کی خبر دیا کرتے ہیں میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آپ سے پہلے شہید ہو کر رسولؐ خدا اور علی مرتضیٰ اور آقائے مظلوم کی والدۂ ماجدہ کو عنقریب آپ کے آنے کی خبر سنا دوں عابس نے یہ جذبہ دیکھ کر اپنے سینہ سے لگا لیا اور امام علیہ السلام کی خدمت میں لے کر گئے اور سارا حال بیان کیا حضرت نے رو کر فرمایا اچھا اگر اس کی یہی خواہش ہے تو میں اس کو اجازت دیتا ہوں۔

جناب بریر عبدالرحمٰن بن روبیہ سے مذاق کرنے لگے۔ انہوں نے کہا اسے بریر آج کا دن مذاق کا نہیں۔ دیکھ رہے ہو موت کس طرح چن چن کر لیے جا رہی ہے۔ بریر نے کہا بھائی میری قوم نے اس سے پہلے کبھی مجھ کو اس قسم کا مذاق کرتے نہیں دیکھا۔ میں مذاق کرنے کا عادی نہیں ہوں لیکن اس وقت جو غیر معمولی خوشی ہے میں اس کو ضبط نہیں کر سکتا۔ عبدالرحمٰن یہ گروہ ستم شعار ہے کیا جب تلواریں کر ان کی طرف بڑھیں گے۔ گوسفندان قربانی کی طرح کاٹ کر رکھ دیں گے۔ اس کے زخموں سے چور ہو کر اور خون میں نہا کر شرف شہادت حاصل کریں گے۔ یہاں سے سیدھے جنت میں جائیں گے۔ حوروں سے معانقہ کریں گے اور کوثر کا ٹھنڈا پانی پئیں گے۔

مسلم بن عوسجہ کی شہادت کے بعد ان کا کم سن لڑکا سر پر باپ کا عمامہ رکھے ہوئے چھوٹی سی تلوار کمر میں لٹکائے ہوئے پٹکے سے کمر کسے ہوئے خدمت امام میں حاضر ہوتا ہے۔ ابن رسول اللہؐ مجھے اجازت کارزار دیجئے حضرت نے آبدیدہ ہو کر فرمایا

بیٹا! تو کم سن ہے۔ فن حرب و ضرب سے آگاہ نہیں۔ کیوں کر تجھے مرنے کی اجازت دوں۔ تیری ماں تیرے باپ کے غم میں آنسو بہا رہی ہے تو باپ کی نشانی ہے تجھے دیکھ کر اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو ڈھارس ہو گی تیرے مرنے کے بعد اس غم دیدہ بیوہ کا کیسا حال ہوگا۔ زندہ درگور ہو جائے گی۔ لڑکے نے کہا۔ میرے مظلوم آقا میری ماں ہی نے تو مجھے بنا کر بھیجا ہے۔ امام علیہ السلام کو تابِ ضبط نہ رہی۔ سینے سے لپٹا کر رونے لگے اور پھر خیمہ کے دروازے پر آ کر فضہ سے کہا کر زوجہ مسلم سے کہو کہ اس کم سن بچے کو میدان میں جانے سے روکے اس زن مومنہ نے کہا میرے شوہر کی وصیت یہ ہے کہ میرے بعد اس بچے کو بھی فرزند رسولؐ پر نثار کر دینا۔ یا ابن رسولؐ اللہ یہ تو ایک ہی بچہ ہے اگر دس بھی ہوتے تو میں باری باری آپ پر قربان کر دیتی۔

وہب بن عبداللہ بھی کوفہ کا ایک پُر جوش جوان ہے جس کی شادی کو کُل بیس روز ہوئے ہیں۔ جب کوفہ میں اسے یہ خبر ملی ہے کہ فرزند رسولؐ کربلا میں گھر چکے ہیں تو گھبرایا ہوا ماں کے پاس آیا۔ اماں جان فرزندِ رسولؐ کربلا میں گھیر لئے گئے ہیں اور کوفہ سے برابر فوجیں کربلا کی طرف جا رہی ہیں۔ اس زن مومنہ نے کہا اے وہب ایسی حالت میں تم کو میرے مولا کی مدد کرنی چاہیے۔ وہب نے کہا یہاں سے چلنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ہر طرف فوجوں کی نقل و حرکت ہے۔ انہوں نے کہا جو کچھ ہو جانا ضروری ہے وہب چلنے پر تیار ہوئے تو ماں نے کہا میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔ بی بی نے کہا مجھے بھی ساتھ لو میں بغیر تمہارے یہاں کس کے سہارے سے رہوں گی۔ الغرض وہب اپنی ماں اور اپنی بی بی کو لے کر راتوں رات کوفہ سے نکلے اور غیر معروف راستوں سے طے منازل کرتے کربلا پہنچ گئے۔

شب عاشورہ جب امام مظلومؑ اپنے رفقاء کا جذبہ محبت دیکھنے کے لئے ایک ایک خیمہ کی طرف گئے تو مادر وہب کے خیمے کے پاس جا کر یہ آواز کان میں آئی۔ ماں بیٹے سے کہہ رہی ہے اے وہب! تم بہت کم سن تھے کہ تمہارے باپ کا انتقال ہو گیا۔ میں نے بڑی مصیبتوں سے محنت مزدوری کر کے تم کو پالا پوسا اور جوان کیا۔ پھر تمہارا بیاہ کیا میں چاہتی ہوں کہ مجھے تم اس مادرانہ شفقت کا صلہ دو۔ وہب نے کہا۔ جو کچھ آپ حکم دیں میں اس کے بجا لانے کو تیار ہوں ماں نے کہا بس تیری خدمت کا صلہ یہی ہے کہ کل جب میدان کارزار گرم ہو تو تم میرے آقا پر اپنی جان نثار کر کے مجھے میری شہزادی فاطمہ زہرا سلام علیہا سے سرخرو کرو۔ وہب نے وعدہ کر لیا۔ حسین علیہ السلام اپنی نصرت کا یہ جوش دیکھ کر رونے لگے، اور ماں بیٹے کے لئے دعائے خیر کی۔

روز عاشورہ۔ جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو مادر وہب اپنے خیمہ میں اس بات کا انتظار کرنے لگیں کہ وہب آ کر مجھے یہ مژدہ سنائے کہ مظلوم کربلا نے مجھے اجازت کارزار دے دی ہے۔ لیکن وہب کے آنے میں تاخیر ہوئی۔ گھبرا کر خیمے کے دروازے پر آئیں اور آواز دی کہ وہب ذرا دیر کے لئے میرے پاس آؤ۔ وہب گھبرائے ہوئے خیمے کے پاس آئے۔ اس زن مومنہ نے کہا وہب دوسروں کے قتل ہونے کا تماشا کب تک دیکھو گے۔ کیا اس وقت لڑنے نکلو گے جب اولادِ رسولؐ

کٹنی شروع ہو جائے گی۔ وہب یہ یاد رکھنا اگر نصرت حسینؑ میں کوتاہی کی تو دودھ نہ بخشوں گی۔
وہب نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ اے مادر گرامی اس میں میرا قصور نہیں میں تو کئی بار خدمت فرزند رسولؐ میں اجازت لینے گیا مگر وہ کسی طرح راضی نہیں ہوتے اور فرماتے ہیں اے نوجوان! ابھی چند روز تو تیری شادی کو ہوئے ہیں تو نے لطف جوانی حاصل نہیں کیا ایسی حالت میں کیونکر اجازت دوں۔ اس نے کہا اچھا میری طرف سے فرزند رسولؐ سے عرض کرکے ذرا دیر کے لئے میری والدہ کے پاس تشریف لے جائیے وہ آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتی ہیں۔
امامِ مظلوم جب مادر وہب کے خیمے کے پاس آئے تو زن مومنہ امام کے قدموں پر گر پڑی اور رو رو کے کہنے لگی یا ابن رسولؐ اللہ! خدا کے لئے وہب کو نہ روکئے۔ مجھے اپنی مادر گرامی سے سرخرو ہونے دیجئے۔ امام نے اس زنِ مومنہ کی ہمت پر تحسین و آفرین کی۔ اور مجبور ہوکر وہب سے فرمایا اچھا جاؤ اپنی ماں اور بی بی سے رخصت ہو آؤ۔ وہب خیمے میں آئے۔ ماں نے پیار کیا اپنے ہاتھوں سے بیٹے کی کمر کسی۔ ہتھیار بدن پر سجائے اور دعائیں دے کر کہا جاؤ راہ خدا میں جہاد کرو۔ وہب ماں سے رخصت ہوکر بی بی کے پاس آئے۔ وہ شوہر کو مرنے پر آمادہ دیکھ کر رونے پیٹنے لگی۔ اس کو تسلی دینے میں وہب کو ذرا تاخیر ہوئی تو ماں نے درخیمہ کے پاس جاکر کہا۔ وہب بیٹا عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں میں نہ آنا اور مجھے روحِ فاطمہ زہراؑ سے شرمندہ نہ کرنا جلد خیمہ سے نکلو تاخیر کا محل نہیں۔
وہب بی بی کو رخصت کرکے میدان میں آئے اور اس شجاعانہ انداز میں کارزار کی کہ فوج مخالف کے پرے کے پرے اُلٹ دیئے۔
فوجِ حسینی کے جوان اس کی کارزاری کی تعریف کر رہے تھے۔ جب دُور تک فوج کو بھگا دیا تو لشکر گاہ حسینی کی طرف لوٹے اور ماں کے خیمے کے پاس آکر کہا اے مادر گرامی آپ مجھ سے راضی ہیں وہ زن مومنہ کہنے لگی۔ اے وہب ابھی نہیں جب تک تیرا سر کٹا ہوا اور تیری لاش خاک و خون میں آغشتہ نہ دیکھوں گی ہرگز خوش نہ ہوں گی بیٹا پھر جا اور فرزند رسولؐ کے دشمنوں کو قتل کر۔
وہب بارِ دیگر پھر میدان میں آئے اور دیر تک جنگ کرتے رہے۔ آخر زخمی ہوکر گھوڑے سے گرے دشمنوں نے آگے بڑھ کر اس عاشق حسین کا سر کاٹ لیا اور خیام حسینی کی طرف پھینک دیا۔ مادر وہب نے بڑھ کر اپنے جوان فرزند کا سر اُٹھالیا۔ پیار کیا اور پھر لشکر اعدا کی طرف پھینک کر کہا۔
جو چیز راہِ خدا میں دے دیتے ہیں اسے واپس نہیں لیتے اس کے بعد عمود خیمہ لے کر میدان میں آئیں اور دشمنوں کو مارنے لگیں۔ چار اشقیا کو فی النار والسقر کیا۔
امام حسین علیہ السلام نے جب اس زن مومنہ کا یہ حال دیکھا تو آواز دی۔ اے مادر وہب واپس آجاؤ

عورتوں پر جہاد فرض نہیں وہ حکم امام حسن کر واپس آ گئیں۔
ایک روایت میں ہے کہ زوجہ وہب خیمہ سے نکل آئیں اور قتل گاہ میں پہنچیں اور لاش وہب سے لپٹ کر زار زار رونے لگیں۔ ایک دشمن نے گرز آہنی اس دکھیا بیوہ کے سر پر مار کر کام تمام کر دیا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

بارہویں مجلس

امیرالمومنین علی علیہ السّلام کے فضائل

شہادت پسران جناب زینبؑ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمْ زَیِّنُوْا مَجَالِسَکُمْ بِذِکْرِ عَلِیِّ ؑ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ لِاَنَّ ذِکْرَہٗ ذِکْرِیْ وَ ذِکْرُ اللّٰہِ عِبَادَۃٌ

اپنی مجلسوں کو علیؑ بن ابی طالبؑ کے ذکر سے زینت دو۔ اس لئے کہ ان کا ذکر میرا ذکر ہے اور میرا ذکر خدا کا ذکر ہے اور خدا کا ذکر عبادت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جناب علیؑ کا ذکر کرنے سے رسولؐ اور خدا کا ذکر بھی ہو جاتا ہے۔ پس ذکر کرنے والے کو تین گنا ثواب مل جاتا ہے۔

جناب علی نفس رسولؐ بھی اور نفس اللہ بھی ہیں لہذا جب ان کا ذکر ہوگا تو محالہ رسولؐ خدا اور خدا دونوں کا ذکر بھی ہو ہی جائے گا۔

ایک حدیث میں فرمایا ہے اَلنَّظَرُ اِلٰی وَجْہِ عَلِیٍّ عِبَادَۃٌ (علیؑ کے چہرے پر نظر کرنا عبادت ہے)

پھر اس خیال سے کہ یہ سعادت تو صرف ان ہی لوگوں کو نصیب ہوگی جو علیؑ کے زمانے میں ہوں گے۔ مابعدہ زمانے والے اس سعادت

ے محروم رہیں گے لہذا ان کے لئے بھی کوئی ذریعہ ثواب ہونا چاہیئے۔ لہذا فرمایا حضرت نے ذِكْرُ عَلِيٍّ عِبَادَةٌ لیکن اس خیال سے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ ذکر علیؑ کو ممنوع قرار دیا جائے گا اور ذکر کرنے والے مجرم قرار دیئے جائیں گے۔ اس بنا پر لوگ ذکر نہ کرسکیں گے۔ لہذا پھر آپؐ نے فرمایا حُبُّ عَلِيٍّ عِبَادَةٌ (علیؑ کی محبت عبادت ہے) یہ محبت ہر زمانے والے کرسکتے ہیں اور دشمنوں کے ضرر سے محفوظ رہ سکتے ہیں کیونکہ محبت ایک قلبی کیفیت ہے دوسرا اس کو نہیں جان سکتا۔

ایک روز ایک شخص نے حضورؐ سے کہا یا نبی اللہ! علیؑ کے فضائل آخر کتنے ہیں تاکہ ہم ایک بار ان سب سے واقف ہوجائیں۔ آپ نے فرمایا۔

لَوْ كَانَ الرِّيَاضُ اَقْلَامًا وَّالْبُحُوْرُ مِدَادًا وَالْجِنُّ حُسَّابًا وَّالْاِنْسُ كُتَّابًا مَا اَحْصَوْا فَضَائِلَ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ (اگر تمام اشجار قلم بن جائیں اور تمام دریا سیاہی بن جائیں اور تمام جن حساب کرنے والے ہوں اور تمام انسان لکھنے والے ہوں تو بھی وہ فضائل علیؑ کا احصا نہیں کرسکتے۔

غور کیجئے دنیا میں کتنے درخت ہیں ایک ایک درخت سے لاکھوں قلم بن سکتے ہیں۔ پھر سمندر رکتنے ہیں۔ ان کی سیاہی کتنی ہوسکتی ہے۔ پھر تمام قوم جن حساب کرنے والی اور تمام انسان لکھنے والے ان کی تعداد کو کون بتا سکتا ہے۔ لیکن وہ فضائل اتنے زیادہ ہیں کہ باوجود ان سب باتوں کے ضبط تحریر میں آسکتے۔ بظاہر یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں معلوم ہوتی لیکن یہ لوگوں کی فہم کا قصور کہا جائے گا۔

جنگ خندق میں جو ضرب علی علیہ السلام نے عمرو بن عبدود کے سر پر لگائی تھی جس سے وہ قتل ہوا اس کے متعلق حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔ ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ جو ضرب روز خندق علیؑ نے عمرو بن عبدود پر لگائی وہ دونوں جہان یعنی جن وانس دونوں کی عبادت سے بہتر ہے) غور کیجئے جس کی ایک ضرب کے وزن پر دونوں جہان کی عبادت تل جائے اس کے دیگر افعال حسنہ کا کیا اندازہ ہوسکے گا۔ علیؑ کی صرف یہی تو ایک فضیلت نہ تھی۔ صرف یہی ایک عمل نیک تو نہ تھا بلکہ بے شمار کام ان سے ظہور پذیر ہوئے۔ ان کا ثواب بھی آخر کچھ ہوگا۔ بتایئے جب ایک ضرب کے فضائل کا احصاء ممکن نہیں تو بھلا اوروں کو کیونکر شمار میں لایا جاسکتا ہے۔

ذرا اس حدیث ضربت پر ایک غائرانہ نظر ڈالئے۔ اگر عمرو بن عبدود کو علیؑ قتل نہ کرتے اور وہ غالب آجاتا اور حضورؐ سرور انبیاء کو شہید کردیتا تو اسلام کا خاتمہ ہوجاتا۔ پھر قیامت تک جو اعمال خیر اسلام کے سائے میں ہوئے تھے وہ بھی ختم ہوجاتے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ علیؑ نے اسلام اور رسول اسلام کی حفاظت کرکے قیامت تک اسلامی احکام کی نگہداشت بھی کرلی اور مسلمانوں کے تمام اعمال نیک کے بجالانے کا ذریعہ بھی بن گئے۔ کون بتا سکتا ہے کہ دنیا میں اس وقت سے قیامت تک کتنے اعمال نیک پیدا کرنے والے ہوئے ہیں اور ہوں گے کسی کی طاقت نہیں کہ شمار میں لاسکے پس اگر ہر عمل خیر کے

ساتھ علیؑ کو بھی اس کا ثواب ملے تو بتایئے کہ ان کا احصاء کیوں کر ہوگا۔ پھر انسانوں کی طرح شریعتِ محمدیؐ جنوں کے لئے بھی تھی یہی صورت وہاں بھی ہوگی۔ ہر عملِ خیر کے مقابل علیؑ کی فضیلت تسلیم کرنی پڑے گی۔ اس بنا پر یہ حدیث بالکل صحیح ہوگی۔

علیؑ کے ہر عمل پر نظر ڈالئے تو اس کے دامن سے بے شمار اعمالِ خیر وابستہ ہوں گے۔

ایک موقع پر حضورؐ نے فرمایا یا علی اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ تمہارے بارے میں وہی کہنے لگیں گے جو عیسٰی بن مریمؑ کے بارے میں کہتے ہیں تو میں تمہارے وہ فضائل بیان کرتا کہ تم جدھر سے گزرتے لوگ تمہارے قدموں کی خاک اٹھا کر اپنی آنکھوں کا سرمہ بناتے۔

علیؑ کے فضائل کا کیا ٹھکانہ ہے۔ خدا نے چھپائے، رسولؐ نے چھپائے۔ دشمنوں نے چھپائے، دوستوں نے چھپائے پھر بھی ہزارہا ضخیم کتابیں آپ کے فضائل سے پر ہیں۔ خدا نے اس لئے چھپائے کہ مسیح کی طرح لوگ ان کو میرا شریک قرار نہ دیں۔ رسولؐ نے اس لئے چھپائے کہ لوگ ان کے کھلم کھلا دشمن نہ ہو جائیں۔ دشمنوں نے اس لئے چھپائے کہ لوگوں کی رجوع ان کی طرف نہ ہو۔ دوستوں نے اس لئے چھپائے کہ ان کو ڈر تھا کہ دشمن قتل نہ کر دیں۔ باوجود اتنی روک تھام کے کون سی تفسیر کی کتاب، کون سی حدیث یا تاریخ و سیر کی کتاب ہے۔ جس میں بہ کثرت علیؑ کے فضائل نہیں۔ اور سوائے خوارج کے اسلام کا وہ کون سا فرقہ ہے جس نے علیؑ کے فضائل نہیں لکھے۔

مسلمانوں کو چھوڑیئے دنیا کی وہ کون سی قوم ہے جس نے علیؑ کے فضائل کو بیان نہیں کیا۔

ایک مصری عالم نے کیا خوب کہا ہے کہ جس کے فضائل کو معاویہ جیسا دشمن جس نے برسرِ منبر علی علیہ السلام پر تبرا کرایا نہ چھپا سکا اس کی ذات سے کسی صاحبِ فضیلت کی ذات کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

ابن الحدید نے لکھا ہے کہ ازل سے ابد تک انسانی فضائل کے جتنے باب بن سکتے ہیں۔ امورِ خیر کی جتنی لمبی چوڑی فہرست تیار ہو سکتی ہے علیؑ کا نام ہر باب میں مقدم اور ہر فہرست میں سرِ فہرست ہوگا۔

حضرت علی علیہ السلام کی یہ فضیلت بھی خصوصیت سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خداوند عالم نے جہاں اپنا اور اپنے رسولؐ کا ذکر کیا ہے وہاں علی علیہ السلام کا ذکر ضرور کیا ہے۔ چند آیتیں اس پر دال ہیں۔

۱۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (سورہ المنافقون ۶۳/۸) (عزت خدا کے لئے ہے اور اس کے رسولؐ کے لئے۔ اور مومنین کے لئے) یہاں مومنین سے عام مومنین مراد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو حقیقی عزت اہل ایمان کے قلوب میں خدا رسولؐ کی ہے وہ عام مومنوں کی نہیں جس سے صدورِ گناہ کا امکان ہے وہ حقیقی عزت کا مستحق نہیں۔

۲۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا (سورہ المائدہ ۵/۵۵) (چونکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی ولایت مطلقہ ہے اور اسی کے ساتھ ایمان والوں کا ذکر ہے لہذا ان کی ولایت بھی ولایت مطلقہ ہوگی اور ولایت مطلقہ سوائے معصوم کے دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ ورنہ ولایت مطلقہ کے ساتھ مشروط ولایت مہمل سی بات ہوگی۔

۳۔ وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ (سورہ التوبہ ۱۰۵/۹) (عمل کرو مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ) اللہ تمہارے عمل کو دیکھتا ہے اور اس کا رسولؐ اور کچھ ایمان والے) یہاں بھی عام مومنین مراد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ رویت اعمال ان سے ممکن نہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ہزاروں پردے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے گھر والوں کے اعمال کی نگرانی نہیں کر سکتے۔ چہ جائیکہ تمام بنی نوع انسان کی۔ یہ بات تو خدا و رسولؐ کے ہی لیے ہے یا پھر ان مومنین کے لیے جن کی طینت رسولؐ کی طینت ہو۔ جن کی خصوصیت رسولؐ کی سی خصوصیات ہوں۔ یہ حکم کسی زمانہ میں مختص نہیں بلکہ قیامت تک لوگوں سے کہا جا رہا ہے بس وہ کچھ اور ہی مومنین ہیں تو جو رسولؐ کی طرح اعمال عباد کے قیامت دیکھنے والے ہیں ان میں سب سے پہلے علیؑ ہیں۔

۴۔ إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ (سورہ الاحزاب ۵۷/۳۳) وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ (سورہ الاحزاب ۵۸/۳۳) (جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو ایذا دیتے ہیں اور مومنین کو ستاتے ہیں۔ سوائے معصوم اور کسی کا یہ مرتبہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو اذیت دینا خدا و رسولؐ کی اذیت کے برابر ہو جائے۔

۵۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (سورہ النساء ۵۹/۴) یہاں رسول اور اولی الامر کی اطاعت ایک ہی اطیعوا کے تحت میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جیسی اطاعت رسولؐ کی ہے ویسی ہی اولی الامر کی ہے۔ لہٰذا اولی الامر سے مراد سوائے معصوم دوسرا نہیں ہو سکتا ورنہ معصوم اور غیر معصوم کی اطاعت ایک ہی ہو جائے گی۔

۶۔ فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا (سورہ التغابن ۸/۶۴) (اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسولؐ پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔) یہاں بھی نور سے مراد ذات علیؑ ہے۔

۷۔ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ (سورہ التحریم ۴/۶۶) (اللہ رسولؐ کا مددگار ہے اور جبرئیل اور صالح مومنین) یہاں بھی صالح المومنین سے مراد علیؑ ہیں۔)

۸۔ شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ (سورہ آل عمران ۱۸/۳) یہاں اولوا العلم سے مراد امیر المومنینؑ ہیں۔

رسولؐ اللہ کے ساتھ علی علیہ السلام کو جو خصوصیت تھی وہ آپ کے سوا اور کسی کو نہ تھی۔ آپ رسولؐ کے ساتھ نور میں میں شریک تھے جیسا کہ حضرت نے فرمایا اَنَا وَعَلِيٌّ مِنْ نُوْرٍ وَاحِدٍ رسولؐ کی طرح علیؑ بھی قریشی و ہاشمی و مطلبی تھے۔ رسولؐ کے آپ پروردہ تھے۔ رسولؐ نے آپ کے لئے فرمایا يَا عَلِيُّ اَنْتَ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْكَ شب ہجرت رسولؐ نے اپنا جانشین حضرت علی علیہ السلام کو بنایا۔ اپنی امانتوں کا امین اور اپنے قرضے کا ادا کرنے والا علیؑ کو بنایا۔ ہر جنگ میں اپنا علمدار لشکر علیؑ کو بنایا۔ اپنا داماد علیؑ کو بنایا۔ علیؑ کی اولاد کو اپنی اولاد کہا۔ علیؑ کو اپنا بھائی اور وارث بنایا يَا عَلِيُّ اَنْتَ اَخِيْ وَوَارِثِيْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ

علی علیہ السلام کو اپنے علم کا دروازہ بنایا۔ علیؑ کو اپنے دار الحکومت کا باب قرار دیا۔ مباہلہ میں علیؑ نفس رسولؐ تھے تطہیر میں رسولؐ کے ساتھ علیؑ شریک تھے۔ علیؑ رسولؐ کے ساتھ اصحاب کسا میں سے تھے۔ رسولؐ نے علیؑ کے سوا اپنے غسلِ میت کی کسی کو اجازت نہ دی۔ علیؑ کو غدیر خم میں اپنی طرح تمام مومنوں کا حاکم بنایا۔

علیؑ کو حدیث ثقلین میں قرآن کے ساتھ کیا۔ علیؑ کی منزلت اپنے لئے وہی قرار دی جو ہارونؑ کی منزلت موسیٰؑ کے نزدیک تھی۔ علیؑ کو اپنے دوش پر سوار کر کے کعبہ میں بت شکنی کرائی۔

علی علیہ السلام کی وہ ذات تھی کہ آپ نے آنِ واحد کے لئے بھی منشائے خدا و رسولؐ کے خلاف کبھی کوئی کام نہ کیا اور ہر ہر قدم پر پیروی رسولؐ کو مقدم سمجھا۔

ایک بار حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے کسی نے سوال کیا کہ فدک اگر علیؑ کا حق تھا تو انہوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس کو واپس کیوں نہ لیا۔ اس کو واپس نہ لینا اس کی دلیل ہے کہ وہ اس کو اپنا حق نہیں سمجھتے تھے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا یہ پیرویٔ رسولؐ تھی جب حضرت نے مکہ کو فتح کیا تو لوگوں نے آپ سے کہا اب آپ اپنے مکان پر قبضہ کر لیں۔ فرمایا ہمارا مکان عقیل نے چھوڑا ہی کہاں اس کو فروخت کر ڈالا ہم اہل بیت اس چیز کو واپس نہیں لیتے جو ہم سے از روئے ظلم لی جائے۔

ایک مرتبہ ابو حنیفہ نے امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا کہ اگر خلافت کی نص علیؑ کے لیے تھی تو انہوں نے اس کو بعدِ وفات رسول طلب کیوں نہ کیا۔ فرمایا کہ وہ اس سے ڈرے کہ سعد بن عبادہ کی طرح کوئی جن مغیرہ بن شعبہ کے تیر سے قتل کر ڈالے یعنی جس طرح مغیرہ نے سعد کو ہلاک کر کے مشہور کر دیا کہ سعد کو ایک جن نے قتل کیا ہے۔ اسی طرح مجھے بھی لوگ قتل کر کے کہہ دیں گے ان کو جن نے قتل کیا ہے۔

دوسرے حضرت رسولؐ خدا کی وصیت تھی کہ جب لوگ تمہارے حق پر قابض ہوں تو صبر سے کام لینا۔ حضرت نے نہج البلاغۃ کے خطبہ شقشقیہ میں فرمایا ہے فَصَبَرْتُ وَفِي الْحَلْقِ شَجًى وَفِي الْعَيْنِ قَذًى، میں نے اسی طرح مصیبت میں صبر کیا جیسے وہ صبر کرے جس کے حلق کو چھو لگا ہوا اور آنکھ میں کھٹک ہو۔

حضرت علیؑ کی حالت اس وقت وصی موسیٰؑ جناب ہارونؑ کی سی تھی۔ لوگوں نے ان کو حد درجہ کمزور بنا دیا تھا یعنی سوائے چند آدمیوں کے سب ان سے الگ ہو گئے تھے۔ اور ان کے قتل کا منصوبہ باندھ رہے تھے، چنانچہ جب موسیٰؑ آئے اور سوال کیا کہ تم ان سے کیوں نہ لڑے تو فرمایا کہ میں اس سے ڈرا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ علی علیہ السلام نے بھی تلوار اسی لیے نہ اٹھائی کہ اسلام میں تفرقہ پڑ جاتا۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ میں نے دیکھا کہ میرا کوئی مددگار سوائے میرے اہل بیت کے نہیں پس میں نے ان کو موت سے بچا لیا۔ اور میں نے ایسے معاملہ میں صبر کیا جو اندرائن کے پھل سے زیادہ تلخ تھا اور یہ بھی فرمایا کہ وفات رسولؐ کے بعد سے میرے اوپر وہ مصائب نازل ہوئے کہ پہاڑوں سے اٹھائے نہ اٹھتے۔ میں نے ان کو اٹھا لیا میں نے اپنے اہل بیت کو دیکھا کہ وہ بے چین ہیں۔ ضبط کی طاقت نہیں اور جو بلا نازل ہو رہی ہے۔ اس کی برداشت کی قوت نہیں رکھتے۔ بے قراری ان

کے صبر کو ختم کر چکی ہے اور ان کی عقل کو کمزور بنا چکی ہے اور ان کے فہم و انہام اور قول و استماع کے درمیان حائل ہو چکی ہے حضورؐ کی وفات کے بعد میں نے صبر کیا اور خاموشی کو لازم قرار دیا اور حضورؐ کی تجہیز و تکفین کی طرف آپ کے حکم کے مطابق متوجہ ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضور رسول خداؐ کی وفات کے بعد سے اہل بیت کے روحانی اقتدار کو روز بروز نئے سے نیا صدمہ پہنچتا رہا۔ حضرت علیؑ کا جمع کردہ قرآن اسی لیے نہ لیا گیا کہ قرآن سے ان کا تعلق رہے گا ان سے حدیث کی روایت کرنا جرم ہو گیا بلکہ ان کے فضائل کی کوئی حدیث بیان کرنا اپنے خون سے کھیلنا تھا۔ ان کی امامت کا وزن گرانے کے لئے بہت سے امام بنا دیئے گئے ان کے معجزات پر پردہ ڈالنے کے لئے ارباب تصوف کی بہت سی کرامتیں گھڑی گئیں۔ ان کے تزکیہ نفس کا اثر کھونے کے لئے صوفیائے کرام کا طبقہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

مالی حالت کو ان کی اس لئے کمزور بنایا گیا کہ اہل حاجت ان کے در پر نہ جائیں۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی جرأت اس حد تک بڑھ گئی کہ کربلا میں ان کے قتل کو کار ثواب سمجھا جانے لگا۔ ان پر پانی بند کرنے کو سب سے بڑی نیکی خیال کیا گیا۔ علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹیوں کو لوٹنے۔ قید کرنے اور شہر شہر برہنہ سر پھرانے کو بہتر محسوس کیا جانے لگا۔

کافروں کو بھی شاید اس بے دردی سے قتل نہ کیا جاتا جس طرح اولاد رسولؐ کو ذبح کیا گیا۔ کیسے صابر و شاکر بندے تھے کہ باوجود انتہائی مظالم سہنے کے انہوں نے ہمّت نہ ہاری اور ناموس اسلام کی حفاظت میں انہوں نے جان و مال و آبرو سب کو بھینٹ چڑھا دیا۔

مردوں کا کیا ذکر عورتوں نے نصرت دین کا وہ جوش دکھایا کہ اپنے ناز پروردہ بچوں کو اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو بڑی آرزو کے ساتھ میدان میں قتل ہونے کے لئے بھیجتی تھیں اور جن کے اولاد نہ تھی وہ اپنی اس محرومی اور بدنصیبی پر آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں

شب عاشور جب امام مظلومؑ خیمۂ جناب عباسؑ کے پاس پہنچے تو دیکھا بنی ہاشم کا چاند تلوار پر صیقل کر رہا ہے اور ام کلثوم ایک گوشہ میں بیٹھی زار زار رو رہی ہیں۔ ناگاہ جناب عباس کی نظر ستم رسیدہ بہن پر جا پڑی۔ تلوار چھوڑ کر آپ اس کے پاس پہنچے اور رونے کا سبب پوچھا۔ انہوں نے فرمایا بھیّا رونا اپنی بدقسمتی کا ہے۔ کل قربانی آل محمدؐ کا دن ہے۔ ہر ایک بی بی بھائی جان پر اپنی اولاد کو قربان کرے گی۔ آہ ام کلثوم ایسی بدنصیب ہے کہ اس کی کوئی اولاد نہیں جس کو اپنے بھائی پر نثار کرے۔ جناب عباسؑ رونے لگے، اور فرمایا شہزادی آپ غم نہ کریں عباس تو حاضر ہے آپ مجھے میرے مظلوم آقا پر فدا کریں۔

یہ حال دیکھ کر امام مظلوم تڑپ گئے۔ خیمہ میں داخل ہو کر ام کلثوم کو سینے سے لگا کر دیر تک روتے رہے۔

آگے بڑھے تو ام المصائب جناب زینبؑ کا خیمہ تھا۔ دیکھا کہ زینبؑ دونوں بچّوں کو سامنے بٹھائے کہہ رہی ہیں۔ میرے جگر پارو میری زندگی کے سہارو، تم کو معلوم ہے کہ ماموں نے ہمیشہ تم پر باپ کی طرح شفقت کی ہے۔ تمہیں کبھی اولاد سے کم نہیں سمجھا۔ تم دیکھ رہے ہو یہ وقت تمہارے ماموں پر کتنا سخت ہے چاروں طرف سے دشمن گھیرے ہوئے ہیں۔ دیکھو ان کی نصرت میں کوتاہی نہ کرنا

اگرچہ تمہارے سن کم ہیں مگر تم جعفر طیار کے پوتے اور شیرِ خدا علیؑ کے نواسے ہو۔ ایسا جم کر لڑنا کہ دُنیا میں نام ہو جائے۔ اگر موقع مل جائے تو پسرِ سعد کا سر لا کر ماموں کے قدموں پر ڈالنا۔ سامنا پڑ جائے تو شمر کو بے قتل کئے نہ رہنا۔ ایک بات اور کہتی ہوں اگر لڑتے لڑتے نہر تک پہنچ جاؤ تو پانی نہ پی لینا۔ میری سکینہؑ پیاس سے مر رہی ہے علی اصغر دم توڑ رہا ہے مجھے رباب اور اُم لیلےٰ سے شرمندہ نہ کرنا۔

ان بچوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی اے مادرِ گرامی ذرا صبح ہونے تو دیجئے انشاء اللہ ان روباہ صفتوں کو ہم دکھائیں گے کہ ہاشمی شیر کس طرح لڑتے ہیں۔ اماں جان آپ ماموں جان سے سفارش کر کے ہمیں لشکر کا علم دلوادیں۔ کیونکہ دادا اور نانا دونوں کی طرف سے وہ ہمارا ورثہ ہے۔ جناب زینبؑ نے فرمایا میرے پیارو ابھی تم کمسن ہو علمداری تمہارے لئے زیبا نہیں دوسرے یہ تو تمہارے چھوٹے ماموں کا حق ہے۔ اگر عباسؑ سنیں گے تو انہیں ملال ہوگا۔ ایسا غلط خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔

حسینؑ نے جو بہن بھانجوں کی یہ باتیں سُنیں تو بے چین ہو گئے۔ بہن کے خیمے میں آ کر دونوں بچوں کو چھاتی سے لگایا اور پیار کیا۔

روزِ عاشور جب انصارِ حسینؑ باری باری میدان میں جا کر شہید ہونے لگے۔ اور عون و محمد رخصت کے لئے خیمہ میں نہ آئے تو جناب زینب سلام اللہ علیہا کو تشویش ہوئی۔ فضہ کو بھیج کر دونوں کو خیمہ میں بلایا اور ناراضی کے لہجے میں فرمانے لگیں کیا رات کے سارے وعدے بھول گئے ہو غیر تو میدان میں جا جا کر فرزند رسولؐ پر اپنی جانیں قربان کر دیں اور تم اب تک جانے کا نام نہ لو۔ اور دوسروں کے قتل کا تماشا دیکھو کیا میں نے اس لئے تمہیں پالا تھا کہ انصار حسینؑ کی بی بیوں سے مجھے شرمندہ کرو۔ یاد رکھو میں تم کو اپنا دودھ نہ بخشوں گی۔ اور روزِ حشر اپنے نانا سے تمہاری شکایت کروں گی۔

ان بچوں نے عرض کی کہ مادرِ گرامی ہمارا اس میں قصور نہیں ہم تو کئی بار ماموں جان کی خدمت میں عرض کر چکے ہیں مگر وہ ہم کو اذن کارزار نہیں دیتے۔ آپ ماموں جان سے ہمیں اجازت دلوا دیجئے ہم تو جانے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔

جناب زینبؑ نے فضہ سے کہا میرے ماں جائے سے عرض کرو کہ آپ کی بہن یاد کر رہی ہیں۔ امام مظلوم علیہ السلام خیمہ میں آئے تو جناب زینبؑ رو رو کر عرض کرنے لگیں۔ بھیا آپ اپنے دونوں غلاموں کو اجازت کارزار کیوں نہیں دیتے۔ بھیا غیر تو آپ پر جان نثار کریں اور اپنے خاص عزیز اُن کے قتل کا تماشا دیکھیں۔

مظلوم کربلا نے فرمایا بہن کس دل سے اجازت دوں۔ یہ ابھی بچے ہیں پوری طرح آئین جنگ سے واقف نہیں۔ جناب زینبؑ سلام اللہ علیہا نے کہا بھیا مجھے ان کا زندہ رہنا اب گوارا نہیں۔ مجھے عون و محمد آپ سے زیادہ عزیز نہیں۔

امام علیہ السلام سر جھکا کے خیمے سے نکلے اور عون و محمد سے فرمایا اچھا جاؤ تم بھی اپنا داغ حسینؑ کے دل پر لگاؤ۔ یہ کہہ کر ان بچوں کو گھوڑوں پر سوار کیا اور جب وہ چلے تو بارگاہ باری میں عرض کی کہ خداوندا گواہ رہنا اب میری بہن کا گھر بھی لٹنے والا ہے پالنے والے تیری راہ میں سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔

جعفری اور علوی بیشہ کے دونوں شیر ہمہمہ کرتے ہوئے رجز پڑھتے ہوئے میدان میں آئے اور اس دلیری سے لڑے کہ دشمن حیران رہ گئے۔ دونوں نے بے شمار کوفی اور شامی تہ تیغ کئے اور لڑتے لڑتے پسر سعد کے خیمے تک پہنچ گئے۔ وہ بدحواس ہو کر نکل بھاگا اور اپنی فوج کو ڈانٹ کر کہا۔ کیا غضب آگیا۔ دو لڑکے تم سب پر چھا گئے اور بڑھتے بڑھتے میرے خیمے تک آگئے۔ یہ سن کر سب یکبارگی ان پر ٹوٹ پڑے اور ہر طرف سے وار پر وار کرنے شروع کر دیئے۔

جب گھوڑے سے گرنے لگے تو آواز دی **یَا عَمَّاہُ اَدْرِکْنِیْ** حضرت یہ آواز سنتے ہی جناب عباسؑ اور علی اکبرؑ کو لے کر قتل گاہ کی طرف چلے۔ جب وہاں پہنچے تو دونوں کو بے دم پایا۔ لاشیں اٹھا کر خیمہ گاہ میں لائے۔ جب بی بیوں کو پتہ چلا کہ زینبؑ کے دونوں بیٹے شہید ہو گئے تو خیام میں کہرام بپا ہو گیا۔ بی بیاں خیمے میں جناب زینبؑ کے پاس آئیں دیکھا کہ وہ سجدۂ خالق میں عرض کر رہی ہیں بارالٰہا تیرا شکر ہے کہ میری کمائی ٹھکانے لگی۔ میرے بچے فدیہ راہِ خدا قرار پائے۔ بی بیوں نے جب بچوں کا پرسا جناب زینبؑ کو دیا تو فرمانے لگیں۔ بی بیو! اب یہ دعا کرو کہ خدا میرے بھائی کو بچا لے۔ آہ مجھے حسین سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں۔

لکھا ہے کہ دونوں کے لاشے میدان سے خیمے میں لائے تو جناب زینبؑ لاشوں سے لپٹ گئیں اور رو رو کر کہنے لگیں۔

میرے پیارو یہ ماں تم پر قربان۔ تم نے ماں کا حق ادا کر دیا۔ آہ! تم پروان چڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ تمہیں موت نے آلیا۔ تمہیں دولہا بنانے کی حسرت میرے دل میں رہ گئی۔ آہ دکھیار زینبؑ اس ہنگامہ رستخیز میں تمہیں جی بھر کے رو بھی نہیں سکتی۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

تیرہویں مجلس

پانی کا بیان اور کربلا میں بندش آب

شہادت جناب بریر ہمدانی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ

اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْہُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ (سورہ الواقعہ ۶۸/۵۶)

ارشاد جناب رب العزت ہے کیا تم نے اس پر بھی غور کیا کہ جو پانی تم پیتے ہو اسے تم نے بادلوں سے برسایا ہے یا ہم برسانے والے ہیں۔

کس کی طاقت ہے کہ خدا کی نعمتوں کا شمار کر سکے۔ خود فرماتا ہے وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (سورہ النحل ۱۸/۱۶) اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو ان کو شمار نہیں کر سکتے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں لَا یُحْصِیْ نَعْمَاءَہُ الْعَادُّوْنَ (شمار کرنے والے اس کی نعمتوں کا شمار نہیں کر سکتے)

خدا کی بے شمار نعمتوں میں پانی ایک خاص نعمت ہے۔ انسانی نظام حیات میں اس نعمت کو خاص دخل ہے۔ اگر ذرا دیر پانی نہ ملے تو انسان تڑپ کر مر جائے۔ دنیا کی ہر شے اسی پانی سے زندہ ہے۔ خدا خود فرماتا ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ

(سورہ الانبیاء ۳۰/۲۱) (ہم نے ہر شئے کو پانی سے زندہ کیا) یعنی آدمی کا کیا ذکر ہر شئے کی زندگی پانی پر موقوف ہے۔ علم طبقات الارض کے ماہرین کا بیان ہے کہ پہاڑ پانی کے اندر ہی بنتے ہیں۔ پہاڑوں پر برف نہ جمے تو دریاؤں میں روانی کہاں سے آئے۔ پانی نہ برسے تو نباتات زمین سے اُگے کیسے۔ اس کی نشو ونما کیسے ہو اس کی بقا کیوں کر ہو پانی نہ ہو تو حیوانات زندہ کیسے رہیں۔

تمام مخلوق سے زیادہ پانی انسان کے صرف میں آتا ہے۔ یہ پیتا بھی ہے۔ یہ جسم ولباس کی کثافت بھی پانی سے دُور کرتا ہے پانی سے مکانات بنواتا ہے۔ پانی سے کھانا پکاتا ہے۔ مشینیں چلاتا ہے۔ بجلی حاصل کرتا ہے نمک حاصل کرتا ہے دریائی جانوروں سے بے شمار فوائد حاصل کرتا ہے۔ غرض پانی کے بے شمار مصرف انسان کے لئے ہیں۔ انسان کی کیا طاقت ہے کہ خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کر سکے۔

غور کیجئے کہ انسان کی خلقت ہی پانی اور مٹی سے ہے۔ اس کی زندگی کا دارومدار پانی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے پانی کو ہر جگہ اس کے پیروں کے نیچے بہا رکھا ہے جہاں ضرورت ہو کنواں کھود کر پانی نکال لے۔ اس کے علاوہ نالاب، دریا، سمندر ہر سر زمین پر پانی سے چھلک رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اونچے اونچے پہاڑوں پر بھی پانی کے سرچشمے پھوٹ نکلے ہیں۔

پانی کے اندر قدرت کے بے شمار ذخیرے ہیں۔ جن کو حاصل کر کے انسان لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس نعمت کی لطافت کا یہ حال ہے کہ ہم اس کے ذائقے کا حال نہ لکھ سکتے ہیں نہ بیان کر سکتے ہیں۔ اس کی تعریف میں ہمارے پاس اس سے زیادہ الفاظ نہیں ٹھنڈا ہے میٹھا ہے۔ لیکن ٹھنڈی اور میٹھی تو ہزاروں چیزیں ہیں۔ ان دونوں لفظوں سے پانی کی امتیازی خصوصیت کا عقدہ تو حل نہیں ہوتا۔ وہ میٹھا ہے مگر دودھ جیسا نہیں۔ وہ میٹھا ہے مگر شہد جیسا نہیں۔ شکر جیسا نہیں۔ آم جیسا نہیں، پھر بتاؤ وہ کیسا میٹھا ہے۔ کیا کسی فصیح البیان اور طلیق اللسان میں یہ طاقت ہے کہ وہ اس کی مٹھائی کی ایسی مکمل تعریف کر سکے کہ وہ دوسری مٹھائیوں سے ممتاز ہو جائے ہرگز نہیں۔

ہم کو خدا کی اس نعمت کی قدر نہیں۔ اس لئے کہ یہ نعمت ہم کو آسانی سے ملتی رہتی ہے۔ ہم نہایت بے پرواہی سے اس کا استعمال کرتے ہیں ہاں اگر کہیں یہ نعمت نہ ملے۔ تب پتہ چلے کہ کیسی گراں قدر نعمت ہے۔

خداوند عالم خصوصیت سے ہمیں اس طرف آیہ مذکورہ بالا میں توجہ دلا رہا ہے۔ فرماتا ہے تم نے کبھی اس پانی پر بھی غور کیا ہے جسے تم ہر وقت اپنے استعمال میں لا رہے ہو۔ بتاؤ تم نے اسے بادلوں سے برسایا ہے یا ہم نے۔ اگر ہم نہ برساتے تو بتاؤ تمہارا کیا حشر ہوتا۔

اب ذرا اس پر غور کیجئے کہ بادل کیسے بنتا اور کیسے برستا اور کیا کیا اثرات دکھاتا ہے۔

پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ سمندر ہے۔ اس کا پانی نہایت تلخ اور بدبودار ہوتا ہے اگر انسان یہ پانی پی لے تو طبیعت مالش کرنے لگے ہر قے آنے لگیں۔ پینے کا ذکر ہی کیا ہے۔ جب سمندر میں لوگ جہازوں کے ذریعے سفر کرتے ہیں اور سمندر کے پانی سے اُٹھ کر جو ہوا مسافروں سے ٹکراتی ہے تو اس کی برداشت نہیں ہوتی اور لوگ قے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب اس کی قدرت کاملہ کو دیکھو

کر کیسا ثقیل، بدہضم اور بدبودار تلخ اور بدمزہ پانی کو وہ کس طرح ہمارے لئے میٹھا۔ خوشگوار اور ممد حیات بناتا ہے۔ سورج کو حکم دیتا ہے کہ تو اپنی کرنوں کے بے شمار اثرات کے ذریعے پانی کو بخارات کی شکل میں آسمانی فضا میں کھینچ لے جا۔

کرنوں کے ڈول سطح سمندر پر اُترے۔ اور ہر قطرہ یوسف کی طرح اس ڈول میں بیٹھ کر اُوپر چلنا شروع ہوگیا۔ دن دہاڑے لاکھوں من پانی اوپر کو معراج پانے کے لئے کھچ گیا۔ دیکھنے والے کنارے پر کھڑے دیکھتے رہے اور کسی کو پتہ نہ چلا کہ جانے والا کب چلا گیا۔ کیسے گیا اور کہاں پہنچا۔ رسول کی معراج جسمانی پر ناک بھوں چڑھانے والے ذرا غور کریں۔ جب دن میں اتنے کثیر اور وزنی مادّہ کے اُٹھ جانے کا پتہ نہ چلا تو اگر شبِ معراج خدا نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اپنے محبوب کے وجود کو براق کے ذریعے سے زمین سے اُٹھا لیا تو کیا تعجب کی بات ہے۔ کرنوں میں اتنی ہی طاقت تھی کہ وہ پانی کو میل دو میل کی بلندی تک لے جائیں لیکن براق میں یہ زور تھا کہ وہ زمین سے اُٹھا کر قاب قوسین او ادنیٰ تک لے گیا۔

اچھا پھر یہ ہوا کہ سورج کی کرنوں نے لاکھوں من وزن سطح سمندر سے اُٹھا کر ہوا کے دامن پر پھیلا دیا۔ ہوا کے دامن کی لطافت کا کیا ٹھکانہ ہے تار نظر کی طرح اس تانے بانے کا کوئی ایک تار بھی نظر نہیں آتا نگاہیں ڈھونڈتی رہ گئیں مگر اس کے دامن تک نہ پہنچیں۔ لوگ ہاتھ ملتے رہ گئے اور اس کا دامن ہاتھ نہ لگا۔ عقل نے لاکھ پہلو بدلے مگر اس کی حقیقت سمجھ میں نہ آئی۔ ایسے نازک اور لطیف دامن پر ایک نیا سمندر ڈال دیا گیا ہے۔ یہ اس کی قدرت کاملہ کا کیسا عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ ہوا کا دامن بغیر اس کے اذن کے کہیں سے چاک نہیں ہوتا۔ جو سمندر پہلے زمین پر بہہ رہا تھا اب وہ فضا میں لہرا رہا ہے۔ ہوا اس الغاروں پانی کو اس طرح ہلا ڈلا رہی ہے جیسے کوئی بچّہ کو جھولا جھلائے۔ گویا یہ وزن اس کے لئے کوئی چیز نہیں۔

ذرا اس پر بھی تو غور کرو کہ جب سمندر میں یہ پانی بہہ رہا تھا۔ اس کی نورانیت کسی کو نظر نہ آئی لیکن ذرا سی بلندی پر معراج پاتے ہی اس میں بجلیاں کوندنے لگیں۔ یا یوں کہوں کہ پانی کے دامن میں آگ لگ گئی۔ یہ پانی کی معراج ہے محبوب رب العالمین کی معراج کا تو ذکر ہی کیا۔ اوّل تو وجودِ ختمی مرتبت خود نور پھر خالق نور کے طلب کردہ نورِ عرش کی ضیا میں چلنے پھرنے والے وہاں سے کیا بن کر آئے ہوں گے کون سمجھے اور کون جانے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ

اب دیکھیے وہی پانی جو ثقیل اور تلخ اور بدبودار تھا ہوا کی آغوش تربیت میں جاتے ہی نہایت خوشگوار شیریں اور جانِ عالم بن گیا۔ تربیت کو صفات کے بدلنے میں بڑا دخل ہے۔ زید بن حارثہ تربیت رسولؐ میں رہ کر اس مرتبے کو پہنچا کہ لوگ اسے ابن رسول اللہ کہنے لگے۔ سلمان کا یہ مرتبہ بڑھا کہ اہل بیتؑ میں شمار ہونے لگے۔ جب مس کا یہ اثر صحبت سے سونا بن جائے تو غور کرو تربیت و صحبت رسولؐ سے علیؑ کیا بنے ہوں گے۔

پانی جب تک سمندر میں رہا کسی کے کان میں تسبیح کی آواز نہ آئی۔ لیکن معراج پاتے ہی قفل دہن کھلا اور خاموش زبان ذکر الٰہی میں مشغول ہوگئی۔ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ (سورہ الرعد ۱۳/۱۳)

یہی بادل کبھی ابر نیساں کی صورت میں جب جلوہ گر ہوتا ہے تو اس کی عظمت کو اور چار چاند لگ جاتے ہیں اور [illegible]

ادھر سمندر کی تہ میں گوشہ نشین صدف آواز سنتے ہی اپنی جگہ سے اُٹھی کہ اب کمال دکھانے کا وقت آگیا۔ باکمال خس و خاشاک کی طرح سمندر کے جھاگ کی مانند ادھر اُدھر مارے مارے نہیں پھرتے۔ وہ سمندر کے ہولناک طوفانوں سے الگ تھلگ گردابوں کے چکروں سے دور رہ کر گوشہ عافیت میں رہ کر خاموش زندگی بسر کرتے ہیں مگر جب وقت آتا ہے تو جواہرات منہ سے اُگلنے لگتے ہیں۔ بیش بہا موتی سینوں سے نکال کر اہل نظر کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

ادھر ابر نیساں گرجا اور صدف نے سطح سمندر پر آکر اپنا بند منہ کھول دیا۔ آنے والا قطرہ جانتا ہے کہ مجھے کہاں جانا ہے اور لینے والا جانتا ہے کہ مجھے کیا لینا ہے۔ بہت سی بار اسی طرح سمندر کی سطح پر چھم چھم مینہ برسا مگر صدف نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ وہ جانتا تھا کہ بارش کے ایسے جھالوں میں موتی بنانے کی طاقت نہیں۔ میں ان کے آگے منہ کھول کر اپنی بات کیوں کھوؤں۔

ادھر قطرہ گرا اور صدف نے اسے اپنے سینے میں جگہ دی۔ یہ اُوپر سے آئی ہوئی نعمت ہے خاص ہی سینوں میں جگہ پا سکتی ہے۔ صدف کیسی قانع ہے کہ ایک ہی قطرہ سے کر اپنا منہ بند کر لیا۔ مالک کی سرکار سے جو مل گیا وہ موتی۔ ناکوں مینڈکوں اور مچھلیوں کے پیٹ میں وہی پانی گیا۔ وہاں کچھ بھی نہ بنا۔ صدف نے لے لیا تھا پانی بنا دیا اسے موتی یہ اپنا اپنا ظرف ہے۔ قطرے کے لیتے ہی صدف خاموشی سے اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گیا کہ اب تو کچھ بنا کر ہی نکلیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک ذات اپنے ظرف کے لحاظ سے فائدہ حاصل کرتی ہے۔ وہی آب نیساں جو صدف میں موتی بنا گیا۔ وہی جب سانپ کے منہ میں پہنچا تو زہر بن گیا۔ ہرن کے پیٹ میں پہنچا تو مشک کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ شہد کی مکھی کے منہ میں آیا تو شہد میں تبدیل ہو گیا۔ گلستان میں پھول کھلانے لگا۔ باغوں میں پھل پکانے لگا۔ کھیتوں میں غلہ اُگانے لگا۔ پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی نکلے۔ غلّے کے پودوں کے آس پاس گھاس بھی پھوٹی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ ابر رحمت ایک پانی ایک اور تاثیریں مختلف۔

زرخیز زمین نے ایک ایک دانے سے ہزار ہزار دانے بنا ڈالے۔ شورہ زار نے ابر رحمت کی موسلا دھار بارش کو اپنے اندر سمو یا تو مگر بنا کچھ نہیں۔

اللہ اللہ اس پانی نے کیا کیا صورتیں بدل کر انسان کو فائدہ پہنچایا۔ برف، اولا، پالا، یخ و گرم سرد، کھاری، میٹھا، خوشگوار۔ بدگوار۔

یہ بھی اسی کی قدرت کاملہ ہے کہ سمندر میں جہاں کھاری اور بدبودار پانی ہے وہاں اسی کے پہلو سے پہلو ملائے میٹھے پانی کی دھار بھی جاری ہے۔ سمندر سے جہاں دجلہ ملتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ دونوں دھاریں الگ الگ ہیں۔ پہلو سے پہلو ملا ہوا ہے ایک بزم ہے ایک صحبت ہے۔ مگر نوعیت جو مختلف اور طبیعت جو جُدا گانہ ہے تو اختلاط ہونا ہی نہیں صحبت اپنا اثر دکھاتی نہیں۔ دونوں کے درمیان قدرت کی طرف سے ایک روک ہے جو ملنے نہیں دیتی۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ (سورہ الرحمٰن ۵۵/۱۹) دودھ میں پانی مل کر ایک جان ہو جاتا

ہے۔ کیونکہ دونوں ایک ہی جنس ہیں لیکن تیل کو اگر دودھ میں ڈالو تو وہ الگ ہی رہے گا لاکھ ملانے کی کوشش کرو وہ ملے گا ہی نہیں دودھ کو آگ پر گرم کرو۔ دودھ کے ساتھ پانی بھی جل جائے گا کیونکہ وہ ہم جنس ہونے کی وجہ سے راحت و مصیبت دونوں میں شریک ہے لیکن تیل ہرگز دودھ کے ساتھ نہ جلے گا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ جگر جگر ہے دگر دگر ہے۔

بہر حال پانی خدا کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ انسان کو کسی سے ہر چیز مانگنے سے شرم آتی ہے۔ مگر پانی ہی ایک ایسی چیز ہے کہ اسے انسان ہر کس و ناکس سے بے تکلف مانگتا ہے اور جو نہیں دیتا وہ شقی ترین انسان سمجھا جاتا ہے۔ شریعت اسلام کا حکم تو یہاں تک ہے کہ اگر کوئی کتا پیاس سے مر رہا ہو اور کسی کے پاس وضو کے لئے پانی رکھا ہو اس کو چاہیے وہ پانی کتے کو پلادے اور تیمم سے نماز پڑھ لے۔

خداوند عالم نے اپنے بندوں کا امتحان کبھی پیاس میں نہیں لیا ہے۔ بھوک میں لیا ہے۔ خوف میں لیا ہے جانوں مالوں اور اولاد کی کمی میں لیا ہے مگر پیاس میں نہ کسی نبی کا امتحان لیا اور نہ کسی ولی کا کیونکہ یہ امتحان ایسا سخت ہے کہ انسان کو اس میں کامیابی دشوار ہے۔

بنی اسرائیل کا ایک عابد کسی ویرانہ میں عبادت کر رہا تھا ایک پیاسا اس کے پاس آیا اور پانی طلب کرنے لگا۔ اس نے کہا میرے پاس تھوڑا سا پانی رہ گیا ہے اگر میں تجھے پلادوں گا تو میں کیا یہاں پیاسا مروں گا۔ پانی کا چشمہ یہاں سے بہت دور ہے۔ اگر یہ پانی ساتھ لے کر نہ جاؤں تو وہاں سے پانی لا نہیں سکتا۔ اس نے کہا اے شخص میری جان لبوں پر ہے۔ چند قطرے مجھے پانی کے دے دے۔ مگر اس نے رحم نہ کھایا۔ آخر وہ پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

جناب موسیٰ پر وحی ہوئی کہ تم جا کر اس عابد سے کہہ دو کہ تو نے میرے ایک بندہ کو پیاسا مار دیا درانحالیکہ تیرے پاس پانی موجود تھا لہٰذا آج تک تو نے جتنے اعمال حسنہ کئے ہیں وہ سب حبط کر دئے گئے۔

بادشاہ بہرام گور شکار کے لیے گیا اور شکار کی دوڑ دھوپ میں اپنے لشکر سے جدا ہو گیا۔ ریگستان میں پیاس کا غلبہ ہوا۔ اسے دور سے ایک جھونپڑی نظر آئی دوڑتا ہوا وہاں پہنچا اور ایک بڑھیا سے جو اس جھونپڑی میں بیٹھی تھی پانی مانگا اس نے کہا میرے پاس تھوڑا سا پانی ہے اور میرا بیٹا لکڑیاں لینے گیا ہے۔ نہ معلوم کس وقت آئے۔ بہرام نے کہا اگر تو نے پانی نہ دیا تو میں پیاسا مر جاؤں گا۔ بڑھیا نے کہا مجھے ایک آدمی کی جان سے زیادہ عزیز پانی نہیں۔ یہ کہہ کر گھڑے میں جتنا پانی تھا اسے پلا دیا۔

بہرام جب آسودہ حال ہو کر اپنے لشکریوں سے جا ملا تو اپنے وزیر سے پوچھا اس بڑھیا کو کیا صلہ دوں وزیر نے کہا کہ اس کا صلہ تو یہ ہے کہ اپنی ساری سلطنت اسے دے دے کیونکہ اگر مر جاتا تو یہ سلطنت تیرے کچھ کام نہ آتی۔ بہرام نے کہا اچھا اس بڑھیا کو بلا کر پوچھو تو کیا چاہتی ہے۔ جب سپاہی اسے لے کر آئے تو بہرام نے اس سے پوچھا۔ اس نیک دل بڑھیا نے کہا مجھے نہ تیری سلطنت کی خواہش ہے اور نہ تیرے انعام و اکرام کی میں نے انسانیت کا ایک فرض ادا کیا ہے۔ بہرام نے کہا کہ اگر

ایسا ہے تو آج سے تو میری ماں ہے اور میں تیرا بیٹا۔ جب تک زندہ رہوں گا تیرے اس احسان کو یاد رکھوں گا اور تیری خدمت بجالانے میں کبھی کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔

جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں وہ کبھی کسی پر پانی بند نہیں کرتے۔

جنگ صفین کا واقعہ سب کو معلوم ہے کہ امیر معاویہ کی فوج جب وہاں پہلے پہنچی تو امیر صاحب نے حکم دیا کہ پانی کے گھاٹ پر پہرہ بٹھا دو، اور علیؑ کی فوج تک ایک قطرہ پانی کا نہ جانے دینا۔ چنانچہ جب لشکر امیر المومنین وہاں پہنچا تو دیکھا کہ گھاٹ پر پہرہ ہے۔ آپ نے اپنے جرنیل مالک اشتر کو حکم دیا کہ ان شامیوں کو مار کر گھاٹ سے ہٹا دو اور قبضہ کر لو۔ چنانچہ مالک اشتر گئے اور سخت جنگ کے بعد شامیوں سے گھاٹ چھین لیا اور اپنا پہرہ بٹھا دیا۔ اب امیر معاویہ کو بڑی تشویش ہوئی عمرو عاص سے جو ان کے وزیر اعظم تھے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ اب کیا ہو۔ دریا تو ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے کہا غم نہ کرو علیؑ کو میں جانتا ہوں وہ ہم پر پانی کبھی بند نہ کریں گے۔

امیر المومنینؑ نے مالک سے کہا گھاٹ کھول دو۔ انہوں نے کہا امیر المومنینؑ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ جنہوں نے ہم پر پانی بند کیا تھا ہم انہیں اب کیسے پانی پینے دیں گے جیسا کہ معاویہ نے کیا ہے ہم بھی ویسا ہی کریں گے۔ فرمایا معاویہ اور علیؑ میں فرق ہے میں ہرگز گوارا نہ کروں گا کہ پانی کے ہوتے ہوئے کوئی مسلمان پیاس سے مرجائے یہ تھا اہل بیت رسولؐ کا روشن کردار اور احکام اسلام کی پابندی۔

جس زمانے میں لوگ حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کئے ہوئے تھے اور پانی ان تک نہیں پہنچنے دیتے تھے حضرت علی علیہ السلام نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو حکم دیا کہ پانی کے مشکیزے کمر پر لاد کر وہاں لے جاؤ اور جس طرح بنے محصوروں تک پہنچاؤ۔ چنانچہ دونوں شہزادے پانی لے کر گئے۔ اس وقت پانی پہنچانا آسان نہ تھا جان جوکھوں کا معاملہ تھا۔ محاصرین بگڑنے لگے اور پانی روکنا چاہا مگر شہزادوں نے کہا کہ ہم پانی ضرور پہنچائیں گے۔ اگر تم لوگ نہ مانے تو ہم تم سے جنگ کریں گے۔ الغرض پانی جس طرح بنا محصورین تک پہنچایا گیا۔ یہ احسانات اہل بیت رسولؐ کے ایسے نہ تھے کہ لوگ ان کو بھول جاتے مگر اسلام اپنے نقوش لوگوں کے دل سے اٹھا چکا تھا مسلمانوں نے اہل بیت رسولؐ کے ساتھ وہ کیا جو کسی کافر کے ساتھ بھی نہ کرنا چاہیئے۔

لیکن چاہے زمانہ میں کیسا ہی ہولناک انقلاب رونما تھا اور چاہے مسلمانوں کی قوت ایمانی اور حمیت ملی کتنی ہی کمزور پڑ چکی تھی۔ مگر اہل بیت جو پہلے تھے وہی اب بھی تھے ان کا کردار لوگوں کے کردار کے ساتھ بدلنے والا نہ تھا۔

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جب حر کا پیاسا لشکر امام حسینؑ کے سامنے آیا تو آپ کیا ان کی پیاس دیکھ سکے۔ ہرگز نہیں فوراً حکم دیا کہ ایک ہزار سپاہیوں کو مع ان کے مرکبوں کے اچھی طرح سیراب کرو۔ اگر امام علیہ السلام اس طرف توجہ نہ فرماتے تو چند منٹ کے بعد وہ سب تڑپ تڑپ کر مرجاتے۔ کیونکہ شدت تشنگی سے ان کے کلیجے کباب ہو رہے تھے۔ چہروں پر مردنی چھا رہی تھی۔ زبانیں باہر نکل آئی تھیں۔ اچھا موقعہ تھا کہ ذرا سی بے توجہی میں ایک ہزار دشمن سے نجات مل جاتی لیکن اگر ایسا ہوتا تو حسینؑ

حسینؑ نہ رہتے اور آپ کا مقصدِ شہادت پورا نہ ہوتا۔

آپ کے ساتھیوں کو امامؑ کا یہ حسنِ سلوک ناگوار تھا وہ بار بار دبے لفظوں میں کہہ رہے تھے۔ حضورؑ ہمارے ساتھ عورتیں بھی اور بچے بھی ہیں اور دُور دُور پانی کا نام ونشان نہیں اگر یہ سب پانی خرچ ہوگیا تو پھر ان بی بیوں اور بچوں کا کیا حال ہوگا۔ یہ لوگ ہمارے خون کے پیاسے ہیں انہیں تڑپ تڑپ کر مرجانے دیجئے۔ فرمایا یہ ہرگز نہ ہوگا انہیں اچھی طرح سیراب کردو۔ جو ہونا ہے وہ ہو رہے گا۔

آہ کیا یہ لوگ کربلا میں موجود نہ تھے۔ اے حمیت اسلامی تو کہاں تھی اس وقت جب ساتویں محرم سے اولادِ رسولؐ پر پانی بند کردیا گیا تھا۔ اے انسانیت! تو کہاں روپوش تھی۔ جب ننھے ننھے بچوں کی آواز **العطش العطش** خیام حسینی سے بلند ہوتی تھی۔ کوفہ دشام کے سپاہی بہرے نہ تھے۔ ان کے سینوں میں دل نہ تھے۔ پتھر نہ تھے۔ وہ آدمیوں کی اولاد نہ تھے۔ جانوروں کی نسل سے نہ تھے۔ اولاد والے بھی تھے مسلمان کہلاتے تھے۔ مگر افسوس سب کے سب صخرہ صماء بنے ہوئے تھے۔

آخر یہ کس جرم کی سزا تھی۔ کیا حسینؑ نے کسی کو بے جرم وقصور قتل کیا تھا کیا کسی کی دولت چھین لی تھی، کیا اپنے کردار کی بنا پر اسلام سے خارج ہوگئے تھے۔ کیا شریعت اسلامی میں کوئی تبدیلی کی تھی کیا وہ نبیؐ کے نواسے نہ تھے کیا وہ اس علیؑ کے بیٹے نہ تھے۔ جس کی قوت بازو سے اسلامی سلطنت کی داغ بیل پڑی تھی۔

اچھا کچھ بھی نہ سہی انسان تو تھے بھوک اور پیاس کی تکلیف کا احساس تو رکھنے والے تھے۔ بالفرض اگر حضرت امام حسینؑ اور ان کے انصار قوم بد شعار کی نظر میں تصور وار تھے تو ان معصوم بچوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو اس طرح پیاس سے تڑپائے گئے کہ بار بار خالی کوزے لے کر نکلتے تھے اور آواز العطش العطش بلند کرتے تھے مسلمانوں کا کیا ذکر اگر کافروں کے نرغے میں یہ آوازیں بلند ہوتیں تو وہ بھی تڑپ جاتے اور ان کو پانی لاکر دے دیتے۔

شب عاشور ان کی پیاس کی شدّت کا حال کس کی طاقت ہے کہ بیان کرسکے۔ ان معصوموں پر کیا گزر رہی تھی، اس کو تو وہی بے کس جانتے تھے۔ چہروں پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں، زبانوں پر کانٹے پڑے ہوئے، آنکھوں میں حلقے۔ پیروں میں لغزش۔ بمشکل آوازیں منہ سے نکلتی تھیں۔ کوئی ماں کی گود میں نڈھال کوئی زمین پر غش کوئی درخیمہ پر فریاد کناں۔

ایک انگریز ڈاکٹر لکھتا ہے کہ ۲۴ گھنٹے کی پیاس سے ہر موٹے بدن اتنی تکلیف دیتا ہے جتنا ایک انچ گہرا اور ایک انچ چوڑا زخم۔ شاید اس تحقیق کے وقت اس کے پیش نظر کم سن بچے نہ ہوں گے جن میں قوت برداشت بہ نسبت جوانوں اور بوڑھوں سے کم ہوتی ہے شاید اس کے وہم وخیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ یہ مصیبت ایک چھ مہینے کی جان پر بھی نازل ہوسکتی تھی۔

آہ رسولؐ کی اولاد اور پانی سے تڑپے۔ سامنے دریا موجیں مار رہا تھا۔ سگ وخوک کافر ومنافق سب سیراب ہو رہے تھے

لیکن بندش تھی تو حسینؑ اور اس کے ساتھیوں پر، معصوم بچوں پر، بے کس و بے بس بی بیوں پر، غریب الوطنوں پر۔ آہ ان پر جن کو بے درد مسلمانوں نے مہمان بلایا تھا۔

حمیت اسلامی اور غیرت دینی للکار رہی تھی اے حُر کے لشکر والو تم کہاں مرگئے۔ احسان فراموشو! حسینؑ نے تمہاری جان بچائی تھی اور اپنے ذخیرہ کا سارا پانی تم کو پلا دیا تھا آج اسی کے بچے تڑپ رہے ہیں۔ اور تمہارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

بریر ہمدانی اپنے خیمے میں بیٹھے تلاوت کلام پاک کر رہے تھے کہ ایک مرتبہ کئی بچے درِ خیمہ پر آکر فریاد کرنے لگے ارے کوئی ایسا نہیں جو ہماری پیاس بجھا دے۔ آہ! ہمارے کلیجے شدّتِ تشنگی سے کباب ہو رہے تھے۔ ہماری جان لبوں پر آگئی ہے۔ لیکن خیموں میں ایک قطرہ ہمیں ڈھونڈے نہیں ملتا۔

اس آواز کو سنتے ہی بریر تڑپ گئے۔ تلاوت کو ختم کیا۔ خیمہ سے باہر نکلے۔ باآواز بلند پکارے۔ اے انصار حسینؑ تُف ہے ہماری اس زندگی پر کہ چھوٹے چھوٹے بچے اس طرح فریاد کریں اور ہم خاموشی سے سنیں۔ اے جوانمردو اخیموں سے نکلو مشکوں کو اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو اگر پانی مل گیا تو لے آئیں گے ورنہ اپنی جانیں ان معصوم بچوں کو دردناک آوازوں پر قربان کر دیں گے۔

بیس جوان مسلح ہو کر بریر کے ساتھ چلے۔ گھاٹ پر پہنچے، تو کسی نے ٹوکا کون آتا ہے۔ بریر نے اس کی آواز کو پہچان کر کہا اے فلاں میں ہوں تیری قوم و قبیلہ کا بریر۔ اس نے کہا کیا چاہتے ہو کہا پانی لینے آتے ہیں۔ اس نے کہا تمہیں گوارا ہو شوق سے پانی پیو۔

بریر مع اپنے ساتھیوں کے نہر میں داخل ہوئے ابھی ایک ہی مشکیزہ بھرا تھا کہ کسی نے غُل مچایا خبردار یہ حسینؑ کے لشکر والے ہیں خیام میں پانی لے جانا چاہتے ہیں۔ انہیں روکو ایسا نہ ہو کہ پانی وہاں تک پہنچ جائے۔ یہ صدا سنتے ہی وہ نابکار سمٹ آئے اور رات کی تاریکی میں ان مجاہدوں سے جنگ شروع کر دی۔

بریر اور ان کے ساتھیوں نے وہ دلیرانہ جنگ کی کہ دشمن کو مقابلہ کی تاب نہ رہی۔ یہ مجاہد لڑتے جاتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے آخر سب ان کے ہجوم سے باہر نکل آئے۔ بریر بہت خوش تھے کہ ایک مشک پانی ہم نے حاصل کر لی بچوں کے سوکھے گلے کچھ تو تر ہوں گے گھوڑے دوڑاتے ہوئے جب خیمہ گاہ کے قریب پہنچے تو بلند آواز سے پکارے۔ بچو! آؤ بریر پانی لے آیا۔

یہ مژدہ جاں بخش سنتے ہی سب بچے خیموں سے نکل آئے اور غُل مچایا۔ بریر پانی لے آئے ہیں۔ سب خیمہ حسینی کے دروازہ پر جمع ہوئے۔ بریر نے جلدی سے مشک اُتار کر زمین پر رکھ دی آہ پیاسے بچے اس پر ٹوٹ پڑے۔ بے تابی میں مشک کا دہانہ کسی بچے نے کھول دیا۔ آناً فاناً سارا پانی زمین پر بہہ گیا۔ بچے رونے چلانے لگے۔ آہ بریرا ہم پیاسوں کی قسمت میں پانی پینا نہ تھا۔ بعض بچوں نے بے چینی کے ساتھ اپنے سوکھے گلے اس تر زمین پر رکھ دیئے۔

کس کی طاقت ہے کہ یہ بیان کر سکے کہ یہ رات ان بچوں نے کس طرح گزاری۔ خیموں میں سیدانیاں ان کی تڑپ دیکھ کر بیقراری سے روتی تھیں چاہتی تھیں کہ کسی طرح سو جائیں۔ مگر آہ! ان بھوکے پیاسوں کو نیند کہاں۔ البتہ بار بار غشی طاری ہو جاتی تھی۔

جناب سکینہ کا جب غیر حال ہوا تو جناب زینبؑ نے ان کو اپنی گود میں لٹا کر تسلی آمیز باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اس بچی نے معصومانہ انداز میں پوچھا پھوپھی جان یہ کون لوگ ہیں جنہیں ہمارے حال پر رحم نہیں آتا۔ کیا ان میں وہ لوگ نہیں ہیں جن کو ہمارے بابا جان نے راستہ میں پانی پلایا تھا۔ جناب زینبؑ نے فرمایا۔ بیٹی وہ سب یہاں موجود ہیں مگر ان پر شقاوت سوار ہے۔ ان کے دلوں میں رحم نہیں یہ ہمارے خون کے پیاسے ہیں سکینہ نے کہا۔ پھوپھی اماں کیا کل بھی ہم کو پانی نہ ملے گا فرمایا بیٹی کل کا ذکر نہ کر دو کر اللہ فرزند رسولؐ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

آہ! اس معصوم بچی کو کیا خبر تھی کہ کل کا دن کیسا سخت ہوگا۔ سارا گھر تباہ ہو جائے گا۔ کوئی ان بے کسوں کا فریاد رس باقی نہ رہے گا۔ بوسہ گاہ نبوی خنجر ظلم سے قلم ہوگی۔ خیموں میں آگ لگائی جائے گی۔ سیدانیوں کے سروں سے چادریں چھینی جائیں گی۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

چودہویں مجلس

شہد کی مکھی کا حال امیر المومنین علیہ السلام کی سیادت

حضرت قاسمؑ کی شہادت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْد

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

(سورہ النحل ۶۸/۱۶) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالدی کہ تو پہاڑوں اور جو لوگ اونچی اونچی ٹٹیاں اور مکانات بناتے ہیں ان میں چھتے بنا پھر ہر طرح کے پھلوں

رکے بُورسے) (ان کا عرق) چوس پھر اپنے پروردگار کی راہوں میں تابعداری کے ساتھ چلی جا۔ مکھیوں کے پیٹ سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے (شہد) جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں ان میں لوگوں کی بیماری کی شفا بھی ہے اس میں شک نہیں کہ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے واسطے قدرت خُدا کی بہت بڑی نشانی ہے

اللہ کی مخلوق اس کثرت سے ہے کہ کوئی ان کا شمار نہیں کر سکتا۔ اس مخلوق کی سینکڑوں قسمیں ہیں اور ان کی صورتیں، سیرتیں، آوازیں، غذائیں۔ رہنے سہنے کے طریقے ایک دوسرے سے جدا ہیں، ہاتھی سے لے کر ایک مچھر تک جو حیوانات اس نے خلق فرمائے ہیں وہ اس کی صنعت کاملہ کا بہترین نمونہ ہیں ان کی فطرت کے گہرے راز سمجھنے سے عقل انسانی قاصر ہے۔

مچھر ایک نہایت چھوٹا اور حقیر سا جانور ہے لیکن علم حشرات الارض کے ماہرین کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ قدرت کی کرشمہ کاریوں کا ایک طلسم ہے اسی لئے خدا نے قرآن مجید میں اس کی مثال بیان کی ہے إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا (سورہ البقرہ ۲/۲۶) (خُدا مچھر یا اس سے بھی بالاتر کی مثال دینے سے نہیں شرماتا) ذرا اس چھوٹے سے پرندہ کی خصوصیات پر غور کرو۔

ماہرین حشرات الارض کا بیان ہے کہ ہاتھی کی طرح اس جانور کے بھی سونڈ ہوتی ہے۔ اندر سے خالی اس کے اندر دو آرے ہوتے ہیں ایک آری ایک نلکی۔ جب یہ مچھر کسی کے بدن پر بیٹھتا ہے تو اپنی سونڈ اس کے جسم کے اندر گھسانا ہے۔ پھر آری سے زخم کو چوڑا کرتا ہے پھر نلکی سے خون کو کھینچ لیتا ہے یہ سب کام اتنی جلدی ہو جاتے ہیں کہ انسان کا ہاتھ اس تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ خون چوس کر اُڑ جاتا ہے۔

یہ جانور ہے تو اتنا چھوٹا سا مگر اتنا جری ہے کہ بغیر آواز دیئے حملہ نہیں کرتا۔ پہلے بولتا ہے کہ میں آرہا ہوں اور پھر حملہ کر کے پلک جھپکنے سے پہلے وہ لوٹ کا مال لے کر چل دیتا ہے۔ انسان بڑا صاحب عقل و شعور ہے لیکن اس کی یہ طاقت نہیں کہ اس کے خون کے پیاسے دشمن کو گرفتار کر سکے۔

انسان بہت سے چھوٹے چھوٹے جانوروں کا رہین منت ہے۔ انہوں نے اسے بہت سے سبق سکھائے ہیں۔ کوّے نے اسے قبر کھودنا سکھایا۔ کرم پیلہ (ریشم کا کیڑا) نے اسے کپڑا بننا اور تانا بانا ڈالنا بتایا ہے۔ جگنو نے اسے انجکشن لگانا تعلیم کیا ہے۔ چیونٹیوں نے ذخیرہ اندوزی کا سبق دیا ہے۔ شہد کی مکھی نے اسے شہر بسانے کا طریقہ سکھایا ہے۔

آیئے ذرا شہد کی مکھی کی خصوصیات پر بھی ایک نظر ڈالیں۔ یہ کوئی بہت بڑا جانور نہیں ایک چھوٹا سا کیڑا ہے مگر قدرت کے وہ وہ کمالات اس کے اندر ہیں کہ انسانی عقل ان پر غور کر کے حیرت و استعجاب کے سمندر میں غوطہ لگانے لگتی ہے۔ کیسا اس مخلوق الٰہی کی یہ فضیلت کچھ کم ہے کہ خلاق عالم نے اس کو اپنی وحی سے مخصوص کیا ہے۔ اگرچہ یہ وہ وحی نہیں جو انبیائے مرسلین پر نازل ہوتی ہے اور جس کا تعلق احکام شریعت سے ہوتا ہے خواہ وہ بذریعہ خواب ہو یا پس پردہ سے آواز آئے یا فرشتہ سامنے آکر پیغام ربانی سنائے لیکن پھر بھی یہ وحی ہے جس کو دوسرے الفاظ میں الہام سے تعبیر کر سکتے ہیں، یعنی

خدا نے مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی۔

انسانوں میں اس قسم کی وحی یا تو مادرِ جنابِ موسیٰ علیہ السلام کے لئے تھی یا یہ وحی شہد کی مکھی سے مخصوص ہوئی اس کی فضیلت کے لئے یہ کافی ہے کہ خدا نے اس کے دل کو اس قابل سمجھا کہ اپنی تعلیم کو اس میں ودیعت فرمائے ہونے کو تو بے شمار جانور اس سطح زمین پر چلتے پھرتے اور فضا میں اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بڑے بھی ہیں چھوٹے بھی ہیں۔ مگر خدائے قدوس نے سوائے شہد کی مکھی کے اور کسی کو اس فضیلت سے نہیں نوازا ایسے الہامات کا محور بننے کے لئے بڑے ظرف کی ضرورت ہے۔ پھر اس مخلوق کی یہ فضیلت بھی کچھ کم نہیں کہ قرآن کا ایک سورہ اس کے نام سے ہے اس فضیلت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو تعلیم ربانی بغیر کسی واسطے اور وسیلے کے پہنچی ہے۔ جو کچھ کہا قدرت نے براہِ راست اسی کے کان میں کہا ہے اب سنو کیا کہا ہے۔

اپنے گھر پہاڑوں، درختوں اور اونچی چھتوں ہوئی پر بنا۔ معلوم ہوا کہ مکھی کو قدرت کے محیر العقول کرشمے دکھانے کے لئے کچھ مخصوص مقامات کی ضرورت تھی۔ ہر جگہ اس قابل نہ تھی کہ اس گراں بہا ذخیرہ کو بے سوچے سمجھے جہاں تہاں رکھ دیا جائے اس گھر بنانے کے لئے ایسے بلند مقامات بنائے گئے جہاں انسان حرص و آز کے ہاتھ قبل از وقت اس کے ذخیرے پر ڈاکہ نہ ڈال سکیں۔

غور کیجئے جب شہد کے ذخیرے کے لئے جو مادی غذا ہے۔ خاص خاص مقامات تجویز کئے گئے تو بھلا علمی ذخیروں کے لئے کچھ بیت اور اہل بیت مخصوص کیوں نہ کئے گئے ہوں گے۔

اب دیکھو قدرت کی یہ چھوٹی سی مشین کیا کیا کرشمے دکھاتی ہے۔

اب وحی الٰہی کے مطابق کسی اونچی جگہ اسے اپنی بستی بسانے کی فکر ہے اس کے لئے ایسے مسالہ درکار ہے اس کا گھر نہ اینٹ پتھر کا بنے گا نہ لکڑی یا بانس کا اُسے مضبوطی اور پائیداری کے لئے نہ چونے کی ضرورت ہے نہ سیمنٹ کی۔ عقول انسانی کو چکرانے اور قادر مطلق کا نیا تماشہ دکھانے کے لئے وہ موم کا گھر بنانا چاہتی ہے مگر ایسا کہ موسم گرما میں نصف النہار کے نقطہ پر پہنچ کر پوری قوت سے شعلہ فشانی کرنے والا آفتاب اس کی شاندار بستی کے کسی گھر کی ایک اینٹ پگھلا کر نہیں بہا سکتا۔ باد و باراں کے اٹھنے والے طوفان جو بڑے بڑے مستحکم قلعوں اور شاہی محلات کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتے ہیں جو بستیاں الٹ دیتے ہیں اس چھوٹی سی مخلوق کی بستی میں ان کی دست برد کا ذرہ برابر اثر نہ ہوگا۔ بجلیاں چمک چمک کر خرمنوں کو جلائیں آشیانوں کو پھونکیں مگر اس قلعے معلیٰ میں ان کا اثر کیا وہ سانپ کی طرح لہرا کر اس ہوشربا بستی سے دور ہی دور نکل جاتی ہیں۔

اربابِ بصیرت یہ لوہے کا نہیں موم کا گھر ہے۔ یہ انجینئروں کا بنایا ہوا نہیں ہے یہ غریب مکھیوں کی صنعت کا بنایا ہوا طلسم ہوشربا ہے۔ کیا اب بھی خدا کی معرفت لوگوں کو نہ ہوگی۔ کیا اس سے بڑھ کر خدا کی قدرت کو سمجھنے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت ہے۔

لیجئے یہ صنعت کار خدا کے انجینئرنگ کالج کا سند یافتہ اب گھر کی بنیاد رکھنے پر تلا ہوا ہے۔ وہ مواد کے فراہم کرنے

کے لئے جا بجا گھومتا پھر رہا ہے۔ قسم قسم کے پھول رنگ برنگ کے پھل پودے اس کی نظر کے سامنے ہیں وہ ایسا دیوانہ نہیں کہ جہاں سے جو ملے وہ لے لے۔ وہ ایسے پھولوں کی تلاش میں ہے جن کو قدرت نے اس کی کارسازی کے لئے مخصوص کیا ہے۔ آدمی ہزار بار دھوکا کھاتا ہے اور اپنی مادی اور روحانی غذا ایسے مقامات سے لے لیتا ہے جہاں سے نہ لینا چاہیے۔ وہ علم کے صحیح مرکزوں کو نہیں پہچانتا، مگر شہد کی ناچیز مکھی جانتی ہے۔ کہ شہد کا ذخیرہ کہاں ہے۔

وہ بدبودار پھولوں کو چاہے کیسے ہی خوش رنگ ہوں سونگھ کر چھوڑ دیتی ہے۔ وہ صورت پر ظاہری آن بان پر فریفتہ ہونے والی نہیں وہ سیرت شناس ہے وہ باطن پرست ہے وہ خوب سمجھتی ہے کہ کن پھولوں کے سینوں میں بدبو چھپی ہوئی ہے اور کہاں سے خوشبو کی لپٹیں آرہی ہیں۔

لیجئے وہ ایک خوشبودار پھول پر بیٹھی۔ کچھ دیر اس سے ہم صحبت رہی۔ جو چیز لینے کی تھی اس سے لے لی اور دینے والے نے خوشی سے اہل سمجھ کر دے دی۔ اسی پھول پر بھونرا بیٹھا کچھ نہ پایا۔ زنبور کو بھی کچھ نہ ملا۔ مکھیاں بھنکیں پھولوں نے منہ نہ لگایا۔ جانتے تھے کہ نااہل کو دینا اپنے کمال کو ضائع کرنا ہے۔ مکھی نے پھولوں سے کیا لیا اور کس طرح لیا، کون بتائے قدرت کا راز ہے۔ پھول کی پتی زبان کی طرح ان کے چھوٹے سے منہ میں در آئی۔ چوسنے والے نے لعاب چوسا اور اپنے سینے کو کیف آور غذا سے بھر لیا۔

ذرا سے جثّے کی مالک ہے کوئی بہت بڑی مشین نہیں۔ آگے منہ پیچھے دنبالہ بیچ میں اسرار الٰہیہ کا مخزن اس کا اصل بدن پھولوں کا رس اس مشین کے اندر آتے ہی اپنا رنگ و روغن بدلنے لگا۔ موم کا حصہ الگ، شہد کا حصہ الگ، مکھی نے پہلے مومی مادہ منہ سے نکالا اور ایک گھر کی بنیاد رکھ دی۔ شہد کو بھی اندر محفوظ کئے ہوئے ہے رکھنے کی جگہ بن جائے تو جو کچھ اندر ہے نکال کر رکھ دے۔ سب درودز کی تنگ و دو میں ہر مکھی ایک چھوٹا سا گھر بنا کر فارغ ہو گئی اور شہد خزانے میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔

غور سے دیکھو اس بستی میں بے شمار گھر بنے ہیں۔ ان کے درمیان آنے جانے کے راستے ہیں کوچے ہیں۔ سڑکیں ہیں۔ ہر مکھی اپنے گھر کی نگرانی کی ذمہ دار ہے۔

دنیا کے مہندسو! باکمال انجینئرو! چابکدست معمارو۔ آؤ ذرا اس بستی کو دیکھو۔ ذرا ان گھروں کی تعمیری خصوصیات دیکھو۔ اس بستی کے معماروں کے پاس نہ پیمانہ ہے نہ پرکار، نہ پنسل ہے نہ اسکیل، نہ گنیا ہے نہ سحول، نہ کنّی ہے نہ بسولی مگر اس بستی کا ہر گھر بنا ہے بے نظیر۔ ہر گھر کی دیواریں ایک ہی سائز کی ہیں۔ لمبائی چوڑائی سب کی برابر ہے۔ زاویے قائمے سب کے یکساں۔ کیا ممکن ہے کہ بال برابر کہیں فرق تو نظر آجائے۔

اب ذرا اس بستی کے نظام پر غور کرو۔ جتنے باشندے ہیں سب ایک بادشاہ کے تحت اور ایک خاص قانون کے اندر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس بادشاہ کو یعسوب کہتے ہیں۔ یہ بلحاظ جسم سب سے بڑا ہوتا ہے اور طاقت میں بھی سب سے

زیادہ، علم میں بھی سب سے بالاتر۔ کسی کی طاقت نہیں کہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کر سکے۔ یہ خدا کی طرف سے ان پر حاکم ہوتا ہے۔ چھتے کے دروازوں پر پہرہ دار بیٹھے رہتے ہیں جب کوئی مکھی باہر سے اندر آنا چاہتی ہے تو پہرہ دار اس کے منہ کو سونگھتے ہیں۔ اگر منہ سے بدبو آتی ہے تو اسی وقت اس کا سر کاٹ کر زمین پر گرا دیتے ہیں۔ چھتے کے نیچے ایسی مکھیاں نظر آئیں گی جن کے سر کٹے ہوئے ہوں گے۔

اس شہر کے قانون کی رُو سے یہ اتنا بڑا جرم ہے جو کسی طرح قابل معافی نہیں۔ کیونکہ خالص شہد میں اگر بدبو کی ذرا سی آمیزش ہو جائے تو وہ چیز وحی کے مطابق نہ ہو گی اور پھر کھانے والوں کے لیے بجائے شفا کے کسی مرض میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گا۔ یعسوب اور اس کی ملکہ کے لئے چھتے کے درمیان میں جگہ بنائی جاتی ہے جو عام گھروں سے زیادہ وسیع ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ اس بادشاہ کا بیت المال یا شہد کا خزانہ ہوتا ہے جہاں ہر مکھی شہد لاکر جمع کرتی ہے۔ موم سے نئے نئے گھروں کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس سے یہ بستی یوماً فیوماً بڑھتی چلی جاتی ہے اور نئی پود کو ان میں رہائش نصیب ہوتی ہے۔

یہ نظام حکومت پوری ذمہ داری و خبرداری کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے۔ جب شاہی جاسوس خبر لاتے ہیں کہ کوئی دشمن حملہ کا ارادہ رکھتا ہے تو یعسوب اپنی مخصوص آواز میں ساری قوم کو آگاہ کرتا ہے۔ یہ گویا خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے اس کی یہ آواز سنتے ہی تمام مکھیاں شہد کے ذخیرے پر جمع ہو جاتی ہیں اور شہد کو جلدی جلدی پینا شروع کر دیتی ہیں تاکہ دشمن کی آمد پر وہ سب ذخیرہ لے کر اڑ جائیں اور اسے کچھ بھی نہ ملے۔

انسان بڑا شیخی باز ہے وہ اپنے اچھے کھانے اور اچھا کپڑا پہننے پر فخر کرتا ہے اتراتا ہے لیکن اگر وہ صحن عالم میں کھڑے ہو کر نقارہ فخر کی آواز کو بلند کرے تو چھوٹے چھوٹے کیڑے منہ توڑ جواب دے کر اس کے سر کو ندامت سے جھکا دیں گے۔ ریشم کا کیڑا بول اُٹھے گا کہ میرے سامنے فخر کرتے تجھے شرم نہیں آتی۔ میری رال اور تھوک سے جو چیز تیار ہوتی ہے تو اس کا لباس پہن کر ہم پہ فخر کرتا ہے۔ ایک شہد کی مکھی کہہ دے گی کہ میری قے تیرے لئے بہترین غذا ہے۔ تیرے امراض کی شفا ہے اور اس پر تو ہمارے سامنے فخر و مباہات کے نعرے مارتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں خداوند عالم نے مکھی کا ذکر کر کے عقل مند انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دی ہے۔

اوّل یہ کہ اس بستی کے باشندے آپس میں لڑتے جھگڑتے نہیں نہایت صلح و آشتی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں

دوسرے جو قانون الہٰی ہے اس کی خلاف ورزی پر آمادہ نہیں ہوتے۔

تیسرے اپنے بادشاہ کے حکم کی پوری پابندی کرتے ہیں۔

چوتھے منافقوں کا پتہ چلتے ہی ان کو شہر بدر کر دیا جاتا ہے۔

پانچویں۔ خدائی نعمت میں ملاوٹ کی اجازت نہیں۔

چھپٹے۔ بادشاہ کا تقرر خدا کی طرف سے ہوتا ہے اس کو علم اور جسم خدا کی طرف سے دیا جاتا ہے اور یہی اس کی وجہ فضیلت ہے۔

اس نظام میں کوئی تو خوبی نظر آئی ہے کہ حضرت رسولؐ خدا نے امیرالمومنین علیہ السلام سے فرمایا یَا عَلِیُّ اَنْتَ یَعْسُوبُ الدِّیْنِ ۔ اے علی! تم دین کے یعسوب ہو یعنی بعد میرے الٰہی حکومت کے چلانے والے تم ہو۔ تم کو اللہ نے سب سے زیادہ علم بھی دیا ہے اور سب سے زیادہ طاقت بھی اور سب سے زیادہ حکومت کی اہلیت بھی۔

ایک دینی بادشاہ کے لئے پہلے تو اسی کی ضرورت ہے کہ وہ خدا کا معین کردہ ہو جیسے طالوت کو خدا نے بنی اسرائیل کا بادشاہ بنایا تھا اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا (سورہ البقرہ ۲/۲۴۷) خدا نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ بنایا ہے) یہ بات بنی اسرائیل کو ناگوار ہوئی اور انہوں نے اس پر اپنے نبی کے سامنے یہ اعتراض کیا قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ (سورہ البقرہ ۲/۲۴۷) (اس کی حکومت ہم پر کیسے ہوسکتی ہے۔ ہم اس سے زیادہ مستحق ہیں یہ تو کوئی مالدار آدمی نہیں۔)

نبی نے فرمایا قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (سورہ البقرہ ۲/۲۴۷) خدا نے علم اور جسم میں اس کو تم پر فوقیت دی ہے اور اس نے حکومت کے لئے اس کو انتخاب کیا ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ بادشاہ دین کے لئے خدا کا انتخاب کرنا ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ علم اور جسم میں سب سے زیادہ ہو۔ بغیر ان دو صفتوں کے دینی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔ بادشاہ کا انتخاب اس لئے ضروری ہے تاکہ ہر کس و ناکس کو اس عہدہ جلیلہ کے حصول کی خواہش نہ ہو۔ اور یہ چیز کسی اثر ورسوخ کے تحت ایسے لوگوں کو نہ مل جائے جن کے قول سے اور فعل سے سلطنت اسلامی کو بے شمار مفاسد کا سامنا کرنا پڑے۔ دوسرے علم کی ضرورت اس لئے ہے کہ وہ قوانین الہیہ کو صحیح طریق سے اپنی رعایا میں جاری رکھ سکے اور امور معاشرت و تمدن میں ان کو صحیح راستے پر چلا سکے۔ نیکی و بدی میں امتیاز کرا سکے۔

تیسرے جسم یعنی طاقتور ہونے کی اس لئے ضرورت ہے کہ وہ دشمن کے حملوں کو دفع کرسکے۔ اور مسلمانوں کو امن و امان کی حالت میں رکھ کر ان کی دینی اور دنیوی ترقی میں ممد و مددگار ہو۔

یہ جو کچھ کہا گیا دینی حکومت کے متعلق ہے دنیوی حکومت سے ہمیں غرض نہیں وہاں بادشاہ کی صفات جو کچھ ہوں اور اس کے تعین کا جو طریقہ بھی لوگوں کو پسند ہو۔

حضرت علی علیہ السلام میں بحمدللہ یہ تینوں باتیں موجود تھیں وہ خدا کے معین کردہ بھی تھے۔ جیسا کہ رسولؐ نے بار بار امت کو بتایا اور سمجھایا۔ دعوت ذوالعشیرہ میں جو رسالت کی سب سے پہلی منزل تھی۔ ان کی وزارت و وصایت کا اعلان کیا غدیر خم میں جو تبلیغ رسالت کی آخری منزل تھی آپ کی وزارت کا اعلان کیا۔ یہ تو قولی نص تھا اب فعلی اور عملی صورت کو بھی دیکھ لیجئے شب ہجرت اپنے فرش پر سلا کر بتا دیا کہ میری جانشینی کا تعلق علیؑ سے ہے جو آج انتہائی خطروں اور جان جوکھوں میں

ہو کر میری نیابت کر رہا ہے۔ وہی میرے مرنے کے بعد میرا جانشین ہوگا۔ یہ عمل رسولؐ کا حکم خدا کے مطابق تھا اگر صرف رسولؐ اپنی مرضی سے کرتے تو آیہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ (سورہ البقرہ ۲/۲۰۷) کا نزول علیؑ کی شان میں نہ ہوتا۔

جنگ تبوک کے لیے نکلے تو علیؑ کو اپنا جانشین بنایا اور اسی موقع پر یہ بھی فرمایا اَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسٰى یعنی جو منزلت ہارون کی موسیٰ کے نزدیک تھی وہی تمہاری میرے نزدیک ہے۔ وہ منزلت اس کے سوا اور کیا تھی کہ حضرت ہارون شریک کار رسالت موسیٰ تھے اس کے سوا اور کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ پس اسی طرح موسیٰ کے جانشین ہارون تھے۔ اسی طرح علیؑ رسول اللہؐ کے جانشین تھے۔

رہا علم تو اس کا پوچھنا ہی کیا۔ رسولؐ کے بعد حضرت علیؑ سے زیادہ کوئی عالم تھا ہی نہیں کیونکہ یہی وہ ذات تھی۔ جو مصداق ... وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ کہلاتی ہے قُلْ كَفٰى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ (سورہ الرعد ۱۳/۴۳) کہلاتی ہے۔

یہی وہ ذات تھی جس کے لئے رسولؐ اللہ نے اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا یہی وہ تھے جو امت کے قضایا سب سے بہتر فیصلہ از روئے قرآن کر سکتے تھے ان ہی کے متعلق رسول اللہ نے فرمایا تھا اَقْضَاكُمْ (تم میں سب سے بہتر قضایا کا فیصلہ کرنے والے علیؑ ہیں) وہ صرف قرآن ہی کے عالم نہ تھے بلکہ ہر آسمانی کتاب کے عالم تھے چنانچہ آپ نے جو سر منبر فرمایا اگر میرے لئے مسند حکومت بچھا دی جائے تو میں اہل توریت کے درمیان توریت سے اور اہل زبور کے درمیان زبور سے اور اہل انجیل کے درمیان انجیل سے اور اہل قرآن کے درمیان قرآن سے حکم کروں گا۔ یہاں تک کہ ہر کتاب اپنے منہ سے بول اٹھے گی کہ علیؑ نے میرے بارے میں وہی فیصلہ کیا ہے جو خدائی فیصلہ ہے۔

ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی جو دنیا کے مدرسوں میں سبقاً سبقاً تعلیم حاصل کرنے والے ہیں اور جو ایک علم کے بعد دوسرے علم کو سیکھنے کے محتاج ہوتے ہیں یہ اکتسابی علم کی صورت ہے لیکن وہبی علم کی شان ہی دوسری ہے وہاں درساً درساً پڑھنا نہیں ہوتا بلکہ نور رحمت کے قلب میں داخل ہونے ہی تمام علوم آجاتے ہیں جو لفظ کُن سے ایک عالم بنا دیتا ہے اس کی قدرت کے نزدیک کون سی بڑی بات ہے کہ جب بطنِ مادر میں بدن کے اندر روح کو ڈالے تو روح کے ساتھ علم کو بھی سمو دے، آخر بعد میں بھی تو وہی نورِ علم عطا کرتا ہے۔ اَلْعِلْمُ نُوْرٌ يَقْذِفُهُ اللّٰهُ فِي قَلْبِ مَنْ يَّشَاءُ اگر یہ تدریجی صورت بدل جائے اور آن واحد میں سب کچھ وہ دے دے تو محل تعجب کیا ہے۔ جو پیدائش کے وقت عیسیٰ کو نبی بنا سکتا ہے اور صاحب کتاب قرار دے سکتا ہے اگر وہ کچھ مخصوص بندوں کو بطن مادر میں سب کتابوں کا علم دے دے تو حیرت کیوں ہے انکار کیوں ہے۔

علم ہی سے ہدایت ہوتی ہے جسے علم نہیں وہ ہدایت کیا کر سکتا ہے قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ

لَا يَعْلَمُوْنَ (سورہ الزمر ۳۹/۹) علی علیہ السلام کے سوا کسی کو آج تک یہ جرأت نہیں ہوئی کہ بر سرِ منبر یہ دعویٰ کر سکے
سَلُوْنِيْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِيْ اور حضرت نے یہ بھی فرمایا يَنْحَدِرُ عَنِّيَ السَّيْلُ وَلَا يَرْقَىٰ اِلَيَّ الطَّيْرُ
علم کا ایک سیلاب میرے سینے سے اُبلتا ہے اور میرے بام کمال تک، پرندہ بھی پَر پرواز نہیں مار سکتا اب رہی شجاعت
تو اس میں علی علیہ السلام کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں اور کافروں سے جتنی لڑائیاں ہوئیں ان سب میں علی علیہ السلام علمدار
لشکر تھے اور اکثر معرکے انہی کے زور بازو سے فتح ہوئے وہ اشجع العرب تھے کسی لڑائی میں ان کا قدم پیچھے نہیں ہٹا بولے
علی علیہ السلام کے دنیا میں کوئی ایسا نہ ہوگا جس کی زرہ میں پشت کا حصہ ہی نہ ہو کسی نے کہا آپ کو اس کا ڈر نہیں کہ کوئی آپ کی پشت
پر حملہ کرے فرمایا یہ خوف تو اس وقت ہو سکتا ہے جب میں اپنے مقابل کے سامنے پیٹھ پھیردوں اس نے کہا یہ بھی تو ہو سکتا
ہے کہ جب آپ لڑ رہے ہوں کوئی پشت کی طرف سے حملہ کر دے۔ فرمایا میں جس طرح آگے سے دیکھتا ہوں اسی طرح پشت کی
طرف سے بھی دیکھتا ہوں۔ پھر مجھے کیا خوف۔

علی علیہ السلام نے کبھی دشمن کو اپنے اوپر قابو پانے نہیں دیا ان کی لڑائی کا ڈھنگ ہی نرالا تھا جمل کے معرکے میں جب
آپ نے اپنے فرزند محمد حنیفہ کو مقابلے کے لئے بھیجا تو جنگ کے آئین یوں تعلیم کئے۔

يَا بُنَيَّ تَزُوْلُ الْجِبَالُ وَلَا تَزُلْ۔ عَضَّ عَلٰى نَاجِذِكَ تِدْ فِي الْاَرْضِ
قَدَمَكَ اَعِرِ اللّٰهَ جُمْجُمَتَكَ غُضَّ بَصَرَكَ اِلٰى اَقْصَى الْقَوْمِ وَاعْلَمْ
اَنَّ النَّصْرَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى خطبہ ۱۱ نہج البلاغہ

بیٹا پہاڑ جگہ سے ہٹ جائے مگر تم نہ ہٹنا۔ دانت پر دانت چڑھا کر لڑنا میخوں کی طرح قدموں کو زمین
میں گاڑ دینا۔ اپنا سر راہِ خدا میں دے دینا۔ اور دشمن کی آخری صف پر نظر جمائے رہنا اور یہ سمجھ کر لڑنا
کہ نصرت خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔

علی علیہ السلام جیسا بہادر دنیا نے کہاں پایا۔ انہوں نے بھاگنے کا تعاقب نہیں کیا۔ جس نے پناہ مانگی اس پر پھر کبھی
تلوار نہ اٹھائی۔ کمزوروں کے قتل کا ارادہ نہ کیا۔ عورتوں اور بچوں کو اپنے تشدد کا شکار نہ بنایا۔ فتح کے بعد گھروں کو جلایا
نہیں۔ باغوں اور کھیتوں کو برباد نہیں کیا۔ بستیوں کو اُجاڑا نہیں۔ اصلی بہادری اسی کا نام ہے نہ کہ بے کسوں اور بے بسوں
پر چھری چلانے کا۔

لوگ کہتے ہیں کہ علی علیہ السلام کو سیاست نہ آتی تھی۔ ہاں وہ سیاست نہ آتی تھی جس سے مظلوموں کے گلے کاٹے جاتے ہیں
بے جرم و خطا لوگوں کو تہ تیغ کیا جاتا ہے۔ ملک و دولت کی ہوس میں فوج کشی کی جاتی ہے۔ مال و زر سے خزانے بھرے جاتے ہیں۔
عیش و عشرت کی زندگی بسر کی جاتی ہے۔ حقوق الناس کو پامال کیا جاتا ہے تسخیر ممالک کا سودا گھر میں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔

حضور سرورِ انبیاء کے فرائض میں یا آیاتِ الہیٰ کی تلاوت تھی یا کتاب و حکمت کی تعلیم یا لوگوں کا تزکیہ نفس ملک گیری اور فتوحات کو آپ کے فرائض میں کوئی مداخلت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رسولؐ نے کوئی جارحانہ جنگ نہ کی۔ جب لڑنے کے لئے نکلے مدافعانہ حیثیت سے۔

علیؑ رسولؐ کے قدم بہ قدم چلنے والے تھے۔ جارحانہ نبرد آزمائی سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ہاں جب دشمن کسی طرح اپنی ستم شعاری اور ایذا رسانی سے باز نہ آتا تھا تو مجبوراً تلوار لے کر نکلتے تھے۔ انہوں نے رسول اللہؐ کی طرح جنگ کی ابتدا اپنی طرف سے کی ہی نہیں کسی فتنہ کی مانع بیل اپنی طرف سے ڈالی ہی نہیں۔

صرف حضرت علیؑ ہی پر موقوف نہیں اس گھرانہ کی تمام ذمہ دار ہستیوں کا اسی پر عمل تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے واقعات پر گہری نظر ڈالو اور سمجھو کہ انہوں نے ابتدا بجنگ کرنے سے کس حد تک گریز کی۔ دوسرے کی طاقت نہ تھی کہ ایسے نازک موقعوں سے دامن بچا کر نکل جاتا۔

جب ولید حاکم مدینہ نے بلایا تھا اور آپؑ اٹھارہ یا بیس بنی ہاشم کو ساتھ لے کر اس سے ملنے گئے تھے۔ اس وقت اس کے دربار میں وہ یا خود تھا یا مروان۔ جب مسئلہ بیعت یزید پر تلخ کلامی تک نوبت پہنچی تو تمام جوانانِ بنی ہاشم درآنہ دربار کے اندر آگئے۔ دو آدمیوں کا مار ڈالنا کون سی بڑی بات تھی ولید کے قتل کے بعد مدینہ کی حکومت پر قابو پالینا کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن حسینؑ نے اس فتنہ کی ابتدا کا الزام اپنے اوپر نہ لیا تاکہ کل کسی کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے کہ یزید نے حسینؑ کے مقابل انتقامی کاروائی کی تھی۔

مکہ میں جا کر پھر ایسا ہی موقعہ آیا اگر آپ چاہتے تو اہل مکہ سے مدد لے کر ابن زبیر کے ساتھ ہو کر حاکم مدینہ کو نکال باہر کر دیتے اگر مقابلہ ہوتا تو آسانی سے دشمن کا سر کچل دیتے۔ مگر ابتدا بجنگ کرنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ منزل شراف پر حُر کی ایک ہزار جاں جلب فوج سے مقابلہ کتنا آسان تھا۔ مگر سوال وہی ابتدا بجنگ نہ کرنے کا تھا۔

جب نہر سے خیمے ہٹانے پر دشمن مصر ہوا تو یہ بھی ہاشمی غیرت کے لئے پورا چیلنج تھا اس وقت دشمن کی فوج کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ مقابلہ آسانی سے ہو سکتا تھا مگر ابتدا بجنگ امام کے گھرانے کا دستور نہ تھا۔

لیکن جب دشمن سر پہ چڑھ ہی آیا اور راہ چارہ مسدود ہو گئی تو پھر تلواروں کا نیام میں ہی رکھنا ہاشمی شجاعت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ نہ تھا۔ اگرچہ تین دن کی بھوک پیاس تھی۔ آفتاب کی حدت گرمی کی شدت نے جسموں کو مضمحل بنا دیا تھا مگر ایمان قوت کے ولولہ اور نصرت حق کے جوش میں ذرہ برابر کمی نہ تھی۔ لڑے اور اس حوصلے سے لڑے کہ سیر و سیراب دشمن چیخ اٹھا۔

بہتر آدمیوں کی فوج ہی کیا۔ چالیس ہزار فوج سے مٹھی بھر آدمیوں کا مقابلہ ہی کیا۔ مگر مرحبا انِ مجاہدوں پر اور صد آفرین ان بھوکے پیاسے غازیوں پر کہ اہل ستم کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ سروں کی جھڑی لگا دی۔

کیا ممکن کہ کسی نے لڑنے سے جان چرائی ہو کیا ممکن کہ باطل کے سامنے سر جھکانے کا ہلکا سا خیال بھی آیا ہو۔

لڑتے تھے اس لئے کہ حق کا بول بالا رہے۔ مرتے تھے اس لئے کہ اسلام کے سر سے آئی بلائل جائے مرنے کا یہ جوش سر کٹانے کا یہ دلولہ کسی نے کہاں دیکھا ہے کہ ایک دوسرے پر سبقت کرنے پر تلا ہوا تھا۔

لَبِسُوا الْقُلُوْبَ عَلَى الدُّرُوْعِ کَاَنَّمَا
یَتَهَافَتُوْنَ عَلٰی ذِھَابِ الْاَنْفُسِ

انہوں نے زرہوں پر دلوں کو پہن لیا تھا اور پروانوں کی طرح جان دینے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔
جیسے مرنے میں دیر ہوتی تھی وہ گھبرایا ہوا شوق شہادت میں تڑپتا تھا۔ مردوں کا کیا ذکر عورتوں میں نصرتِ حق کا یہ جوش تھا کہ جس بی بی کا جوان لڑکا میدان میں کھڑا نظر آتا تھا وہ اس کو اپنی بدنصیبی پر محمول کرتی تھی اور بارگاہِ الٰہی میں دعا مانگتی تھی کہ الٰہی مجھے جلد روح علیؑ و فاطمہؑ کے سامنے سرخرو کر۔
جب انصارِ حسین درجہ بدرجہ جام شہادت نوش کر چکے اور بنی ہاشم کی باری آئی تو ہر بی بی کی خواہش یہ تھی کہ میری اولاد سب سے پہلے فدیہ راہِ خدا ہے جب جناب زینبؑ کے دونوں صاحبزادے میدانِ جنگ میں کام آ چکے تو جناب اُمِ فروہ مادر جناب قاسم نے فضہ سے کہا ذرا قاسم کو میرے پاس بلا دو۔ کیا غضب آگیا۔ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ میری نظر شہزادی کونین ثانی زہرا کے سامنے نیچی ہے۔ ہے ہے ان دونوں کے بچے شہادت پا چکے ہیں۔ اور قاسم ابھی تک چچا کے پہلو میں کھڑے نظر آرہے ہیں۔ فضہ در خیمہ پر آئیں اور جناب قاسم کو بلایا۔ خیمہ میں آئے تو ماں کی تیوری پر بل دیکھے۔ لرزنے لگے۔ بیوہ ماں نے عتاب آمیز لہجے میں کہا۔ کیا تم مرنے سے جان چُرا رہے ہو۔ کیا جب آگے بڑھو گے کہ چچا کی لاش خاک و خون میں تڑپتی نظر آئے گی۔ جس چچا نے تم کو باپ کی طرح پالا تھا۔ کیا اس کی محبت و شفقت کا بدلا یہی ہے۔ ہے ہے عون و محمد تو مر نے کو جائیں اور تم کھڑے منہ دیکھو۔ تم نے مجھے اس قابل نہ رکھا کہ ثانی زہرا سے آنکھ ملا سکوں۔ آہ! میں ان کو دونوں بیٹوں کا پُرسا دوں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ مجھے تمہارے مرنے پر پُرسا دیتیں۔
قاسم نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ اے مادر گرامی اس میں میرا قصور نہیں۔ میں تو کئی بار چچا جان کی خدمت میں اذن حاصل کرنے کے لئے گیا۔ مگر کیا کروں حضور اجازت نہیں دیتے۔ آپ چچا جان سے سفارش کریں۔
انہوں نے کہا تم جاؤ اور فرزند رسولؐ سے اجازت مانگو اور یہ تعویذ جو تمہارے بازو پر ہے اس کو کھول کر اپنے چچا جان کو دکھاؤ اس میں تمہارے باپ کی وصیت ہے۔ قاسم یہ سُن کر حضرت کی خدمت میں آئے اور اجازت طلب کی امام مظلومؑ نے حیرت سے یتیم بھتیجے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا بیٹا کس دل سے اجازت دوں۔ تم میرے موئے بھائی کی یادگار ہو۔ جب تم کو دیکھتا ہوں بھائی جان یاد آجاتے ہیں۔ قاسم نے عرض کی یا ابن رسول اللہؐ تمام جوانانِ بنی ہاشم باری باری شرفِ شہادت حاصل کر کے راہی جنت ہو چکے ہیں۔ کیا یہ غلام اس سعادت سے محروم رہے

گا۔ میری والدہ گرامی اس بات پر مجھ سے ناراض ہیں کہ مرنے میں کیوں تاخیر کر رہا ہوں۔

ابھی چچا بھتیجے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ خیمے سے کسی بی بی کے رونے کی آواز آئی۔ امام علیہ السلام درِ خیمہ پر آئے اور فضہ سے پوچھا کون رو رہا ہے۔ عرض کی شہزادے آپ کی بھابی رو رہی ہیں۔ امام یہ سن کر خیمے میں داخل ہوئے دیکھا کہ اُم فروہ ستونِ خیمہ سے لپٹی ہوئی زار زار رو رہی ہیں۔ حضرت بے چین ہو گئے پوچھا بھابی جان آپ کے اس قدر بے چینی سے رونے کا سبب کیا ہے۔ اس غم دیدہ اور ستم رسیدہ بی بی نے کہا۔ یا بن رسولؐ اللہ مجھ دُکھیا کو ندامت سے بچایئے اور اپنی مادرِ گرامی سے شرمندہ نہ کیجئے۔ کیا بیوہ کا لال فدیہ راہِ خدا بننے کا اہل نہیں۔ یا بن رسولؐ اللہ ایک قاسم کیا اگر ایسے ہزار بیٹے ہوں تو آپ کے قدموں پر نثار کر دوں۔ یہ سن کر امام سر جھکائے آنکھوں میں آنسو بھرے خیمے سے نکل آئے اور دیر تک خاموش کھڑے رہے۔

قاسم نے بازو سے تعویذ کھول کر خدمتِ امام میں پیش کیا۔ حضرت نے بھائی کی تحریر دیکھ کر ایک آہ سرد کھینچی۔ اس میں لکھا تھا۔ قاسم یہ میری وصیت ہے کہ کربلا میں تمہارے چچا نرغہ اعدا میں گھر جائیں گے تو تم ان پر جان نثار کرنے میں پس و پیش نہ کرنا۔

بھائی کی یہ وصیت پڑھ کر امام مظلوم مجبور ہو گئے اور فرمایا اچھا بیٹا! تم بھی جاؤ۔ آہ حسینؑ پر کیا وقت آگیا ہے کہ گود کے پالے گھر کے اُجالے آنکھوں کے آگے دم توڑ رہے ہیں اور کچھ بس نہیں چلتا۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے تبرکات امام حسن علیہ السلام منگوائے اور اپنے ہاتھوں سے یتیم بھتیجے کو موت کے منہ میں بھیجنے کے لئے سجایا، سر پر عمامہ امام حسن علیہ السلام کا باندھا۔ پٹکے سے کمر کسی۔ ہتھیار بدن پر سجے اس کے بعد جناب قاسم کو چھاتی سے لگا کر دیر تک روتے رہے پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر رکاب پکڑ کر گھوڑے پر سوار کیا۔ جب قاسم چلے تو کلیجہ پکڑے ہوئے پیچھے پیچھے دوڑے۔ اے جان عم ذرا دیر ٹھہر۔ قاسم نے گھوڑے کی باگ روک لی۔ پھر فرمایا گھوڑے سے اُترو کہ مرحوم بھائی کی طرف سے ایک بار پھر تمہیں رخصت کر لوں۔

الغرض جناب قاسم اُترے۔ امام نے سینے سے لگایا پیار کیا اور پھر گھوڑے پر سوار کر کے فرمایا پروردگار گواہ رہنا کہ اب بھائی کی نشانی بھی حسین سے جدا ہو رہی ہے۔

جناب قاسم نے میدان میں آ کر ہاشمی انداز میں ایسا رجز پڑھا کہ میدان کربلا گونج اُٹھا۔ پھر فرمایا جو اپنی جان سے بیزار ہو وہ میرے سامنے آئے۔ میں شیر کردگار کا پوتا امام حسن علیہ السلام کا بیٹا ہوں۔ یہ سن کر ارزق شامی کا ایک بیٹا جو اپنے کو رستم زمان سمجھتا تھا۔ بڑے طمطراق سے گھوڑا کدّاتا سامنے آیا۔ اور کہنے لگا کہ اے نوجوان! تو میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ یہ کہہ کر اس نے وار کیا۔ حضرت قاسم نے اس کا وار سپر پر روکا۔ جب وہ پے در پے چند وار کر چکا تو آپ نے فرمایا او بدبخت اب شمشیر حیدری کا وار روک یہ کہہ کر ایک تلوار ایسی ماری کہ خود اور سر کو کاٹتی سینہ تک اُتر آئی اور وہ نابکار بے قابو ہو کر گھوڑے سے گر پڑا۔ جناب قاسم

نے اس کا سر کاٹ کر لیسرِ سعد کے لشکر کی طرف پھینک دیا۔ یہ حال دیکھ کر ارزق شامی کے تین بیٹے باری باری لڑنے آئے۔ جناب قاسم نے ان کو بھی مار گرایا اور ارزق ملعون جس کے سامنے اس کے چار بیٹے واصل جہنم ہو چکے تھے۔ مار سیاہ کی طرح پیچ و تاب کھاتا فوج کی صفوں سے نکلا۔ جناب قاسم نے بہت جلد اس کا بھی کام تمام کیا۔ جب لیسرِ سعد نے یہ حال دیکھا تو اپنے لشکریوں کو حکم دیا کہ سب یکبارگی اس جوان پر ٹوٹ پڑو۔ چنانچہ یکایک بادل کی طرح چاروں طرف سے فوج سمٹ آئی اور ہر طرف سے وار پیدا ہونے لگے۔

شہزادہ قاسم کا تمام بدن تیروں اور نیزوں سے چھلنی ہو گیا۔ ہر بُن مُو سے فوارہ کی طرح خون پھوٹ نکلا جب گھوڑے پر بیٹھنے کی تاب باقی نہ رہی اور چکر آنے لگے تو آواز دی۔

یَا عماہ ادرکنی

امام مظلومؑ نے جناب عباسؑ اور علی اکبرؑ کو ساتھ لیا اور قتل گاہ میں پہنچے۔ مگر آہ حضرت کے پہنچنے سے پہلے جناب قاسمؑ کی روح راہی جنت ہو چکی۔ امام مظلومؑ نے قریب جا کر دیکھا کہ تمام بدن گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچلا ہوا ہے اور اعضائے بدن جدا ہو چکے ہیں۔ فَقُطِعُوْہُ اِرْبًا اِرْبًا ایک ایک عضو ظالموں نے جدا کر دیا تھا۔

غرض جس طرح بنا جوان بھتیجے کی لاش کو خیمہ گاہ تک لے آئے جب بی بیوں کو خیمہ میں معلوم ہوا کہ قاسمؑ کی لاش آ رہی ہے تو کہرام بپا ہو گیا۔ ہر طرف سے وا قاسماہ واثمرۃ فؤاداہ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مادرِ جناب قاسمؑ سجدہ میں گر پڑیں اور رو رو کر عرض کرنے لگیں۔ خداوندا تیرا شکر ہے کہ آج بیوہ کی کمائی ٹھکانے لگی۔ سجدہ سے سر اٹھایا تو بیٹے کی لاش سے لپٹ گئیں۔ قاسم بیٹا! تم ماں کو چھوڑ کر جنت کو سدھار رہے۔ آہ! اب بیوہ ماں کس کے سہارے جئے گی۔ اے میرے نونہال اے میرے گیسوؤں والے اے میری تمناؤں کے مرکز، میری آرزوؤں کے خزانے۔ میں تیری جان نثاری کے صدقے تم نے ماں کی آبرو رکھ لی۔ ندامت سے بچا لیا۔ دادی جان کی خدمت میں حاضر ہو کر میرا سلام عرض کرنا اور کہنا کہ رانڈ بہو کے پاس جو کچھ دولت تھی وہ فرزندِ رسولؐ کے قدموں پر نثار کر دی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

پندرہویں مجلس

معجزات کتاب و میزان کا بیان

شہادت حضرت علی اکبر علیہ السلام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (سورۃ الحدید ۵۷/۲۵)

(ہم نے اپنے رسولوں کو معجزات دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ہم نے کتاب اور میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ عدل کے ساتھ کام کریں۔)

اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے خدا نے اپنے انبیاء اور مرسلین کو بھیجا۔ نبی اور رسولؑ میں یہ فرق ہے کہ رسول وہ ہیں جن پر کوئی کتاب یا صحیفہ نازل ہوا ہے اور نبی وہ ہے جو صاحب کتاب کی شریعت پر عمل کرے اور عمل کرائے۔

خداوند عالم نے اس امر کی شناخت کے لئے کہ یہ خدا کے برگزیدہ بندے اور اس کی طرف سے ہدایت خلق کے لئے بھیجے ہوئے لوگ ہیں اپنے رسولوں کو معجزات عطا فرمائے۔

معجزہ کی تعریف یہ ہے کہ لوگ اس کے بجالانے سے عاجز ہوں۔ معجزہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور انبیاء و مرسلین کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مرضی سے جب چاہیں دکھادیں۔ جب خدا اظہار معجزے کے لئے ان پر وحی کرتا ہے۔ تب وہ معجزے دکھاتے ہیں۔ جب کسی زمانے میں باکمال لوگ اپنے کمال پر لوگوں کو فریفتہ کرکے ان کی گمراہی کا سبب بنتے ہیں تو خداوند عالم ان کے نقارۂ فخر کی آواز کو دبانے اور ان کے غرور کو توڑنے کے لئے اپنے انبیاء کو ایسے معجزات عطا فرماتا ہے جن کے سامنے لوگوں کے کمالات کے کرشمے بے حقیقت ہوکر رہ جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں نمرود کو اپنی فوج کی کثرت پر بڑا ناز تھا۔ اور اس نے اپنی سطوت و سلطنت کے زور پر لوگوں سے اپنی خدائی کا اقرار کرالیا تھا۔ خدا نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا پر مچھروں کی فوج بھیج کر اس کے تکبّر کی ناک رگڑ دی۔ جناب موسیٰؑ کے زمانے میں جادوگروں کا بڑا زور تھا۔ فرعون کو ان پر بڑا گھمنڈ تھا۔ خدا نے عصائے موسیٰؑ کے ذریعے سے ان کا سارا کمال خاک میں ملا دیا۔ جناب داؤد علیہ السلام کے زمانے میں لوہاروں کو اپنی صنعت پر بڑا ناز تھا۔ جناب داؤد علیہ السلام کے لئے لوہا نرم کرکے اس غرور کے قلعہ کو بھی مسمار کردیا۔ جناب سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں جنوں کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا۔ ایک خاتم سلیمانی نے ان سب کے سر جھکا دیئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں طبیبوں نے بڑا سر اُٹھایا تھا۔ خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بیماروں کے اچھا کرنے اور مُردوں کو جلانے کا معجزہ دے کر ان کی قلعی بھی کھول دی۔ اسی طرح حضرت رسولؐ خدا کے عہدِ مبارک میں عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ قرآن نے ان کا ناطقہ بھی بند کردیا۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ بجائے انبیائے و مرسلین کی طرف رجوع کرنے کے ان ہی باکمالوں کے کمال پر ایمان لاتے اور پھر وہ جس راستے پر چاہتے ان کو لگا دیتے۔

زیر بیان آیت میں معجزات کے بعد خدا نے فرمایا ہے کہ ہم نے رسولوں کے ساتھ کتاب اور میزان بھی نازل کی۔ اس پر آج تھوڑی دیر ہمیں غور کرنا ہے کسی رسولؐ کے ساتھ نہ کوئی کتاب پیدا ہوئی ہے نہ کوئی ترازو۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بنا بر مشہور روایت کے لوگوں کی ہدایت کے لئے آئے۔ لیکن کبھی کسی نے نہ سُنا ہوگا۔ کہ کوئی نبی کتاب بغل میں دبائے یا ترازو کی ڈنڈی ہاتھ میں لئے بطن مادر سے نکلا ہو ہر رسول پر جو کتاب نازل ہوئی ہے وہ اس کی عمر کا ایک بڑا حصّہ گزر جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت کا نزول جوانی کی حد سے آگے بڑھ کر ہوا۔ جناب داؤد علیہ السلام کو تیس برس کے بعد زبور ملی۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام کی جوانی میں انجیل کا نزول ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پر قرآن چالیس سال کی عمر کے بعد نازل ہوا۔ پھر کیا مطلب ہے اس آیت کا کہ ہم نے رسولوں کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کے اندر یہ آیت موجود ہے۔ قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ ؕ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا (سورہ مریم ۱۹/۳۰) (میں اللہ کا بندہ ہوں اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ بطنِ مادر سے جُدا ہوتے ہی جب انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے تو ماننا پڑے گا کہ وہ کتاب لئے ہوئے اور نبی بنے ہوئے

شکم مادر سے آئے تھے۔

لیکن اس کتاب سے مراد انجیل نہیں کیونکہ اس کا نزول برسوں بعد ہوا ہے۔ جز در اس کتاب سے مراد کچھ اور ہے دوسرے اس کے ساتھ میزان کا ذکر حضرت عیسیٰ نے نہیں کیا اور خدا فرماتا ہے کہ ہم نے کتاب اور میزان دونوں کو دے کر بھیجا ہے۔ اس عقدے کا حل یہ ہے کہ خدا کی کتاب دو قسم کی ہے ایک کتاب وجودی دوسرے کتاب شرعی۔ کتاب وجودی ہر انسان کا جسم ہے جس میں قدرت کے لاکھوں راز سربستہ ہیں، اور کتاب تشریعی وہ ہے جو رسولوں پر نازل ہوتی ہے جس میں احکام الٰہی اور دین کے قوانین درج ہوتے ہیں۔

کتاب وجودی کے متعلق امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اَتَزْعَمُ اَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيْرٌ وَفِيْكَ انْطَوٰى عَالَمُ الْاَكْبَر
وَ اَنْتَ الْكِتَابُ الْعَظِيْمُ الَّذِىْ بِاَحْرُفِهٖ يُظْهَرُ الْمُضْمَرُ

یعنی اے انسان کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ چھوٹا سا جثہ ہے حالانکہ تیرے اندر ایک بہت بڑا عالم چھپا ہوا ہے تو خدا کی وہ عظیم الشان کتاب ہے جس کے ایک ایک حرف سے قدرت کا کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔

یہ کتاب وجودی بہت سے ابواب اور فصلوں پر تقسیم ہے اور اس کا ایک ایک باب ایسا مکمل ہے کہ ع

زیر حرف او جائے انگشت کس

کسی کی طاقت نہیں کہ اس کتاب کا ایک لفظ بدل دے یا اس سے بہتر کوئی انسانی پیکر بنا کر دکھا دے۔ اس کا انتہائی کمال یہ ہے کہ اگر ایک بال جسم انسانی سے علیحدہ ہو جائے تو دُنیا کی کوئی طاقت اس کو اپنی جگہ پر جما نہیں سکتی۔ تمام جوڑنے والے مادے لئی سے لے کر سیمنٹ تک اس کو جمانے میں ناکام رہتے ہیں۔ اگر کوئی پُرزہ اس مشین کا خراب ہو جائے تو دنیا کے کسی کارخانے سے ویسا پُرزہ مل نہیں سکتا۔ جو ضائع ہو گیا وہ عمر بھر کو ضائع ہو گیا۔ مصنوعی لاکھ پُرزے لگائے جائیں مگر جو فطری زور خوش نمائی اور خوبی ہے وہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔

خداوند عالم نے کتنے عالم خلق فرمائے ہیں ان سب کے اجزا اس چھوٹے سے جثے میں سمو دیئے ہیں اس میں نُور بھی ہے نار بھی ہے۔ پانی بھی ہے ہوا بھی ہے مٹی بھی ہے پتھر بھی ہے۔ درختوں کا سا نشوونما بھی ہے، حیوانوں کے سے جذبات بھی ہیں۔ فرشتوں کی سی سیرت بھی ہے شیطانی خصلت بھی ہے۔ جنوں کا سا غیظ و غضب بھی ہے بجلی کی چمک بھی ہے بادل کی گھن گرج بھی ہے۔ حوروں کا سا حُسن بھی ہے غلمان کی نزاکت بھی ہے۔ دوزخ کے شعلے بھی ہیں۔ جنت کی بہار بھی ہے۔ چاند سورج کی روشنی بھی ہے۔ غرض کہ جو اٹھارہ ہزار عالموں کی سطح پر پھیلا ہوا تھا وہ قدرت نے سمیٹ کر ایک چھوٹے سے جثے میں بند کر دیا ہے گویا سمندر کو زے کے اندر سما یا ہوا ہے۔

یوں سمجھو جیسے جو کچھ تمام قرآن میں ہے وہ سورہ فاتحہ میں ہے اور جو سورہ فاتحہ میں ہے وہ بسم اللہ میں ہے اور جو بسم اللہ میں ہے وہ بائے بسم اللہ میں ہے جو بائے بسم اللہ میں ہے وہ نقطہ بائے بسم اللہ میں ہے یعنی پورا قرآن ایک نقطہ کے اندر آگیا ہے۔ جب یہ نقطہ کسی نورانی دل کے اندر بیٹھتا ہے تو پھر وہاں اس کی بندھی ہوئی تہیں کھلتی ہیں اور ایک ایک باب سے ہزار ہزار باب نکل کر آتے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھو۔

برگد کا درخت کتنا بڑا ہوتا ہے اور اس کا بیج کتنا چھوٹا اگر میں بیج کو ہاتھ پر رکھ کر کہوں کہ اس کے اندر پورا برگد کا درخت مع اپنے تنے اور کل شاخوں، پتوں اور پھلوں کے سمایا ہوا ہے تو کوئی ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا لیکن جب وہ کسی زرخیز زمین میں بھی دبا جاتا ہے تو قدرتی مشین سے پرلیس کی ہوئی جتنی چیزیں اس کے اندر ہوتی ہیں وہ سب کھلنی شروع ہو جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ وہ پورا درخت بن جاتا ہے۔ جب انسان نے ایسی مشینیں بنائی ہیں کہ منوں روئی کو مشینوں میں دبا کر ایک چھوٹا سا گٹھا بنا دیتا ہے تو قدرت نے اگر اٹھارہ ہزار عالموں کو ایک چھوٹے سے جسم میں جو ابھی بطن مادر سے نکلا ہے چھپا دیا ہے تو کیا محل تعجب ہے۔ ہر جسم انسانی قدرت کی بہترین کتاب ہے مگر عام جسموں سے اس نے تحدی نہیں کی ان میں وہ خصوصیت عطا نہیں فرمائی۔ جو کچھ مخصوص ہستیوں کو جو اس کے انبیاء، مرسلین و اولیاء میں عطا فرمائی ہے۔

پس جو کتاب رسولوں کے ساتھ نازل ہوتی ہے وہ ان کی کتاب وجودی ہے جس کی قوتیں تمام انبیائے روزگار کی قوتیں سے ممتاز ہوتی ہیں اور یہ جسمانی خصوصیات اس کی دلیل ہوتی ہیں کہ یہ خداوند تعالیٰ کے مخصوص بندے ہیں۔

مثلاً قوت باصرہ تمام انسانوں کو عطا کی گئی ہے لیکن انبیاء و مرسلین کی قوت باصرہ بلحاظ اپنی قوت کے سب سے الگ ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوت باصرہ کا یہ حال ہے کہ زمین پر بیٹھے ملکوت سموت والارض کا معائنہ کر رہے ہیں۔
وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورہ الانعام ۶/۷۵) ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آسمان وزمین کے انتظامات دکھا دیئے۔

جناب سلیمان علیہ السلام کی نگاہ کو دیکھو کہ وادی النمل میں چیونٹیوں کی سردار چیونٹی نے اپنی قوم سے خطاب کیا تھا کہ اپنے اپنے گھروں میں چلی جاؤ ایسا نہ ہو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر تمہیں کچل دیں، تو آپ نے دور سے اس چیونٹی کو دیکھ لیا اور جا کر اسی کو پکڑ لیا۔ چیونٹی کے ایک پورے دل میں ایک چیونٹی کو دیکھ لینا اور اسی کو چٹکی میں پکڑ کر اٹھا لینا عام لوگوں کی نگاہ کا کام نہیں۔ چیونٹیوں میں کوئی امتیازی شان نہیں ہوتی سب ایک ہی شکل وصورت اور جثہ اور رنگ کی ہوتی ہیں۔ یہ نبی کی کتاب وصورت کی ایک روشن آیت ہے۔

سید المرسلینؐ، امام الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر دیکھو کہ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (سورہ النجم ۸/۵۳) کی منزل پر پہنچ کر جہاں انوار وجلال ایزدی کے سامنے انسان کا کیا ذکر فرشتے کی نظر نہیں ٹھہر سکتی حضور

کی نگاہ جمی رہی مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ⑰ (سورہ النجم ۵۳/۱۷)

عباس بن عبدالمطلب جنگ بدر کے لئے جب کفار کے ساتھ آرہے تھے تو ایک رقم اپنی بی بی ام الفضل کو دے آئے تھے جب مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوئے اور حضرت رسول خداؐ نے رہا کرنے کے لئے ان سے فدیہ مانگا تو انہوں نے کہا میرے پاس کیا رکھا ہے فرمایا اس رقم سے ادا کرو جو ام الفضل کو دے کر آئے ہو۔ اگرچہ کوئی آنکھ دیکھنے والی نہ تھی مگر میں دیکھ رہا تھا۔

اب حضرت علی علیہ السلام کی نظر کا حال بھی سُن لو۔ ایک روز بر سرِ منبر فرمارہے تھے۔ سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ عَمَّا دُوْنَ الْعَرْشِ (میرے مرنے سے قبل مجھ سے عرش سے پرے کی بات پوچھ لو) یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا بتاؤ اس وقت جبریلؑ کہاں ہیں۔ آپؑ نے اوپر نیچے داہنے بائیں آگے پیچھے نظر کرنے کے بعد فرمایا اَنْتَ جِبْرَئِیْلُ (تم جبریلؑ ہو) یہ سنتے ہی وہ شخص نظروں سے غائب ہوگیا۔ لوگوں نے پوچھا آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہی شخص جبریلؑ ہے۔ آپ نے فرمایا میں نے شش جہات میں ہر جہت کی طرف نظر دوڑائی لیکن جبریلؑ کہیں نظر نہ آئے تب میں سمجھا جبریلؑ یہی ہیں۔

انبیاء و اولیاء کی کتاب وجودی کا یہ ایک باب ہے۔

دوسری قوت سامعہ ہے اس کا حال بھی سنتے چلیئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے وادی نمل میں کھلی فضا میں چیونٹی کی آواز سن لی اور اپنے ہاتھ پر بٹھا کر فرمایا۔ یہ خوف تجھے کیوں پیدا ہوا کہ میں اور میرا لشکر تمہیں کچل دے گا۔ اس نے کہا یا نبی اللہ آپ کے سوا اس فوج میں دوسرا کوئی معصوم نہیں اور غیر معصوم سے ہر امر قبیح ممکن ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: تیرا مرتبہ ان چیونٹیوں میں کیا ہے۔ اس نے کہا جس طرح آپ ایک قوم کے بادشاہ ہیں میں بھی بادشاہ ہوں۔ مگر اس وقت میں آپ سے افضل ہوں آپ کی سواری ایک گھوڑا ہے جو ایک حیوان ہے اور میری سواری ایک نبیؑ کا ہاتھ ہے۔

قوت شامہ کا حال یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بُو کنعان میں سونگھ لی تھی۔

اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ (سورہ یوسف ۱۲/۹۴)

آواز کی قوت کا یہ حال تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حج کے لئے لوگوں کو بلایا تو اُن کی آواز دنیا کے ہر انسان کے کان میں پہنچی جو بچے ماں کے پیٹ میں تھے انہوں نے سُنی بلکہ جو نطفے اصلاب آبا میں تھے انہوں نے بھی سنی۔

جب میرے مظلوم امامؑ نے کربلا میں آوازِ استغاثہ بلند کی تو کائنات کا ہر ذرّہ ہل گیا۔ ملاءِ اعلیٰ کے ساکن مضطرب ہوگئے قوم جن تڑپ اُٹھی جنگلوں کے وحشی، ہوا کے پرندے لرزنے لگے۔

اگر تمام قوتوں کا ذکر کیا جائے انسان کے اعضا کی خصوصیت بتائی جائیں تو مجلس کو طول ہو جائے گا۔ بہر حال انبیاء و اوصیاء انبیاء کی کتاب وجودی کی یہ خصوصیات ہیں یہی ابواب اس کتاب وجودی کے اس امر کی دلیل ہوتے ہیں کہ یہ خدا کے خاص بندے ہیں۔

اب تیسری چیز پر غور کیجیۓ اور وہ میزان ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی نبی یا رسولؐ ترازو ہاتھ میں لۓ پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس میزان سے کیا مراد ہے۔ جاننا چاہیے کہ ہر چیز کے تولنے کی ایک ترازو جُداگانہ ہوتی ہے۔ اگر آپ کو لکڑیاں تولنی ہیں تو ان کے لۓ وہ بڑی ترازو ہوگی جس کو تنک کہتے ہیں۔ اور اگر آٹا وغیرہ تولنا ہو تو اس کی ترازو اور ہوگی اور اگر آپ کو اسٹیم یا بھاپ تولنی ہے یا آکسیجن کا وزن معلوم کرنے کے لۓ اس کی ترازو اور ہوگی اور اگر یہ معلوم کرنا ہے کہ بخار کس ڈگری پر ہے تو اس کی ترازو اور ہوگی اور اگر یہ معلوم کرنا ہے کہ بخار کس ڈگری پر ہے تو اس کی ترازو تھرمامیٹر ہوگا اور ہوا کا وزن معلوم کرنا ہے تو اس کی ترازو بیرومیٹر ہوگا اور اگر شعر کا وزن معلوم کرنا ہے تو اس کی میزان سب سے الگ ہوگی۔ اور الفاظ کو الفاظ کے ذریعے تولا جاۓ گا۔

کریما بہ بخشاۓ بر حال ما

کا وزن معلوم ہوگا۔ کریما فعولن۔ بہ بخشا فعولن لۓ بر حا فعولن یما فعل

اور اگر اخلاقی فضائل کا وزن معلوم کرنا ہے تو دوسرے کے اخلاق کو میزان قرار دینا ہوگا۔ رستم کی سی بہادری۔ نوشیرواں کا سا عدل۔ حاتم کی سی سخاوت۔

پس جو ترازو انبیاء و مرسلین اپنے ساتھ لاتے ہیں وہ ان کے اخلاق و عادات اور اعمال و افعال ہیں۔ ان کی امتوں کے اعمال کو ان ہی کے اعمال کے سامنے رکھ کر جانچا جاۓ جس نسبت سے جس قوم کے اعمال ہوں گے اسی کے لحاظ سے اجر دیا جاۓ گا۔

اُمت محمدی کے اعمال کی جانچ پڑتال حضورؐ سرور انبیاء کے اعمال کو میزان قرار دے کر کی جاۓ گی چونکہ ہر زمانے میں اس قسم کی میزان کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا رسولؐ اللہ نے اپنے بعد اس کا پورا پورا انتظام کر دیا تاکہ ہر زمانے والوں کے سامنے نمونہ عمل رہے۔

آپؐ نے کھُلے لفظوں میں فرمادیا **يَا عَلِيُّ اَنْتَ صِرَاطُ الْمُسْتَقِيْمِ وَ مِيْزَانُ الْاَعْمَالِ** قیامت میں جو میزان نصب ہوگی اور لوگوں کے اعمال تولے جائیں گے اس سے مراد یہی میزان ہے یعنی محمد و آل محمد علیہم السلام کے اعمال کا ایک نقشہ لوگوں کے سامنے ہوگا۔ اور یہ جانچا جاۓ گا کہ ان حضرات کے عمل سے مسلمانوں کے اعمال کس حد تک ملتے جلتے ہیں۔ کس حد تک ان میں خلوص ہے۔ کس حد تک ان میں ریاضت کو دخل ہے کس حد تک ان کا لائحہ عمل صحیح ہے۔

حضورؐ سرور کائنات نے اس کا بند و بست یوں فرمایا تھا کہ قرآن کے ساتھ اپنی عترت کو دیا تھا۔ تاکہ حکم اور عمل کے دونوں ذخیرے ساتھ ساتھ ہوں۔ جب تک کسی معصوم کا عمل قرآن کے احکام کے ساتھ نہ ہو اس کی صحت پر کسی حالت میں بھی اعتماد نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اہل بیتؑ کے عمل پر عصمت کا سایہ تھا۔ لہٰذا اُمت کی گمراہی کا کھٹکا باقی نہیں رہ سکتا تھا۔

احکام الہیہ کے سلسلے میں کوئی دائرہ عمل ایسا نہ تھا جس میں اہل بیت رسولؐ کو وہ سرفرازی اور بلندی حاصل نہ ہو جہاں دوسروں کا پہنچنا محال تھا۔

عبادت کی تو ایسی کہ علی علیہ السلام کے چہرے پر نظر کرنا عبادت ہوگیا۔ علیؑ کا ذکر عبادت ہوگیا۔ علی علیہ السلام کی محبت عبادت

ہوگئی۔ نمازیں پڑھیں تو اس شان سے کہ ایک ایک رات میں ہزار ہزار تکبیروں کی آوازیں لوگوں نے سُن لیں۔ روزہ رکھے تو اس شان سے کہ کوئی دن صوم سے خالی نہ رہا۔

فرمایا کرتے تھے تین چیزیں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں۔

اَلْاِکْرَامُ لِلضَّیْفِ وَالْجِهَادُ بِالسَّیْفِ وَالصَّوْمُ فِی الصَّیْفِ

مہمان کا اکرام۔ تلوار سے جہاد اور گرمی کا روزہ

حج کیے تو اس شان سے کہ سواری پر بیٹھ کر اپنے معبود کے گھر جانا، آئین بندگی کے خلاف سمجھا اپنی حکومت کے دور میں بھی اپنے قدیم دستور کو نہ چھوڑا۔ شدید گرمی کے موسم میں بھی مکہ کا طول طویل راستہ پیادہ ہی طے ہوتا تھا۔ جب یہ دیکھتے کہ لوگ حضرت کو پیادہ دیکھ کر اپنی سواریوں پر بلحاظِ ادب و احترام سے اُتر جاتے ہیں اور ان کو پیادہ چلنے میں تکلیف ہوتی ہے تو شاہ راہ عام کو چھوڑ دیتے تھے۔ اگرچہ ایسے راستوں میں چلنے سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ مگر پُرخلوص عبدیت کسی طرح یہ گوارا نہ کرتی تھی کہ سوار ہو کر معبودِ برحق کی بارگاہ میں حاضر ہوں۔

اندھیری راتوں میں اس برگزیدۂ باری کی دل ہلا دینے والی مناجاتوں سے حرم الہٰی کا ذرّہ ذرّہ رو رہا تھا کعبہ کا پردہ پکڑے ہوئے تمام تمام رات اپنے خالق کی یاد اس شان سے کر رہے ہیں۔

طُوْبیٰ لِمَنْ کُنْتَ اَنْتَ مَوْلَاہُ
فَارْحَمْ عُبَیْدًا اِلَیْکَ مَلْجَاہُ

چہرے کا رنگ اُڑا ہوا ہے۔ آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ دل میں درد ہے۔ جگر میں سوزش آہوں میں گرمی حرمِ الہٰی کے آس پاس دُنیا پڑی سو رہی ہے مگر علی علیہ السلام جاگ رہے ہیں اور یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

قَدْ نَامَ وفلک حول البیت قَاطِبَةً
وَاَنْتَ وحدک یا قَیّوم لم تنم

خیرات کی تو ایسی کہ جو ہاتھ میں آیا اللہ کے محتاج بندوں کی نذر کر دیا خود فاقے پر فاقے کئے اور دوسروں کو شکم سیر ہو کر کھلایا۔ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورہ الحشر ۹/۵۹) ان کی تعریف میں ہے اپنے پیٹ پر پتھر باندھے دوسروں کے خالی پیٹ بھرے۔ کسی نے کہا آپ اتنے فاقے کیوں کرتے ہیں فرمایا۔ کَیْفَ اَشْبَعُ وَحَوْلِیْ بُطُوْنٌ غَرْثیٰ (میں کیسے سیر ہوں درانحالیکہ کچھ بھوکے میرے گرد ہوں۔)

سخاوت کی تو ایسی کہ لوگ حاتم کو بھول گئے کسی سائل کو اپنے در سے ناکام جانے ہی نہ دیا۔ بلکہ ایک روٹی کے سائل

کو اُونٹوں کی قطار بخش دی کسی نے حاتم کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ وہ ایک سائل کو چالیس دروازہ سے دینا تھا فرمایا ایک ہی دروازہ سے اتنا کیوں نہ دے دیا کہ دوسرے دروازوں پر جانے کی ضرورت ہی نہ رہتی یہ اسی بے مثل سخاوت کا اثر ہے کہ آج تک مانگنے والے ان کا نام لے کر بھیک مانگتے ہیں تاکہ ان کی سخاوت کو یاد کر کے لوگ حاجت روائی کریں۔

شجاعت کا یہ حال کہ کسی معرکے میں پیٹھ نہ دکھائی سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح قدم جما کر رہے کَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ انہی کی شان میں کرارٌ غیر فرار ان کا طریقہ امتیاز ہے لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّؑ ان کے نقارہ فخر کی آواز ہے ضَرْبَةُ عَلِيٍّؑ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ ان کے جہاد فی سبیل اللہ کی آئینہ دار ہے۔ شب ہجرت بستر رسولؐ پر سونا ان کی شجاعت کا شاہکار ہے۔

عدل کیا تو ایسا کہ رسولؐ اللہ نے اَقْضَاكُمْ عَلِيٌّؑ کی سند دی۔ قَضِيَّةٌ وَلَا اَبَا حَسَنٍ لَهَا کے نعروں سے عرب کی فضا گونج اٹھی۔

زہد کی منزل سے دیکھا تو ان سے بڑھ کر تارک الدنیا نظر نہ آیا گھر میں دُنیا کا کوئی سامان نہیں چند مٹی کے برتن ایک پانی کی مشک، ایک اُونٹ کی کھال جو رات کو علی علیہ السلام کا بستر بنتی تھی، اور دن کو اونٹ اس پر دانہ کھاتا تھا۔ لباس کا یہ عالم کہ پیوند لگانے کی جگہ باقی نہ رہی۔

خوراک کا یہ عالم کہ جَو کی روٹی نمک کے پانی میں چور کر کھانا اپنے لئے مرغوب غذا تھی۔ آدمی سے زیادہ بھوسی ملا ہوا آٹا چھانکنا توکلت علی اللہ کا سرمایا جاتا۔ دو غذائیں بیک وقت کھانا زہد فی الدنیا کے منافی سمجھا۔ صلہ رحم کا یہ حال کہ دُکھ درد میں ہر ایک کے شریک رہے جس کی جو اعانت ممکن ہوئی کر دی۔

بیواؤں اور یتیموں پر یہ شفقت کہ عہد حکومت میں خرموں اور روٹیوں کی بوریاں کمر پر لاد کر ے جاتے اور لپس دوسے آواز دے کر تقسیم کرتے چہرہ پر نقاب ڈال لیتے کہ کوئی صورت دیکھ کر شرمائے نہیں۔

بارگاہِ باری میں عمل کی قبولیت کے لئے خلوص کی شرط ہے، ایمان باللہ کی شرط ہے علیؑ اور اولاد علی کے عمل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو کام کرتے تھے خالصاً للہ۔ قربتہ الی اللہ، فی حُبِّ اللہ، نہ ریا کو اس میں دخل نہ نام و نمود کا شائبہ تک۔ نہ اپنی کوئی غرض وابستہ نہ کسی سے شکر گزاری کی خواہش لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (سورہ دہر ۹/۷۶) ان ہی کے عمل کی تعریف ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جو کام بھی انہوں نے کیا۔ خدا اور رسولؐ کی بارگاہ سے اس کی مقبولیت کی سند مل گئی۔

شب ہجرت رسولؐ، رسول خدا کے بستر پر سوئے۔ آیہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (سورہ البقرہ ۲/۲۰۷) نے نازل ہو کر ہمت افزائی فرمادی۔ اور قبولیت کی سند عطا کر دی۔

مسکینوں یتیموں اور اسیروں کو تین روز تک پانچ پانچ روٹیاں دیں۔ پورا سورہ دہر اپنی شان میں نازل کرا لیا کوئی

بہت بڑی خیرات نہ تھی۔ لوگ لنگر خانے کھولتے ہیں۔ محتاج خانے بنواتے ہیں۔ یہاں تو صرف پانچ روٹیاں تھیں مگر
وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ (سورہ دہر ۸/۷۶) کے دسترخوان میں لپٹی ہوئی تھیں۔
رکوع میں ایک انگوٹھی دے دی تو اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ کی سند لے لی۔
ایک کافر کے سر پر تان کر ایک ضرب لگادی تو ضَربَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ کا سند لے لی۔ آخر
کوئی تو اس ضربت میں خصوصیت تھی۔ اور لوگوں نے بھی بہت سے کافر مارے۔ اور بڑی بڑی گہری گہری چوٹیں لگائی تھیں مگر تعریف
ہوئی تو اسی ضربت کی۔ ضرور اس میں کوئی راز ہے۔

غرض اسی طرح جو عمل کرتے گئے قبولیت کی سند حاصل کرتے گئے۔ ان کا کوئی عمل بھی مردود بارگاہ باری قرار نہ پایا جس
کی لِم یہ ہے کہ ریا کو کسی عمل میں دخل نہ تھا اسی وجہ سے ان کے اعمال کو میزانِ عمل بنا دیا گیا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وقت کے لحاظ سے عمل کی نوعیت بدل جاتی ہے لیکن اہل بیتؑ کے عمل کی پرخلوص نوعیت کسی حالت
میں بدلتی نظر نہ آئی۔ سفر ہو یا حضر۔ راحت ہو یا تکلیف، دولت ہو یا عسرت ہر جگہ ایک ہی منزل پر نظر آتے ہیں۔ نہ
اخلاقی قدروں کو بال برابر نیچے گرنے دیتے ہیں نہ عمل کی نوعیت میں کوئی ہلکی سی تبدیلی کرتے ہیں۔ ان کے اصول زندگی اٹل
ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ ان کے ایمان و ایقان کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا۔ وہ خدا کے سوا کسی سے
ڈرنے والے نہیں۔

جب بُرا وقت آپڑتا ہے تو بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور جو کرنا نہیں چاہتے ہیں وہ خوف جان
سے کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور ان کہی کہہ دیتے ہیں مگر اہل بیت کا یہ دستور نہیں۔

کربلا میں امام مظلومؑ پر کیسا سخت وقت آیا تھا حکومت اسلامی کا ذرّہ ذرّہ ان کے خون کا پیاسا بنا ہوا تھا مگر مصائب
آلام کے اس بے پناہ ہجوم میں حسینؑ وہی حسینؑ تھے جو اس سے پہلے تھے ان کے ارادے میں بال برابر لرزش نہ تھی۔ ان کے
منصوبے میں ذرا سی لچک نہیں پیدا ہوئی۔ اعادوں کو پلپانے کے لئے کیا کچھ سامان نہ تھا۔ دشمن کی فوجوں سے میدان کربلا چھلک
رہا تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے کل ساتھی جوان بوڑھے اور بچے کل بہتر تھے جن کے سہارے فتح کی امید ہو ہی نہ سکتی تھی۔ تین
روز کی بھوک پیاس بھی تھی۔ ایک ایک کے قتل ہونے کا پورا یقین بھی تھا۔ ناموس رسولؐ کے لٹنے اور قید کئے جانے کا
خطرہ بھی تھا۔ گھر کی تباہی و بربادی کا قوی اندیشہ بھی تھا اتنی بلاؤں کے ہجوم میں حسینؑ اپنے مقام پر تھے دوسرا ہوتا تو گھبرا کر
بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دیتا۔ دشمن کے سامنے سر جھکا دیتا۔ جان کے بچانے کے لئے ہر ذلت کو گوارا کر لیتا۔ مگر حسینؑ جہاں تھے
وہیں رہے۔ انہوں نے کسی موقع پر اپنی اخلاقی کمزوری کا ثبوت نہیں دیا۔ انہوں نے کوئی سیاسی چال نہیں چلی۔ انہوں
نے ایک بات منہ سے ایسی نہیں نکالی جو خلاف واقع ہو۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کسی وقت بھی دھوکے میں نہیں رکھا
جو انجام ہونے والا تھا سب کو اس سے آگاہ کر دیا۔ وہ بھوک پیاس سے گھبرائے نہیں وہ قتل ہونے سے ڈرے نہیں۔

یہ ان کے کردار کی بلندی اور عمل میں خلوص کا اثر ہی تو تھا کہ بہتّر کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔

بڑے بڑے وفادار اور سچّے جاں نثار حسینؑ کے سامنے موجود تھے۔ اور امام کو ان کی سرفروشی اور جاں نثاری پر پورا پورا اعتماد بھی تھا مگر جب جنگ کا آغاز ہوا تو انہوں نے سب سے پہلے دشمن کے مقابلے کے لئے نہ غیروں کو اجازت دینی چاہی نہ اپنے عزیزانِ خاص کو کیونکہ اس میں اخلاقی کمزوری کا ایک پہلو نکلتا ہے کہ غیروں کو موت کے شعلوں میں ڈالنا چاہتے ہیں اور اپنی اولاد کو بچانا چاہتے ہیں۔ امام سے جب دشمن کی طرف سے مبارز طلبی ہوئی تو اپنے کڑیل جوان کی طرف دیکھا اور فرمایا بیٹا سب سے پہلے تم لڑنے کے لئے جاؤ۔ اگرچہ انصار واحباب نے حضرت علی اکبر کو جانے نہیں دیا۔ مگر امام حسین علیہ السلام نے اپنے روشن کردار پر دھبّہ نہ لگنے دیا۔

اس وقت حسین علیہ السلام کے بہت سے ناصر و مددگار موجود تھے انہوں نے حضرت علی اکبر کو بچا لیا لیکن آہ حسین علیہ السلام کا یہ لختِ جگر، شبیہ پیغمبرؐ ان ظالموں کے دست برد سے کہاں بچ سکتا تھا۔ آخر وہ وقت بھی آگیا کہ امام مظلوم کو اپنے اس کلیجے کے ٹکڑے اور آنکھوں کے نُور کو تیغوں میں رکھنا ہی پڑا۔

اولاد کی محبّت ماں باپ کو جیسی کچھ ہوتی ہے کون نہیں جانتا۔ بالخصوص جب اولاد جوان اور لائق ہو تو ماں باپ کی ہزار ہا آرزوئیں اس سے وابستہ ہوتی ہیں۔ لیسا اوقات انسان جذبہ محبّت سے مجبور ہو کر اپنی جان کو اولاد پر قربان کر دیتا ہے اور کسی طرح ان کی تکلیف کو دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ بلکہ اکثر لوگ اپنی اولاد کی محبت میں صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتے ہیں۔

صرف دو شخص ہی دنیا میں ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے محض دین اسلام کو مصیبت سے بچانے کے لئے اپنے جوان بیٹے کی موت کو خوشی سے قبول کیا ان میں سے ایک حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں اور دوسرے حسین بن علی علیہم السلام حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں جو ستارہ پرست قوم تھی وہ انسانی قربانی کو بہترین عبادت جانتی تھی۔ لوگ اپنے بچوں کو ہیکل زحل میں لے جا کر قربانی کرتے تھے۔ وہ بار بار حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہتے تھے کہ آپ کے دین میں چونکہ انسانی قربانی جائز نہیں لہٰذا وہ سچّا دین نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لاکھ لاکھ ان کو سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ آخر بحکم خدا بیٹے کی قربانی پر آمادہ ہوگئے۔ جب جناب اسمٰعیل کی جگہ دُنبہ ذبح ہوگیا تو خلیل باری نے قوم سے کہا دیکھو اگر خدا انسانی قربانی کو پسند کرتا ہوتا تو میرے بیٹے کی قربانی ضرور قبول کر لیتا۔

اس واقعہ کا اس قوم پر ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے بچوں کی قربانی کا سلسلہ بند کر دیا چونکہ ایک رسمِ بد کا انسداد ہوا تھا۔ لہٰذا خدا نے اس واقعہ کی یادگار میں ہمیشہ کے لئے قربانی کا حکم دے دیا۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوت کا بڑا زبردست مظاہرہ کیا۔ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے کے لئے تیار ہو جانا معمولی بات نہیں۔ یہ سب خوشنودی خدا حاصل کرنے کے جذبے میں کیا گیا۔ لیکن باوجود اس کے بشریت اپنے تقاضوں سے باز نہیں رہی۔ بیٹے کو ذبح کرنے کے ارادے سے جب منیٰ میں پہنچے اور ہاتھ پاؤں

باندھ کر ذبح کرنے پر آمادہ ہوئے تو آنکھوں پر پٹی باندھ لی تاکہ بیٹے کا خون آنکھوں سے نہ دیکھیں۔ خدا تبارک و تعالیٰ نے اس امتحانِ عظیم کو ان سے ہٹا لیا اور ان کا بیٹا صحیح و سالم پہلو میں کھڑا ہوا دیکھ لیا۔

جب گھر سے چلے تھے تو ماں نے پوچھا تھا۔ اے خلیل باری آپ اسمٰعیلؑ کو کہاں لئے جاتے ہیں۔ فرمایا تھا کہ ایک دوست کے یہاں دعوت میں لئے جاتا ہوں۔ جناب ہاجرہؑ نے کہا ٹھہریئے میں ان کو ناشتہ کرا دوں نا معلوم وہاں کس وقت کھانا ملے جب جناب اسمٰعیلؑ کو لوٹنے میں تاخیر ہوئی تو جناب ہاجرہؑ بے چین ہوئیں اور بار بار دروازے پر آکر دیکھتی تھیں۔

لیکن خلیل کربلا کے لئے جو صورت پیش آئی وہ اس سے بہت مختلف ہے۔ ان کا بیٹا جو شبیہ رسولؐ تھا اور شباب میں ڈوبا ہوا تھا تین روز کا بھوکا پیاسا تھا۔ پھر ایسے وقت میں امام حسینؑ سے رخصت ہو رہا تھا جبکہ علی اکبر کے سوا کوئی ناصر و مددگار باقی نہ رہا تھا۔ جناب ہاجرہؑ نے بیٹے کو ناشتہ کرا کے بھیجا تھا لیکن غریب ام لیلیٰ کے لئے ایسا کرنا کہاں ممکن تھا۔ وہاں تو ایک گھونٹ پانی دینے کا بھی امکان نہ تھا۔

منقول ہے کہ جناب عباسؑ بھی شہید ہو گئے اور سوائے علی اکبر کے لشکرِ حسینیؑ میں کوئی بھی جوان باقی نہ رہا تھا تو علی اکبرؑ نے باپ کی خدمت میں عرض کیا۔

"حضور! اب چارہ کار کیا ہے نہ چچا عباس ہیں نہ قاسم نہ عون و محمد"

امام حسین علیہ السلام نے ایک آہ سرد دلِ پُر درد سے کھینچ کر فرمایا! آہ کس دل سے تجھے مرنے کی اجازت دوں لیکن مرضیٔ خدا یہی ہے کہ میں تجھے خاک و خون میں لوٹتا دیکھوں۔ اچھا بیٹا! تم خیمہ میں جا کر اپنی ماں پھوپھی سے رخصت ہو کر آؤ۔

جناب علی اکبرؑ تسلیم بجا لائے اور خیمہ کا رُخ کیا۔

آہ علی اکبرؑ کا خیمہ میں داخل ہونا قیامت کا سماں تھا۔ ایک کہرام بپا تھا۔ سیدانیاں سمجھ گئیں کہ اب علی اکبرؑ بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو رہے ہیں۔ جناب زینب سلام اللہ علیہا نے چھاتی سے لپٹا لیا اور رو کر کہنے لگیں۔ بیٹا علی اکبر! اب کس ارادے سے آئے ہو۔ عرض کی پھوپھی اماں سے رخصت آخر کے لئے۔ بابا جان کے لشکر میں اب سوائے میرے کوئی باقی نہیں رہا۔ دشمن بار بار مبارز طلبی کر رہا ہے۔ اب تو ان سے لڑے بغیر چارہ کار نہیں۔ جناب زینبؑ نے فرمایا۔ بیٹا ضعیف باپ کو کس پر چھوڑتے ہو۔ آہ میرا ماں جایا تنہا رہ جائے گا آہ بیٹا! تیرا داغ ہم سے نہ اُٹھایا جائے گا۔

اُم لیلیٰ نے بڑھ کر بیٹے کی بلائیں لیں۔ علی اکبر کیا تم بھی اب مرنے کو جا رہے ہو۔ آہ میرے سب ارمان خاک میں مل رہے ہیں۔ کاش میں تم سے پہلے مر جاتی اور یہ روز بد نہ دیکھتی۔ بیٹا کیا مدینے سے اس لیے لائے تھے کہ یہاں غریب ماں کو نرغۂ اعدا میں چھوڑ جاؤ۔ فرزند رسولؐ اب کس کے سہارے سے جئیں گے آہ اس بڑھاپے میں بہتر داغ کلیجے پر کھاتے ہوئے ہیں۔ اب ان میں اتنی جان کہاں کہ تمہارا نیا داغ دل پر کھائیں آہ فاطمہؑ کا گھر تباہ ہو گیا آہ میں کربلا میں آکر لٹ گئی کیا خبر تھی کہ قسمت بھرے

شباب میں تم کو مجھ سے چھین لے گی۔

علی اکبر سر نہوڑائے زار زار رو رہے ہیں اور صبر کی تعلیم دے رہے ہیں مگر یہ نصیحت ایسی نہیں کہ کسی کو صبر آجائے سیدانیاں چاروں طرف حلقہ کئے ہوئے ہیں سکینہ دامن سے لپٹی ہوئی ہیں۔ کوئی بی بی کمر میں ہاتھ ڈالے رو رہی ہے۔ کسی کے گردن میں ہاتھ ہیں۔ کوئی پٹکا پکڑے ہوئے ہے کسی طرح شہزادے کو چھوڑنا گوارا نہیں۔ لیکن ایسی بے بسی اور بے کسی کا عالم ہے کہ روک سکتے نہیں بنتی۔

ابھی علی اکبر سب بی بیوں کے بیچ میں کھڑے تھے کہ فضہ نے کہا کہ شہزادے آپ کے بھائی بیمار کربلا کہہ رہے ہیں۔ مجھ سے ملے بغیر نہ جانا۔ یہ سن کر بی بیوں کے ساتھ علی اکبر بیمار کربلا کے خیمے میں آئے دیکھا کہ کمزوری سے آپ میں اُٹھنے کی طاقت نہیں بھائی سے لپٹ کر زار زار رونے لگے بیمار کربلا نے پوچھا اب کیا ارادہ ہے۔ فرمایا دشمنوں سے لڑ کر مر جانا اس کے سوا چارہ کار نہیں۔ فرمایا کیا اب کوئی لشکری فرزند رسولؐ میں باقی نہیں رہا۔ علی اکبرؑ نے رو کر کہا کہ سب راہی جنت ہوئے اب نہ قاسم ہیں نہ عون و محمد نہ چچا عباس میرے سوا اب کوئی باقی نہیں رہا۔ یہ سن کر بیمار کربلا تڑپ گئے۔ فرمایا علی اکبر! تم شبیہ پیغمبر ہو تم کو پھوپھی جان نے بڑے ناز سے پالا ہے۔ میں تم کو نہ جانے دوں گا۔ اسی نقاہت کے عالم میں فرش سے اُٹھے اور جناب زینبؑ سے فرمایا۔ پھوپھی اماں! تم ان کو روکو۔ ان کے بدلے میں مرنے کو جاتا ہوں۔ یہ سنتے ہی کہرام بپا ہو گیا۔ سب بی بیوں نے بیمار کربلا کو روکا۔ جناب زینب نے گردن میں باہیں ڈال دیں۔ اے بیمار فرزند میں تم پر قربان تم میں اتنی جان کہاں کہ میدان میں جا کر لڑو۔ بیٹا! جو قسمت میں لکھا ہے وہ پورا ہو گا۔

ابھی علی اکبر خیمے سے برآمد نہ ہونے پائے تھے کہ دشمن نے مبارزطلبی کا شور مچایا اے حسینؑ! جو کوئی اور باقی رہا ہو اسے بھی بھیجو تاکہ ہم اس کا سر کاٹ کر ہی فارغ ہوں۔ اگر کوئی نہیں آتا تو اب ہم خیام کی طرف بڑھتے ہیں۔

دشمن سے یہ سن کر امام علیہ السلام خیمہ میں آئے اور فرمایا جلد علی اکبر کو رخصت کرو ورنہ دشمن میری زندگی میں خیمہ گاہ میں در آئیں گے۔ مجبور سیدانیاں بے کس سیدانیاں کیا کرتیں۔ علی اکبر کو رخصت کیے بنی۔ شہزادے نے ایک ایک بی بی کو رخصتی سلام کیا اور خیمے سے نکلے۔

امام مظلوم نے اپنے کڑیل جوان کو اپنے ہاتھوں سے سجایا مسلح کیا۔ حسرت سے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور رو دیئے۔ خدا کسی باپ پر یہ وقت نہ لائے کہ وہ اپنے جوان بیٹے کو مرنے کے لئے بھیجے۔ آپ نے آسمان کی طرف رُخ کیا۔ اور فرمایا خداوندا گواہ رہنا کہ اب وہ جوان مجھ سے جدا ہو رہا ہے جو صورت و سیرت میں اور بول چال میں تیرے رسولؐ کی صورت سے سب سے زیادہ مشابہ تھا۔ خداوندا جب میں تیرے رسولؐ کی زیارت کا مشتاق ہوتا تھا تو اس کو دیکھ لیا کرتا تھا اس کے دم سے مجھے بڑی ڈھارس تھی۔ اب میرا یہ آخری سہارا بھی مجھ سے جدا ہو رہا ہے۔ خداوندا مجھے اس غم میں صبر دے۔ اس کے بعد رکاب پکڑ کر گھوڑے پر سوار کیا۔ جب علی اکبر چلنے لگے تو مظلوم حسینؑ نے اپنا سینہ ہاتھوں سے پکڑ لیا

اور حسرت سے بیٹے کو موت کے منہ میں جاتے دیکھتے رہے کیسا سخت وقت تھا جس کے تصور سے روح کانپتی تھی۔
علی اکبر میدان میں آئے۔ ہاشمی انداز میں ایک پُرزور رجز پڑھا اور شیر خشمناک کی طرح فوج دشمن پر حملہ کیا یہ معمولی حملہ نہ تھا لوگوں کو علیؑ کی جنگ یاد آ گئی۔ تھوڑی دیر میں ایک سو بیس اشقیا کو فی النار کیا۔ کشتوں کے پشتے اور لاشوں کے انبار لگا دیئے۔ ہر طرف خون کی ندی بہہ رہی تھی اور الامان الامان کی آوازیں آ رہی تھیں۔
عمر سعد کو خوف ہوا کہ کہیں اس کے خیمے تک نہ آ جائیں۔ ایک مرتبہ فوج کو للکارا یہ کیا بزدلی ہے کہ ایک جوان نے سارے لشکر میں ہلچل ڈال دی ہے۔ جوانمردی سے اس کا مقابلہ کرو۔ بس اس کے بعد لشکر حسینؑ کا خاتمہ ہے اس کو مار کر حسینؑ کا سر کاٹیں گے اور یہ مہم سر کرنے کے بعد امیر ابن زیاد سے انعام و اکرام حاصل کریں گے سب مل کر ایک باری اس جوان پر حملہ کر دو۔
چنانچہ اس نابکار کے ہمت دلانے سے منتشر فوج یک جا ہوئی اور شبیہ پیغمبر کو چاروں طرف سے گھیر کر وار پر وار شروع کر دیئے۔ ایک طرف سے تیر انداز تیروں کا منہ برسا رہے تھے۔ دوسری طرف سے نیزہ و شمشیر کے وار ہو رہے تھے۔ اسی عالم میں سنان بن انس نے شہزادے کے سینے پر ایک ایسا نیزہ مارا کہ سینہ کو توڑتا ہوا کلیجہ کو چھیدتا ہوا پشت سے باہر نکل گیا۔ اب گھوڑے پر ٹھہر نہ سکے آواز دی۔ یاابتاہ ادرکنی۔
آہ اس آواز کے سنتے ہی امام مظلوم کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ عباسؑ کے مرنے سے کمر ٹوٹی تھی اب آنکھوں کی بصارت میں ضعف پیدا ہو گیا۔ مروی ہے کہ حضرت اس تیزی اور بے قراری سے جھپٹے جیسے باز شکار پر جاتا ہے۔ راستے میں جا بجا ٹھوکریں کھاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے بیٹا علی اکبر کہاں ہو مجھے اپنی آواز سنا دو۔ ضعیف باپ کو تم تک پہنچنا دشوار ہے۔
غرض جس طرح بن پڑا اس مقام پر پہنچے۔ جہاں کڑیل جوان بیٹا شبیہ پیغمبر بنی ہاشم کا فخر خاک پر پڑا دم توڑ رہا تھا۔ تمام بدن خون سے لہولہان تھا کرب میں ایڑیاں خاک پر رگڑ رہے تھے۔ مظلوم باپ نے اپنی آغوش میں سر لیا۔ گرم گرم آنسو جب علی اکبر کے چہرے پر ٹپکے تو غش سے آنکھیں کھولیں۔ حسینؑ نے خون بھری پیشانی کو بوسہ دیا۔ منہ پر منہ رکھا۔ خشک ہونٹوں کو چوما۔ بیٹا کیا حال ہے عرض کی باباجان وقتِ جاں کنی ہے۔ اب کوئی دم میں یہ غلام رخصت ہونے والا ہے۔ باباجان میں دیکھ رہا ہوں کہ حضرت رسولؐ خدا اور میرے دادا جان اور دادی جان یہ میرے سامنے کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں اے علی اکبر ہمارے پاس آؤ حورانِ جنت تمہاری مشتاق ہیں کوثر کے جام تمہارے لئے چھلک رہے ہیں۔
باباجان آپ میری لاش کو یہیں چھوڑ دیجئے گا کیونکہ اب آپ میں اتنی طاقت کہاں کہ مجھے اٹھا کر خیمہ گاہ میں لے جائیں۔

آہ یہ حسینؑ کا کلیجہ تھا کہ جوان بیٹے کا یہ عالم دیکھا ایک روایت میں ہے کہ برچھی جو سینہ علی اکبر میں در آئی تھی امام مظلوم نے اسے ہلا ہلا کر نکالا۔ برچھی کے نکلتے ہی علی اکبر نے دم توڑ دیا۔

حسینؑ اب اس جوان کی لاش کو کس طرح اٹھائیں۔ کوئی معین و مددگار نہیں۔ دل بھر آیا۔ یاور و انصار یاد آ گئے آواز دی، عباس بھیا ضعیف بھائی سے جوان بیٹے کی لاش نہیں اٹھتی میری مدد کو آؤ۔ کہاں پڑے سو رہے ہو۔ جوان بیٹے کا پرسہ نہیں دیتے۔ اے قاسم اے یادگار برادر، چچا پر یہ وقت سخت ہے اور تم خبر نہیں لیتے آؤ میرے ساتھ علی اکبر کی لاش کو اٹھاؤ۔ اے عون و محمد تم ہی آجاؤ۔ اے حبیب بن مظاہر اے مسلم بن عوسجہ، اے بریر اے میرے وفادارو۔ اے میرے جانثارو۔ آؤ میرے کڑیل جوان کا لاشہ اٹھاؤ۔ کیا بعید ہے کہ امام مظلوم کی یہ درد بھری آواز سن کر لاشہائے شہدا کانپ گئے ہوں۔

مروی ہے کہ جب علی اکبر میدان میں آئے تھے تو جناب ام لیلیٰ نے فضہ سے کہا تھا تم خیمے کے دروازے پر کھڑی ہو جاؤ اور فرزند رسولؐ کے چہرے کی طرف نظر رکھو۔ اگر خدانخواستہ میرے بچے پر کوئی آفت آئے گی تو باپ کے چہرے سے تغیر کا اظہار ہوگا۔ چونکہ تم نے فرزند رسولؐ کو پالا ہے لہٰذا ان کی پریشانی دیکھ کر تمہارے چہرے کی رنگت بدلے گی میں تمہارا چہرہ دیکھ کر سمجھ لوں گی کہ میرا بچہ کسی مصیبت میں ہے۔ جب حضرت علی اکبر نے امام مظلوم کو پکارا تو گھبرائے ہوئے مقتل کی طرف چلے۔ فضہ نے خیمہ میں آکر کہا بی بی تمہارے بچے کی خیر نہیں فرزند رسولؐ گھبرائے ہوئے مقتل کی طرف گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی خیموں میں کہرام بپا ہو گیا۔ خیمے کے دروازے کے پردے اٹھے اور مقتل کی طرف ایک ایک نے دیکھنا شروع کیا۔ دیکھا کہ امام مظلوم لاشہ لا رہے ہیں۔ لیکن جوان کی میت ہے کہ اٹھائے نہیں اٹھتی دو قدم چلتے ہیں اور پھر رک جاتے ہیں یہ دیکھ کر فضہ دوڑیں میرے پیارے حسین میں تیری غربت کے قربان میں سہارا دوں گی۔ جب ذرا اور آگے آئے تو جناب زینب روتی پیٹتی خیمہ سے نکلیں ام لیلیٰ نکلیں، علی اکبرؑ کی لاش کو سنبھالا۔

جب لاش خیمہ میں آئی تو سیدانیوں کی نوحہ و زاری سے زمین و آسمان ہل گئے۔

ے ایک کہتی تھی ہے ہے علی اکبر علی اکبر ۔۔۔ مہ رو علی اکبر میرے صفدر علی اکبر
ویران کیا ماں کا بھرا گھر علی اکبر ۔۔۔ تم مر گئے جیتی رہی مادر علی اکبر

منزل گل تو پیاس سے مرجھائے تھے بیٹا
پھل برچھی کا کھانے کے لئے آئے تھے بیٹا

کس کی طاقت ہے کہ اس غم انگیز منظر کی تصویر کشی کر سکے۔ خدا نہ کرے کہ کسی جوان کا جنازہ ماں باپ کی موجودگی میں گھر سے نکلے۔

ے دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ ۔۔۔ دل کو فگار کرتا ہے لخت جگر کا داغ

آج علی اکبر نہیں مرے زینب و اُم کلثوم اور اُم لیلیٰ کی ہزارہا آرزوئیں مرگئیں بے شمار تمناؤں کے جنازے نکل گئے۔ بہو بیاہ کر لانے کی حسرت خاک و خون میں مل گئی۔ دولہا بنا کر سر پر سہرا دیکھنے کی حسرت دل میں پچھاڑیں کھا کر رہ گئیں۔ تصویر پیغمبرِ خاک و خون میں اٹی ہوئی ہے۔ ماں بہنیں پھوپھیاں برہنہ سر لاش کے گرد کھڑی رو رہی ہیں جوان کا ماتم ہے کس طرح صبر آئے۔ آہ کربلا تو نے آل رسولؐ پر کیا کیا مصائب نازل کئے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

سولہویں مجلس

فضائل حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اور

شہادت امام حسین علیہ السلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فِىْ كِتَابِهِ الْمَجِيْدِ وَفُرْقَانِهِ الْحَمِيْد

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (سورۃ الاحزاب ۴۵/۳۳)

اے نبی ہم نے تمہیں شاہد و مبشر و نذیر بنا کر بھیجا اور خدا کے حکم سے لوگوں کو دعوت دینے والا بنایا اور ہم نے تم کو روشن چراغ قرار دیا۔

یہ آیت سرکار رسالتؐ کی شان میں ایک لمبا چوڑا قصیدہ ہے۔ یہ کسی شاعر کا کلام نہیں جس میں غلو یا مبالغہ کو دخل ہو۔ یہ اصدق الصادقین رب العالمین کا بیان ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ ہزار فضائل بداماں ہے کس کی طاقت ہے کہ ان الفاظ کی معنویت کو معرض بیان میں لا سکے۔ یہ خدا نے اپنے محبوب کی تعریف کی ہے۔ قدرت نے اپنا زور اس کے بیان میں صرف کر دیا ہے۔ قرآن میں جا بجا حبیب خدا حضرت محمد مصطفےٰؐ کی تعریف مختلف الفاظ اور گوناگوں پیرایوں میں کی گئی ہے

مگر جس شان سے اس آیت میں اوصافِ محمدی کو ذکر کیا گیا ہے اس کو سب پر فضیلت ہے۔
سب سے پہلے مخاطبہ یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ کہہ کر کیا گیا ہے یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ سے نہیں حالانکہ رسالت کا مرتبہ بظاہر نبوت سے بڑھا ہوا ہے غور کیجئے تو نبوت رسالت سے کیا ہر عہدہ الٰہی سے مقدم ہے۔ انسانیت کے سر پر سب سے پہلا تاج نبوت ہی کا رکھا گیا ہے۔ حضور سرور انبیاءؐ نے فرمایا ہے۔ کُنْتُ نَبِیًّا وَّآدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ (میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم علیہ السلام پانی اور مٹی میں تھے) خلافت وغیرہ جتنے عہدے برگزیدگان باری کو ملے ہیں وہ سب مادی پیکروں کے بن جانے کے بعد ملے ہیں لیکن نبوت ہی ایک ایسا عہدہ ہے جس کا وجود عالم نور میں پایا جاتا ہے۔
آنحضورؐ کب سے نبی تھے کوئی آنکھ اس کے دیکھنے والی نہیں کیونکہ حضرتؐ کے وجود سے پہلے کوئی آنکھ ہوتی تو دیکھی آدم کا کیا ذکر فرشتے بھی نہیں بتا سکے کہ حضورؐ کو کب نبوت ملی۔ اور یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ سرکار دو عالم کب پیدا ہوئے کیونکہ نور محمدی اول مخلوق ہے جو اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ سے واضح ہو گیا۔ پس جب اوّل نور ہیں اور تمام انوار و مادیات حضرت سے بعد میں خلق ہوئے ہیں تو اس بات کا بتانے والا کہاں سے آئے کہ وجود محمدی کب خلق ہوا ہے اور چونکہ نبوت اس کے وجود کے ساتھ ساتھ ہے لہٰذا کون بتا سکتا ہے کہ حضورؐ کب سے نبیؐ ہیں۔ فرشتوں نے تو انوار مقدسہ محمدؐ و آل محمدؐ کو بہت بعد میں سمجھا ہے۔ جب شیطان نے سجدہ آدمؑ سے انکار کیا تو خدا ئے ذوالجلال نے اس سے فرمایا اَسْتَکْبَرْتَ اَمْ کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ (سورہ صٓ ۷۵/۳۸) تو نے تکبر کیا ہے یا تو اپنے کو عالین ہی سے سمجھتا ہے) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ انوار مقدسہ فرشتوں کے مقام سے بہت بلند مقام پر تھے جب ہی تو عالین کہلائے۔ عالین کا تعارف اس وقت ہوا جب آدمؑ کو ان کے اسماء تعلیم ہوئے اور پھر مسمیات میں کون نام کس کا ہے۔ یہی سوال فرشتوں سے کیا گیا تھا مگر وہ نہ بتا سکے۔ اور لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (سورہ البقرہ ۳۲/۲) کہہ کر اپنی جہالت کا اقرار کیا اس سے معلوم ہوا کہ عالین کے انوار مقدسہ کو دیکھے تو تھے لیکن یہ نہ جانتے تھے کہ ان میں محمدؐ کون ہیں اور علیؑ کون ہیں فاطمہؑ کون ہیں اور حسنؑ و حسینؑ کون ہیں۔
پس جب یہی نہیں جانتے تھے تو وہ بے چارے کیا بتا سکتے تھے کہ حضورؐ کو نبوت کب ملی اس کے عینی گواہ تو صرف وہی لوگ ہو سکتے تھے جو شریک نورِ رسالت تھے اسی لیے خدا نے حضرتؐ کا گواہ قرآن کے علاوہ اس ہستی کو بنایا جو جزو نورِ محمدی تھی آیہ وَیَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ (سورہ ہود ۱۷/۱۱) اس کی دلیل ہے۔
حدیث قدسی میں ہے کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے۔ کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُكَ یَا مُحَمَّدُؐ (میں ایک خزانہ مخفی تھا پس میں نے اس بات کو دوست رکھا کہ پہچانا جاؤں پس اے محمدؐ میں نے تجھ کو پیدا کیا) اس سے معلوم ہوا کہ معرفت ایزدی کرانے والی سب سے پہلی ذات جناب سرکار

رسالت کی نفی اور نبی کا یہی کام ہے کہ وہ نبی کی معرفت کرلیئے۔ اس نبوت کا پہلا تبلیغی دور فرشتوں میں تھا چنانچہ حضورؐ نے فرمایا ہے۔ سَبَّحْنَا فَسَبَّحَتِ الْمَلَآئِكَةُ بِتَسْبِيحِنَا (ہم نے تسبیح کی اور تسبیح سے ملائکہ نے تسبیح کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبوت محمدی نے ملائکہ پر تبلیغ کی اور ان کو تسبیح سکھائی۔ پھر حضرت نے یہ بھی فرمایا لَوْلَا نَحْنُ مَا عَبَدَ اللّٰهَ لَوْلَا نَحْنُ مَا عَرَفَ اللّٰهَ (اور اگر ہم نہ ہوتے تو خدا کی عبادت نہ ہوتی اگر ہم نہ ہوتے تو خدا کی معرفت نہ ہوتی)

اب تو اس نبوت کی حقیقت کچھ سمجھ میں آئی ہوگی پہلی تو ایک لاکھ چوبیس ہزار گزرے مگر ایسا نبی ایک بھی نہیں سب اسی نبوت کا پرتو ہیں اسی لئے آیہ زیر بیان میں نبی پر الف لام تخصیصی داخل کیا گیا اور فرمایا گیا

يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ

اب ذرا اس نبوت کی قدامت اور ازلیت سے ملتی جلتی جلوہ آرائی کو ایک اور طریقے سے سمجھئے خدا نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (سورہ الاحزاب ۵۶ پ) ایمان والوں سے کہا جا رہا ہے کہ خدا و ملائکہ نبی پر درود بھیجتے ہیں لہٰذا تم بھی بھیجو خدا کی ذات واجب الوجود ہے اس کے لئے نہ کوئی زمانہ ہے نہ حد، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا پس درود الٰہی کا تعلق اس نبی سے کب سے ہے اس کو کوئی نہیں بتا سکتا کیونکہ اس کی ابتدا تو اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب ہم ذات باری کے لئے ابتدا مان لیں اور جب ذات باری کے لئے ابتدا نہیں تو اللہ کے درود کا وقت بھی معین نہیں کیا جاسکتا اور چونکہ درود کا تعلق نبی سے ہے لہٰذا نبی کی نبوت کا آغاز بھی نہیں بتایا جاسکتا۔

كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ سے معلوم ہوتا ہے کہ درود ابراہیمؑ اور اولاد ابراہیمؑ پر بھی بھیجا گیا۔ مگر حضورؐ پر درود کی شان کچھ اور ہے۔ وہاں درود کا تعلق صرف ذات باری سے ہے۔ اور حضورؐ پر درود میں اللہ کے ساتھ ملائکہ اور مومنین بھی ہیں۔ دوسرے وہ درود ختم کر دیا گیا کیونکہ سلامتی کا ذکر اس میں نہیں یہاں وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا بھی ہے جس سے درود کا اس وقت باقی رہنا ضروری ہے جب تک ملائکہ اور مومنین دنیا میں ہیں تیسرے یہ کہ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (سورہ الاحزاب ۵۶/۳۳) میں جملہ اسمیہ ہے جو دوام و ثبات کے لئے آیا ہے پھر یصلون مضارع کا صیغہ ہے جو حال و مستقبل دونوں زمانوں کو شامل ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر درود کا واقعہ ایک واقعہ ماضی ہے اور آنحضورؐ پر درود حال و مستقبل کا آئینہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ و آل ابراہیمؑ پر درود واجب نہیں کیا گیا مگر آنحضورؐ پر درود بھیجنا واجب ہے صلوا صیغہ امر ہے۔

اب ایک اور طریقے سے بھی اس نبوت کی شان کو دیکھئے۔ حدیث قدسی ہے لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ

(اے رسولؐ اگر تم نہ ہوتے تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا) اور جب افلاک ہی پیدا نہ ہوتے تو کائنات کا کوئی گوشہ آباد نہ ہو سکتا پس اٹھارہ ہزار عالموں میں جتنی مخلوق ہے وہ منت کش ہے وجود محمدی کی۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ حضورؐ کا وجود فلکیات و عنصریات و مادیات سب سے پہلے تھا اب حدیث کسا کے الفاظ پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

جب پنج تن پاک ایک چادر کے نیچے آگئے اور نزول رحمت باری شروع ہوا تو فرشتوں نے پوچھا: خدایا یہ کون لوگ اس چادر کے نیچے ہیں۔ خدا نے فرمایا:

يَا مَلَآئِكَتِي وَ سُكَّانَ سَمَاوَاتِي وَ عِزَّتِي وَ جَلَالِي إِنِّي مَا خَلَقْتُ سَمَآءً مَبْنِيَّةً وَلَا أَرْضًا مَدْحِيَّةً وَلَا شَمْسًا مُضِيئَةً وَلَا قَمَرًا مُنِيرًا وَلَا فَلَكًا يَدُورُ وَلَا بَحْرًا يَجْرِي وَلَا فُلْكًا تَسْرِي إِلَّا فِي مَحَبَّةِ هٰؤُلَاءِ الْخَمْسَةِ الَّتِي تَحْتَ هٰذِهِ الْكِسَآءِ

اے میرے ملائکہ اور اے سماوات کے ساکنو! اپنے عزّت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے آسمانوں کو نہیں بنایا اور زمین کو نہیں بچھایا اور سورج کو روشن نہیں کیا فلک کو نہیں گھمایا۔ دریاؤں کو نہیں بہایا کشتیوں کو نہیں چلایا مگر ان پانچ کی محبت میں جو اس چادر کے نیچے ہیں۔

اب تو سمجھ میں آگیا کہ یہ کائنات محمدؐ و آل محمدؐ کے صدقے میں پیدا کی گئی ہے اور یہ محبّت نہیں ہو سکتی جب تک الوہی منصب بجلیلہ حاصل نہ ہو اور یہ منصب اوّلین نبوت محمدؐ مصطفٰے الحق۔

چونکہ تمام کائنات ان کے صدقہ ہی میں ہے اور ان کے لیے بنی ہے اور ان کی نبوت سے فیض پا چکی ہے لہٰذا عالم کون و فساد کا ذرّہ ان کے وجود کو جانتا ہے پہچانتا ہے اور ان کا تابع فرمان ہے۔

فرشتے ان کے دربان ہیں ان کے بچوں کے گہوارہ جنبان ہیں۔ رضوان ان کے لیے جنت کے میوے اور کھانے لے کر آتا ہے۔

آفتاب ان کے حکم سے مغرب میں جانے کے بعد پلٹ آتا ہے۔ چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے ستارہ ٹوٹ کر ان کے گھر میں آتا ہے۔ بادل ان کے سر پر سایہ کرتا ہے۔ جن ان کے بچوں کی حفاظت کرتا ہے سنگریزے ان کے ہاتھ پر آکر بولتے ہیں۔ حجر اسود ان کی بات کا جواب دیتا ہے۔ ہرنی ان کے لئے بچہ آہوے کر آتی ہے مکڑی ان کی حفاظت کے لئے جالا تنتی ہے۔ کبوتر غار ثور کے دروازے پر آشیانہ بنا کر انڈے دیتا ہے۔ ہوا ان کا بساط اٹھا کر کہف رقیم پر لے جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ یہی وہ ذات تھی جن سے کاشانہ نبوت کی ابتدا ہوئی اور یہی وہ ذات ہے جس پر ختم نبوت کی مہر لگی۔ نہ حضورؐ سے اوّل کوئی نبی نہ آخر کوئی نبی۔

اے ذات پاک مصطفےٰ اوّل تو ہی آخر تو ہی

اب تک جو کچھ بیان ہوا کہ لفظ یَاۤاَیُّھَا النَّبِیُّ کی توضیح تھی اب دوسرے الفاظ پر غور کیجئے۔

یَاۤاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا (سورہ الاحزاب ۴۵/۳۳) یعنی اے نبی ہم نے تم کو شاہد یعنی گواہ بنا کر بھیجا۔ یعنی تم ہمارے قدیم و واجب الوجود اور خالق کُل کائنات ہونے کے گواہ ہو کیونکہ تمام مخلوق تمہارے سامنے عدم کی تاریکی میں تھی سب سے پہلے وجود کی کرن جو پھوٹی تھی وہ تمہارا نور تھا اسی سے ہم نے تمام عالموں کو بنایا ہے پس تم ہی اس کے گواہ ہو کہ ان تمام عالموں کا بنانے والا ہمارے سوا کوئی نہیں۔

یوں تو ہر شے ہماری توحید کی دلیل ہے ؎

ہر گیاہے کہ از سبزہ زمین روید — وحدہ لاشریک لہٗ گوید

مگر تم عینی اور بولتے ہوئے گواہ ہو۔ ہم نے تمہارا نور ہر نبی کے ساتھ رکھا تاکہ تمہاری گواہی ہر زمانہ میں ہمارے متعلق موجود رہے۔ اسی لئے ہم نے تمام اُمتوں کا آخری گواہ تم کو ہی قرار دیا ہے۔

فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍۭ بِشَھِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰۤؤُلَآءِ شَھِیْدًا (سورہ النساء ۴۱/۴) روز قیامت ہر اُمت کو اس کے گواہ (نبی) کے ساتھ بلائیں گے اور تم اے حبیب ان سب پر گواہ ہو گے) کیونکہ تم نے ہر اُمت کے ایمان کو دیکھا ہے اور ان کے عرفان کی حقیقت کو سمجھا ہے۔

تمہارے بارے میں تمام انبیاء سے اسی لیے میثاق لیا گیا کہ تم ہماری توحید اور ربوبیت و خالقیت کے عینی گواہ ہو۔ ہماری مخلوق اوّل ہو ہماری حجت آخر ہو۔ جس طرح تم ہماری ربوبیت کے گواہ ہو اسی طرح ہم تمہاری رسالت کے گواہ ہیں۔ قُلْ کَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًاۢ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ (سورہ الرعد ۴۳/۱۳) کہہ دو کہ میری نبوت کی تصدیق کا گواہ اللہ اور من عندہ علم الکتاب کے سوا دوسرا ہو ہی نہیں سکتا اللہ نے تم کو نبی بنایا اور من عندہ علم الکتاب (علی) نے جو تمہارے نور کا جز ہے تم کو تاج نبوت سر پر رکھتے دیکھا ان دو کے سوا جو اور گواہ ہیں وہ سب سماعی ہیں یعنی تم نے ان سے کہا میں نبی ہوں اور انہوں نے تصدیق کر دی تھیں۔ نبی بنتے کسی نے نہیں دیکھا اے نبی! ہم نے تم کو اس لیے بھی اپنا گواہ بنایا ہے کہ تم ہماری صفات جلالی و جمالی کے آئینہ دار ہو۔ جس طرح گواہ سے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے اسی طرح تمہارے وجود سے ہمارے کمال کی تصدیق ہوتی ہے۔

حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے نبی آئے خدا نے کسی نبی کی اُمت سے اپنی عبادت میں اپنے ساتھ ان کی نبوت و رسالت کی گواہی نہیں دلوائی، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں صرف ایک ذات حضرت خاتم الانبیاء کی ایسی ہے کہ ہر زمانہ میں خدا کی توحید کی گواہی کے ساتھ متصلی رسولؐ کی رسالت کی بھی گواہی دیتا ہے اَشْھَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

گواہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو اپنے قول سے کسی امر کی تصدیق کرتا ہے دوسرے اپنے فعل سے مثلاً ایک شخص زبان سے کہتا ہے لا الہ الا اللہ مگر اس کے عمل سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ دوسرا اپنے عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا کو معبود برحق جانتا ہے کیونکہ نہ دل سے اس کے احکام کی تعمیل کرتا ہے جناب محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم قولی گواہ ہیں اور فعلی بھی۔ یہی چیز تھی جس نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے اثر کو اتنے جلد عام کر دیا۔ اب صرف تئیس سال کی تبلیغ میں لاکھوں آدمی مسلمان ہو گئے۔ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (سورہ النصر ۲/۱۱۰)

آپؐ کے پاس نہ مال و دولت کے خزانے تھے۔ نہ لاؤ لشکر، نہ قوم کی حمایت مگر اس پر بھی لاکھوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس لیے کہ ان کے ایک ایک عمل سے خالق عالم کی یکتائی ۔ اس کی خالقیت اس کی حکومت مطلقہ کا ثبوت ملتا تھا۔ وہ اللہ کی گواہی دے رہے ہیں اور اللہ ان کی۔

رسولؐ کی رسالت کا وہ گواہ بھی کس پائے کا تھا جس کی گواہی خدا نے اپنے ساتھ رکھی، اور جس کی تعریف میں خود خدا نے فرمایا۔ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (سورہ الرعد ۴۳/۱۳)

معلوم ہوا کہ جس کے پاس پورا پورا علم کتاب ہو۔ وہی اس قابل ہو سکتا ہے کہ اللہ کے ساتھ گواہی دے آخر کوئی وصف تو اس کے گواہ کے اندر تھا کہ خدا نے اپنی گواہی کے ساتھ اس کی گواہی رکھی صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اپنی عدالت کی گواہی بھی اس سے دلوائی۔ ایک طرف رسولؐ خدا اس کی توحید و ربوبیت وغیرہ کے گواہ اور دوسری طرف وہی وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (۴۳) کا مصداق عدالت ایزدی کا گواہ

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (سورہ آل عمران ۳/۱۸) اللہ اس کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور ملائکہ اور اولو العلم گواہی دیتے ہیں کہ وہ عدل پر قائم ہے۔ یہاں بھی وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (سورہ الرعد ۴۳/۱۳) والے کی صفت وہی علم ہے۔ یہ گواہ بھی عجیب خصوصیت کا مالک ہے کبھی اللہ کے ساتھ رسولؐ کی رسالت کی گواہی کے لئے نکلتا ہے کبھی اللہ کی عدالت کی گواہی دینے کو ملائکہ کے ساتھ برآمد ہوتا ہے اس کی ذات میں کیا کمال ہے کہ جس محفل میں چاہو بٹھاؤ ہر جگہ کھپ جاتا ہے۔

عالموں کی بزم میں	صاحب من عندہ علم الکتاب ہے
مومنوں کی محفل میں	کل ایمان ہے۔
بہادروں کی محفل میں	کرار غیر فرار ہے۔
صدیقوں کی محفل میں	افضل الصدیقین ہے

بزم رسولؐ میں	نفس رسولؐ
منبر پر	خطیب سلونی
کساءِ رسولؐ کے اندر	صاحب تطہیر
کفار کے سامنے	اشداء علی الکفار
حکومت کے دربار میں	اولی الامر
سخاوت کے دربار میں	افضل الاسخیا۔ صاحب یوفون بالنذر
مومنوں کے جرگے میں	امیر المومنین
مشرکوں کی جماعت کے لئے	قاتل المشرکین

کہیں اوصاف انبیاءؑ کا آئینہ، کہیں جبریل امین کا استاد، کہیں حلال مشکلات، کہیں اللہ کا ہاتھ، کہیں نبی کا نفس، کہیں قاتل سر اصنام، کہیں دین کا حامی کہیں منزلت ہارون کا مالک، کہیں سفینہ نوحؑ کی مثل و مانند، کہیں نفوس سے اولیٰ کہیں مومنوں کا مولا۔ غرض نفسانی کمالات کا کوئی میدان روحانی فضائل کی کوئی منزل ایسی نہیں جہاں یہ گواہ موجود نہیں۔

اب ذرا آگے بڑھیئے اور آیۂ زیرِ بیان کی دوسری صفت پر غور کیجئے۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا (سورہ الاحزاب ۴۵/۳۳)

ہر نبی کے فرائض میں بشارت و نذارت دونوں داخل ہیں یعنی نیک کام کرنے والوں کی جنت کی بشارت اور بُرے کام کرنے والوں کو عذاب دوزخ اور قہر الٰہی سے ڈرانا لیکن جس مکمل صورت میں یہ دونوں چیزیں سرورِ کائنات نے اپنی اُمت کے سامنے پیش کی ہیں ان کی نظیر دیگر انبیاءؑ کے یہاں نہیں ملتی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہاں نذارت کا پہلو زیادہ ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل حد درجہ سرکش تھے اور جناب موسیٰؑ کی نافرمانی پر کمر باندھے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کو زندگی کے ہر موڑ پر ڈرانے کی ضرورت پیش آئی احکام بھی روز بروز سخت ہوتے گئے۔ فرائض بندگی کا وزن بھی روز بروز بڑھتا چلا گیا۔

شریعت عیسوی میں جس کو شریعتِ محبت کہا جاتا ہے چونکہ گرمی کو نرمی سے اور سخت گیری کو رواداری سے بدلا گیا لہٰذا انذارت سے بشارت کا سرمایہ زیادہ ہو گیا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت میں گرم و نرم دونوں پہلو مساواتی حیثیت سے مدنظر رکھے گئے لہٰذا البشارت و نذارت دوش بدوش چلتی رہیں تاکہ نیکی والے مایوس نہ ہوں اور بدی کرنے والوں کی جرأت نہ بڑھے نکوکاروں کو بہترین صلا پانے کی اُمید رہے اور گنہگار عذاب کی مختلف صورتوں پر نظر رکھ کر کانپ جائے۔

ایک بار جناب سلمان کے پاس ایک یہودی اور ایک نصرانی آیا اور انہوں نے کہا ہم نے سنا ہے آپ پہلے نصرانی تھے بعد کو مسلمان ہوئے جناب سلمان نے فرمایا ہاں یہ درست ہے انہوں نے کہا آپ کو اسلام میں کیا خوبی نظر آئی فرمایا وہ جو نہ یہودیت میں ہے نہ نصرانیت میں۔ انہوں نے کہا ذرا بیان تو ہو۔

جناب سلمان نے فرمایا یہودی کہتے ہیں نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (سورۃ المائدہ ۵/۱۸) ہم تو اللہ کی اولاد اور اس کے رشتہ دار ہیں لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (سورہ البقرہ ۲/۸۰) (آگ اگر ہم کو چھوئے گی بھی تو چند روز) ان بشارتوں سے گناہگاروں کا حوصلہ بڑھتا ہے اور جو نہ کرنے والا ہو اس کا دل بھی گناہ کرنے کو چاہتا ہے۔ لہٰذا یہ تعلیم خدائی تعلیم نہیں اور یہ دین خدائی دین کہلانے کا مستحق نہیں۔

نصاریٰ کہتے ہیں کہ علیٰؑ صلیب پر چڑھ کر اپنی ساری اُمت کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر لے گئے لہٰذا اس سے بدسرشتوں اور گناہ پسندوں کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ بدی کرنے والے کے دل سے جب بدی کا خوف نکل گیا تو پھر وہ بے محابہ ہر گناہ کرنے پر تیار ہوگا۔ لہٰذا میں نے نتیجہ نکالا کہ یہ باتیں خدائی دین کی نہیں ہیں برخلاف اس کے میں نے اسلام پر نظر کی تو وہاں کوئی پہلو ایسا نظر نہ آیا جس سے گناہگار کی ہمت افزائی ہو اور نیکوکار کو ناامیدی کا سامنا ہو۔ قرآن میں یہ آیت ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (سورہ بنی اسرائیل ۱۷/۱۵) (کوئی کسی کے گناہ کا بار نہ اُٹھائے گا) ہر شخص اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (سورہ الزلزلۃ ۹۹/۷،۸)

اب یہ آیہ زیرِ بیان کی تیسری صفت پر غور کیجئے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (سورۃ الاحزاب ۳۳/۴۵)

یعنی اے رسولؐ! تم اذنِ خدا سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے والے ہو۔ یہ دلیل اس بات کی ہے کہ کسی کو حضرت نے اپنی طرف سے دعوتِ اسلام نہیں دی بلکہ حکمِ خدا سے دی۔ جس طرح ہر نبی و رسولؑ بحکمِ الٰہی دعوت دیتا تھا اور اپنی قوم سے کہتا تھا اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ یہ رد ہے ان یہود و نصاریٰ اور بت پرستوں کے قول کا جو کہتے تھے کہ یہ شاعر ہیں، مجنوں ہیں ایک عجمی ان کو تعلیم دیتا ہے اس کا نام انہوں نے جبریل رکھ چھوڑا ہے یہ توریت و انجیل کے قصے سن سنا کر بیان کرتے ہیں لکھے نہ پڑھے خدا کے رسولؐ کیسے ہو گئے خدا نے اپنے قول میں ان سب کی تردید کر دی۔

اگر حضرت پڑھے لکھے ہوتے تو یہود اور نصرانی کہتے کہ ہماری کتابوں کو پڑھ کر کم بیشی کے ساتھ قرآن بنا لیا ہے مگر وہ جاہل نہ تھے۔ پیدائش سے قبل ہی سب کچھ بارگاہِ الٰہی سے حاصل کر کے آئے تھے وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (سورۃ النساء ۴/۱۱۳) نے بتا دیا کہ ہر شے کا علم ان کو حاصل تھا اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (سورہ الرحمٰن)

امام رضاؑ نے بتادیا کہ اس انسان کامل کو خلقت سے پہلے خدا نے تعلیم دے دی تھی سعدی نے کیا خوب کہا ہے ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانہ چند ملت بشست

داعیاً الی اللہ باذنہ کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ حضور بغیر وحی کے کوئی کلام کرتے ہی نہ تھے۔
وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (سورہ النجم ۵۳/۴)

مامون نے ایک بار اپنے دربار کی علما سے پوچھا کہ جب حضرت مبعوث برسالت ہوئے اس وقت سب سے بڑا عمل خیر کیا تھا۔ یحییٰ ابن اکثم نے جو دربار کے سب سے بڑے عالم تھے جواب دیا کہ حضرت پر ایمان لانا۔ مامون نے پوچھا سب سے پہلے اس دعوت پر کس نے لبیک کہی۔ یحییٰ نے کچھ تامل کے بعد کہا کہ سابق الی الاسلام حضرت علیؑ تھے ضرور مگر چونکہ وہ کم سن تھے۔ لہٰذا ان کا ایمان لانا قابل اعتبار و اعتماد نہ تھا۔ کیونکہ بچے اپنے بڑوں کی تائید ہی کیا کرتے ہیں۔ مامون نے پوچھا یہ بتاؤ کہ رسولؐ اللہ نے علیؑ کو دعوت اسلام دی تھی یا وہ از خود اسلام لے آئے تھے۔ یحییٰ خاموش ہوئے۔ مامون نے جواب کا تقاضا کیا۔ تو انہوں نے کہا از خود کیوں نہیں لاتے رسولؐ اللہ نے دعوت دی تھی مامون نے کہا اب یہ بتاؤ کہ یہ دعوت باذن اللہ تھی یا رسولؐ اللہ نے اپنی طرف سے دی تھی۔ یحییٰ نے اب کوئی جواب نہ دیا۔ تو مامون نے کہا۔ سنو یہ تو تم نہیں کہہ سکتے کہ رسولؐ نے اپنی طرف سے دی تھی کیونکہ یہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کے صریحاً خلاف ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ بحکم خدا دعوت دی تھی۔ پس خدا نے ایسے شخص کو دعوت دینے کا حکم کیوں دیا جو من لا یجوز علیہ الحکم (جس کے لیے یہ حکم جائز نہ تھا) یہ ماننا پڑے گا کہ کم سنی میں علیؑ کے اندر یہ اہلیت تھی کہ ان کو دعوت اسلام دی جائے۔

اب اس آیت کا صرف ایک لفظ توضیح کے لئے اور باقی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا
(سورۃ الاحزاب ۴۶/۴۵ /۳۳)

(روشن چراغ)

حضور سرور کائناتؐ کی یہ خصوصیت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خداوند عالم نے بے شمار القاب سے یاد کیا ہے
یٰسٓ ۔ طٰہٰ ۔ مُزَّمِّل ۔ مُدَّثِّر ۔ ذِکْر ۔ شَمْس ۔ لیکن اس آیت میں خصوصیت سے سراج منیر ارشاد فرمایا ہے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ حضرت کی ہدایت کا تعلق ہر ادنیٰ و اعلیٰ اور امیر و غریب سے ہے۔ چراغ کی ضرورت ہر شخص کو لاحق ہوتی ہے خواہ اس کی کوئی صورت بھی ہو۔ دیا ہو۔ شمع ہو۔ لالٹین ہو۔ گیس کا ہنڈا ہو یا بجلی کا بلب ہو سراج کا اطلاق سب پر ہی ہوگا کوئی گھر اس کی ضیا باری سے خالی نہیں نظر آتا۔ رات کے اندھیرے میں اسی کی

روشنی سے کام کاج ہوتے ہیں۔

ایک بڑھیا کی جھونپڑی میں اپنی حیثیت کے لحاظ سے ہوگا۔ امیر کے محل میں اپنی حیثیت سے لیکن ہوگا ضرور۔

حضور سرور انبیاءؑ کو خداوند عالم نے کافۃ الناس کی طرف مبعوث فرمایا تھا خواہ امیر ہو یا غریب بادشاہ ہو یا رعایا، کالا ہو یا گورا، جاہل ہو یا عالم مرد ہو یا عورت آپ سب کے ہادی تھے۔

بخلاف اور انبیاء کے کہ وہ اس عمومیت کے ہادی نہیں بنائے گئے تھے۔ بعض اپنی قوم پر مقرر ہوئے تھے جیسے حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام صرف بنی اسرائیل کے ہادی تھے۔ بعض کو ایک لاکھ یا اس سے بھی زائد افراد پر نبی بنا کر بھیجا گیا۔ بعض اپنے گاؤں کے لئے ہی ہادی تھے۔ پھر ہر ایک کی نبوت کا ایک خاص زمانہ تھا۔ مرنے کے بعد نبوت کا دائرہ عمل بھی ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن سرکار دو عالمؐ کو بعثت کے وقت سے لے کر قیامت تک جتنی قومیں آنے والی ہیں خواہ وہ کسی خاص خطہ ارض پر آباد ہوں ان سب پر نبی بنایا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء کی ہدایت کا زمانہ مجموعی طور پر جس قدر ہے اس سے زیادہ طولانی زمانہ نبوت ختم الانبیاء کا ہے۔ اور جس قدر کام ان سب نے کیا ہے اس میں سب سے زیادہ حضرت کے ذمے عاید کیا گیا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت نے فرمایا ہے اِنِّیْ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (یعنی جو کام اب تک ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں سے پورا نہیں ہو پایا اس کو میں پورا کر کے تکمیل کر دوں۔

چونکہ مکارم اخلاق کا تعلق تزکیہ نفوس سے ہے لہٰذا قیامت تک لئے اس کا بندوبست حضورؐ کو کرنا تھا ورنہ تکمیل کی صورت پیدا نہ ہوتی۔ تزکیہ نفوس کے لئے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نمونہ عمل ہر زمانہ کے لوگوں کے سامنے ہونا چاہیے۔ ورنہ خدا کی حجت لوگوں پر تمام نہ ہوگی۔

انسانی فطرت ہے کہ وہ مشابہہ سے اچھا یا برا اثر جلد قبول کر لیتی ہے۔ اس لئے "صحبت اثر بے وارد" ایک ضرب المثل ہے۔ صحبت کا اثر اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ نمونۂ عمل سامنے ہوتا ہے۔ اگر عمل صحیح سامنے ہوگا۔ تو نقش درست سامنے بیٹھے گا۔ ورنہ گمراہی کی طرف مائل ہو جانا ایک امر یقینی ہوگا۔ اسی غرض کو پیش نظر رکھ کر حضورؐ نے اپنی عترت کو قرآن کے ساتھ کیا۔ حضورؐ نبی اکرمؐ کے عمل کا نمونہ ہر زمانے کے لوگوں کے سامنے رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سراج منیر ہیں۔ آپؐ نے اسلام کی شاہراہ میں بارہ شمعیں اور روشن کیں جو صورت و سیرت اور ضیا باری میں حضورؐ ہی کی مانند تھیں۔

اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَّ اَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَّ آخِرُنَا مُحَمَّدٌ وَ کُلُّنَا مُحَمَّدٌ

شمع کی قائم مقامی شمع ہی کر سکتی ہے نہ ایک لکڑی جلانے سے اجالا ہوتا ہے اور نہ ایک اپلا سلگانے سے

شمع کا شمع سے ایک رشتہ ہوتا ہے۔ اگر یہ رشتہ شمع میں باقی نہ رہے تو وہ روشن ہو ہی نہیں سکتی۔

شمع کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جتنی شمع اس سے چاہو روشن کر لو۔ اس کی ضیا باری میں فرق نہیں آتا نیز یہ کہ شمع کی لو میں اعتدال ہوتا ہے نہ وہ بہت زیادہ اونچی ہوتی ہے نہ زیادہ نیچی اور ایک صورت سے آخر وقت تک جلتی رہتی ہے کسی کے بڑھانے گھٹانے کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے رسولؐ کی ہدایت ہر زمانے کے لئے یکساں ہے اس میں کمی زیادتی کا کوئی سوال ہی نہیں نہ کسی کو گھٹانے بڑھانے کا اختیار۔

یہ خدا کی روشن کی ہوئی شمع ہے پھونکیں مارنے سے بجھ نہیں سکتی۔

چراغے راکہ ایزد بر فروزد

اگر کس پف زند ریشیں بسوزد

شمع کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس کے روشن ہوتے ہی پروانے آنے شروع ہو جاتے ہیں اور جب تک وہ جلتی رہتی ہے برابر اس کے گرد گھومتے رہتے ہیں مگر چونکہ جنس غیر ہیں لہٰذا فیض کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ ان کی آنکھوں میں اسی وقت تک چمک رہتی ہے جب تک شمع کے سامنے ہوتے ہیں ادھر وہ بجھی اور پھر وہ اندھے کے اندھے جہاں سے آئے تھے وہیں پھر پلٹ جاتے ہیں۔ البتہ شمع سے مستقل نور حاصل کرتی ہے تو وہی شمع جو اس کی جنس سے ہو وہ آخری وقت تک اپنی روشنی سے ہدایت کرتے رہے گی۔

یہ بارہ شمعیں جو رسولِ خدا نے روشن کی تھیں اپنے اپنے زمانے میں ضیا باری کی ذمہ داری لے کر آئیں لیکن کورباطنوں نے ان کی روشنی سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اور ان کو گل کر دینے کی کوششیں کیں۔ رسولؐ کے بعد علی ان کے جانشین تھے دشمنوں نے ان کا خاتمہ کیا انکے بعد امام حسنؑ کا نمبر آیا تو ان کو زہر دیکر شہید کیا تیسرا نمبر امام حسینؑ کا تھا ان پر تو وہ مظالم توڑے کہ خدا کی پناہ کربلا میں سارا خاندان رسولؐ ہی تباہ کر دیا۔

پنجتن میں صرف ایک دم امام حسینؑ کا باقی رہ گیا تھا جس سے اہل ایمان کو بڑی ڈھارس تھی۔ بنی ہاشم کا رہا سہا وقار اُن کے دم سے چمک رہا تھا لیکن یزید نے نہ چاہا کہ دنیا اُن کے وجود سے فیض یاب ہو۔

" امام حسین علیہ السلام کی زندگی کا آخری زمانہ ایک بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا۔ مسلمانوں کی عملی قوت روز بروز مفلوج ہوتی چلی جا رہی تھی اور سب سے زیادہ خوفناک صورت یہ پیدا ہو گئی تھی کہ نیکی بدی کا احساس اور امرِ حق کے اظہار کی جرأت گہری گور میں جا سوئی تھی۔ جس قوم میں یہ دو چیزیں مر جاتی ہیں سمجھ لو وہ قوم مر گئی یزید نے انعام و اکرام کی بارش کر کے اپنی سطوت کی دو دھاری تلوار دکھا کر مسلمان کے دل کو اتنا بے حس بنا دیا تھا کہ وہ نیکی و بدی میں تمیز ہی نہ کرتے تھے بلکہ بدی کر کے اتنا خوش ہوتے تھے۔ جیسا کوئی نیکی کر کے ہو بلکہ ان میں جرأت باقی نہ رہی تھی اور وہ ناحق کی تردید اور حق کی حمایت میں جان و مال و آبرو کے خوف سے ایک لفظ منہ سے نکال سکیں۔

حسین علیہ السلام کی شہادت کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ قوم کے خفتہ احساس کو بیدار کر دیں، اور حقیقت کے اظہار سے

نڈر بنادیں۔ حسین علیہ السلام اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے لوگوں نے بہت جلد سمجھ لیا کہ یزید دشمن اسلام ہے جو باتیں دل سے زبان پر نہ آتی تھیں حضرت کی شہادت کے بعد وہ بھرے جلسوں میں گونجنے لگیں۔

امام علیہ السلام نے یزید کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا کل سرمایہ حیات میدان کربلا میں لاڈالا اور جان و مال وآبرو کسی چیز کی پرواہ نہ کر کے یزید کے شکنجہ ضلالت سے اسلام کی گردن نکال لی۔

امام حسین علیہ السلام کی مظلومیت نے جس آن بان سے ظلم وجور کا مقابلہ کیا تاریخ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یزیدیت کے پیکر ستم پر جتنے ہتھیار تھے وہ سب بیکار ہو کر رہ گئے۔ مظلوم کے قدموں پر ظالم کی گردن بغیر جھکے نہ رہی۔ کس کا کلیجہ ہے کہ مصائب وآلام کے سیلاب کو صبر و شکر کے سینوں سے اس طرح روکے کہ دنیا حیرت میں آجائے۔ کس کی طاقت ہے کہ اپنے عزیزوں اور جگر کے ٹکڑوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے اس لئے کٹوادے کہ حق باطل سے نفاق ایمان سے اور کفر اسلام سے جدا ہو جائے۔

امام حسین علیہ السلام کے لئے کیسا سخت وقت تھا جب تمام انصار واحباب درجہ بدرجہ شہادت نوش کر چکے اور حسین علیہ السلام بالکل تنہا رہ گئے۔ تو باوجود انتہائی دل شکستگی اور افسردہ خاطری کے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

انسانی فطرت ہے کہ انتہائی پریشانی میں اپنے اعزا یاد آتے ہیں۔ اس وقت مظلوم امام کو ضرور یہ خیال آیا ہوگا۔ آہ کہاں گئے وہ شمع امامت کے پروانے جو کربلا میں میرے سینہ سپر تھے۔ کہاں گئے وہ بیشہ شجاعت کے شیر جنہوں نے تین دن کی بھوک پیاس میں سینکڑوں زخم کھائے اور اُف نہ کی۔ کہاں گئے وہ میرے ہاشمی جوان جو کربلا سے یہاں تک میرے فدائی بن کر آئے تھے۔

بے چین ہو کر یہ دردناک الفاظ کربلا کی فضا میں بھر دیئے اے حبیب بن مظاہر، اے مسلم بن عوسجہ، اے زہیر بن قین، اے بریر، یا ابا الفضل العباس یا قاسم بن الحسن یا علی بن الاکبر، اے بیشہ شجاعت کے شیرو اے صدق وصفا کے پیکرو تمہیں کیا ہو گیا کہ میں آواز استغاثہ بلند کر رہا ہوں اور تم میری مدد کو نہیں آتے۔ میں تمہیں پکار رہا ہوں اور تم جواب نہیں دیتے۔ اے میرے جانثار وا میری گود کے پالو اب تنہا حسینؑ پر اعدا کا نرغہ ہے اس کی مدد کو آؤ حرم رسول کی بے حرمتی سے بچاؤ۔ آہ موت نے تم سب کو چھین لیا۔ آہ! تم باری باری سب مجھ سے رخصت ہو گئے۔

اس کے بعد امام علیہ السلام رخصت آخر کے لئے خیمہ میں آئے سیدانیاں سمجھ گئیں کہ فرزند رسولؐ کا سایہ بھی ہمارے سروں سے اٹھنے والا ہے۔ سب نے امام مظلوم کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ اس وقت خیمہ امام میں ایک کہرام بپا تھا کسی بی بی کے ہوش بجا نہ تھے۔ ایک ایک کو اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ ہر طرف وا محمداہ واہ علیاہ وا غربتاہ کے نعرے لگ رہے تھے۔ ایک ایک بی بی حسینؑ کے دامن سے لپٹی ہوئی تھی اور رو رو کر کہہ رہی تھیں۔ آپ کے جانے کے بعد ہمارا پرسان حال

کون ہوگا۔ ہم کس کے سہارے سے جئیں گے۔ سکینہ نے دامن پکڑ لیا۔ کیوں باباجان کیا آپ بھی مرنے پر تیار ہوگئے۔ فرمایا بیٹی کیونکہ تیرا باپ مرنے پر آمادہ نہ ہو۔ جب کوئی مونس و مددگار باقی نہ رہا ہو اس جگر سوختہ مصیبت دیدہ تھوک کی پیاسی بچی نے کہا اچھا اگر آپ مرنے جاتے ہیں تو ہم کو ہمارے جد کے روضے پر پہنچا دیجئے۔ فرمایا اے بیٹی! اگر یہ ممکن ہوتا تو تمہیں اس مصیبت میں کیوں چھوڑتا۔ جناب زینبؑ نے گلے میں باہیں ڈال دیں اور رو رو کر کہنے لگیں۔ اے مظلوم بھیا۔ یہ بے کسوں کا قافلہ کس کے سپرد کر کے جا رہے ہو آہ! اب نہ عباسؑ ہیں نہ علی اکبرؑ نہ قاسم ہیں نہ عون و محمد۔ آپ کے بعد ہمیں دشمنوں کے ظلم سے کون بچائے گا۔ بھیا جب نانا جان مرے تھے تو پنجتن میں چار بزرگ موجود تھے، سب کو ان کے دم سے ڈھارس تھی اس کے بعد والدہ نے رحلت کی ان کے بعد جب باباجان نے رحلت کی تو آپ دو بھائی ہماری دلداری کو موجود تھے جب بھائی حسنؑ کا جنازہ اٹھا تو آپ سب کی تسکین کا باعث بنے۔ لیکن اب تو پنجتن پاک میں سوائے آپ کے اور کوئی ہے ہی نہیں۔ آپ کے جانے کے بعد اس گھر کا سنبھالنے والا، ہم بے وارثوں کی خبر لینے والا ان یتیم بچوں پر دست شفقت پھیرنے والا کون ہوگا۔

امام مظلوم نے فرمایا اے بہن مرضیٔ خدا میں کسی کا کیا زور موت سے کسی کو مفر نہیں جب نانا جان اور باباجان اس دنیا میں ہمیشہ نہ رہے تو کون رہے گا۔ بندہ وہی ہے جس کی گردن رضائے الٰہی کے سامنے خم رہے اور جو مصیبت آئے اس کو صبر و شکر سے جھیلے۔ دعا کرو کہ حسین اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ اور نانا کا دین دشمنوں کے شر سے محفوظ رہے۔ میں نے اسی مقصد کے لیے اپنے تمام گھر کو برباد کیا ہے۔ میں تم سب کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں اور یہ وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد جو مصیبتیں نازل ہوں ان کو صبر کے ساتھ جھیلنا میرے اس قافلہ کے سالار علی ابن الحسین ہیں جو وہ کہیں وہی کرنا۔ بہن آخری وصیت یہ ہے کہ میرے بچوں سے خبردار رہنا۔ ہر بی بی کے دکھ درد میں شریک رہنا۔

"تاخیر کا اب محل نہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن خیموں پر حملہ کر دے۔ اچھا بہن میرے لباس کا بقچہ لاؤ تاکہ میں مرنے کی تیاری کر دوں" امام علیہ السلام نے سب سے نیچے ایک بوسیدہ لباس جا بجا سے پھٹا ہوا پہنا۔ جناب زینبؑ نے پوچھا بھیا آپ ایسا کیوں کرتے ہیں فرمایا تاکہ دشمن اس لباس کو ناکارہ سمجھ کر میرے بدن سے نہ اتارے اور لاش کو عریاں نہ کرے جب لباس پہن چکے تو جناب زینبؑ نے فرمایا بھیا مجھے اجازت دیجئے کہ اماں جان کی ایک وصیت پوری کر دوں۔ انہوں نے فرمایا تھا جب میرا حسین کربلا میں رخصت آخر کے لئے آئے تو اس گلے کے بوسہ دینا۔ آہ! یہ بوسہ گاہ نبوی اس دن خنجر سے کاٹی جائے گی۔ جب زینبؑ بوسہ لے چکیں تو امام علیہ السلام نے فرمایا۔ ذرا اپنے شانوں سے ردا ہٹاؤ تاکہ ایک اور خواہش میری بھی پوری ہو۔ آپ نے بہن کو چھاتی سے لگا کر دونوں شانوں کو بوسہ دیا۔ جناب زینبؑ نے پوچھا۔ بھیا آپ نے ایسا کیوں کیا۔ فرمایا میری مظلوم بہن! میرے مرنے کے بعد دشمن تم کو اسیر کریں گے اور ان بازوؤں میں رسی باندھیں گے۔

اس کے بعد امام علیہ السلام بیمار کربلا کے خیمہ میں آئے دیکھا کہ وہ غش میں پڑے ہوئے ہیں۔ بازو پکڑ کر چونکایا بیمار

نے آنکھ کھولی۔ حضرت کو دیکھتے ہی اُٹھنے کا قصد کیا۔ مگر ضعف نے اجازت نہ دی۔ حضرت نے فرمایا بیٹا علی! اب ہم تم سے رخصت ہونے آئے ہیں۔ یہ سنتے ہی بیمارِ کربلا کو تابِ ضبط نہ رہی۔ پوچھا بابا جان! کیا اب آپ کے لشکر میں کوئی باقی نہیں رہا۔ فرمایا ہاں بیٹا سب راہی جنّت ہوئے یہ میرے کپڑے سب ان ہی کے خون میں بھرے ہوئے ہیں۔ کہیں علی اکبر کا خون ہے تو کہیں عباس دلاور کا، کہیں قاسم بے پر کا، کہیں عون و محمد کا۔ آہ ان سب نے میری گود ہی میں دم توڑا ہے۔ آہ! میں نے اپنی آنکھوں سے ان سب کے منکے ڈھلکتے دیکھے ہیں۔

بیٹا علیؑ اب یہ سب بیوائیں یہ یتیم بچے تمہارے سپرد ہیں۔ بیٹا صبر و رضا کے ساتھ آنے والی منزلوں کو طے کرنا گھبرانا نہیں۔ اللہ تمہاری مدد کرنے والا ہے۔ اس کے بعد اسرارِ امامت تعلیم فرمائے اور بیمار بیٹے سے گلے مل کر رو دئے۔ پھر رخصت کر کے خیمے سے برآمد ہونا چاہا۔

حمید کہتا ہے میں دیکھ رہا تھا کہ حسین علیہ السلام کے خیمے کا پردہ بار بار اُٹھتا ہے اور گرتا ہے میں نے کسی سے پوچھا کیا ہو رہا ہے اس نے کہا جب حسینؑ خیمہ سے نکلنا چاہتے ہیں تو سیدانیاں بے چین ہو کر لپٹ جاتی ہیں اور کہتی ہیں۔ اے بے کسوں کی آس۔ اے ٹوٹے دلوں کے سہارے۔ اے فاطمہؑ کے جگر پارے ہم کو کس پر چھوڑے جا رہے ہو؟

الغرض امام مظلوم سب کو روتا پیٹتا چھوڑ کر خیمے سے برآمد ہوئے مگر اس طرح ؎

شبیرؑ برآمد ہوئے یوں خیمے کے در سے
جس طرح نکلتا ہے جنازہ بھرے گھر سے

دروازے پر گھوڑا کھڑا تھا۔ لیکن اب کون رکاب پکڑے، دل بھر آیا، پھر اپنے یاور و ناصر یاد آئے۔ دل پُر درد سے ایک آہ کھینچی مقتل کی طرف رُخ کر کے فرمایا: اے حبیبؑ، اے مسلمؑ، اے بریرؑ، اے عباسؑ، اے قاسمؑ اے علی اکبرؑ۔ میں نے تم سب کو رکاب تھام کر سوار کیا تھا۔ آہ! میری رکاب پکڑنے کے لئے تم میں سے کوئی نہیں آتا۔ موت نے تم سب کو پچھاڑ دیا۔ تم سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔

عزادارو! سنو حضرت کی رکاب کس نے پکڑی۔ خیمے کے دروازہ کا پردہ اُٹھا۔ ایک بی بی برقع پوش خیمے سے یہ کہتی نکلیں۔ میرے مظلوم بھیا، میرے بےکس بھیا، زینبؑ رکاب پکڑنے کے لئے حاضر ہے حضرت نے فرمایا بہن میری زندگی میں خیمے سے نہ نکلو۔ بہر حال بہن نے بھائی کو سوار کیا۔ آہ! گھوڑے پر جاتے تو دیکھا مگر پھر واپس ہوتے نہ دیکھا۔ گھوڑا لوٹ آیا مگر سوار کو کھو کر آیا۔ خون میں تر بتر ہو کر آیا۔ باگیں کٹی ہوئیں۔ زین ڈھلا ہوا تمام بدن خون سے رنگا ہوا۔ حسینؑ کا عمامہ زین پر رکھا ہوا۔ تلوار لٹکی ہوئی جب اس حال سے گھوڑے کو خیمہ کی طرف آتے دیکھا ہوگا تو بیبیوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔

بارھویں امام علیہ السلام زیارتِ ناحیہ میں فرماتے ہیں۔ جب میرے جدِ مظلوم کا گھوڑا روتا ہوا آہیں بھرتا ہوا اور سسکتا ہوا خیمہ کی جانب خبرِ شہادت دینے آیا تو خیامِ حسینی کے دروازوں سے پردے اُٹھے اور بی بیاں سر کھلے بال بکھرے چہروں پر

طمانچے مارتی سر و سینہ پیٹتی نکل پڑیں واحسیناہ! واحسیناہ!! واحسیناہ!!! وامظلوماہ کی صدائیں آ رہی تھیں بچے گھوڑے کی ٹانگوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ بی بیوں نے ذوالجناح کو اپنے حلقے میں لے لیا تھا اور اس سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں۔

سکینہ کی فریاد تھی اے میرے بابا کے گھوڑے، میرے بابا کو کہاں چھوڑا۔ ہائے میں یتیم ہوگئی آہ اب میں کس کے سینے پر سوؤں گی آہ! اب میں اپنا درد دکھ کس سے بیان کروں گی۔

عزادارو! ابھی سوگوار بی بیاں گھوڑے کے گرد کھڑی بین کر رہی تھیں کہ مقتل میں یہ آواز گونجنے لگی۔

اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُؑ۔ اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُؑ

اس کے ساتھ ہی وہ اشقیا گھوڑے دوڑاتے خیمہ گاہ حسینی میں گھس آئے۔ بی بیاں مضطرب الحال گھوڑے کو چھوڑ کر اپنے خیمے کے اندر چھپنے کے لئے گئیں۔ مگر ظالموں کے دستبرد سے کہاں بچتیں۔

لُٹی گئیں، اسیر ہوئیں، در بدر پھریں

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

سترہویں مجلس

مسئلہ شفاعت فضائل اہلبیتؑ
و
شہادت حضرت عباسؑ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فِىْ كِتَابِهِ الْمَجِيْدِ وَفُرْقَانِهِ الْحَمِيْد

مَنْ ذَا الَّذِىْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

(سورہ البقرہ ۲۵۵/۲)

کوئی خدا کے سامنے بغیر اس کے اذن کے شفاعت نہیں کر سکتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت ہو تو سکے گی مگر یہ کام کر وہی سکے گا جس کو خدا نے اجازت دی ہوگی۔

ہر نبی و مرسل اپنی اپنی اُمت کا گواہ بن کر روز قیامت پیش خدا آئے گا۔ یعنی جو کچھ اعمال نیک و بد انہوں نے کئے ہوں گے ان کی تصدیق کرے گا اور ان سب کے بیانات کی تصدیق سرور انبیاءؐ کریں گے۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (سورہ النساء ۴/۴۱) حضورؐ کی گواہی اس لئے نہ ہوگی کہ معاذ اللہ انبیاء دروغ گو یا کسی کا پارٹ لینے والے ہیں بلکہ صرف بغرض توثیق اور اتمام حجت ہوگی تاکہ دشمنان انبیاءؑ یہ نہ کہہ سکیں کہ انہوں نے ہماری عداوت میں ایسا کیا ہے۔

لیکن گواہی کے ساتھ انبیاءؑ کو اپنی امتوں کے معاملہ میں سفارش کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔ سورہ السبا میں فرماتا ہے وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (سورہ النساء ۳۴/۲۳) خدا کے سامنے شفاعت مفید نہ ہوگی مگر اس

کی جسے خدا نے اذن دے دیا ہو۔

سورہ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (سورہ طٰہٰ ۲۰/۱۰۹) اس روز شفاعت فائدہ نہ دے گی مگر اسی کی جسے خدا نے اجازت دے دی ہو اور اس کی بات پسند بھی کرے۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ خدا کے کچھ مخصوص بندے ہوں گے جن کو اذن شفاعت ملے گا ان کی ایک خصوصیت تو یہ ہوگی کہ خدا ان کی بات کو یعنی سفارش کو پسند کرتا ہوگا دوسری جگہ فرماتا ہے لَّا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا (سورہ مریم ۱۹/۸۷) (نہیں قادر ہوگا شفاعت مگر وہی جس نے خدا سے سفارش کا اقرار لے لیا ہو۔

معلوم ہوگیا کہ یہ اقرار ہر شخص کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ کچھ مخصوص ہستیاں ہیں جن سے اقرار ہوا ہے۔

اس سفارش کا آخری درجہ مخصوص ہوگا۔ خاتم الانبیاء سے کیونکہ وہ تمام امتوں کے حالات سے باخبر ہوں گے اور اپنی امت کے حال سے بھی۔

صرف حضورؐ کی امت میں ہونا شفاعت کے لئے کافی نہیں کیونکہ آپ سے تمام امت نے یکساں ہدایت حاصل نہیں کی۔

حضورؐ کی ہدایت کی مثال آفتاب کی سی ہے کہ وہ ہر جگہ اپنی روشنی ڈالتا ہے۔ خشکی پر، تری پر، دریاؤں پر، جنگلوں پر، نباتات پر، پہاڑوں پر، ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس سے فیض حاصل کرتا ہے سمندروں پر اس کی چمک سے بخار پیدا ہوتا ہے اور اس سے بادل بنتے ہیں۔ بادل سے مینہ برستا ہے زمین زندہ ہوتی ہے، پہاڑوں پر برف پگھلتا ہے جس سے چشمے پھوٹتے ہیں، دریا بہتے ہیں اسی سورج کی گرمی سے ہوا میں حرکت پیدا ہوتی ہے اس سے آندھی آتی ہے بگولے اٹھتے ہیں زرخیز زمینوں میں سبزی پیدا ہوتی ہے مگر کھاری زمینوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ صاف چٹانوں پر کتنی ہی بارش پڑے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

پاک و صاف دل دریاؤں سے مشابہ ہیں۔ جب دینی ہدایات کے بادل دلوں سے اٹھتے ہیں تو لوگوں کے قلوب زندہ ہو جاتے ہیں۔ فاجر و فاسق اور منافق کی مثال کھاری زمین کی سی ہے جہاں ہدایت کی تخم کاری ہوتی ہی نہیں۔

اللہ نے اپنے نور کی جلوہ ریزی رسولؐ پر کی اور رسولؐ نے امت پر۔ بس جس کا جو ظرف تھا اس نے اتنا ہی فیض حاصل کر لیا۔ کوئی مومن بنا تو کوئی کامل الایمان، کوئی منافق بنا تو کوئی منافق گر، کوئی ضعیف الایمان بنا اور کوئی مولفۃ القلوب۔

باغ کی سرزمین پر جب بارش ہوتی ہے تو کتنے مختلف اثرات دکھاتی ہے۔ کہیں تو لالہ و گل سے کیاریاں مہکنے لگتی ہیں

کہیں سبزہ سے روشیں لہک اُٹھتی ہیں کہیں ہرے بھرے پودوں میں پھل پھول لگتے ہیں کہیں اسی سے زمین پر خاردار جھاڑیاں بھی اُگ آتی ہیں۔ ببول کے لمبے لمبے نکیلے کانٹے بھی پیدا ہو جاتے ہیں زمین ایک، پانی ایک، فضا ایک، ہوا ایک، مگر حالت سب کی ایک نہیں۔ ایک کیاری میں آم کی گٹھلی دبائی گئی تھی اور اسی کے پاس ترش لیموں کا تخم بھی تھا۔ جب درخت آگے تو الگ الگ پھلوں کا مزا ہوا تو الگ الگ نہ ایک جگہ بیج دبانے سے کڑوے پھل کو میٹھے پھل سے فیض پہنچا نہ ایک کیاری میں پرورش پانے سے کیونکہ جس کا جو ظرف تھا اس نے وہی حاصل کیا۔

پس غور طلب بات یہ ہے کہ جب رسولؐ کی ہدایت سب کے لئے یکساں نہیں تو پھر ان کی منزلت بھی نگاہ رسولؐ میں یکساں نہ ہوگی لہٰذا ایسی صورت میں ناممکن ہے کہ حضورؐ کی شفاعت کا حق سب کو پہنچ سکے۔ بلکہ صرف ان ہی لوگوں کو پہنچے گا جنہوں نے پوری طرح رسولؐ کا اتباع کیا ہوگا۔ اور جس مقصد کے لئے رسولؐ بھیجے گئے تھے اس کی تکمیل میں رسولؐ کو مدد دی ہوگی۔ خداوند عالم اپنے رسولؐ کو ایسے ہی لوگوں کی شفاعت کا اذن دے گا نہ کہ ہمہ و شما کے لئے۔

ہر درخت کی وقعت اس کے پھل سے ہوتی ہے نہ کہ کسی زمین کے لحاظ سے نہ کسی مالی کی سعی و کوشش کے لحاظ سے نہ فضا و ہوا کے لحاظ سے۔ اگر پھل شیریں اور صحت بخش ہے تو لوگ خود بخود اس کی طرف کھنچتے ہیں اگر اس کے پھولوں میں مہک ہے تو اس کی طرف لوگوں کی طبیعت ضرور مائل ہوگی۔ انسان کو اگر درخت مانا جائے تو اس کے پھل اور پھول اس کے اعمال ہوں گے، اور اعمال کی اچھائی کا نتیجہ نجات ہے۔

عمل نیک نام ہے احکام خدا کی پُرخلوص اطاعت کا جو اس پر ایمان لانے کے بعد ہو ورنہ یوں تو عمل مشرک و کافر لامذہب بھی کرتے ہیں مگر چونکہ ایمان باللہ نہیں اور جو احکام خدا نے اپنے انبیاء و مرسلین کے ذریعے سے بھیجے ہیں ان کو صحیح طور پر بجا لایا نہیں گیا لہٰذا وہ سب قابلِ رد ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق خداوند تعالیٰ فرماتا ہے عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ ٥ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ″ (سب سے سخت سے سخت عمل کرنے والے ہیں مگر وہ جہنم کی آگ کو تاپیں گے۔

رسولؐ تو صرف ان ہی لوگوں کی سفارش کر سکیں گے جن کی سفارش کی اجازت خدا دے گا، اور خدا ان ہی کی سفارش کی اجازت دے گا جو اس کے اُوپر سچے دل سے ایمان لائے ہوتے ہوں گے، اور جنہوں نے اس کے احکام کے مطابق عمل کیا ہوگا۔

جس طرح دُنیا میں انسانی کوششوں کے نتیجے مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح خدا کے سامنے بھی ان کے اعمال کے مختلف نتائج ہوں گے۔ دُنیا میں انسانی کوششوں کے جانچنے کا معیار اور ہے اور خدا کے سامنے اور ہوگا، چونکہ ابنائے روزگار صاحب کوشش کی دلی حالت سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ قیاسات سے کام لے کر غلط نتائج نکال لیتے ہیں اور اسی لیے اکثر نیک کوششیں رائیگاں جاتی ہیں لیکن خدا چونکہ ہر دل کی بات جاننے والا ہے لہٰذا وہاں کسی کی پُرخلوص

کوشش رائیگاں نہ جائے گی۔

انسان کی نجات کا سب سے پہلا شفیع اس کا عملِ خیر اور حب خیر ہے اور دوسرا شفیع وہ ہوگا جس کو خدا شفاعت کی اجازت دے گا۔

کوئی یہ نہ کہے کہ جب عمل کو حق شفاعت پہنچتا ہے تو پھر دوسرے کی ضرورت کیا رہی۔ اس کو یوں سمجھئے کہ انسان کے اعمال کی دو صورتیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق براہِ راست خدا سے ہے۔ یعنی اس کی عبادت اور اس قسم کے تمام اعمال براہِ راست خود شفیع ہوں گے اور جو قابلِ قبول ہوں گے۔ خدا ضرور ان کو قبول کرے گا اور اسے اختیار ہوگا کہ جو فروگزاشتیں عبادات میں بندوں سے ہوئی ہیں انہیں معاف کر دے۔

لیکن دوسری قسم اعمال کی وہ ہے جس کا تعلق بندوں سے ہے یعنی اگر کسی نے صلہ رحم نہیں کیا یا کسی کے حق کو مار لیا ہے یا کسی کو قتل کر دیا ہے تو یہاں اعمال کی سفارش بیکار ہوگی بعض گناہ تو ان میں قابل معافی ہوں گے ہی نہیں جیسے مومن کا قتل عمد اور بعض ایسے ہوں گے جن کا عوض مظلوم کو دلایا جائے گا، لیکن وہاں مال و زر مویشی و املاک تو ہونگے نہیں کہ ایک دوسرے کے نقصان کو پورا کر دے۔ وہاں تو عمل کا بدلہ عمل ہی سے ہوگا۔

اس موقعہ پر بندہ مومن کے حق میں معصومین کی شفاعت کا کام دے گی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ رسولؐ کا حق کَافَّةً لِّلنَّاس پر ہے پس جن لوگوں نے حق رسولؐ ادا نہیں کیا وہ ضرور رسولؐ کے مجرم ثابت ہوں گے جس طرح ایک دوسرے کا دامن اپنی حق طلبی کے لئے پکڑے ہوئے ہوگا، اسی طرح رسولؐ بھی اپنے گناہ گار کا دامن پکڑے ہوں گے اب شفاعت کی صورت یہ ہوگی کہ آپ اپنے مجرم سے فرمائیں گے۔ میں تجھ کو اس صورت میں بخش سکتا ہوں کہ تو میرے دوست کا گناہ بخش دے۔ لہٰذا اس طرح محبانِ رسولؐ کو اپنے ماخذہ داروں سے نجات ملے گی۔

رسولؐ کی طرح حق شفاعت آل رسولؐ کو بھی پہنچے گا کیونکہ انہوں نے اپنی زندگیاں کار خدا کے لئے وقف کر دی تھیں اور ایک آن واحد کے لئے بھی حکم خدا کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اپنی جانیں اس کی راہ میں قربان کر دیں۔ چونکہ شفاعت سے محروم کرنے والا کوئی امر چونکہ ان سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ لہٰذا وہ بھی شفیع ہوں گے۔

اللہ نے چونکہ ان کی مودت کو تمام مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے اور اس کو اجر رسالت فرمایا ہے لہٰذا جس نے ان کا حق ادا نہ کیا اس کا دامن ان کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور وہ اپنے دوست کو اسی طرح نجات دلائیں گے جیسے رسولؐ۔

تفسیر طنطاوی میں ہے کہ روز قیامت تین شفیع ہوں۔ انبیاء، علماء اور شہداء۔ لیکن صاحب تفسیر نے عمومیت کا درجہ دے دیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ ان تینوں گروہوں میں صرف وہی لوگ شفیع ہوں گے جن کے متعلق فرمایا گیا ہے۔ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (سورہ مریم ۱۹/۷۸) جنہوں نے خدا سے عہد و اقرار لے لیا ہوگا اور یہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے نفس کو مرضی الٰہی خرید نے کے لئے بیچ دیا ہوگا۔

ایسا گھر جس میں شفاعت کرنے والوں کے یہ تینوں گروہ موجود ہوں سوائے محمدؐ و آل محمدؐ کے دوسرا مل ہی نہیں سکتا۔ اس گھر میں نبی ایسا جو سید الانبیاء والمرسلین ہیں اور عالم ایسا جو مصداق من عندہ ام الکتاب ہے اور شہداء ایسا جو سید الشہداء ہے پس کوئی وجہ نہیں کہ اس شرف و فضل کے ہوتے ہوئے ان کو حق شفاعت حاصل نہ ہو۔

جن لوگوں نے شریعت الٰہیہ کو بدلا کتاب خدا میں تحریف کی۔ کتاب خدا کے منزل من اللہ ہونے میں شک کیا یا اس کی بعض آیتوں پر ایمان لائے اور بعض پر نہیں۔ جنہوں نے امرائے جور کی اعانت کی۔ جنہوں نے اغراض نفسانی کے تحت حقوق الناس کو پامال کیا۔ عبادت الٰہی میں ریا کو دخل دیا۔ علم و عمل کو ان لوگوں سے نہ لیا جو خدا اور رسولؐ کی طرف سے اس کے ذمہ دار بنائے گئے تھے۔ تو وہ شفاعت محمدؐ و آل محمدؐ سے محروم رہیں گے۔ سفارش دوست کی ہوتی ہے نہ کہ دشمن کی۔ صرف لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہنے سے کام نہیں چلتا۔ یہ گواہی تو منافق بھی دیتے تھے مگر خدا نے ان کو جھوٹا قرار دیا کیونکہ وہ اقرار صرف زبانی تھا جیسا کہ سورہ منافقون میں ہے۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ (سورہ المنٰفقون ۶۳/۱)

یعنی منافق تمہارے پاس آئیں اور کہیں ہم اس کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں اور اللہ بھی جانتا ہے لیکن اللہ اس کی گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

جو عمل جہالت سے ہوگا وہ ہرگز مستحق شفاعت نہ ہوگا۔ اس کا بڑا دارومدار ایمان و یقین اور علم و معرفت پر ہے۔ جب کوئی بندہ اپنے دل میں ایمان کا بیج بوتا ہے اور اطاعت الٰہیہ کے پانی سے اس کو سیراب کرتا ہے اور اخلاق رذیلہ کے کانٹوں سے دل کو پاک کرتا ہے اور فضل خدا کا انتظار کرتا ہے۔ لقائے الٰہی کے شوق میں موت کی آرزو کرتا ہے مصائب و آلام میں صبر سے کام لیتا ہے۔ خدا کا شکوہ زبان پر نہیں لاتا وہ یقیناً مستحق شفاعت ہے۔ جو لوگ خواہش نفسانی کا اتباع کرتے ہیں لذت دنیا کی طلب میں رہتے ہیں۔ ان کو کیا حق ہے کہ خدا سے مغفرت کی اُمید اور محمدؐ و آل محمدؐ سے شفاعت کی توقع رکھیں کتنا احمق ہے وہ شخص جو بغیر ریاضت کئے اور تخم بکھیرے اپنی کھیتی کے لہلہانے کی اُمید رکھتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرکار دو عالم صراط مستقیم پر تھے۔ ان کی ہر حرکت و ہر سکون تابع حکم الٰہی تھا پس جو لوگ ان کے نشان قدم پر چلے کیا وجہ کہ روز قیامت ان کی شفاعت قبول نہ ہو۔

اہلبیت علیہم السلام نے اسلام کی وہ گراں قدر خدمت انجام دی جس کی تعریف نہیں ہو سکتی اگر آنحضرتؐ کے بعد علی علیہ السلام اور ان کے گیارہ جانشین نہ ہوتے تو اسلام کی صورت مسخ ہو کر رہ جاتی۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جب مسلمانوں میں یکایک تسخیر ممالک کا ولولہ پیدا ہوا اور وہ فتوحات ملکی کے شوق میں ہر طرف پھیلنے شروع ہو گئے تو اسلام کے اندر ایک ایسا ہولناک انقلاب آیا جس کے تصور سے

روح کا نتیجہ ہے وہ یہ تھا کہ جب اہل عرب جو تلوار کے دھنی اور خون ریزی میں مشاق تھے اور اسلامی تعلیم نے پوری طرح ان میں جڑ نہ پکڑی تھی ۔ فتوحات کے بعد روم و ایران و ہندوستان وغیرہ ملکوں کے فلاسفروں حکماء اور مذہبی پیشواؤں سے ملے اور تبادلہ خیال شروع ہوا تو مذہبی عقائد کے متعلق اقوام عالم نے جو دلائل ان کے سامنے پیش کئے یہ ان کی تردید پر قادر نہ ہوئے یہ سپاہی تھے، عالم نہ تھے نتیجہ میں رفتہ رفتہ کفار و مشرکین کے عقائد اور مذہبی رسوم اور اخلاقی تمدن نے ان کے دل و دماغ پر قابو پانا شروع کیا ۔ انہوں نے ان کا ملک فتح کیا تھا انہوں نے ان کے دل و دماغ کو فتح کر لیا۔ اس انقلاب عظیم نے اسلام کی بنیادوں کو ہلا دیا ۔ اور اسلام کا ہر عقیدہ ایک نئے لباس میں نظر آنے لگا ۔ اوروں کا کیا ذکر توحید الہٰی جو اسلام کا مایہ ناز عقیدہ تھا اس کے پاک صاف دامن پر ہزاروں دھبے پڑ گئے ۔ دوسروں کے ناپاک عقیدے اس میں سمو گئے ۔ مثلاً مسلمان بھی رویت باری کے قائل ہو گئے ۔ عدل الہٰی کے عقیدے کو چھوڑ بیٹھے ۔ بندہ مجبور محض بنا دیا ۔ جبر و شر دونوں کا فاعل خدا کو قرار دیا ۔ کلام الہٰی کے قدیم ہونے کے قائل ہوئے ۔ اسی طرح نبوت و قیامت میں بھی کفار و مشرکین کے عقائد کا ایک سیلاب امڈ آیا ۔

ایسے موقعہ پر اسلام کو جس نے مسخ ہونے سے بچایا وہ ذات تھی امیر المومنین علیہ السلام کی ۔ انہوں نے اسلام کی رگوں سے اس زہر کو دور کرنے کے لئے ایسے خطبے بیان فرمائے جن کی نظیر نہیں ملتی ۔ خود فرماتے ہیں ۔ ہم آل محمدؐ وہ ہیں

مَوْضِعُ سِرِّهٖ وَلَجَاُ اَمْرِهٖ وَعَيْبَةُ عِلْمِهٖ وَمَوْئِلُ حُكْمِهٖ وَكُهُوْفُ كُتُبِهٖ وَجِبَالُ دِيْنِهٖ بِهِمْ اَقَامَ انْحِنَاءَ ظَهْرِهٖ وَاَذْهَبَ ارْتِعَادَ فَرَائِصِهٖ

وہ سر الہٰی کی جگہ ہیں اس امر کے لئے پناہ کا مقام ہیں اس کے علم کا خزانہ ہیں حکمتوں کے رجوع کرنے کی جگہ ہیں اس کی کتابوں کے گہرے غار ہیں اس کے دین کے پہاڑ ہیں ۔ ان ہی سے تو اسلام کی ٹیڑھی کمر سیدھی ہوئی ان ہی سے تو اس کے شانوں کی کپکپاہٹ دور ہوئی کمر کی کجی اور شانوں کی کپکپاہٹ یہ ہی تو تھی جس کا اوپر ذکر کیا ۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔

زَرَعُوا الْفُجُوْرَ وَسَقَوْهُ الْغُرُوْرَ وَحَصَدُوا الثُّبُوْرَ خطبہ نہج البلاغہ لوگوں نے فجور کو بویا یا غرور سے سینچا اور ہلاکت کی کھیتی کو کاٹا)

ایک اور خطبے میں فرماتے ہیں : بِنَا اهْتَدَيْتُمْ فِي الظَّلْمَاءِ وَتَسَنَّمْتُمُ الْعَلْيَاءَ وَبِنَا انْفَجَرْتُمْ عَنِ السِّرَارِ (تم نے تاریکیوں میں ہم سے ہدایت پائی ۔ تم نے بلندیاں ہماری وجہ سے حاصل کیں ۔ تم کو ہماری وجہ سے اندھیرے میں صبح کا اجالا ملا)

یہی ہولناک انقلاب تھا جس نے یزید کے دور میں اسلام کی صورت بالکل ہی مسخ کر کے رکھ دی ۔ اب تو اسی کا نتیجہ تھا کہ آیات قرآنی کی تاویلیں نئی ہو رہی تھیں ۔ عقائد کے سانچے بدلے جا رہے تھے لیکن یزید کے دور میں تو یہ قیامت آئی

کہ اس نے قرآن کی تنزیل اور سرور انبیاء کی نبوت ہی سے انکار کردیا۔ اس کا مشہور شعر ہے۔

لَعِبَتْ بَنُوْهَاشِمِ بِالْمُلْكِ فَلَا
مَلَكٌ جَاءَ وَلَا وَحْیٌ نَزَلْ!

بنی ہاشم نے ملک کے لئے ایک کھیل کھیلا تھا نہ کوئی فرشتہ ان کے پاس آیا تھا نہ وحی نازل ہوئی تھی)

فرمائیے اس کے بعد اسلام میں رہ کیا گیا۔ نہ قرآن منزل من اللہ رہا نہ رسول منصوص و منصوب من اللہ سے جب بنیادی چیزیں ہی اپنی جگہ سے ہٹ گئیں تو اس کے بعد دیگر عقائد کا ذکر ہی کیا۔ چونکہ اس کا ایمان نہ کتاب خدا پر تھا نہ رسولؐ کی رسالت پر۔ لہٰذا اس نے نہایت بے باکی سے حلال محمدی کو حرام اور حرام محمدی کو حلال کردیا۔

اب غالباً ارباب عقل و فہم کو اس سوال کا جواب دینے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوگی کہ اگر واقعہ کربلا نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔

حسین علیہ السلام کا فرض تھا کہ اس عقیدہ باطل کی روک تھام کریں۔ اس خیال سے شاید کہنے والے کل کو یہ کہہ دیں کہ یہ شعر یزید کا نہیں یا وہ اس عقیدہ کا آدمی نہ تھا۔ امام علیہ السلام کو اس کی ضرورت پیش آئی کہ وہ اس کے عمل کو دنیا والوں کے سامنے پیش کرکے یہ بتادیں کہ یہ شعر اسی کا ہے اور وہ اسی عقیدہ کا آدمی ہے۔

کربلا میں اولاد رسولؐ پر جو مظالم بحکم یزید کئے گئے۔ وہ اس کی دلیل بن گئے کہ وہ نہ خدا پر ایمان رکھتا ہے نہ رسولؐ پر اس کی نظر میں احکام الہٰی کی قطعاً وقعت نہیں۔ بحمدللہ امام حسینؑ کی یہ کوشش کامیاب ہوگئی اور یزیدیت اور حسینیت کے فرق کو دنیا کی ہر قوم نے اچھی طرح سمجھ لیا۔

غضب خدا کا قرآن کہتا ہے۔ "وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ (سورہ النساء ۹۳/۴)" جس نے ایک بندہ مومن کو عمداً قتل کیا اس کی جزا جہنم ہے"۔

یزید نے ایک، دو نہیں بہت سے مومنان کامل کو قتل کرایا پھر مومن بھی کیسے؟ رسول اسلام کے دل کے ٹکڑے آنکھوں کا نور سردار شباب اہل الجنۃ۔ جن کے متعلق حضورؐ نے فرمایا تھا۔ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ جس نے اسے ستایا اس نے مجھے ستایا۔ اس کی جنگ میری جنگ ہے اس کی صلح میری صلح ہے۔

حسین علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ شہید ہوئے وہ معمولی انسان نہ تھے۔ وہ قاریان قرآن تھے جو ایک رات میں پورا قرآن پڑھتے تھے۔ وہ حافظان قرآن تھے۔ ان میں اصحاب رسولؐ بھی تھے فقیہ زمانہ بھی تھے۔ زہاد و عباد بھی تھے۔ پیغمبرؐ کے شبیہ بھی تھے پیغمبرؐ کے خاندان والے بھی تھے۔

اگر کافروں سے مقابلہ ہوتا تو شاید وہ بھی انسانی اصول کو اس بے پرواہی سے طاق نسیان نہ رکھتے جس طرح ان نام نہاد

مسلمانوں نے رکھے۔

امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں اِنَّ الْمُحَرَّمَ شَهْرٌ كَانَ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يُحَرِّمُوْنَ فِيْهِ الْقِتَالَ فَاسْتُحِلَّتْ فِيْهِ دِمَاۤؤُنَا وَانْتُهِكَتْ فِيْهِ حُرْمَتُنَا وَسُبِيَ فِيْهِ ذَرَارِيُنَا محرم وہ مہینہ ہے جس میں کفار و مشرکین بھی لڑائی کو حرام جانتے تھے۔ لیکن آہ اسی مہینے میں ہمارے خون بہائے گئے اور ہماری ہتک حرمت کی گئی اور ہماری ذرّیت کو قید کیا گیا۔

کون سا ظلم تھا جو ان ظالموں نے اٹھا رکھا انتہا یہ ہے کہ شقی انسان بھی کم سن بچوں پر رحم کرتا ہے لیکن ان ظالموں کو ان پر بھی رحم نہ آیا۔ معصوم بچوں پر پانی بند کر کے ان کو تڑپایا۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا اور اولاد رسولؐ پانی سے محروم تھی۔ سگ و خوگ جس پانی کو پی رہے تھے وہ ذریت رسولؐ پر بند تھا۔ خیموں سے بار بار پیاسے بچے آواز العطش العطش بلند کرتے تھے اور ان سنگ دلوں کے دل و دماغ پر چوٹ نہ پڑتی تھی۔

کس کی طاقت ہے کہ شب عاشورا ان بچوں کی بے چینی کا نقشہ کھینچ سکے بار بار خالی کوزے لے کر در خیمہ پر آتے تھے اور آواز العطش العطش بلند کرتے تھے۔ جس کو سن سن کر انصار حسین کے دلوں پر خنجر لگتے تھے مگر بے بس تھے کیا کرتے کسی طرح ان کی پیاس بجھانا ممکن نہ تھا۔

یہ رات کس طرح ان معصوم بچوں نے گزاری اس کا اندازہ وہی کر سکتے تھے جو ان کے حال زار کو دیکھنے والے تھے عاشور کے دن تو ان غریبوں میں اتنی جان بھی باقی نہ تھی کہ اپنے دل کا حال بھی بیان کر سکتے۔

حسین علیہ السلام کی چھوٹی سی بچی جس کا سن چار سال کا تھا بار بار غش کھا رہی تھی۔ جب سب بچوں نے آکر گھیرا۔ اور کہا سکینہ تم اپنے چچا کو بہت پیاری ہو۔ ہمارے ساتھ ان کے پاس چلو اور فریاد کرو یقین ہے کہ وہ ضرور پانی کی کوئی نہ کوئی سبیل نکالیں گے معصوم بچی سب کو لے کر در خیمہ پر آئی اور نحیف آواز میں کہا کوئی میرے چچا عباس کو بلا دو۔

کسی نے جا کر جناب عباس سے کہا کہ اے قمر بنی ہاشم آپ کو آپ کی بھتیجی سکینہ در خیمہ پر بلا رہی ہے جناب عباس آئے تو بچی چچا سے لپٹ گئی اور رو کر کہنے لگی۔ کیوں چچا کیا ہمیں مدینہ سے آپ اسی لئے لائے تھے کہ اس طرح پیاس سے تڑپائیں۔ چچا جان اب میرا دم ہونٹوں پر آگیا ہے کوئی دم جاتا ہے کہ آپ اپنی بھتیجی کو مرا ہوا سنیں گے کیا آپ جب پانی لائیں گے جب میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گی۔

حضرت عباسؑ بھتیجی کو چھاتی سے لپٹائے زار زار رو رہے تھے۔ آخر فرمایا اچھا بیٹی لاؤ اپنا مشکیزہ مجھے دے دو۔ اسے لے کر میں نہر کی طرف جاتا ہوں یا تو پانی لے کر آؤں گا۔ ورنہ اب تم کو اپنی صورت نہ دکھاؤں گا۔

اس کے بعد آپ مشکیزہ لے کر امام علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ مولا! اب میرا دل زندگی سے سیر ہو گیا ہے۔ سکینہ کی فریاد مجھ سے نہیں سنی جاتی۔ تف ہے اس زندگی پر کہ میں اس ننھی سی جان پیاس سے جاں بلب دیکھوں میں

سکینہ کا مشکیزہ لے آیا ہوں اگر پانی مل گیا تو واپس آؤں گا ورنہ وہیں جام شہادت نوش کروں گا۔

جناب عباسؑ سے یہ سننا تھا کہ امام علیہ السلام زار زار رونے لگے۔ فرمایا بھیا عباسؑ تمام ناصر و مددگار باری باری درجہ شہادت پر فائز ہو چکے۔ اب سوائے تمہارے اور علی اکبر کے اور کوئی باقی نہیں۔ کیا تم بھی اس عالم بے کسی میں مجھ سے جدا ہونا چاہتے ہو۔ عباس! تم میرے لشکر کے علمبردار ہو۔ عباس! تم سے میری پشت قوی ہے۔ تم سے ان دردرسیدہ سیدانیوں کو بڑی ڈھارس ہے آہ تمہارے جانے کے بعد یہ ظالم مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔

جناب عباسؑ نے عرض کی یابن رسول اللہ اب بغیر میرے گئے چارہ کار نہیں۔ حسینؑ اجازت دینے کے لئے مجبور ہوئے بھائی کو چھاتی سے لگایا اور اذن کارزار مرحمت فرمایا۔

جناب عباسؑ شیر کی طرح ہمہمہ کرتے فوجِ دشمن پر حملہ آور ہوئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ علیؑ خیبر میں لڑ رہے ہیں خندق کا معرکہ سر کر رہے ہیں۔ کس کی تاب تھی کہ اس شیر بیشۂ حیدری کے سامنے ٹھہر سکتا۔ صفوں کو اُلٹتے لاشوں کے انبار لگاتے تیروں کے مینہ برساتے خون کی ندیاں بہاتے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ نہر میں داخل ہو گئے۔ گھوڑے کو اشارہ کیا کہ تو پانی پی لے۔ مگر اس وفادار نے اپنی گردن کو نیچا ہی نہ کیا۔ اور بزبان بے زبانی گویا ہوا بھلا کس طرح ممکن ہے کہ اولاد رسولؐ تو پیاس سے تڑپ رہی ہو اور میں پانی پی لوں۔

اس کے بعد جناب عباسؑ نے مشک سکینہ کو بھرا اور نہر سے غضب ناک شیر کی طرح باہر نکلے۔ گھاٹ کے پہرہ داروں نے جب یہ دیکھا کہ عباسؑ پانی لے جانا چاہتے ہیں تو وہ خطاکار ہر طرف سے سمٹ آئے اور علمدار حسینی کو گھیر لیا۔ جناب عباس نے وہ جنگ کی کہ دشمن بدحواس ہو کر بھاگنے لگا۔ اسی اثنا میں ایک شقی نے آپ کے داہنے ہاتھ پر وار کیا۔ جس سے دست مبارک کٹ کر گر پڑا۔ آپ نے علم کو بائیں ہاتھ میں لیا۔ اور مشکیزہ کا تسمہ دانتوں سے دبا لیا ناگاہ ایک شقی نے حملہ کر کے بایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا۔ اب علمِ فوج حسینی سرنگوں ہو کر خاک پر گر پڑا۔ ایک جفاکار نے ایک ایسا تیر مشک پر مارا کہ سارا پانی بہہ گیا۔ پانی کا بہنا تھا کہ عباسؑ نے ایک سرد آہ کھینچی اور گھوڑے پر تیورانے لگے۔ بدن میں سناٹا چھا گیا۔ ناگاہ نوفل شقی نے سر اقدس پر ایک گرز مارا کہ پھر حضرت عباسؑ گھوڑے پر نہ ٹھہر سکے۔ آواز دی یابن رسولؐ اللہ ادرکنی۔

یہ آواز سنتے ہی امام مظلوم گھبرا گئے۔ کمر کو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور فرمایا۔ اَلْاٰنَ اِنْكَسَرَ ظَهْرِیْ وَقَلَّتْ حِيْلَتِیْ اب حسینؑ کی کمر ٹوٹ گئی اور راہ چارہ مسدود ہو گئی۔ علی اکبر چلو میرا بتیس برس کا بھائی میرا قوت بازو میری فوج کا علمبردار میرے بچوں کا سقا مجھے پکار رہا ہے۔

علی اکبر کو ساتھ لے کر امام مظلوم جانب نہر روانہ ہوئے۔ بار بار کہتے تھے عباس بھیا میں آ رہا ہوں۔ راستے میں دو جگہ امام مظلوم گھوڑے سے اُترے اور اپنے وفادار بھائی کے کٹے ہوئے ہاتھ اٹھائے چھاتی سے لگایا۔ آہ! یہ میرے

بھائی کے وہ ہاتھ ہیں جو میری نصرت میں قلم ہوئے۔ الغرض جس طرح بنا وہاں پہنچے۔ جہاں علیؑ کا شیر خاک پر پڑا دم توڑ رہا تھا۔ بے اختیار بھائی سے لپٹ گئے۔ سر کو گود میں رکھا۔ عباس میرے بھیا کیا حال ہے۔ عرض کی مولا اب کوئی دم میں یہ غلام آپ سے رخصت ہو رہا ہے۔ فرمایا بھیا عباس اگر کوئی آرزو ہو تو بیان کرو۔ عرض کی بس آخری تمنا یہ تھی کہ آپ کے روئے مبارک پر نظر کرتے ہوئے میرا دم ٹوٹتا۔ فرمایا پھر کیا چیز مانع ہے۔ عرض کی ایک آنکھ میں تیر پیوست ہے اور دوسری میں خون بھرا ہوا ہے کس طرح دیکھوں امام علیہ السلام نے دامن سے آنکھ کا خون صاف کیا۔ جناب عباسؑ نے ایک حسرت بھری نظر چہرہ امام پر ڈالی۔ حضرت نے فرمایا۔ عباس کوئی وصیت کرنی ہو کر دو۔ اگرچہ میں بھی چند ساعت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں مگر قاعدہ ہے کہ مرنے والے سے پوچھا جاتا ہے کہ کچھ کہنا ہے عرض کی کہ میری وصیت یہ ہے کہ آپ میری لاش کو یہیں چھوڑ دیں۔ خیمہ گاہ میں نہ لے جائیں۔ پوچھا۔ کیوں۔ عرض کی اول تو آپ میں اتنی طاقت نہیں کہ میری لاش کو اٹھا سکیں۔ علی اکبر کی مدد سے بھی یہ کام نہ ہو سکے گا۔ دوسرے مجھے سکینہ سے ندامت ہے میں وعدہ کر کے آیا تھا کہ پانی لے کر آؤں گا آہ میں اس بچی کی پیاس نہ بجھا سکا۔ اب میں اپنی صورت اس اُمید بھری بچی کو دکھانا نہیں چاہتا۔

امام علیہ السلام نے فرمایا۔ بھیا ایک آرزو میری بھی پوری کرو۔ تم نے ہمیشہ اپنے کو غلام اور مجھے آقا کہا۔ آج مجھے بھائی کہہ کر پکار لو۔ آہ! ابھی عباس کچھ کہنے نہ پائے تھے منکا ڈھل گیا اور بھائی نے بھائی کی گود میں دم توڑ دیا ؎

حسرت بھری نگاہ سے دیکھا امام نے
بھائی کا دم نکل گیا بھائی کے سامنے

آہ جی بھر کے بتیس برس کے بھائی کی لاش پر رونے بھی نہ پائے۔ کیونکہ دشمنوں کے حملے کا ہر طرف سے خوف تھا۔ علی اکبر سے کہا۔ مشک وعلم کو لے کر خیمہ گاہ کی طرف چلو۔ علی اکبر نے علم کو سنبھالا اور مشک سکینہ کو اس کے نیچے سے باندھ دیا۔

جب ان بچوں نے جو پانی کے انتظار میں خالی کوزے لئے کھڑے تھے علم آتے دیکھا تو خوشی سے پھولے نہ سمائے جناب سکینہ نے کہا بچو مبارک ہو میرے چچا جان پانی لے کر واپس ہو رہے ہیں۔ لیکن آہ جب امام علیہ السلام قریب پہنچے اور جناب عباسؑ کو ساتھ نہ دیکھا تو حضرت کی خدمت میں دوڑی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں بابا جان عمو کیوں نہیں آئے اور آپ یہ خالی مشک کیوں لا رہے ہیں۔ امام مظلومؑ نے چھاتی سے لگا کر فرمایا سکینہ تیرا چچا تیرا سقہ دریا کے کنارے شہید کر دیا گیا۔

آہ جب علم خیمہ کے اندر آیا تو کہرام بپا ہوگیا۔ علم کا پھریرہ علمدار حسینؑ کے خون سے رنگین تھا۔ اور سیدانیاں علم سے لپٹی ہوئی وہ دردناک بین کر رہی تھیں کہ زمین و آسمان ہل رہے تھے۔ ایک ایک بی بی عباسؑ کا خون دیکھ کر سر و سینہ پیٹتی اور واعباساہ کے نعرے مارتی تھی۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

اٹھارویں مجلس

ذکر فضیلت حضرت رسول خدا انبیاء علیہم السلام پر

اور

فضائل اہل بیتؑ اور شہادت انصار حسینؑ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فِيْ كِتَابِهِ الْمَجِيْدِ وَفُرْقَانِهِ الْحَمِيْدِ

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (سورہ البقرہ ۲/۲۵۳)

یہ رسولؑ ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

انبیاء و مرسلین کا سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور خاتم الانبیاء پر ختم ہوا۔ ان کی تعداد بنا بر روایات مشہور ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے یہ سب معصوم ضرور تھے لیکن بلحاظ فضائل و مراتب یکساں نہ تھے اور ان کی تبلیغ کے دوائر بھی مختلف تھے بعض ان میں اولوالعزم تھے۔ بعض ان میں ایسے تھے جن سے خدا ہم کلام ہوا۔ بعض صاحبانِ شریعت تھے بعض صاحبانِ صحیفہ تھے۔ بعض کو سلطنت دی گئی۔ بعض شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوئے لیکن یہ مسلّم ہے کہ ان میں جو مرتبہ خاتم الانبیاء کا تھا وہ کسی کا نہ تھا۔ اور اس کی کچھ وجوہ ہیں۔

۱۔ کسی کو خدا نے رحمۃ العالمین نہیں کہا۔ یوں تو ہر نبی کا وجود رحمت ہے مگر تمام عوالم کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنے زمانہ والوں کے لئے برخلاف ختم الانبیاء کے وہ اپنے وقت سے لے کر تا قیام قیامت تمام عوالم کے لئے باعث رحمت ہیں خواہ

وہ عالم علوی ہوں یا عالم سفلی ۔ نوری ہوں یا ناری ۔ حیوان ہو یا انسان ۔ شجر ہوں یا حجر وجود ختمی مرتبت ہر عالم کے لئے کس طرح باعث رحمت ہے ۔ اس کا سمجھنا بہت دشوار ہے ۔ کیونکہ ہم کو اہل عالم کی خصوصیات کا علم نہیں اور نہ ہم ان کے مایحتاج سے واقف ہیں اس کی مادی مثال یہ ہے کہ نظام شمسی میں آفتاب کا وجود تمام عالم علوی و سفلی کو پر فیض باری کرتا ہے ۔ زمین ۔ دریا ۔ پہاڑ، ہوا ۔ برق ۔ مقناطیس، بادل، سیارے ستارے سب کے لئے وہ باعث رحمت ہے لیکن کیسے کیسے ہے یہ ہم نہیں جانتے ۔

۲ ۔ دوسرے خدا نے آپ کے لئے فرمایا ہے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (سورہ الم نشرح ۹۴/۴) اور ہم نے اے رسول تیرے ذکر کو بلند کیا ۔ یہ خصوصیت بھی صرف آپ ہی کی ہے ۔ یعنی خدا کے ذکر کے ساتھ ساتھ دنیا میں ہمیشہ آپ کا ذکر ہوتا رہے گا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ محمد رسول اللہ بھی کہنا ہوتا ہے ۔ اسی طرح تشہد میں بھی ۔ ہر نبی کے زمانہ میں جو عبادت ہوتی تھی ۔ اس میں ذکر خدا کے ساتھ اس نبی کا ذکر لازم نہیں قرار دیا گیا تھا ۔ صرف ذکر الٰہی پر اکتفا کی جاتی تھی ۔ یہاں تک کہ یہ رعایت انبیائے اولوالعزم کے ساتھ بھی ملحوظ نہیں رکھی گئی ۔

۳ ۔ تیسرے حضرت کی اطاعت کو خدا نے اپنی اطاعت قرار دیا ہے مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (سورہ النساء ۴/۸۰) (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اگرچہ ہر نبی کی اطاعت اطاعت خدا ہے لیکن کسی آسمانی کتاب میں صراحتہً اس کا ذکر نہیں کیا گیا نیز یہ کہ کسی نبی کے ہر فعل کو خدا نے اپنا فعل نہیں کہا ۔ سوائے آنحضرت کے کہ آپ کی بیعت خدا نے اپنی بیعت قرار دی اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ سورہ الفتح ۱۰/۴۸) اے رسول جس نے تمہاری بیعت کی اس نے میری بیعت کی، حضور نے کفار کی طرف خاک پھینکی خدا نے کہا میں نے پھینکی ہے وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (سورہ الانفال ۸/۱۷) خدا نے انکی بات کو اپنی بات کہا ۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (سورہ النجم ۵۳/۴) ان کے ہاتھ کو خدا نے اپنا ہاتھ کہا يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (سورہ الفتح ۱۰/۴۸) اپنی عزت کے ساتھ ان کی عزت کو بھی بیان کیا وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ (سورہ المنافقون ۶۳/۸) اپنی رضا کے ساتھ ان کی رضا بھی رکھی ۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (سورہ التوبہ ۹/۶۲) اپنے اور رسول کے بلانے کو یکساں بتایا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ (سورہ الانفال ۸/۲۴)

۴ ۔ خدا نے کسی نبی کی اولاد کی محبت کو واجب قرار نہیں دیا سوائے آنحضرت کے قُلْ لَّاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى (سورۃ الشوریٰ ۴۲/۲۳)

۵ ۔ کسی نبی پر دوامی صلوٰۃ کا حکم نہیں سوائے حضور سرور انبیا کے ۔

۶ ۔ ہر نبی کو وقتی معجزہ دیا گیا جو ایک وقت خاص تک اثر دکھانے کے بعد ختم ہو گیا ۔ نوح کی کشتی اب کہاں ہے ۔ موسیٰ کا عصا

اور ید بیضا اب کہاں۔ بساط سلیمان اب کہاں، داؤدؑ کے لوہا نرم کرنے کا نشان اب کہاں، عیسیٰؑ کے مردہ جلانے اور بیماروں کو اچھا کرنے کا اعجاز اب کہاں لیکن سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ قرآن آج بھی موجود ہے اور قیامت تک اس کا یہ دعویٰ برقرار رہے گا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ (سورہ البقرہ ۲/۲۳)

۷۔ ہر نبی کی تبلیغ کا دائرہ محدود تھا۔ لیکن سرکار دوجہاں نہ کسی خاص ملک کے لئے نبی تھے نہ کسی خاص قوم کے لئے بلکہ کافتہ الناس کے لئے قیامت تک وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ (سورہ سبا ۲۸/۳۴) غور کیجئے اس سے آپ کی تکلیف اور ذمہ داری کتنی بڑھ گئی ہے حضرت موسیٰ صرف فرعون اور اس کی قوم سے خائف تھے اور حضورؐ کے دشمن نہ صرف بت پرست تھے بلکہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی مجوسی و ستارہ پرست بھی۔ زندیق و ملحد بھی۔ مگر حضورؐ خائف نہیں ہوئے۔ اگر شخص واحد سے کہا جائے کہ تم اکیلے فلاں شہر کے لوگوں کو ان کی باتوں سے روکو۔ جو عقلاً اور مذہباً خلاف ہیں تو وہ گھبرا جائے گا۔ لیکن حضورؐ نہ بت پرستوں کے عقاید کی مذمت کرنے سے رکے۔ نہ یہود و نصاریٰ کے غلط عقائد کو بیان کرنے سے۔ آپ نے اس بات کی ذرا پروا نہ کی کہ یہ سب میرے دشمن بن کر میرے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔

۸۔ آپ کا دین تمام ادیان سے افضل اور تمام ادیان سابقہ کا ناسخ ہے اور آپ کی اُمت تمام اُمتوں سے افضل و برتر ہے۔ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (سورہ آل عمران ۳/۱۱۰) یہ فضیلت اُمت محمدی کو صرف آنحضورؐ کے اتباع سے حاصل ہوئی۔ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (سورہ آل عمران ۳/۳۱)

۹۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء بنایا جس سے ثابت ہوا کہ جس کام کے لئے اللہ تعالیٰ نے کثیر تعداد میں انبیاء بھیجے وہ غرض حضرت کی تبلیغ سے پوری ہو گئی۔

۱۰۔ صاحب معجزہ انبیاء کو ایک ایک یا دو دو معجزے ملے۔ لیکن ہمارے حضورؐ کو بہ کثرت ملے۔ جن کی تعداد علمائے اسلام نے تین ہزار تک بیان کی ہے اور یہ معجزات مختلف قسم کے تھے بعض قدرت سے متعلق تھے جیسے تھوڑے کھانے سے بہت سے لوگوں کو سیر کر دینا تھوڑے پانی سے بہت سے لوگوں کو سیراب کر دینا بعض علوم سے متعلق تھے جیسے غیب کی خبریں دینا اور فصاحت و بلاغت قرآن۔ بعض آپ کی ذات سے مخصوص تھے جیسے، شرف نسب تمام اشراف قریش پر۔ بعض حضورؐ کی شجاعت سے متعلق تھے۔ چنانچہ مروی ہے کہ جب حضرت علیؑ نے عمرو بن عبدود کو قتل کیا تو حضورؐ نے پوچھا۔ كَيْفَ وَجَدْتَ نَفْسَكَ يَا عَلِيُّ (اے علیؑ تم اپنا کیا حال پاتے ہو) فرمایا۔ لَوْ كَانَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ فِي جَانِبٍ وَأَنَا فِي جَانِبٍ لَقَدَرْتُ عَلَيْهِمْ الا انت۔ اگر تمام اہل مدینہ ایک طرف ہوتے اور میں ایک طرف تو میں ان پر غالب رہتا

سوائے حضورؐ کے۔

۱۱۔ آپ تمام اولادِ آدمؑ سے افضل ہیں جیسا کہ فرمایا اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ میں اولادِ آدمؑ کا سردار ہوں اور یہ میرے لئے باعثِ فخر نہیں۔ اور یہ بھی فرمایا۔ لَا یَدْخُلِ الْجَنَّۃَ اَحَدٌ مِنَ النَّبِیِّیْنَ حَتّٰی اَدْخُلَھَا اَنَا۔ جب تک میں داخل نہ کروں گا کوئی نبی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

۱۲۔ حضرت نے فرمایا میرے لئے پانچ خصلتیں ایسی ہیں جو کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ (۱) میں اسود احمر کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ اور مجھ سے پہلے ہر نبی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے (۲) میرے لئے زمین کو جائے سجدہ اور طاہر بنایا گیا (۳) خدا نے ملائکہ سے میری مدد کرائی (۴) میرے لئے مالِ غنیمت کو حلال کیا۔ (۵) مجھے حق شفاعت دیا گیا۔

۱۳۔ جو امیر جہاں کا ہوتا ہے اس کو بقدر اس کی رعیت کے خرچ دیا جاتا ہے۔ مثلاً جو ایک گاؤں پر امیر ہے اس کو گاؤں والوں کی تعداد کے لحاظ سے رقم خرچ دی جائے گی اور جو ایک شہر کا ہے اس کو شہر کے باشندوں کے لحاظ سے اور جو مشرق سے مغرب تک ہر جگہ کا امیر ہوگا۔ اس کو اسی کے لحاظ سے دیا جائے گا پس جو رسولؐ ایک قوم یا ایک گاؤں پر بھیجا گیا اس کو توحید کے خزانے اور معرفت کے جواہرات اس کی رسالت کے لحاظ سے دیئے گئے۔ حضورؐ چونکہ کافۃ الناس کی طرف مبعوث کئے گئے۔ لہٰذا آپ کو علم کی اتنی دولت دے دی جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (سورہ النساء ۱۱۳/۴) اے رسولؐ جو بھی تم نہ جانتے تھے وہ سب تم کو تعلیم کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا لاعلمی کا تعلق آپ کی ذات سے رہا ہی نہیں۔ کائنات کے ہر ذرہ کا علم آپ کو عطا کر دیا گیا۔

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضورؐ انبیائے سابقین سے افضل نہ تھے اور ثبوت یہ ہے کہ آدمؑ مسجودِ ملائکہ تھے حضور نہ تھے۔ ابراہیمؑ کے لیے آگ سرد ہوئی۔ آنحضورؐ اس سے محروم رہے۔ موسیٰؑ کو معجزات عظیمہ ملے حضرت کو بہت کم ملے، حضرت داؤدؑ کے ہاتھ میں لوہا نرم ہوا آپ کے لئے ایسا نہ ہوا۔ سلیمان کی حکومت جن و انس و طیر پر تھی۔ آپ کے لئے ایسا نہ تھا۔ عیسیٰؑ نے مردے جلائے اور بیماروں کو اچھا کرتے تھے۔ آپ نے ایسا نہیں کیا۔ خدا نے ابراہیمؑ کو خلیل بنایا۔ موسیٰ کو کلیم اور عیسیٰؑ روح اور حضرت کو کوئی ایسا لقب خدا نے نہیں دیا پھر حضرت نے خود فرمایا ہے لَا تُفَضِّلُوْنِیْ عَلٰی یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی جب یونس ہی سے حضرت افضل نہ تھے تو اولوالعزم انبیاء کا ذکر ہی کیا اور یہ بھی فرمایا لَا تُخَیِّرُوْنِیْ عَنِ الْاَنْبِیَاءِ مجھے انبیاء سے نہ بڑھاؤ۔ ابن عباس سے مروی ہے ہم مسجد میں فضیلت انبیاء کا ذکر کر رہے تھے نوحؑ کی عبادت، ابراہیمؑ کی خلت، موسیٰ سے خدا کا کلام عیسیٰ کا رفع۔ پھر ہم نے کہا رسول اللہؐ ان سے افضل ہیں کیونکہ حضورؐ کو خدا نے کافۃ الناس کی طرف بھیجا ہے۔ اسی اثنا میں رسول اللہؐ تشریف لائے اور فرمایا کیا ذکر تھا ہم نے بیان کیا۔ فرمایا یحییٰ بن زکریا سے بہتر کوئی نبی نہیں کیونکہ انہوں نے کوئی گناہ نہ کیا تھا اور نہ اس کا ارادہ۔

جواب یہ ہے کہ آدمؑ، سرورِ دو عالمؐ سے کسی طرح افضل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے خود فرمایا آدم و من دونہ تحت لوائی یوم القیامۃ (آدم اور حوا جو ان کے قریب ہوں گے وہ میرے جھنڈے کے نیچے روزِ قیامت ہوں گے اور حضرت کی مشہور حدیث ہے کُنْتُ نَبِیًّا وَآدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ میں اس وقت نبی تھا جب آدم آب و گِل میں تھے۔ ملائکہ نے جو آدمؑ کو سجدہ تعظیمی کیا تھا وہ ایک وقتی چیز تھی۔ ختم ہو گئی۔ لیکن محمد و آل محمد پر بلحاظ عظمت ملائکہ قیامت تک درود بھیجتے رہیں گے۔ آدمؑ کو سجدہ صرف ملائکہ سے مخصوص تھا اور محمد و آل محمد پر صلوات و درود نہ صرف مومنین و ملائکہ بھیجتے ہیں بلکہ ذاتِ واجب بھی اس میں شریک ہے۔ آدمؑ کو ملائکہ نے محض اس لیے سجدہ کیا کہ نورِ محمدی جو اوّل مخلوقِ الٰہی تھا ان کی پیشانی میں تھا۔ آدمؑ کو صرف اسما کا علم دیا گیا تھا اور حضور نبی اکرمؐ کو ماکان و مایکون کا وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ (سورہ النساء ۱۱۳/۴) آدمؑ کو علم بعد خلقت دیا گیا اور حضورؐ کو قبل خلقت اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ (سورہ الرحمٰن ۲/۵۵) اور یہ ایک ایسا فعل تھا کہ خدا نے اس کے متعلق فرمایا ہے وَکَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا (سورہ النساء ۱۱۳/۴) حضورؐ کی تعلیم و تربیت و تادیب خدا نے خود کی جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ خدا نے مجھے تعلیم ادب دی اور اچھی طرح دی۔ علاوہ بریں حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے ہر شے کی ماہیت کا علم دیا تھا جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا۔ اَرِنَا اللّٰهَ الْاَشْیَاءَ کَمَا هِیَ آدمؑ کا علم محدود ہو کر رہ گیا۔ اور حضورؐ کا علم ہمیشہ بڑھتا رہا کیونکہ خدا نے ان سے فرمایا کہ یہ دعا کیا کرو۔ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔ رہا جبرائیلؑ کا تعلیم دینا تو یہ وقتی تلقین تھی ورنہ اصلی تعلیم تو خدا نے دی تھی۔ اسے یوں سمجھو۔ جیسے ایک جگہ خدا فرماتا ہے۔ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ (سورہ السجدہ ۱۱/۳۲) اور دوسری جگہ فرماتا ہے اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا (سورہ الزمر ۴۲/۳۹) پس ملائکہ سے موت کا تعلق مجازی ہے۔

اگر کہا جائے کہ نوحؑ کا یہ قول قرآن میں موجود ہے۔ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ (سورہ الشعراء ۱۱۴/۲۶) میں مومنوں کو اپنے پاس سے ہٹانے والا نہیں) اور آنحضورؐ کے متعلق یہ حکم ہے وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ (سورہ الانعام ۶/۵۲) جو لوگ خدا کو پکارتے ہیں ان کو اے رسولؐ اپنے سامنے سے ہٹاؤ) اس سے معلوم ہوا کہ خلقِ نوحؑ خلقِ محمدی سے زیادہ تھا لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ نوحؑ اپنی قوم کو عذاب سے ڈرانے والے تھے اور حضورؐ رحمۃ للعالمین تھے وہ مومنوں پر انتہائی مہربان تھے جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (سورہ التوبہ ۱۲۸/۹) انجام میں نوحؑ کو یہ کہنا پڑا۔ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا (سورہ نوح ۲۶/۷۱) خداوندا روئے زمین پر کسی کافر کو آباد نہ رکھ) اور حضورؐ نے ازراہِ شفقت فرمایا۔ رَبِّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ خداوندا میری قوم کو ہدایت کر کیونکہ یہ جاہل ہیں۔)

رہے حضرت موسیٰ وہ بے شک کلیم اللہ تھے۔ لیکن ایک درخت سے آواز سنتے تھے۔ جس کو ان لوگوں نے بھی سنا جن

کو وہ میقات پر لے گئے تھے۔ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا (سورہ الاعراف ۱۵۵/۷) جس سے معلوم ہوا کہ وہ کوئی رازدارانہ بات نہ تھی۔ لیکن شب معراج حضرت سے جو مکالمہ ہوا تو یہ ایک راز کی حیثیت سے تھا۔ جسے کسی نے سنا نہ کسی کو بتایا گیا۔ فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى (سورہ النجم ۱۰/۵۳)

اگر موسیٰ اس بنا پر صاحبِ فضیلت ہیں کہ خدا نے ان سے کلام کیا اور قرآن میں موجود ہے وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (سورہ النساء ۱۶۴/۴) تو ہم کہیں گے کہ قرآن میں تو ابلیس و خدا کے مکالمہ کا بھی ذکر ہے۔ اگر یہ موسیٰ کے لیے باعث شرف ہے تو ابلیس کے لئے کیوں نہیں۔ یہ ایسا شرف نہیں کہ حضرت خاتم الانبیاء پر موسیٰؑ کی فضیلت کو ثابت کرے۔

آنحضرتؐ کے فضائل میں یہ بات خصوصیت سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دیگر انبیاء کو کچھ خاص فضیلتیں ہیں جن سے مخصوص کیا ہے مثلاً ابراہیمؑ کو خلیل اللہ بنایا۔ موسیٰؑ کو کلیم اللہ۔ داؤد کے لیے ملک اور نبوت کو جمع کیا۔ سلیمان نے جن وانس و طیور کو مسخر کیا۔ لیکن آنحضرتؐ کے لیے یہ تمام فضیلتیں جمع کر دیں۔ اپنا حبیب بنایا۔ عرش پر کلام کیا۔ تمام دنیا کو مسخر کیا۔ نبوت کے ساتھ سلطنت جمع کی۔ نہ صرف منطق الطیر بلکہ ہر ذی روح کی بات آپ سمجھتے تھے۔ آپ کے جسم کا سایہ نہ تھا۔ سر پر بادل سایہ فگن تھا۔ جس طرح آگے سے دیکھتے تھے اسی طرح پیچھے سے۔ سوتے وقت آنکھ سوتی تھی دل نہیں سوتا تھا۔ آپ کی آواز سے اونچی آواز کرنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ مکھی آپ کے بدن پر نہ بیٹھتی تھی بول و براز کو زمین نگل جاتی تھی بدن سے خوشبو آتی تھی اس قسم کی بے شمار فضیلتیں آپ کو حاصل تھیں۔ اسی لیے آپ تمام انبیاء سے افضل تھے۔ کیونکہ آپ ان سب کے فضائل کے جامع تھے۔ باقی رہے وہ اقوال و احادیث جو حضورؐ کی زبان سے دیگر انبیاء کا افضل ہونا ثابت کرتی ہیں وہ ضعیف ہیں۔

اب اہل بیت علیہم السلام کی حالت پر بھی ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ کتنی باتوں میں وہ افضل الانبیاء علیہ التحیۃ والثناء کے ساتھ شریک ہیں۔

۱۔ نورِ رسالت میں شرکت ہے حضرت نے فرمایا۔ اَنَا وَعَلِيٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ

۲۔ شریکِ نسبِ رسولؐ ہیں۔

۳۔ نفسِ رسولؐ ہیں اَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ

۴۔ رسولؐ کی ذات ان کی ذات ہے یَا عَلِيُّ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ الرَّأْسِ مِنَ الْجَسَدِ فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِّنِّيْ حُسَيْنٌ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْهُ

۵۔ رسولؐ کی طرح ان پر صدقہ حرام ہے۔

۶۔ رسول کی طرح ان کی اطاعت بھی واجب ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (سورہ النساء ۵۹/۴)

۷ ۔ رسولؐ کی طرح ان کی محبت بھی واجب ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (سورہ الشوریٰ ۴۲/۲۳)

۸ ۔ رسولؐ کی طرح ان پر بھی صلواۃ واجب ہے ۔

۹ ۔ رسول کی طرح یہ بھی ولی ہیں ۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (سورہ المائدہ ۵/۵۵)

۱۰ ۔ رسول کی طرح ان کے لئے طہارت کاملہ ہے ۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (سورہ الاحزاب ۳۳/۳۳)

۱۱ ۔ ان کی اذیت رسولؐ کی اذیت ہے ۔

۱۲ ۔ رسول کی طرح علیؑ اعمال اُمت کے دیکھنے والے ہیں ۔ اِعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (سورہ التوبہ ۹/۱۰۵)

۱۳ ۔ رسولؐ کی طرح یہ بھی شہید علی الخلق ہیں ۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (سورہ البقرہ ۲/۱۴۳)

۱۴ ۔ رسول کی طرح یہ بھی شفیع اُمت ہیں ۔

لہذا ماننا پڑے گا کہ جس طرح رسولؐ تمام انبیاء سے افضل ہیں اسی طرح ان کے اہل بیت بھی انبیاء سے افضل ہیں ۔

حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا ۔

مَنْ اَرَادَ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى آدَمَ فِيْ صَفْوَتِهٖ وَاِلٰى نُوْحٍ فِيْ تَقْوَاهُ وَاِلٰى اِبْرَاهِيْمَ فِيْ خُلَّتِهٖ وَاِلٰى مُوْسٰى فِيْ هَيْبَتِهٖ وَاِلٰى عِيْسٰى فِيْ زُهْدِهٖ فَلْيَنْظُرْ اِلٰى وَجْهِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍؑ

جو کوئی چاہتا ہے کہ آدم کو ان کی صفوت میں نوح کو ان کے تقوے میں، ابراہیم کو ان کی خلت میں، موسیٰ کو ان کی ہیبت میں عیسیٰؑ کو ان کے زہد میں دیکھے اس کو چاہیئے کہ علی بن ابی طالب کے چہرے پر نظر کرے ۔

اس حدیث کو غائرانہ نظر سے دیکھئے پہلی تو یہ بات ہے کہ حضورؐ نے انبیائے اولوالعزم کی مخصوص صفات کو بیان کیا ہے دوسرے یہ کہ جو صفات ان کے اندر مخفی تھیں ۔ وہ علیؑ میں اس قدر سما بھر گئیں کہ ان کے چہرے سے ان صفات کا پتہ چلنے لگا اسی

لئے حضورؐ سرورِ انبیاء نے فرمایا۔ اَلنَّظَرُ اِلٰی وَجْہِ عَلِیٍّ عِبَادَۃٌ کیونکہ یہ تمام صفات دلیل کمالِ انسانیت ہیں۔ پس جو شخص ایک انسان کامل کے چہرے کو دیکھے گا جس سے صفاتِ کمالیہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہوں۔ جیسے آفتاب سے کرنیں۔ تو وہ لامحالہ اتباع کی طرف مائل ہوگا۔

تیسری بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا انبیاء کو صرف ایک ایک صفت کا مرکز بنایا گیا اس سے زیادہ کی ان کے ظرف میں باری تعالیٰ نے گنجائش نہ دیکھی۔ لیکن ایک علیؑ کی ذات میں ان سب کو جمع کر دیا گیا۔

انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہی وجہ ہے کہ حضرت امیرالمومنین نے فرمایا۔ نَزِّلُوْنَا عَنِ الرُّبُوْبِیَّۃِ وَقُوْلُوْا فِیْنَا مَا شِئْتُمْ لیعنی ہمیں ربوبیت سے توالگ کر دو باقی ہمارے بارے میں جو چاہو کہو۔ لیعنی حدوث و امکان کے اعجازی مدارج اور فضائل و مناقب ہو سکتے ہیں وہ سب ہم میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ ہم خدا نہیں ہیں اس کے بندے ہیں اور اطاعت شعار بندے ہیں لیکن ان کی مخلوق میں ہم سے اونچے درجے کا کوئی نہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔

نَحْنُ وُلَاۃُ اَمْرِ اللّٰہِ وَخُزَّانُ عِلْمِ اللّٰہِ وَوَرَثَۃُ وَحْیِ اللّٰہِ وَحَمَلَۃُ کِتَابِ اللّٰہِ۔ طَاعَتُنَا فَرِیْضَۃٌ وَحُبُّنَا اِیْمَانٌ وَبُغْضُنَا کُفْرٌ وَمُحِبُّنَا فِی الْجَنَّۃِ وَمُبْغِضُنَا فِی النَّارِ

(ہم امر خدا کے حاکم و ولی ہیں۔ ہم علم الٰہی کے خزانے ہیں۔ ہم وحی خدا کے وارث ہیں۔ ہم کتاب خدا کے حامل ہیں۔ ہماری اطاعت فرض ہے۔ ہماری محبت ایمان ہے۔ ہمارے ساتھ بغض کفر ہے۔ ہمارا محب جنت میں ہے۔ ہم سے بغض رکھنے والا دوزخی ہے۔)

پھر فرمایا۔ اِنَّ خَبَرَنَا صَعْبٌ مُّسْتَصْعَبٌ لَا یَحْتَمِلُہٗ اِلَّا مَلَکٌ مُّقَرَّبٌ اَوْ نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ اَوْ عَبْدٌ اِمْتَحَنَ اللّٰہُ قَلْبَہٗ بِالْاِیْمَانِ (ہمارے اخبار و احادیث سخت سے سخت تر ہیں نہیں برداشت کر سکتا ان کو مگر ملک مقرب یا نبی مرسل یا وہ شخص جس کا امتحان خدا نے ایمان میں لیا ہو۔)

حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کسی نبی کی ذریت ایسی نظر نہیں آئی۔ جو تمام کمالاتِ انسانی کی جامع ہو اور اس نے ہر کمال کا مظاہرہ بھی کرا دیا ہو۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی ذوات مقدسہ انسانیت کے حلقہ میں ہر طرح کامل ذاتیں تھیں۔ لیکن یہ کمال ان کے اندر اکثر حالتوں میں بالقوی رہا فعلیت کے مرتبے میں لانے کا موقع ان کو نہ ملا۔ جس سے ان کے کردار کی تابش اطراف و جوانب میں پڑتی۔

علمائے اخلاق نے نفس انسانی کے فضائل کو چار چیزوں میں منحصر کیا ہے جن کو فضائل چہار گانہ کہا جاتا ہے وہ حکمت وعفت وعدالت وشجاعت ہیں ہر نبی میں بالقویٰ یہ عام فضائل موجود ہیں مگر کسی ایک نبی کو بھی ان چاروں فضیلتوں کے بروئے کار لانے کا موقعہ نہ ملا۔ ان کی قوموں کے حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ حکمت کی تمام انواع کا مظاہرہ نہ کرسکے۔ شجاعت کی پوری طرح مرقع کشی نہ کرسکے۔ عدالت کے ہر پہلو کو نمایاں کرنے کا ان کو موقع نہ ملا۔ اسی لیئے تاریخ ان کے کردار پر پوری طرح روشنی ڈالنے سے قاصر رہی۔

لیکن خدا نے اپنے فضل وکرم سے اہل بیت علیہم السلام کو یہ تمام فضائل اجاگر کرنے اور قوم کے سامنے پیش کرنے کا موقع دیا اور ہر ہر منزل پر انہوں نے اپنے عمل کا نمونہ لوگوں کے سامنے رکھا۔

علیؑ حکیم تھے یعنی علم وعمل وحکمت نظری وحکمت علمی) کی دنیا کے تاجدار کوئی علمی مسئلہ آپ کے سامنے ایسا نہ آیا جس کو آپ نے بآسانی حل نہ کردیا۔ عمل صحیح کی کوئی ایسی صورت نہ رہی جس کو آپ نے کرکے نہ دکھایا۔ رسولؐ کے بعد اس فضیلت میں کوئی مسلمان علیؑ کی ٹکر کا نہ تھا حضورؐ نے فرمایا ہے۔ اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا۔ اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا۔ آپ کے حکیمانہ خطبوں اور اقوال کو دیکھیئے کہ ان میں علم حکمت کے کتنے نازک مسائل کو حل کیا گیا ہے اور کتنے سربستہ رازوں کی نقاب کشی کی گئی ہے۔

اسی طرح عفت پر نظر ڈالیئے کہ آیت تطہیر کی رُو سے ان کو طہارت کاملہ کا مرتبہ حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی ترکِ اولیٰ بھی ان سے نہ ہوا۔

آدَمُ قَدْ اَكَلَ الْحِنْطَةَ وَاللّٰهُ نَهٰی
وَعَلِیٌّ تَرَكَ الْاَكْلَ لِقَصْدِ الْقُرْبِ

آدمؑ کو اللہ نے منع کیا پھر بھی انہوں نے گیہوں کھالیا۔ اور علیؑ نے باوجود ممانعت نہ ہونے کے محض قربت کی بناء پر اس کو ترک کردیا۔ یہ احتیاط عفت کی آخری منزل ہے۔ ترکِ اولیٰ کی منزل میں انبیاء کے قدم بھی ڈگمگاتے ہیں۔ شجاعت کی یہ صورت کہ خدا ورسولؐ سے بار بار اس فضیلت کی مدح کرائی۔ کرارِ غیر فرار کی سند لی۔ رسولؐ نے ان کی ایک ضربت کو عبادت ثقلین سے افضل قرار دیا۔ لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ کی صدائیں فضا میں گونجیں۔

عدالت کا یہ عالم کہ اقضاکم علی کی سند رسولؐ سے حاصل کی۔ خدا سے اُمتِ وسط کا خطاب پایا۔ عرب میں یہ قول مشہور ہوگیا۔ قَضِيَّةٌ وَلَا اَبَا الْحَسَنِ لَهَا۔ حضرت عمر نے بار بار کہا لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ

بہرحال ان تمام فضائل کے عملی نمونے اہل بیت نے پیش کئے۔ وہ کسی کمال میں امت محمدی سے پیچھے نہیں رہے

ہشام بن عبدالملک نے ایک بار امام محمد باقر علیہ السلام کو دمشق میں طلب کیا جب آپ داخلِ دربار ہوئے تو وہ تیر اندازی کی مشق اپنے ارکان سلطنت کے ساتھ کر رہا تھا پس اس نے چاہا کہ حضرت کو ذلیل کرے کہنے لگا۔ آپ بھی تیر نشانہ پر لگائیے۔ فرمایا مجھے اس شغل سے باز رکھو۔ مجھے اس کی مشق نہیں رہی۔ اس نے کہا آپ لوگوں کا تو دعویٰ ہے کہ آپ ہر فن میں اور ہر علم میں کمال رکھتے ہیں اور ہر فضیلت میں سب سے فائق و برتر ہیں۔

یہ طعن آمیز باتیں سُن کر آپ نے تیر و کمان کو اس سے لے لیا اور تیر کو نشانہ پر مارا وہ نشانہ پر بیٹھا اور سیدھا رہا دوسرا تیر مارا تو وہ پہلے تیر کے آخری حصہ میں پیوست ہوگیا۔ تیسرا تیر مارا تو وہ دوسرے تیر کے آخر حصہ میں داخل ہوا اور تینوں تیر سیدھے ہوا میں معلق رہے۔ یہ دیکھ کر ہشام حیران رہ گیا۔ کہنے لگا آپ نے یہ کمال کہاں حاصل کیا۔ فرمایا ہم کسی سے حاصل نہیں کیا کرتے۔ ہم کو خدا نے ہر کمال میں یدِ طولیٰ دیا ہے۔

ان کی علمی قوت کا ہی یہ اثر تھا کہ ان کی عظمت و حرمت لوگوں کے ایمان کا جزو بن گئی تھی۔

ہر چیز کے پرکھنے کا ایک معیار جُداگانہ ہوتا ہے۔ ان حضرات کے نفسانی اور روحانی کمالات صرف وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جن کے دل میں نورِ ایمان تھا۔

اس کو یوں سمجھئے کہ حضورؐ سرورِ انبیاء انسانی کمالات کا مجسّمہ تھے۔ خداوندِ عالم نے کون سی فضیلت تھی جو ان کو نہ دی تھی۔ لیکن کفار و مشرکین نے آپ کو ساحر و مجنون ہی کہا اور قرآن مجید جیسی کتاب کو اساطیر الاولین سے تعبیر کیا۔ اسی طرح اور انبیاء کو بھی اپنا جیسا بشر سمجھا۔ اور جنوں سے نسبت دی۔ اس کی یہی وجہ تھی۔ نبوت و رسالت کے پرکھنے کا معیار ان کے پاس نہ تھا۔ اور جن کے پاس صحیح معیار تھا انہوں نے پہلے ہی موقع پر تصدیق کر دی۔

نبوت و امامت کے پرکھنے والوں کی صحیح اور غلط ذہنیت کا کھلا ہوا مرقع کربلا کا میدان تھا۔ ایک طرف چالیس ہزار ایسے اندھوں کی جماعت تھی۔ جن کو نیکی اور بدی میں تمیز نہ تھی جن کے پاس حق و باطل کے پرکھنے کا معیار ہی نہ تھا۔ باوجودیکہ امام حسین علیہ السلام نے بار بار ان کے سامنے اپنے فضائل کو بیان کیا۔ اپنے مدارج کو دکھایا مگر انہوں نے کوئی اثر ہی نہ لیا۔ گویا امام علیہ السلام کی آواز زندوں کے نہیں بلکہ مُردوں کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔

دوسری طرف وہ کامل الایمان تھے جو امامت کے حق شناس تھے۔ ان سے امام نے کسی موقع پر اپنا تعارف نہیں کرایا۔ کوئی بھولا سبق یاد نہیں دلایا۔ زندگی کی کوئی اُمید نہیں دلائی۔ اپنی نصرت پر مجبور نہیں کیا آنے والے ہر خطرہ سے آگاہ کر دیا۔ بیعت کا بار ان کی گردنوں سے اُٹھا لیا۔ مگر ان کے ارادوں میں بال برابر لغزش پیدا نہ ہوئی۔ امام کے اعزاز و اقتدار کا کوئی پہلو مضمحل نہ ہوا۔ موت نے ان کے دلوں کو لرزایا نہیں۔ ظلم و ستم کی بجلیوں نے ان کی عقیدت کے خرمن کو جلایا نہیں۔ وہ امام کے فدائی حق کے پروانے تین دن کی بھوک و پیاس میں ایسی ہمت سے لڑے کہ سیر و سیراب دشمن کے لالے پڑ گئے۔

ذرا دیکھا وہ میدان میں کیسی آن بان سے جا رہے ہیں۔ چہرے پر بشاشت کے آثار دل میں مرنے کی اُمنگ دشمن کی صفوں کو روندنے کا ولولہ۔ ہر ایک کی کوشش ہے کہ سب سے پہلے سعادت شہادت حاصل کر دں۔ اس دن انہیں زندگی سے کہیں زیادہ پیاری موت تھی۔

شب عاشور بریر ہمدانی عبدالرحمٰن بن ربہ سے مذاق کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا یہ وقت دل لگی کا نہیں۔ بریر نے کہا دُنیا جانتی ہے کہ میں ٹھٹھول کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ مگر کیا کروں اس وقت میرا دل خوشی سے پھولا ہوا ہے برادر یہ دشمن ہمارے سامنے ہیں کیا جب تلوار لے کر میدان میں جا پڑیں گے۔ خون کا مینہ برسا دیں گے۔ اگر لڑائی میں مارے گئے تو پھر انشاءاللہ حورانِ بہشتی سے ہم آغوش ہوں گے۔ جنت کے میوے کھائیں گے۔ کوثر کا پانی پئیں گے۔ کیا اس سے زیادہ خوشی کا کوئی اور موقعہ بھی ہو سکتا ہے۔

حبیب اپنے خیمے میں انصار کو جمع کر کے کہہ رہے ہیں۔ اے ناصرانِ حسین کل جنگ ضرور ہوگی۔ بتاؤ ہم کو کیا کرنا ہوگا آیا اولاد رسولؐ کے قتل کے بعد لڑنے جاؤ گے یا پہلے۔ میرے غیرت مند دستو یہ یاد رکھنا اگر ہماری نظر کے سامنے اولاد رسولؐ میں سے کوئی کسی کا بال بیکا ہوا تو روزِ حشر حضرت رسولؐ خدا اور علیؑ و فاطمہؑ کو کیا منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔

عبداللہ بن حنظلہ اپنے غلام سے کہہ رہے ہیں میں نے تجھے آزاد کیا۔ اس پردہ شب میں نکل جا۔ میں نہیں چاہتا کہ تو بھی ہمارے ساتھ مارا جائے۔ وہ مومن حق شناس شجاعانہ انداز میں کہتا ہے۔ آپ تو جنت میں جائیں اور میں محروم رہوں۔

امام مظلوم علیہ السلام جون کو اجازت کارزار نہیں دے رہے اور کہہ رہے ہیں اے جون اِتم ہمارے پاس اس لئے آئے تھے کہ راحت و آرام سے زندگی بسر کرو۔ لہٰذا میں تم کو اس بلا میں ڈالنا نہیں چاہتا وہ دنا کا بیکرہ حق کا فدائی کہہ رہا ہے کہ مولا یہ کیسے ممکن ہے کہ عیش میں تو آپ کے ساتھ رہوں۔ اور مصیبت میں آپ کی نصرت سے دست کش ہو جاؤں یا بن رسولؐ اللہ میں حبشی ہوں میرا خون سیاہ ہے۔ میرے پسینے سے بو آ رہی ہے۔ میرا نسب بھی پست کیا آپ نہیں چاہتے کہ میرا کالا خون آپ کے پاک خون میں مل جائے۔ اور میرا کالا چہرہ غازہ شہادت سے سرخ و سفید ہو جائے۔

مسلم ابن عوسجہ گھوڑے سے گرے تو آواز دی یا ابن رسول اللہ ادرکنی۔

یہ صدا سنتے ہی امام علیہ السلام مع حبیب ابن مظاہر کے مقتل کی طرف روانہ ہوئے۔ جب مسلم کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ بیہوش ہیں۔ ان کا سر اپنے آغوش میں لے لیا۔ حبیب نے شانہ ہلا کر کہا کہ مسلم ہوش میں آؤ دیکھو تو تمہارا سر فرزند رسولؐ کے زانو پر ہے۔ مسلم نے آنکھ کھولی۔ حبیب نے کہا کہ مسلم دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی مرنے والا ہوتا ہے۔ تو اس سے پوچھتے ہیں کہ کوئی وصیت کرو۔ اگرچہ ہم بھی تمہارے بعد ہی آ رہے ہیں۔ وصیت کے پورا کرنے کا موقعہ کہاں ملے گا۔ مسلم نے امام علیہ السلام کی طرف اشارہ کر کے فرمایا اُوْصِيكَ بِهٰذَا (میں ان کے لئے وصیت کرتا ہوں) یعنی نصرت امام میں کوتاہی

نہ کرنا۔

یہ تھی انصار حسین کی حق شناسی وفاداری اور امامت کی قدردانی۔

جناب مسلم بن عوسجہ کوفہ کے نامور سپاہی تھے۔ امیرالمومنین کے ساتھ جنگ جمل وصفین میں لڑ چکے تھے۔ جب کوفہ سے چلے تھے تو اپنے ساتھ اپنی بی بی اور اپنے اکلوتے لڑکے کو بھی لے لیا تھا جو بہت کم سن تھا۔

جب امام مظلوم مسلم کی لاش خیمہ گاہ میں لائے تو کہرام بپا ہوگیا۔ سیدانیاں اس عاشقِ حسین کو اس طرح روئیں جیسے اپنے خاص عزیز کو روتے ہیں۔ زوجہ جناب مسلم کو پرسا دینے کے لئے ان کے خیمہ میں جمع ہوئیں۔ اس زن مومنہ نے کہا۔ بی بیوا بجائے مسلم کا پرسہ دینے کے بارگاہ ایزدی میں رو رو کر دعا مانگو کہ خدا فرزند رسول کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک نوعمر لڑکا امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا یا بن رسول اللہ مجھے بھی اذن کارزار فرمائیے۔ میں آپ کے غلام مسلم بن عوسجہ کا فرزند ہوں۔ حضرت نے رو کر فرمایا بیٹا ابھی تو کمسن ہے کس طرح تجھے ان دشمنوں کے نرغے میں بھیج دوں۔ مجھ سے ممکن نہ ہوگا۔ ابھی مسلم کی موت کا صدمہ ہی تیری ماں کے لئے کافی ہے۔ تیری موت اس کے زخموں پر اور نمک چھڑکے گی۔ لڑکا کسی طرح نہیں مانتا فرمایا اچھا پہلے تو اپنی ماں سے اجازت حاصل کر۔ اس نے کہا یا بن رسول اللہ میری ماں ہی نے تو جنگ کے لئے میرے بدن پر ہتھیار سجا کر مجھے حضور کی خدمت میں بھیجا ہے۔ یہ نصرت حسین کا جوش مردوں عورتوں اور بچوں میں۔ حضرت اس کی باتیں سن کر رو رہے تھے کہ خیمہ سے آواز آئی یا بن رسول اللہ آپ کے جد کا واسطہ اس بچے کو نہ روکئے۔ اسے باپ کے پاس جانے دیجئے مجھے روح علیؑ وفاطمہؑ سے سرخرو ہونے دیجئے۔

الغرض امام مظلوم نے مجبور ہو کر اس لڑکے کو گھوڑے پر سوار کیا۔ لڑکا مسلم کا لڑکا تھا۔ ایک بہادر باپ کا بیٹا تھا بھوک پیاس کی حالت میں جوانوں کی طرح لڑا۔ آخر ایک شقی نے اس کے سر پر ایسی تلوار ماری کہ پھر وہ گھوڑے پر نہ سنبھل سکا اور آواز دی یا بن رسول اللہ ادرکنی۔ آہ حسین اس وقت اس کمسن شہید راہِ خدا کے پاس پہنچے۔ جب اس کی روح تن سے جدا ہوگئی تھی۔ جناب عباس اور علی اکبر سے فرمایا۔ اس کی لاش اٹھا کر لے چلو۔ تاکہ اس کی دکھیا ماں پھر ایک بار اسے دیکھ لے۔ جب لاش آئی اور بی بیوں نے اس کے تن پاش پاش کو دیکھا تو دہائیں مار کر رونے لگیں۔ ہر بی بی اس کی لاش سے لپٹی ہوئی بین کر رہی تھیں۔ زوجہ مسلم اپنے بچے کے پاس آئیں پیار کیا بلائیں لیں۔ اور فرمانے لگیں۔ شاباش بیٹا تو نے بڑا کام کیا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میری کمائی ٹھکانے لگی۔

یہ تھے انصار حسینؑ جو شمع امامت کے پروانے بنے ہوئے تھے۔ ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح امام مظلوم کی جان بچ جائے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں امامؑ پہ آنچ نہ آنے دی لیکن آہ کہاں تھے یہ وفادار حق شناس۔ جاں نثار۔ جب امام تنہا رہ گئے تھے اور بار بار استغاثہ بلند کر رہے تھے هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا هَلْ مِنْ مُغِيثٍ يُغِيثُنَا اس دردناک آواز نے تمام کائنات کو ہلا دیا۔ آسمانوں کے فرشتے تڑپ اٹھے فضا میں قوم جن گھبرانے لگی۔ سب نے اپنے سردار زعفر جن سے کہا۔ آہ نبیؐ کا نواسہ فریاد کر رہا ہے۔ اور ہم سن رہے ہیں۔ روز حشر کیا رسول کو منہ دکھائیں گے۔ یہ وقت ہے کہ ہم ان کی مدد کو جائیں

اور ان کے دشمنوں کو نہ تیغ کریں۔ الغرض زعفر اپنی فوج لے کر کربلا کی طرف روانہ ہوا لیکن آہ اس وقت پہنچا جب کربلا میں ہر طرف یہ آواز گونج رہی تھی۔ قُتِلَ الْحُسَيْنُ بِكَرْبَلَاء ذُبِحَ الْحُسَيْنُ بِكَرْبَلَاء زعفر جن روتا پیٹتا مع اپنی فوج کے واپس گیا۔ میں کہتا ہوں کہ اے زعفر! تم کو نہ جانا چاہیے تھا۔ اگر تم کربلا میں رہتے تو سیدانیاں لوٹی نہ جاتیں۔ خیموں میں آگ نہ لگتی۔ شہدا کے لاشے پامال نہ ہوتے۔ امام مظلوم کا سر نیزہ پر نہ چڑھتا۔ بے وارث بی بیاں قید نہ ہوتیں۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

انیسویں مجلس

قصہ حضرت آدم علیہ السلام و فضائل اہلبیت ؑ

واقعات بعد شہادت امام مظلوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فِىْ كِتَابِهِ الْمَجِيْدِ وَفُرْقَانِهِ الْحَمِيْدِ

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (سورہ البقرہ ۲/۳۵)

(اے رسول وہ وقت یاد کرو۔ جب خدا نے ملائکہ سے کہا میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انہوں نے کہا کیا تو ایسے کو خلیفہ بنائے گا۔ جو زمین پر فساد اور خونریزی کرے۔ درآنحالیکہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں۔ خدا نے فرمایا میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

ان آیات میں چند باتیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ خدا نے ملائکہ سے مشورہ تو کیا نہیں تھا کہ خواہ مخواہ ان کو اپنی رائے ظاہر کرنا پڑی۔

۲۔ ملائکہ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ آدمؑ فسادی و خونریز ہیں۔ جب کہ ان سے کوئی عمل ظہور ہی نہ آیا۔ بات یہ ہے کہ جب ملائکہ نے آدم میں قوت غضبی اور شہوی کو داخل ہوتے دیکھا۔ تو یہ نتیجہ نکالا کہ قوت شہوی باعث فساد ہوگی اور قوت غضبی

باعث خونریزی۔ لہٰذا خدا کی مصلحت کے اظہار کے لئے یہ سوال کر بیٹھے۔ البتہ ملائکہ کے دل میں حصول خلافت کی آمنگ ضرور تھی۔ اس استحقاق کے ظہور میں انہوں نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ اوّل اپنے رقیب کی مذمت کی۔ پھر اپنی افضلیت کے ثبوت میں تسبیح و تقدیس کو پیش کیا اور اصل مدعا کو اس لئے پوشیدہ رکھا کہ مزاجِ قدرت کے خلاف نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بھی بات پردہ ہی میں رکھی۔ اور گول مول لفظوں میں کہہ دیا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے لیکن ان پر حجت تمام کرنی ضرور تھی۔

۷۔ ملائکہ کا اس پر اجماع تھا کہ وہ ضرور آدمؑ سے زیادہ مستحق خلافت ہیں۔ اوّل تو آدمؑ ان سے عمر میں کم ہیں کوئی تجربہ نہیں رکھتے۔ پھر ان میں فساد و خونریزی کا مادّہ ہے۔ تیسرے تسبیح و تقدیس میں وہ ان سے زیادہ ہیں، لیکن ان کا یہ اجماع باوجود معصوم ہونے کے بارگاہ ایزدی میں قابلِ قبول نہ ہوا۔ کیوں کہ خدا نے خلیفہ بنانا دوسروں کی رائے اور مشورہ پر منحصر نہیں رکھا تھا۔ بلکہ اس کا تقرر اس کی مشیت پر موقوف تھا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ ۲/۳۰) چونکہ جملہ اسمیہ ہے لہٰذا دوام و ثبات پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی ہمیشہ ہمیشہ خلیفہ کا تعین تقرر میں ہی کیا کروں گا بندوں کا خواہ وہ ملائکہ ہوں یا جن و انسان کو اس بارے میں کوئی اختیار نہ ہوگا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ (سورہ القصص ۲۸/۶۸) (تمہارا رب جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ان میں سے چن لیتا ہے بندوں کا اس میں کوئی اختیار نہیں۔)

خدا نے یہ ثابت کرنے کے لئے آدم مستحق خلافت کیوں ہیں۔ آدم کو کچھ اسما تعلیم کیے پھر ان ناموں کے مسمیات کو ملائکہ کے سامنے پیش کر کے کہا ان کے نام بتاؤ۔ وہ نہ بتا سکے آدم نے ہر مسمّی کا نام بتا دیا۔ لہٰذا ملائکہ ہار گئے اور ان کا دعویٰ قابل سماعت نہ رہا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ نام کیا تھے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ جو کچھ چیزیں روئے زمین پر خدا نے خلق فرما دی تھیں ان کے نام تھے۔ تاکہ آدمؑ ان سے واقف ہو جائیں۔ لیکن یہ بات دل کو نہیں لگتی ابھی روئے زمین پر آئے نہیں چیزوں کو دیکھا نہیں سمجھا نہیں نام پہلے سے بتا دیئے گئے ہیں۔ پھر آدم نے بغیر دیکھے بھالے سمجھے بوجھے ان لاکھوں اور کروڑوں مسمیات کے نام بھی بتا دیئے گویا خدا نے ساری دنیا کو اٹھا کر آدمؑ کے سامنے رکھ دیا تھا، اور یہ ایک ایک کے نام بتلاتے جا رہے تھے۔ عقل میں آنے والی بات نہیں، علاوہ بریں اس قضیئے سے ملائکہ کا تعلق کیا۔ اور ان پر حجت تمام ہونے کی صورت کیا۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ (سورہ البقرہ ۲/۳۱) میں ھُم کی ضمیر ذوی العقول کے لئے ہے اینٹ پتھر مولی گاجر، دریا اور پہاڑ گائے بیل کے لئے اس کا استعمال کیونکر درست ہوگا اور ماننا پڑے گا کہ یہ اسما ضرور ذوی العقول ہستیوں کے تھے اور ان کا اس مقدمے سے کوئی تعلق بھی نہ تھا۔

ہمارے آئمہ نے اس عقدہ کو حل کر دیا ہے ۔ وہ اسمائے گرامی پنج تن پاک علیہم السلام کے تھے جو آدم کو بتائے گئے۔ اس کے بعد ان کے نورانی پیکروں کو سامنے کر کے پوچھا گیا۔ بتاؤ ان میں سے محمد کس کا نام ہے۔ اور علی کس کا ہے فاطمہ کس کا ہے اور حسن و حسین کس کا ہے۔ ملائکہ نے یہ نورانی پیکر زیرِ عرش تسبیح و تقدیس کرتے دیکھے تو تھے۔ لیکن ناموں سے مسمیات کو پیش کرنے کی غرض یہ تھی کہ اے ملائکہ تم نے آدم کے پیکر کو دیکھ کر نتائج نکالے ہیں وہ غلط ہیں یہ انوار مقدسہ بھی عالم ظہور میں اسی آدم کی اولاد سے ہوں گے ۔ چونکہ یہ سب معصوم ہیں ۔ لہذا نہ ان سے فساد کا اندیشہ ہے نہ خونریزی کا نیز یہ کہ یہ تسبیح و تقدیس میں تم سے بہت سابق ہیں کیونکہ یہ اوّل نور ہیں۔ تم نے تسبیح ان ہی سے سیکھی ہے۔ حضور سرور انبیاء نے فرمایا ہے۔ سَبَّحْنَا فَسَبَّحَتِ الْمَلَآئِكَةُ تَسْبِيْحِنَا (ہم نے تسبیح کی پس ملائکہ نے ہم سے تسبیح سیکھی ۔

اے میرے ملائکہ تم نے قوت شہوی اور غضبی کو دیکھ کر فساد اور خوں ریزی کا الزام آدم پر لگایا۔ لیکن یہ نہ سمجھے کہ ہم نے اس کو ان دونوں قوتوں پر قابو حاصل کرنے کے لیے قوت عاقلہ بھی تو دی ہے ۔ یہ ہی وہ قوت عاقلہ ہے جو سرچشمہ علم ہے اور علم ہی وہ قوت ہے جس سے انسان ہر بدی سے رُک سکے گا۔ اسی قوت عاقلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ جو تم نہ بتا سکے۔ وہ آدم نے بتا دیا انوار مقدسہ جب پیکر آدم میں داخل ہوں گے تو عصمت اس پر سایہ فگن ہو جائے گی ملائکہ حقیقت کو سمجھنے کے بعد خاموش ہو گئے۔

خدا نے ملائکہ سے یہ بھی فرمایا تھا کہ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (سورہ الحجر ۱۵/۲۹) جب میں آدم کے پیکر کو ٹھیک ٹھاک کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سجدہ میں گر پڑنا) اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کی اظہار عظمت کے لئے ملائکہ کو حکم دیا گیا تھا وہ روح نبوتی تھی نہ کہ پیکر بشری۔ اس سجدے سے شرک لازم نہیں آیا۔ کیونکہ یہ سجدہ تعظیمی تھا نہ کہ تعبدی۔ یہیں سے معلوم ہوا کہ ہر صاحب عظمت چیز کو سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تعظیمی سجدہ تھا جو جناب یوسف کے بھائیوں نے اور والدین نے ان کو کیا تھا۔ جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے ۔

شیطان نے اس سجدے سے انکار کر دیا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ وہ پکا موحد تھا کہ ہر قسم کی ذلت اپنے لئے گوارا کر لی ۔ مگر آدم کو سجدہ نہ کیا۔ یہ امر ہرگز بہ تقاضائے توحید پرستی نہ تھا۔ بلکہ بلحاظ کبر و نخوت اور غلط قیاس کی بناء پر تھا جیسا کہ اس کے قول سے ظاہر ہے۔ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (سورہ الاعراف ۷/۱۲) (تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے) صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنی افضلیت کے گھمنڈ میں سجدے سے انکار کر رہا تھا۔ سب سے پہلا قیاس کرنے والا ابلیس ہے۔ اس نے مٹی کو تو دیکھا۔ لیکن جو کمالات روحانی اس کے اندر تھے۔ ان پر اس کی نظر نہ گئی۔ خدا فرماتا ہے اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ (سورہ البقرہ ۲/۳۴) (اس نے انکار کیا اور تکبر کیا) یعنی یہ سجدہ نہ کرنا از روئے کبر تھا نہ کہ از روئے توحید پرستی وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (سورہ البقرہ ۲/۳۴) (اور وہ کافروں میں سے ہو گیا) اس سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے غلط قیاس کرنے والے۔ کرے

کام لینے والے خلیفہ خدا کی تعظیم سے انکار کرنے والے اور بھی بہت سے کافر ہوں گے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔
اس انکار پر خدا نے ان سے پوچھا اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ (سورہ صٓ ۳۸/۷۵) تونے تکبر کیا ہے یا تو عالین میں سے بن بیٹھا ہے) یہ عالین کون تھے۔ اس وقت لے دے کے تین گروہ تھے۔ ایک آدم۔ دوسرا شیطان تیسرے ملائکہ تو عالین سے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کی اور شیطان کی سطح تو اس وقت برابر تھی۔ دوسرے جب ملائکہ نے سجدہ کر دیا تو اب ان میں سے ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ماننا پڑے گا کہ یہ تیسرا گروہ کوئی اور تھا اور اس کا مرتبہ اور مقام ملائکہ سے بلند تھا
اب ایک حدیث رسول سنیئے۔ خُلِقْتُ اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ اٰدَمُ بِتِسْعَةِ الْاٰفِ عَامٍ (میں اور علیؑ ایک نور سے پیدا کئے گئے۔ خلقت آدم سے نو ہزار سال پہلے) اور یہ نو ہزار سال ہماری دنیا کے نہیں بلکہ عالم نور کے ہیں۔ جہاں کا ایک دن ہزار سال کا ہمارے حساب سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا۔ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (سورہ الحج ۴۷/۲۲) (تمہارے حساب سے ہزار برس) اب حساب لگائیے کہ نو ہزار سال کتنے ہوئے۔

صحابہ نے پوچھا۔ اَيْنَمَا كُنْتُمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ۔ (حضور آپ اس مدت میں کہاں رہے) فرمایا۔ كُنَّا اَشْبَاحًا مِّنْ نُوْرٍ تَحْتَ عَرْشِ اللّٰهِ نُسَبِّحُهٗ وَنُقَدِّسُهٗ۔ (ہم عرش الٰہی کے نیچے ایک نور کا پرتو تھے اس کی تسبیح کرتے اور تقدیس کرتے تھے) معلوم ہوا ان انوار مقدسہ کا مقام تحت عرش تھا اور یہ ظاہر ہے کہ عرش کا مقام سب سے بالاتر ہے۔ لہٰذا جو اس کے نیچے تسبیح و تقدیس کر رہے تھے وہی عالین تھے۔
جب خدا نے اس کی یہ سرکشی دیکھی تو فرمایا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (سورہ الاعراف ۷/۱۳) (نکل جا میرے جوار رحمت سے تو ذلیل لوگوں میں سے ہے) گستاخانہ کلام نہ خدا کی بارگاہ میں اچھا نہ رسول کے دربار میں۔ مرض الموت میں جب رسولؐ کے سامنے لوگوں نے شور و غل مچایا تو حضورؐ نے فرمایا قُوْمُوْا عَنِّیْ لَا يَنْبَغِیْ عِنْدِیَ التَّنَازُعُ (ہٹ جاؤ میرے سامنے سے میرے پاس جھگڑا کرنا سزاوار نہیں)
جب شیطان مردود بارگاہ باری قرار پایا تو اس نے کہا میں نے جو تیری سالہا سال عبادت کی ہے اس کا صلہ تو مجھے دے۔ خدا نے فرمایا مانگ لے۔ اس نے کہا اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (مجھے قیامت تک کی مہلت دے) خدا نے فرمایا تجھے مہلت تو دی جاتی ہے مگر اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (سورہ الحجر ۱۵/۳۸) (ایک خاص وقت تک) قیامت تک کی مہلت اس لئے نہیں دی گئی کہ اسے حضرت حجت کے ہاتھ سے قتل ہونا تھا۔ دوسرے حضرت کے عہد میں اغوا شیطانی کا ختم ہو جانا لازم تھا۔ تاکہ شرق سے غرب تک ایک دین اسلام ہو۔ اور دنیا عدل و داد سے اسی طرح بھر جائے جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔ اگر شیطان قیامت تک زندہ رہتا تو آنحضرتؐ کی یہ پیشین گوئی پوری نہ ہوتی اور اس آیت کا مطلب نہ کھلتا۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (سورہ التوبہ ۹/۳۳) تاکہ دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب

کردے۔

جب شیطان کو معلوم ہوگیا کہ وقت معلوم تک موت اس سے ہٹ گئی تو اب اس نے کہنا شروع کیا۔ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِي لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (سورہ الاعراف ۱۶/۱۷) (تو نے مجھے گمراہی میں چھوڑا ہی ہے میں بھی تیرے بندوں کو صراط مستقیم پر دھرنا دے کر بیٹھوں گا اور ان کے پاس سامنے سے پیچھے سے داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے آؤں گا۔ اور تو ان میں سے اکثر کو ناشکرا پائے گا۔)

اس کے بعد کچھ سوچ سمجھ کر یہ بھی کہہ دیا وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (سورہ الحجر ۴۰ و ۱۵/۳۹) (میں سب کو بہکاؤں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے) اس سے معلوم ہوا کہ شیطان خدا کے مخلص بندوں کو جانتا تھا۔ اور ان کی خصوصیات کو پہچانتا تھا۔ ورنہ بے ان کے دیکھے اور ان کو سمجھے بوجھے بغیر اس نے ان کا استثناء کر کیسے دیا ضرور یہ مخلص بندے اس کے پیش نظر ہوں گے۔ اور یہ نہیں ہو سکتے۔ سوائے ان کے جن کو خدا نے عالین کہا تھا۔ یہ کھلی دلیل ہے۔ عصمت انبیاء علیہم السلام کی جس کا اقرار خود انسان کے سب سے پکے دشمن نے کیا ہے۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَآءُ (بزرگی وہی ہے جس کی گواہی دشمن دے)

یہ تو دشمن کا بیان تھا اب خدا کا بیان ان کے متعلق سن لو۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (سورہ بنی اسرائیل ۱۷/۶۵) میرے خاص بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہ ہوگا۔ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لوگوں نے شیطان کی پیروی کی سوائے ایک گروہ کے جو ایمان لانے والوں میں سے تھا۔

سورہ کہف میں ہے اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا (سورہ الکہف ۵۰)

(کیا انہوں نے مجھے چھوڑ کر شیطان اور اس کی ذرّیت کو اپنا ولی بنا لیا ہے حالانکہ وہ ان کے دشمن ہیں اور ظالموں کے لئے بہت بڑا بدلا ہے۔ میں نے شیطان اور اس کی ذرّیت کو آسمان و زمین کی پیدائش پر گواہ نہیں بنایا اور نہ ان کے نفسوں کی پیدائش کا اور میں گمراہوں سے مدد لینے والا نہیں ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ کچھ ایسی ہستیاں ہیں جن کو خدا نے آسمان و زمین کی خلقت اور لوگوں کی پیدائش پر گواہ بنایا ہے اور وہ وہی ہو سکتے ہیں۔ جن کی خلقت سب سے پہلے ہوئی۔ اور جن کے لیے کہا گیا کہ اے رسول! اگر میں تجھے پیدا نہ کرتا تو

آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اصول دین پانچ ہیں۔ شیطان ان میں سے تین کا ماننے والا ضرور تھا۔ خدا کی توحید کا بھی اسے اقرار تھا۔ قیامت کو بھی مانتا تھا۔ ورنہ یہ نہ کہتا اَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ (سورہ الاعراف ۱۴/۷) مجھے قیامت تک کی مہلت دے) اور نبوت کا بھی قائل تھا۔ ورنہ یہ نہ کہتا کہ میں سب کو بہکاؤں گا۔ مگر تیرے مخلص بندوں کو۔ یہ مخلص بندے سوائے انبیاء کے اور کون ہو سکتے ہیں۔

البتہ دو باتوں کا قائل نہ تھا۔ ایک تو عدل کا کیونکہ خدا نے اس کے عقیدے کی رو سے مفضول کو فاضل پر یعنی مٹی والے کو آگ والے پر ترجیح دی تھی۔ دوسرے خلافت نصی کا قائل نہ تھا ورنہ اور ملائکہ کی طرح وہ بھی سجدہ کر لیتا۔ ان ہی دو کی انکار کی وجہ سے وہ راندہ درگاہ باری ہوگیا۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خدا نے شیطان کو شیطان پیدا نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ اپنے عمل سے شیطان بن گیا۔ جب تک اچھے کام کئے صفوف ملائکہ میں شامل رہا۔ لیکن جب نافرمانی پر کمر باندھی تو راندہ درگاہ ہوگیا۔

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں ؎
اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

اس سے معلوم ہوا کہ جب تک انجام بخیر نہ ہو پہلے افعال و اعمال قابل تعریف نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے بہت سے اچھے کام کئے ہوں لیکن آخر میں وہ ایسے افعال کا مرتکب ہوگیا ہو جو پسندیدہ خدا نہیں۔ تو پچھلا کارنامہ اس کے ایمان کی دلیل نہ ہوگا۔

تکبر کے علاوہ شیطان حسد کا بیمار بھی تھا۔ اور یہ بیماری بھی سب سے پہلے اسی میں پیدا ہوئی۔ اخلاقی رذائل میں اس سے بدتر کوئی رذیلت نہیں۔ سب کا علاج ممکن ہے مگر اس کا علاج حد امکان سے باہر ہے اسی لئے خدا نے اس بیماری سے پناہ مانگنے کی خاص طور پر ہدایت فرمائی ہے وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (سورہ الفلق ۵/۱۱۳) یہ بیماری جس کو لگی پھر زندگی بھر اس سے رہائی ممکن نہیں۔ ؎

حاسد کو ایک دم نہیں راحت جہاں میں
رنج حسد ہے جان ہے جب تک کہ جان ہیں

جب سے شیطان راندہ درگاہ ہوا انسان کے پیچھے لگ گیا۔ آدم علیہ السلام زمین پر آئے تو وہ بھی آیا اور ان کو صدمہ پہنچانے کا موقع ڈھونڈنے لگا۔

ہابیل و قابیل دو بھائی آدم کی اولاد تھے۔ ہابیل ایک نکوکار انسان تھے اور قابیل غنڈہ قسم کا آدمی۔ جناب آدم علیہ السلام کو ہابیل سے بڑی محبت تھی۔ وہ اسی کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ شیطان تو تاک میں تھا ہی اسے حسد کی آگ

قابیل کے دل میں بھڑکانے کا موقعہ مل گیا۔ بھائیوں میں چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی۔ آدم علیہ السلام نے کہا تم دونوں اپنی اپنی قربانی بارگاہ باری میں پیش کرو جس کی قبول ہو جائے گی وہی میرا جانشین ہوگا۔ دونوں راضی ہو گئے۔ قابیل کے پاس بہت سی بھیڑ بکریاں تھیں۔ لہٰذا اس نے بڑا موٹا تازہ دُنبہ پہاڑ پر جاکر باندھا کہ یہ تو ضرور خدا کو پسند آئے گا۔ ہابیل غریب کھیتی باڑی کرتے تھے انہوں نے گیہوں کی تھوڑی سی بالیں لارکھیں۔ بجلی گری اور ہابیل کی بالوں کو جلاتی ہوئی نکل گئی۔ نذر قبول کا شور مچ گیا۔ خلوص سے جو کام کیا جاتا ہے وہ ضرور بارگاہِ باری میں قبول ہوتا ہے لوگوں نے لنگر خانے کھولے کچھ نہ ہوا۔ علیؑ نے پانچ روٹیاں خیرات کر دیں تو پورا سورۂ دہر اپنی تعریف میں نازل کرالیا۔ رکوع میں ایک انگوٹھی دے دی تو ولایت کی سند لے لی۔

قابیل کو چونکہ اس موقعہ پر ذلت نصیب ہوئی تھی لہٰذا اس نے ارادہ کر لیا کہ ہابیل کا قصہ ہی ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہیے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اس نے غصے میں بھر کر واشگاف لفظوں میں اپنے بھائی سے کہہ دیا کہ میں ضرور تم کو قتل کر ڈالوں گا۔ اس نیک نفس اور پاکیزہ خصلت بزرگ نے کہا بھائی اس میں میرا کیا قصور ہے خدا تو متقیوں کی نذر قبول کرتا ہے۔ اگر تم میرے قتل کے لئے ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں ہرگز تمہارے قتل کرنے کو اپنا ہاتھ نہ بڑھاؤں گا کیونکہ میں تو رب العالمین خدا سے ڈرتا ہوں، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تیرے گناہوں کے ساتھ اپنے گناہ بھی تجھ پر لاد دوں تاکہ تو پکا پاپی بن کر دوزخ کا ایندھن بن جائے کیونکہ ظالموں کی سزا یہی ہے۔

سمجھانا تو بہت بڑی بات تھی مگر قابیل کے سر پر تو شیطان سوار تھا وہ کیا غور کرتا اسے تو یہ دُھن لگی تھی کہ کسی طرح بے گناہ بھائی کا خون بہادے۔ موقع مل گیا ایک جگہ تنہا پاکر ایک بڑا سا پتھر کھینچ مارا۔ اور ظالم نے بھائی کی جان لے لی۔

اب یہ فکر ہوئی کہ اس لاش کو کس طرح چھپائے۔ ابھی تک کوئی مُردہ زمین میں دبا ہی نہ تھا۔ خدا کو منظور نہ ہوا کہ اس کے نبی کا بیٹا اس کا نیک بندہ بے دفن کے رہ جائے۔ لہٰذا اس نے کوّے کو بھیجا جس نے زمین اپنی چونچ اور پنجوں سے کھود کر ایک مرے ہوئے کوّے کا بدن اس میں چھپا دیا۔ یہ دیکھا تو قابیل نے کفِ افسوس مل کر کہا:

آہ میں اس کوّے سے بھی کم درجہ کا ہوں۔ میں اپنے بھائی کو دفن بھی نہ کرسکا۔ ندامت کا پسینہ اس کے ماتھے سے ٹپکنے لگا۔

اس واقعہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ میت کا زمین میں دبانا پسند ہے نہ کہ آگ میں جلانا دوسرے خدا نے یہ پسند نہ کیا کہ ایک نبی زادہ بے گور و کفن رہے۔ لیکن آہ کربلا میں پیغمبر آخر الزمان کا بیٹا علیؑ و فاطمہؑ کا بیٹا کیسا مظلوم تھا کہ تین دن تک اس کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔ آہ عاقبت برباد، شقاوت کرداروں، خدا و رسولؐ کے دشمنوں کے نجس لاشے تو دفن ہوں، اور شہدائے راہ خدا مقربان ایزدی کے لاشے یوں

ہی زمین کربلا پر پڑے رہیں۔
کون سا ظلم تھا جو کربلا میں اولاد رسول پر نہ کیا گیا۔ امام مظلوم کی شہادت کے بعد عمر سعد نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ ابھی ہتھیار نہ کھولنا۔ گھوڑوں پر سے نہ اُترنا۔ ابھی بحکم ابن زیاد حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کے لاشوں کو پامال سم اسپاں کرنا ہے، یہ خبر سنتے ہی کچھ لوگ حُر کے رشتہ داروں میں سے عمر سعد کے پاس پہنچے، اور کہنے لگے کہ اے امیر ہم نے تیرے حکم سے اپنے عزیز خاص حُر کو قتل کیا۔ لیکن اب ہم اس کی لاش کو پامال نہ ہونے دیں گے۔ اس میں ہماری اور ہمارے قبیلے کی بدنامی ہے۔ اس شقی نے کہا اچھا حُر کی لاش علیحدہ کر لی جائے۔ پھر بنی اسد والے آئے انہوں نے حبیب کی لاش کے لئے کہا۔ حکم ہوا کہ اسے بھی علیحدہ کر لو۔ اسی طرح ہر قبیلے کے لوگ عمر سعد کے پاس جا جا کر اپنے عزیز کی لاش کو بچانے کا حکم لیتے رہے۔ یہاں تک کہ شمر نے کہا۔ اے امیر عباس اور ان کے بھائی میرے قبیلے کی لڑکی کی اولاد ہیں میں نہیں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کی لاشیں پامال ہوں۔ پسر سعد نے کہا ان کی لاشیں علیحدہ کر لے۔ لیکن آہ! میرے مظلوم آقا کی لاش کو بچانے کے لئے کوئی نہ آیا۔

فضہ در خیمہ پر کھڑی تھیں۔ ایک سپاہی سے یہ تذکرہ سُنا تو روتی پیٹتی خیمہ میں آئیں اور جناب زینبؑ سے عرض کرنے لگیں۔ کہ عنقریب شہیدوں کے لاشے پامال ہوا چاہتے ہیں آہ! میرے حسین کی لاش کا بچانے والا کوئی نہیں۔ شہزادی اجازت دو کہ میں لاش سے جا کر لپٹ جاؤں۔ گھوڑوں کی ٹاپیں مجھے کچل دیں۔ مگر میرے حسین پر آنچ نہ آئے۔

جناب زینبؑ یہ سُن کر تڑپ گئیں۔ فرمانے لگیں۔ فضہ میں نے بھائی سے سُنا تھا کہ اس جنگل میں ایک شیر رہتا ہے۔ اگر کوئی مصیبت پڑے تو اسے یا ابا الحارث کہہ کر پکارنا لہذا تم خیمہ سے باہر جا کر آواز دو۔ فضہ سر و پا برہنہ خیمہ سے نکلیں اور آواز دی یا ابا الحارث کیا چین سے بیٹھا ہے۔ فرزند رسولؐ کی لاش پامال ہوا چاہتی ہے۔ یہ صدا سنتے ہی ایک شیر دہاڑتا ہوا نہایت تیزی کے ساتھ مقتل شہدا میں آیا۔ اور ایک ایک لاش کو سونگھنے لگا۔ اسے لاش امام کا پتہ چل گیا۔ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ جب فوج یزید نے دیکھا تو اس پر حملہ کرنا چاہا مگر جب وہ غیظ میں دہاڑا اور ان ظالموں پر جھپٹا تو وہ روباصفت بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن آہ! مظلوم امام علیہ السلام کی لاش پامالی سے نہ بچ سکی شیر کے جانے کے بعد اس پر گھوڑے دوڑائے گئے۔

لاشوں کی پامالی کے بعد پسر سعد نے حکم دیا کہ خیام حسینی میں گھس جاؤ اور جو کچھ سامان ہو اسے لوٹ لو۔ یہ سنتے ہی وہ بے حیا خیموں کی طرف بڑھے اور بے محابا اندر گھس کر لوٹنا شروع کیا، یہاں تک کہ کسی بی بی کے سر پہ چادر

کرنے کی آرزومند تھی مگر یہ بچارہا لیکن اگر میری یہ خواہش پوری نہ کرے گا تو ضرور قید کیا جائے گا۔
غور کیجئے حضرت یوسف کے لئے کتنا نازک موقعہ تھا۔ بڑے سے بڑے پرہیزگار آدمی سے بھی ایسے موقع پر ضبط کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہوتا ہے مگر یہ نفوس انبیاء علیہم السلام ہیں۔ جن کو اپنے جذبات پر پورا پورا کنٹرول ہوتا ہے وہ کسی حالت میں بھی گناہ کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ اسی کا نام عصمت ہے۔ حضرت یوسف نے فرمایا اے میرے پالنے والے جس امر کی یہ عورتیں مجھ سے خواہش رکھتی ہیں اس کی نسبت مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے۔ یہ بھی ایک نبی یا ولی ہی کا ظرف ہوسکتا ہے۔ بہرحال حضرت یوسف کو قید خانہ میں بھیج دیا گیا۔ دو قیدی اور بھی آپ کے ساتھ جیل میں داخل ہوئے۔ یہ دونوں شاہی ملازم تھے۔ ایک شراب پلاتا تھا دوسرا خانسامہ تھا۔ ان میں سے ایک نے تو یہ خواب دیکھا کہ میں شراب بنانے کے واسطے انگور نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے دیکھا کہ سر پر روٹیاں اُٹھائے ہوئے ہے اور چڑیاں اس میں سے کھا رہی ہیں۔ دونوں نے حضرت یوسف سے تعبیر پوچھی۔ وہ دونوں کافر تھے۔ آپ نے نصیحت کا موقع سمجھا۔ فرمایا تم دونوں اس پر غور کرو کہ بھلا جُدا جُدا معبود اچھے یا خدائے یکتا اور زبردست۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر بس ان چند ناموں ہی کی پرستش کرتے ہو جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑا ہے خدا نے تو ان میں کوئی قوت نہیں دی۔ حکومت تو بس خدا ہی کے لیے ہے۔ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سچا دین ہے۔

اچھا اب اپنی خواب کی تعبیر سنو۔ تم میں سے ایک تو بادشاہ کو شراب پلانے کا کام کرے گا اور دوسرا جس نے روٹیاں دیکھی ہیں سولی پر چڑھایا جائے گا اور جانور اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ یہ ہو کر ہی رہے گا اور جو نجات پانے والا تھا اس سے کہا کہ جب تم بادشاہ کی خدمت پر مامور ہو تو میرا ذکر بھی کر دینا کہ ایک بے گناہ قید خانہ میں ہے اس کو رہا ہونے کے بعد یاد نہ رہا ہو اور حضرت یوسف چند سال قید ہی رہے۔
ایک روز بادشاہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں ان کو سات دُبلی پتلی گائیں کھائے جا رہی ہیں اور سات تازی سبز بالیاں دیکھیں اور پھر سات سوکھی بالیاں۔ اہلِ دربار سے کہا کہ تم اس کی تعبیر بتاؤ۔ انہوں نے کہا یہ تو خواب ہائے پریشان ہیں ان کی تعبیر ہی کیا۔ اب اس آدمی کو جو قید خانہ سے رہا ہوا تھا حضرت یوسف یاد آئے۔ اس نے کہا مجھے قید خانے جانے دیجئے۔ میں اس کی تعبیر معلوم کر کے آتا ہوں۔ چنانچہ وہ گیا اور بادشاہ کا یہ خواب حضرت یوسف سے بیان کیا۔ فرمایا تعبیر یہ ہے کہ تم لوگ سات سال متواتر کاشتکاری کرتے رہو گے۔ تو جو فصل تم کاٹو۔ اس کے دانوں کو بالیوں ہی میں رہنے دینا (چھڑانا نہیں) مگر تھوڑا سا قوت لایموت ہو اس کے بعد سات سال قحط کے آئیں گے۔ ان سالوں میں جو ذخیرہ جمع کیا ہوگا وہ کھا جاؤ گے مگر قدرے قلیل بیج کے لئے بچا سکو گے۔ پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں کے لئے خوب مینہ برسے گا۔ اور انگور خوب پھیلے

گا۔ اور لوگ انہیں شراب کے لیے نچوڑیں گے۔

بادشاہ نے یہ تعبیر سنی تو کہا کہ اس قیدی کو یہاں لے آؤ۔ حضرت یوسف نے آنے والے سے کہا تو جاکر بادشاہ سے کہو کہ آپ کو کچھ ان عورتوں کا حال بھی معلوم ہے جنہوں نے مجھے دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے اور یہ معلوم کیجئے کہ میں ان کا طالب تھا یا وہ میری۔ اس میں شک نہیں میرا پروردگار ان کے مکروں سے خوب واقف ہے۔

جب سرکاری چپڑاسی نے جاکر کہا تو بادشاہ نے ان عورتوں کو بلایا اور مفصل حال پوچھا۔ انہوں نے کہا حاشا اللہ ہم نے یوسف میں کسی طرح کی کوئی برائی نہیں دیکھی۔

تب زلیخا بول اٹھی۔ اب تو بات کھل گئی اور اصل حال سب پر ظاہر ہو گیا۔ لہذا میں اب کیوں چھپاؤں۔ بات یہ ہے میں نے خود اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی اس سے تمنا کی تھی۔ بے شک وہ سچا ہے۔ یہ واقعہ شاہی چوبدار نے حضرت یوسف سے جاکر بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا یہ قصہ میں نے اس لیے چھیڑا تاکہ تمہارے بادشاہ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے عزیز کی غیبت میں اس کی امانت میں خیانت نہیں کی۔ خدا خیانت کرنے والوں کی مکاری کو ہرگز نہیں چلنے دیتا۔ یوں تو میں بھی اپنے نفس کو گناہ سے بے لوث نہیں کہتا ہوں کیونکہ میں بھی بشر ہوں اور نفس برابر برائی کی طرف ابھارتا ہی رہتا ہے مگر میرا پروردگار جس کو چاہتا ہے گناہ سے بچا لیتا ہے۔

جب بادشاہ کو یہ پتہ چل گیا کہ یوسف بڑا پاکیزہ نفس اور فرشتہ خصلت انسان ہے تو اس نے حکم دیا کہ ان کو قید خانہ سے نکال لاؤ۔ میں ان کو اپنے ذاتی کام کے لئے خاص کر لوں گا۔ جب حضرت یوسف آئے تو اس نے کہا آج سے تم معتمد خاص ہو۔ جو کام کہو تمہارے سپرد کر دوں۔ انہوں نے فرمایا مجھے ملکی خزانوں پر مقرر فرمائیے میں اس کا امانتدار خزانچی بنوں گا۔ چنانچہ یہ عہدہ آپ کے سپرد کر دیا گیا۔

اس طرح خداوند عالم نے یوسف کو مصر کا حاکم بنایا۔ اس واقعہ سے یہ پتہ چلا کہ خداوند عالم کی طرف سے جو لوگوں پر حاکم بنایا جاتا ہے ایک تو وہ متقی و پرہیزگار ہو دوسرے ملکی خزانوں کو نہایت احتیاط سے صرف کرنے والا ہو۔ نہ تو اس میں خیانت کرے اور نہ کسی کے حق کو روکے۔ نہ اپنی ذاتی خواہشوں کو صرف میں لائے۔ نہ اسراف کو راہ دے۔ خدا کی مخلوق کو اپنے نفس پر ترجیح دے۔ چنانچہ جناب یوسف جس زمانہ میں بادشاہ تھے خود معمولی غذا کھاتے بلکہ اکثر اوقات فاقے کرتے تھے۔ اسی کا نام سیاست الٰہیہ اور سیاست نبویہ ہے۔ جن انبیاء کو خدا نے حکومت دی انہوں نے ان تمام باتوں کو پوری طرح مدنظر رکھا۔

حضورؐ سرور انبیاء جس سیاست کو چلانا چاہتے تھے وہ یہی سیاست تھی۔

آپ کے بعد جب امیر المومنین علیہ السلام نے زمام خلافت اپنے ہاتھ میں لی تو آپ نے خدائی قوانین کی پوری طرح پر نگہداشت کی۔ ابنائے روزگار نے جو طرز جہانبانی اختیار کیا تھا آپ نے اس کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا۔

آپ جب اسلامی خزانوں کے مالک ہوئے تو آپ کو یہ فکر لاحق ہوئی ہی نہیں کہ اپنے لیے کوئی عالیشان قصر تعمیر کرا لوں۔ امیرانہ اور ملوکانہ ٹھاٹھ کے ساتھ زندگی بسر کروں۔ جاگیر و املاک کا مالک بن جاؤں۔ بلکہ فدک کو جو آپ کا جائز حق تھا۔ اور حکومت اولیٰ میں اس سے محروم ہو گئے تھے۔ اپنے زمانہ خلافت میں اس کو بھی واپس نہ لیا تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ خلیفہ بن کر علیؑ نے اپنی مالی حالت کو درست کر لیا۔

سلطنت اسلامی کی عنان حکومت ہاتھ میں تھی۔ مگر غذا میں وہی جو کی روٹی اور نمک کا پانی۔ لباس وہی پیوند دار اور گھٹیا کپڑے کا۔ سردی کا موسم ہے اور ایک میلی سی چادر اوڑھے کپکپا رہے ہیں کسی نے کہا آپ تو بادشاہِ وقت ہیں اپنے لیے کوئی اچھا سامان زندگی کیوں نہیں کرتے۔ فرمایا بیت المال میرا نہیں ہے۔ تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ واللہ یہ کھیس بھی میں مدینہ سے اپنے ساتھ لایا ہوں اور یہی لے کر واپس جاؤں گا۔ مجھے تمہارے مال کی خواہش نہیں۔

امیر المومنینؑ کا معمول تھا کہ ہر روز رات کو بیت المال میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے اور فرماتے تھے۔ یَاصَفْرَاءُ یَاغَبْرَاءُ غُرِّیْ غَیْرِیْ اے سونے چاندی! میرے سوا کسی اور کو دھوکا دینا۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ جب تک بیت المال میں آئی ہو رقم کو تقسیم نہ کر دیتے۔ رات بھر بے چین رہتے۔ بیت المال سے جو اپنا حق لیتے وہ سب کا سب فقراء و مساکین پر تقسیم کر دیتے۔ معاویہ نے ایک بار کہا۔ علی جیسا سخی مسلمانوں میں کوئی نہیں ہے۔ لَوْکَانَ لِعَلِیِّ بَیْتَیْنِ مِنْ تِبْنٍ وَّتِبْن لَّخَتَمَ التِّبْن قَبْلَ تِبْنٍ (یعنی اگر علیؑ کے پاس دو گھر سونے کے ہوں اور بھس کے ہوں تو بھس ختم ہونے سے پہلے سونا ختم ہو جائے گا۔) ایک بار کسی جنگ میں کچھ قیدی امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے پیش ہوئے۔ جن میں کچھ عورتیں تھیں اور کچھ بچے۔ سب کا حال تباہ تھا۔ انہوں نے فریاد کی کہ امیر المومنین آپ کی فوج نے ہمیں بہت ستایا ہے۔ ہمیں فاقہ سے رکھا ہے۔ پیدل چلایا ہے۔ آپ ان کی فریاد سن کر رونے لگے۔ قنبر سے فرمایا ان کے لئے لباس اور غذا مہیا کرو اور جو لوگ ان کو گرفتار کر کے لائے تھے۔ ان سے فرمایا ان کو چھوڑ دو۔ ان کے لیے یہی کافی ہے۔ کہ ان کے عزیز قتل ہوئے ہیں۔ یہ اپنے گھروں سے جُدا ہو کر عالم غربت میں آئے ہیں۔ رسول اللہؐ نے عورتوں اور بچوں پر ظلم کرنے سے منع فرمایا ہے۔

افسوس جو بنی نوع انسان پر ایسا شفیق ہو جو مسکینوں اور یتیموں کے حال پر انتہا درجہ شفیق ہو کیا اسی کی اولاد کے ساتھ مسلمانوں کو یہ سلوک کرنا روا تھا کہ ان بے کس و بے بس بی بیوں کو جن کے سروں سے وارثوں کے سائے اُٹھ گئے تھے۔ بندیاں ترک و دیلم کی طرح قید کر کے سر برہنہ بے مقنعہ و چادر اسی کوفہ میں تشہیر کریں جہاں چند سال پہلے وہ شہزادیاں تھیں۔

ابن طریح اور ابن طاؤس نے اپنی اپنی مقاتل میں لکھا ہے کہ جب اہل حرم کو اچھی طرح تشہیر کر چکے تو اس

خیال سے کہ جناب زینبؑ و اُم کلثوم اور سید سجاد کی پُر اثر تقریروں سے پبلک کوئی ہنگامہ برپا نہ کردے۔ اس نے منادی کرادی کہ تمام اعیانِ شہر مسجد کوفہ میں جمع ہوں۔ جب مسجد کھچا کھچ مجمع سے بھر گئی تو وہ شقی منبر پر گیا اور کہا ایہا الناس ایک کذاب ابن کذاب نے امیر المومنین یزید پر خروج کیا تھا۔ ہم نے خدا کے فضل و کرم سے اس کو اور اس کے تمام انصار کو قتل کرکے نمایاں فتح حاصل کی اور اس کے خاندان کی عورتوں کو قید کرکے لائے ہیں تاکہ مخالفین یزید کو عبرت حاصل ہو۔

اس جلسے میں عبداللہ بن عفیف بھی تھے۔ جو امیر المومنین علیہ السلام کے خاص صحابی تھے۔ عرب کے مشہور بہادر تھے جمل و صفین کے معرکوں میں کارہائے نمایاں کئے تھے۔ ایک آنکھ ان کی تیر لگنے سے جمل میں جاتی رہی تھی۔ اور دوسری صفین میں۔ انہوں نے یہ گستاخانہ کلمات ابن زیاد کی زبان سے سُنے تو غصے میں تھر تھر کانپنے لگے۔ کھڑے ہوکر فرمایا او ولد الزنا خاموش ہو جا۔ تیری یہ جرأت کہ رسول کے نواسے کو کذاب ابن کذاب کہہ رہا ہے اپنا عصا اُٹھا کر چاہتے تھے کہ اس شقی کے سر پر ماریں کہ اس نے شور مچایا۔ اس اندھے بے وقوف کو گرفتار کرلو اور قتل کرڈالو۔ اس کے غلام ٹوٹ پڑے۔ عبداللہ بن عفیف کے قبیلے کے لوگ بھی موجود تھے۔ وہ تلواریں سونت کر کھڑے ہوگئے۔ اور کہا کسی کی کیا مجال ہے کہ ہمارے سردار کو ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھ سکے۔ ابھی مسجد میں خون کے دریا بہہ جائیں گے۔ ابن زیاد خائف ہوا اور وہ لوگ عبداللہ کو صحیح سالم نکال لائے۔

دوسرے دن ابن زیاد نے اپنی فوج کا ایک دستہ عبداللہ کی گرفتاری کو بھیجا۔ جب انہوں نے فوج کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنی تو اپنی لڑکی سے جس کی ماں بھی مرچکی تھی فرمایا بیٹی میری تلوار مجھے دے جس وقت یہ لوگ گھر میں گھس آئیں مجھے بتاتی رہنا کہ کدھر سے حملہ کررہے ہیں۔ چنانچہ وہ گھر کے اندر داخل ہوئے تو لڑکی نے بتایا بابا اب داہنی طرف سے حملہ ہونے والا ہے۔ عبداللہ نے تلوار لے کر ان پر حملہ کیا اور بہت سوں کو مار گرایا پھر بائیں طرف سے حملہ کرکے دشمنوں کو مار گرایا آخر کہاں تک لڑتے۔ اشقیا نے عبداللہ کو چاروں طرف سے گھیر کر وار پر وار کرنے شروع کئے یہاں تک کہ ان کے ٹکڑے کردیئے گئے اور ان کی لڑکی کو قید کرکے لے گئے۔

ادھر تو یہ ہنگامہ تھا اور ادھر اہل بیت کا قافلہ باب الساعات کے قریب پہنچ گیا تھا۔ جہاں جناب مسلم کا سر لٹکا ہوا تھا جناب مسلم کی بیٹی نے یکایک رو رو کر کہنا شروع کیا۔ اماں جان مجھے اپنے بابا جان کی بو آرہی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ میرے بابا جان کہیں میرے قریب ہیں۔ ماں نے کہا بیٹی تیرے باپ یہاں کہاں ان کو تو ظالموں نے اسی شہر میں ۹ ذی الحجہ کو شہید کردیا تھا۔ بے کس بی بیوں کو کیا خبر کہ مسلم کا سر دروازہ پر لٹکا ہوا ہے آگے آگے سر جا رہے ہیں خلقت کا ہجوم تھا۔ بی بیوں کے اونٹ پیچھے تھے۔ ناگاہ مجمع میں ایک شور مچا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ باب الساعات پر وہ نیزہ جس پر سر حسینؑ تھا خولی کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین میں گڑ گیا ہے اور اس سر سے جو باب الساعات پر لٹکا ہوا ہے کچھ باتیں کررہا ہے۔ دونوں سروں کے ہونٹوں

کو حرکت ہے۔ پبلک سکتہ کے عالم میں ہے۔

عزادارو! امام علیہ السلام جناب مسلم سے کہہ رہے ہوں گے۔ بھائی مسلم تم نے حق رفاقت ادا کیا آہ ظالموں نے تم کو اور تمہارے چھوٹے بچوں کو شہید کیا۔ بھائی مسلم میں تم سے کیا داستانِ غم بیان کروں۔ ہمارا سارا گھر کربلا میں تباہ ہوگیا۔ مردوں میں سوائے علی بن الحسین کوئی نہیں بچا۔ ظالموں نے ہمارے سروں کو نیزوں پہ چڑھایا۔ ہماری عورتوں کو قید کیا۔ پیچھے اونٹوں پر زینبؑ و ام کلثوم اور خاندان کی ساری بی بیاں سر کھلے آرہی ہیں۔ تمہاری بی بی اور بچی بھی ساتھ ہے جب سر حسین تادیر نہ چلا تو شمر نے امام زین العابدین سے کہا کہ اپنے باپ سے کہو کہ جلد چلیں۔ دربار میں جانے کا وقت آگیا ہے۔ بیمار کربلا کو اونٹ سے اتارا گیا۔ آپ نے قریب آکر کہا۔ آپ جلد چلیئے ورنہ شمر مجھ کو اذیت دے گا۔ سر حسین آگے بڑھا۔ تو سیدانیوں کے اونٹ قریب سر مسلم کے آئے۔ کہرام بپا ہوگیا۔ وا مسلماہ! وا مسلماہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ جناب مسلم کی بچی نے ہاتھ پھیلا دیئے۔ بابا میرے پاس بلا لیجئے۔ ابھی بچی اپنے باپ سے دکھ بھری کہانی کہہ بھی نہ پائی تھی کہ ظالموں نے اونٹوں کو آگے بڑھا دیا۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

چھبیسویں مجلس

بقیہ قصہ حضرت یوسف مع فضائل و مصائب

اور

اہلبیت اہلحرم کا دربار ابن زیاد میں داخلہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیۡ کِتَابِہٖ الۡمَجِیۡدِ وَفُرۡقَانِہٖ الۡحَمِیۡدِ

وَجَآءَ اِخۡوَۃُ یُوۡسُفَ فَدَخَلُوۡا عَلَیۡہِ فَعَرَفَہُمۡ وَہُمۡ لَہٗ مُنۡکِرُوۡنَ

(سورہ یوسف ۵۸/۱۲)

یوسف کے بھائی گھر آئے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یوسف نے تو ان کو پہچان لیا۔ مگر وہ نہ پہچان سکے۔

جس زمانے میں حضرت یوسف بادشاہ تھے اور مصر میں قحط پڑا ہوا تھا۔ کنعان میں بھی غلہ کی کمی تھی۔ حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو غلہ لینے کے لئے مصر کو بھیجا۔ انہوں نے مصر پہنچ کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے اور غلہ کی منظوری حاصل کرنے کی درخواست پیش کی۔ حضرت یوسف نے ان کو بلالیا اور ان کے حالات دریافت کیے وہ تو اپنے ان بھائیوں کو پہچان گئے مگر بھائی نہ پہچانے۔

یاد رکھیئے۔ انبیاء و اوصیائے انبیاء کے یہ بھی خصائص میں سے ہے کہ جب وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ان کو پہچان لے تب تو

لوگ پہچان سکتے ہیں اور جب نہیں چاہتے تو نہیں پہچانتے۔

بارہویں امام علیہ السلام برابر زیارت امام حسینؑ اور جناب عباسؑ اور امیر المومنینؑ وغیرہ کے لیے ہر شب جمعہ میں تشریف لاتے ہیں مگر چونکہ وہ اپنے کو پہچنوانا نہیں چاہتے لہذا کوئی ان کو نہیں پہچانتا۔ اور جب چاہتے ہیں تو لوگ پہچان لیتے ہیں۔

حضرت یوسف نے غلہ دینا منظور کر لیا۔ جب انہوں نے غلہ کو بار کر لیا تو حضرت یوسف نے کہا۔ اب کی بار جب آنا تو اپنے سوتیلے بھائی کو بھی ساتھ لیتے آنا تاکہ اس حصے کا غلہ بھی میں تم کو دے دوں۔ اور اگر کے کر نہ آئے تو پھر نہ میرے پاس تمہارے نام کا غلہ ہوگا اور نہ میں تم کو اپنے پاس بلا کر بٹھاؤں گا۔ انہوں نے کہا ہم جا کر والد سے اس کے بارے میں کہیں گے۔ حضرت یوسف نے نوکروں سے کہا جو رقم غلہ کی قیمت میں ان سے لی ہے وہ کسی کپڑے میں لپیٹ کر ان کے غلہ کے اندر رکھ دو تاکہ غلہ مفت پانے کی صورت میں یہ پھر لوٹ کر آئیں۔

جب یہ لوگ کنعان پہنچے تو جاتے ہی باپ سے کہا اگر آپ نے اگلی بار بنیامین کو ہمارے ساتھ نہ بھیجا تو ہم کو غلہ نہ ملے گا۔ ہم ہر طرح اس کی حفاظت کریں گے جناب یعقوب نے کہا مجھے تمہارے کہنے کا اعتبار نہیں۔ تم نے اس کے بھائی یوسف کے بارے میں بھی یہی کہا تھا۔ خیر لے جاؤ اللہ اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔

جب غلے کے تھیلے کھولے تو ان میں سے ایک کے اندر قیمت رکھی ہوئی پائی۔ تو انہوں نے کہا لیجیے بادشاہ نے قیمت تک واپس کر دی ہے۔ اب جو ہم اپنے بھائی کو لے کر جائیں گے تو غلہ اور زیادہ ملے گا۔ یہ تو تھوڑا ہی سا ہے۔

الغرض جب حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں سے عہد و پیمان لینے کے بعد بنیامین کے بھیجنے پر راضی ہو گئے۔ اور فرمایا دیکھو ایک دروازے سے سب کے سب داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے جانا (تاکہ نظر نہ لگ جائے)

جب لوگ مصر میں پہنچے اور حضرت یوسف کو معلوم ہوا تو انہوں نے سب کو بلا لیا اور اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس جگہ دی اور چپکے سے ان کے کان میں کہہ دیا میں تمہارا بھائی یوسف ہوں۔ جو کچھ یہ لوگ تمہارے ساتھ کر چکے ہیں اس کا رنج نہ کرنا۔

ان کو بھرپور غلہ دے کر رخصت کیا گیا۔ آپ نے ایک نوکر کو حکم دیا کہ شاہی پیالہ بنیامین کے بورے میں داخل کر دے۔ اس طرح کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ جب قافلہ چلا تو ایک شخص نے پکار کر کہا۔ اے قافلے والو ٹھہرو تم چور ہو یہ سن کر وہ پھر پڑے اور پوچھنے لگے۔ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے۔ شاہی ملازموں نے کہا۔ بادشاہ کا پیالہ نہیں ملتا جو شخص اس کو ڈھونڈ کر لائے گا اسے ایک اونٹ کے بار کا غلہ مفت ملے گا۔ (چور اس لیے کہا گیا کہ وہ یوسف کو چرا چکے تھے اس بار کے اعتبار سے نہیں کہا تھا)

انہوں نے کہا تم جانتے ہو کہ ہم تمہارے ملک میں فساد کرنے نہیں آئے تھے۔ اور نہ ہم لوگ چور ہیں۔ انہوں

نے کہا۔ اور اگر یہ پیالہ تمہارے سامان سے نکل آئے تو چور کی سزا کیا ہوگی۔ وہ بولے جس کے سامان سے نکلے اسی کو پکڑ لینا۔ ان لوگوں نے پہلے تو اور بھائیوں کے سامان میں تلاش کیا۔ بعد میں بنیا مین کے سامان سے برآمد کر لیا۔ خدا نے یوسف کو یہ تدبیر بتائی ورنہ مصر کے قانون کے مطابق وہ بنیامین کو روک نہیں سکتے تھے۔

جب پیالہ برآمد ہوا تو انہوں نے کہا اس نے چوری کی تو کون سا تعجب ہے اس کا بھائی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے (یہ اشارہ تھا اس واقعہ کی طرف کہ حضرت یوسف کو ان کی پھوپھی نے پالا تھا۔ حضرت یعقوب جب یوسف کی جدائی کو گوارا نہ کر سکے۔ تو اپنی بہن کے پاس لینے گئے ان کو جدا کرنا شاق تھا لہذا یہ حیلہ کیا کہ ایک کمر بند ان کی کمر میں باندھ دیا اور چور قرار دے کر روک لیا۔

جب بنیا مین کو روک لیا گیا تو بھائی بہت پریشان ہوئے اور عزیز سے کہنے لگے اس کے باپ بوڑھے ہیں ان جدائی کی تاب نہ لائیں گے۔ آپ ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ روک کر ہم پر احسان کیجئے۔ حضرت یوسف نے فرمایا معاذ اللہ جو چور نہیں میں اس کو کیسے روک لوں۔ جب مایوس ہوئے تو سب بھائی الگ کھڑے ہو کر مشورے کرنے لگے بڑے بھائی یہودا نے کہا ہم باپ سے اس کی حفاظت کا کیسا سخت وعدہ کر کے آئے تھے۔ اس سے پہلے یوسف کے بارے میں بھی ہم جھوٹے ثابت ہو چکے ہیں لہذا میں تو یہاں سے جاؤں گا نہیں۔ میں منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں تم جا کر اطلاع دیدو کہ آپ کے صاحبزادے نے چوری کی اس علت میں پکڑے گئے ہمیں اس کا کیا حال معلوم تھا۔

جب کنعان پہنچ کر یہ واقعہ بیان کیا تو حضرت یعقوب نے کہا اس نے ہرگز چوری نہیں کی۔ یہ بات تم نے دل سے گھڑلی ہے۔ بہر حال اب سوائے صبر چارہ کار ہی کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ خدا اس سے ملا دے گا۔ آپ نے ان کی طرف سے منہ پھیر کر کہا۔ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ (سورہ یوسف ۱۲/۸۴) (کہنے لگے ہائے یوسف اور اس قدر روئے کہ آنکھیں صدمے سے سفید ہو گئیں) انہوں نے کہا آپ تو ہمیشہ یوسف ہی کو یاد کرتے رہیں گے یہاں تک کہ بیمار ہو جائیے گا یا جان دے دیجئے گا۔ فرمایا میں تم سے کچھ نہیں کہتا۔ اپنے رنج و غم کی شکایت اللہ سے ہی کر رہا ہوں۔

یہاں سے پتہ چلا کہ رونا ناجائز نہیں۔ ورنہ یعقوب نبی ہرگز ناجائز بات کیوں کرتے۔ اور پھر رونا بھی اتنا کہ روتے روتے بینائی جاتی رہی تھی۔

پھر بیٹوں سے فرمایا جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور رحمت خدا سے مایوس نہ ہو۔ آخر سب بھائی پھر آئے اور حضرت یوسف سے کہا۔ حضور! ہمارے سارے کنبہ کو قحط کی وجہ سے بڑی تکلیف ہو رہی ہے اور ہم تھوڑی سی پونجی لے کر آئے ہیں۔ اس کے عوض غلہ دلا دیجئے۔ اور صدقہ و خیرات دیجئے۔

حضرت یوسف نے کہا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا۔ انہوں نے

تعجب سے کہا۔ کیا آپ یوسف ہیں۔ فرمایا ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ انہوں نے شرمندہ ہوکر کہا خدا کی قسم اس نے تم کو ہم پر فضیلت دی ہے۔ بے شک ہم ہی خطادار ہیں۔ فرمایا اب آج سے تم پر کوئی الزام نہیں۔ خدا تمہارے گناہ معاف فرمائے گا۔ وہ الرحم الراحمین ہے۔

اچھا اب میرا یہ کرتا لے جاؤ اس کو بابا جان کے چہرے پر ڈال دینا۔ وہ پھر سیانکے ہوجائیں گے۔ اور تم لوگ سب لڑکے بالوں کو لے کر میرے پاس آؤ۔ ادھر تو یہ قافلہ مصر سے چلا۔ ادھر جناب یعقوب نے کہنا شروع کیا مجھے اگر تم لوگ سٹھیا ہوا نہ سمجھو تو ایک بات کہوں مجھے یوسف کی بو معلوم ہو رہی ہے۔ کنبہ والوں نے کہا آپ تو اسی پرانے خیال (محبت) میں پڑے ہوئے ہیں۔

جب یوسف کی خوشخبری دینے والا آیا اور یوسف کا کرتا چہرہ پر ڈال دیا تو اس کی بینائی پلٹ آئی۔ فرمایا: میں تم سے نہ کہتا تھا کہ خدا کی طرف سے جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

الغرض جب یہ لوگ مع یعقوب کے وہاں پہنچے تو یوسف نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا۔ اور یہ سب کے سب یوسف کی تعظیم کے لئے سجدے میں گر پڑے۔ اس وقت یوسف نے کہا بابا جان یہ تعبیر ہے میرے اس خواب کی۔ میرے پروردگار نے اسے سچ کر دکھایا۔

اس قصے میں چند باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔

۱۔ تعظیمی سجدہ مخلوق کے لئے بھی جائز ہے۔ اس سے شرک لازم نہیں آتا۔ پہلے خدا نے ملائکہ سے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرایا پھر یوسف کے بھائیوں سے اور ماں باپ سے یوسف کو سجدہ کرایا۔ اگر جائز نہ ہوتا تو ایک نبی خدا کبھی بندے کے سامنے اور بالخصوص اپنے بیٹے کے سامنے سجدے کے لئے سر نہ جھکاتا۔

۲۔ سب سے زیادہ قابلِ غور یہ امر ہے کہ یوسف بیٹے تھے اور یعقوب باپ پھر خدا نے ان کو سجدہ کرنے کا حکم کیوں دیا۔ باپ کی تعظیم بیٹے پر واجب ہے نہ کہ بیٹے کی باپ پر۔

یہ سچ ہے کہ نبی دونوں تھے لیکن خدا نے سب کا مرتبہ یکساں نہیں رکھا تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سورہ البقرہ ۲۵۲/۲) دوسرے جناب یوسف نے اپنی پاکیزگی نفس اور کمال روحانی کا مظاہرہ جس شان سے کیا اس نے ان کے مرتبے کو ایک سے ہزار کر دیا۔ جن نازک مرحلوں سے ان کو گزرنا پڑا ان میں ثابت قدم رہنا ان کے کردار کی انتہائی بلندی کو ظاہر کرتا ہے۔ مادی اعتبار سے ضرور باپ واجب التعظیم ہے لیکن روحانی مدارج میں بیٹے کی تعظیم بجالانا اس کی الوہیت کو نقصان نہیں پہنچتا۔

دوسرے خداوند عالم اپنے خاص خاص بندوں کا امتحان ایسے مواقع سے لیتا رہا ہے۔ جیسے فرشتوں کا امتحان سجدۂ آدمؑ سے لیا گیا۔ صرف یہ دیکھنے کو کہ یہ میرا حکم بجالاتے ہیں یا نہیں۔ آدم تو آدم تھے خدا نے پتھروں تک کی

تعظیم اپنے حبیب سے کرائی۔ حجر اسود کو بوسہ دینا اسی قسم کا امتحان تھا۔ خدا کو خدا مانتے ہوئے ایسی تعظیم نہ کفر ہے نہ شرک بلکہ قلب کے تقوے کا سبب ہے۔ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (سورہ الحج ۲۲/۳۲) جو شعائر اللہ کی تعظیم کرتا ہے وہ اس کے قلب کے تقوے کا اثبات ہے۔ حجر اسود، صفا و مروہ، قربانی کا اونٹ یہ سب اسی لیے صاحبِ عظمت ہیں کہ شعائر اللہ میں سے ہیں پس اگر ہم تعزیہ یا ذوالجناح کی تعظیم کریں تو لوگ اس کو بت پرستی کیوں کہتے ہیں۔ غلافِ کعبہ جو پاکستان سے بھیجا جا رہا تھا، جا بجا اس کی زیارت کرائی گئی لوگوں نے آنکھوں سے لگایا، بوسہ دیا حالانکہ ابھی خانہ کعبہ کو اس کپڑے سے مس نہ کیا تھا مگر چونکہ کعبہ سے منسوب ہو چکا تھا لہذا اس میں شانِ عظمت پیدا ہو گئی۔ اسی طرح جو سامان عزا کربلا والوں سے منسوب ہوتا ہے اس میں عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۔ جناب یوسف ان انبیاء میں ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ حکومت بھی دی۔ ایسے نبی چند ہی ہوئے ہیں۔ سکندر ذوالقرنین، داؤد، سلیمان، یوسف اور حضرت محمد مصطفیٰؐ۔ خداوند عالم نے تمام انبیاء کو نہ دولت دی اور نہ حکومت تاکہ مال و زر کے لالچ یا ہیبت حکومت سے لوگ ایمان نہ لائیں۔ بلکہ حقیقت اسلام کو سمجھ کر مومن بنیں۔ لیکن چند انبیاء کو اس لئے حکومت دی تاکہ لوگ یہ بھی دیکھ لیں کہ حکومت و خزانوں کے مالک ہونے کے بعد خاصان خدا فقر و زہد و ورع کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ورنہ عام لوگ کہتے کہ حکومت و دولت ملنے کے بعد آدمی محتاط نہیں رہ سکتا۔

۴۔ جناب یعقوب کے بارہ بیٹے تھے۔ ان میں صرف ایک کی جدائی برداشت نہ کر سکے۔ حالانکہ نبی یہ بھی جانتے تھے کہ یوسف مل جائیں گے۔ پھر بھی اتنا روئے کہ بصارت کھو بیٹھے۔ یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ بیٹا بھی مل گیا اور بادشاہ بن کر مل گیا اور بینائی بھی لوٹ آئی۔ جناب یعقوب کے ہاتھ سے صبر کی باگ چھوٹ چکی تھی۔ ورنہ یہ نہ کہتے اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (سورہ یوسف ۱۲/۸۶) شکایت وہی کرتا ہے جسے تابِ ضبط باقی نہیں رہتی۔

اب ان کے مقابلہ میں امام حسین علیہ السلام کے صبر کو دیکھو۔ ایک کلیجہ پر اٹھارہ داغ تو بنی ہاشم کے تھے اور کم سے کم ۵۴ داغ انصار کے لیکن کسی وقت بھی شکایت کا لفظ زبان پر نہ آیا۔

اور حسین علیہ السلام سے زیادہ صبر دکھایا امام زین العابدین نے سارا گھر اپنی آنکھوں کے سامنے کٹتے دیکھا لٹتے دیکھا، جلتے دیکھا۔ ناموسِ رسولؐ کو سر برہنہ بازار کوفہ و شام میں تشہیر ہوتے دیکھا۔ یہ وہ مصائب ہیں کہ آدمی برداشت کرے تو کلیجہ پھٹ جائے۔ ناموس کا معاملہ بڑا سخت ہوتا ہے۔ آدمی سب اپنے اوپر ہر قسم کے مصائب جھیل لیتا ہے لیکن اگر اپنے ناموس کی بے حرمتی دیکھتا ہے تو زمام صبر ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ ایوب جیسا صابر اسی منزل پر تڑپ اٹھا تھا اور

بارگاہ باری میں عرض کرنے لگا۔ اِنّی مَسَّنِیَ الضُّرُّ مجھے نقصان پہنچ گیا۔

یہ ایک کیا بے شمار صبر آزما مواقع امام زین العابدین علیہ السلام کے سامنے آئے۔ کیسا سخت موقع تھا دربار پسر زیاد میں جانا۔ اس شقی نے قتل حسینؑ کی خوشی میں اچھی طرح دربار کو آراستہ کیا تھا اور کوفے کے تمام امراء شرفا اور سردارانِ قبیلہ کو حکماً آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کا تمام دارالامارہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ سرہائے شہداء مع اسیروں کے اس کے سامنے پیش ہوئے۔ عورتیں رسیوں سے جکڑی ہوئی سر برہنہ باحال تباہ کھڑی تھیں۔ امام زین العابدینؑ کے پیر میں بیڑی ہاتھوں میں ہتھکڑی، کسی نبی کی اولاد اس کی اُمت کے ہاتھوں اس طرح ذلیل نہیں ہوئی۔ جس طرح آل رسول مسلمانوں کے ہاتھوں۔

امام حسینؑ کا سر اس کے سامنے پیش ہوا اس ملعون نے نہایت ذلت کے ساتھ اپنی کرسی کے نیچے رکھا جناب زینبؑ کا رنج و غم اور شرم و حیا سے عجب حال تھا۔ سب درباری زرق برق لباس پہنے ہوئے تھے اور شہزادیٔ عالم رسول کی نواسی کا لباس حد درجہ بوسیدہ تھا۔ سر و پا برہنہ شانوں میں رسی بندھی ہوئی۔ نقاہت کا یہ عالم کہ کھڑی نہ ہو سکیں ابن طریح اور ابن طاؤس نے اپنی مقتل میں لکھا ہے کہ جناب زینبؑ کا سر جھکا یا تو بیٹھ گئیں۔ کنیزوں نے چاروں طرف سے آپ کو گھیر لیا۔ ابن زیاد نے ان کی آنکھوں کے سامنے مسکرا کر امام مظلوم کے دندانِ مبارک پر اپنی چھڑی مار رہا تھا۔ زید بن ارقم سے جو رسول اللہؐ کے بوڑھے صحابی تھے یہ گستاخی نہ دیکھی گئی۔ فرمایا او لپسر مرجانہ ان ہونٹوں سے چھڑی ہٹا لے۔ واللہ میں نے رسول اللہؐ کو ان ہونٹوں کے بوسے لیتے دیکھا ہے اور ان کو اس طرح چوستے دیکھا ہے جیسے کوئی خرمائے تر کو چوستا ہے۔ یہ کہہ کر رونے لگے۔ ابن زیاد نے غصے میں بھر کر کہا خدا تیری آنکھوں کو ہمیشہ رُلائے اگر تو سٹھا ہوا بوڑھا نہ ہوتا تو میں ابھی تجھے قتل کرا دیتا۔ زید نے کہا میں اس سے زیادہ وزنی حدیث آنحضورؐ کی تجھے سناتا ہوں واللہ میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رسول ایک ران پر حسنؑ کو بٹھائے تھے اور دوسری پر حسینؑ کو اور اپنے دونوں ہاتھ ان کے سروں پر رکھے ہوئے تھے اور فرما رہے تھے خدایا میں ان دونوں کو اور صالح المومنین علی علیہ السلام) کو تیری سپردگی میں دیتا ہوں۔ اے پسر زیاد کیا ودیعت رسولؐ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر روتے ہوئے دربار پسر زیاد سے نکل گئے۔ اے گروہ عرب تم نے ابن زیاد کو حاکم بنایا تو ہے اور ابن فاطمہؑ کو قتل تو کیا ہے۔ عنقریب وہ تم کو بھی بے ذلیل کئے نہ چھوڑے گا۔ خدا کا عذاب تم سب پر منڈلا رہا ہے۔

اس کے بعد ابن زیاد جناب زینبؑ کی طرف متوجہ ہوا۔ اور پوچھنے لگا۔ یہ کون ہے جسے کنیزیں حلقہ میں لئے ہوئے ہیں۔ شمر نے آگے بڑھ کر کہا یہ اسیرہ زینبؑ بنت علیؑ ہیں۔ اس شقی نے جناب زینبؑ سے مخاطب ہو کر کہا الحمد للہ خدا نے تم کو ذلیل کیا۔ اور تمہاری احادیث کو جھٹلایا اور تم کو قتل کیا۔ یہ سنتے ہی جناب زینبؑ بے چین ہو کر اُٹھ کھڑی

ہوئیں اور فرمایا۔ خدا کا شکر ہے جس نے جناب محمد مصطفٰےؐ سے ہم کو صاحب عزت و بزرگی بنایا اور ہر قسم کے رجس سے پاک کیا۔ اسے پسر مرجانہ رسوا فاسق ہوتا ہے اور فاجر جھٹلایا جاتا ہے اور وہ تو ہے۔ اسے دشمنِ خدا و رسول اس نے کہا اسے بنتِ علیؑ تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے تیرے بھائی اور اس کے اہلِ بیت سے کیا سلوک کیا۔ فرمایا میں تو اس میں بہتری ہی بہتری دیکھ رہی ہوں۔ خدا نے ان کو درجہ شہادت عطا کیا۔ خدا کل تجھ کو اور ان کو جمع کرے گا۔ اے ابن زیاد پیشِ خدا جواب دہی کے لئے تیار ہو جا۔

ابن زیاد کو یہ سن کر غصہ آگیا اور حکم دیا کہ اس عورت کو قتل کر دو۔ عمرو بن حارث نے کہا اے امیر یہ عورت ہے اور عورت سے مواخذہ نہیں کرنا چاہیے۔ ابن زیاد نے کہا اللہ نے طاغی و باغی حسینؑ کو قتل کر کے میرے دل کو ٹھنڈا کیا۔ اور نافرمان تیرے خاندان کے ذلیل ہوئے۔ جناب زینبؑ سے ضبط نہ ہو سکا۔ رو کر فرمایا۔ تو نے ہمارے بوڑھوں اور بچوں کو قتل کیا۔ ہماری ہری شاخوں کو کاٹ ڈالا۔ اور اس سے تیرے دل کو خوشی ہوئی۔ اور تیرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ ابن زیاد نے کہا یہ عورت شاعرہ ہے اس کا باپ بھی شاعر تھا۔ فرمایا اے پسر مرجانہ خدا سے ڈر عورت کو شاعری سے کیا کام۔

پھر ابن زیاد علی بن الحسینؑ کی طرف متوجہ ہوا وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے اس کے سامنے کھڑے تھے اور آپ کی پنڈلیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے پوچھا یہ کون ہے۔ شمر نے بتایا یہ علی بن الحسینؑ ہیں۔ اس نے کہا کیا علی کو خدا نے قتل نہیں کیا۔ حضرت نے فرمایا وہ میرا بھائی تھا جس کو تیری فوج نے عالمِ شباب میں تین دن کا بھوکا پیاسا قتل کیا ہے۔ اے ابن زیاد وہ دن بھی یاد آ رہا ہے کہ روزِ قیامت تو بھی کھڑا ہوگا۔ ہم بھی کھڑے ہوں گے۔ جب تجھ سے سوال ہوگا۔ تو رسول اللہؐ کے آل کے قتل اور غارت گری کا کیا جواب دے گا۔ اے ابن زیاد تو کتنا بے غیرت ہے کہ میری پھوپھی کی توہین سب کے سامنے کر رہا ہے۔ خدا تیرے ہاتھ پاؤں قطع کرے کہ تو نبی زادی سے گستاخانہ کلام کرتا ہے۔

ابن زیاد نے غصہ سے کہا کہ تیری یہ جرأت کہ مجھے جواب دیتا ہے۔ حکم دیا گیا کہ اس کو بھی قتل کر دو۔ جلاد تلوار لے کر بڑھا تو جناب زینبؑ بھتیجے سے لپٹ گئیں اور فرمایا اے پسر زیاد کیا اتنے کثیر خون بہا کر بھی تجھے چین نہ آیا۔ کیا تو ہم سے کسی کو زندہ چھوڑے گا ہی نہیں۔ اگر ہم بے کسوں کے اس قافلہ سالار کو قتل کرنا چاہتا ہے تو مجھے بھی اس کے ساتھ قتل کر دے۔

امام زین العابدین نے فرمایا۔ اے پھوپھی اماں آپ خاموش رہیے۔ اس کی کیا مجال کہ مجھے قتل کر سکے۔ اور ابن زیاد سے فرمایا۔

"تو مجھے قتل سے ڈراتا ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے۔ شہادت ہماری کرامت ہے۔"

درباری لوگوں نے کہا۔
اے امیر اس بیمار کے قتل کا ارادہ نہ کرنا کیونکہ ان بے کس بیبیوں کا سرپرست اور نگران اس کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔
ابن زیاد باز رہا اور حکم دیا انہیں قید خانہ میں لے جاؤ۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

ستائیسواں مجلس

جناب ایوب کا قصہ و فضائل

اور

مصائب اہلبیت (زندان کوفہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِی کِتَابِہِ الۡمَجِیۡدِ وَفُرۡقَانِہِ الۡحَمِیۡدِ

وَمِنۡ ذُرِّیَّتِہٖ دَاوٗدَ وَسُلَیۡمٰنَ وَاَیُّوۡبَ وَیُوۡسُفَ وَمُوۡسٰی وَھٰرُوۡنَ ط

وَکَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ (سورہ الانعام ۶/۸۴)

(اور ذریت ابراہیم میں داؤد و سلیمان و ایوب و یوسف و موسیٰ و ہارون تھے اور احسان کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔)

حضرت ایوب علیہ السلام بڑے ہی صابر اور عبادت گزار نبی تھے۔ افرائیم بن یوسف کی بیٹی ان کی زوجہ تھیں۔ حضرت کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ جب تک دس محتاجوں کو کھانا نہ کھلا لیتے۔ منہ میں لقمہ نہ رکھتے۔ جب تک دس ننگوں کو لباس نہ پہنا دیتے نیا لباس نہ پہنتے۔

اللہ نے ان کو بہت سی نعمتیں دے رکھی تھیں۔ مال میں مال، اولاد میں اولاد، سواری کو گھوڑے، دودھ پینے

کو مویشی، رہنے کو کئی کئی مکان۔ پانچسو جوڑی تو بیل پھر لاتعداد بکریاں اونٹ اور گھوڑے اور خچر تھے چار سو چرواہے تھے، غلام اور سائیس، ہزاروں بیگہ اراضی برائے کاشت اور باغات تھے۔ سات بیٹے اور سات بیٹیاں تھیں۔ لیکن باوجود اس قدر نعمتیں مہیّا ہونے کے بعد دن رات عبادت میں بسر کر رہے تھے۔ خدا اپنے بندوں کا امتحان دو طریقوں سے لیتا ہے۔ اوّل نعمتیں دے کر تاکہ یہ دیکھے کہ اس کی نعمتوں کا شکر صحیح طریقے سے ادا کرتے ہیں یا نہیں۔ دوسرے ان نعمتوں کو سلب کرے تاکہ صبر کی آزمائش کرے۔ ان امتحانوں میں انبیاء سب سے آگے آگے ہوتے ہیں۔

جناب ایوب شکر کی منزل میں تو کامیاب ہو گئے۔ پھر خدا نے اپنی نعمتوں کو سلب کر کے ان کا امتحان صبر میں لیا۔ صورت یہ ہوئی جنگل میں آگ لگی تو تمام بکریاں جل گئیں۔ جناب ایوب نے صبر کیا۔ خبر دینے والے نے خبر دی تو فرمایا میں کیا کروں جس کا مال تھا اس نے لے لیا۔ کچھ دیر بعد چرواہے نے آکر کہا کہ میدان میں ایسی وبا پھیلی کہ سب بیل اور گائیں تڑپ تڑپ کر مر گئیں۔ فرمایا میں مرضی خدا پر راضی ہوں۔ پھر شتر بانوں نے آکر خبر دی کہ سب اونٹ تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ سائیسوں نے آکر کہا۔ سب گھوڑے مر گئے۔ آپ ہر ایک سے یہی فرماتے رہے مرضیٔ خدا میں کیا دخل۔

پھر گھر میں آگ لگی اور سارا گھر جل کر خاک ہو گیا۔ دوسرے دن خبر ملی کہ آپ کی ساری اولاد جس مکان میں تھی اس کی چھت گری اور سب دب کر مر گئے۔ مگر صبر کی باگ حضرت ایوب کے ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ اور جس شان سے شب و روز عبادت کرتے تھے کرتے رہے۔

امتحان روز بروز سخت ہوتا جا رہا تھا۔ خدا کو یہ دکھانا تھا کہ میرے برگزیدہ بندے میری رضا کے لئے ہر مصیبت کو خوشی سے جھیل جاتے ہیں اور زبان کو حرف شکایت سے آشنا نہیں کرتے۔

اسی سلسلے میں جناب ایوب بیمار ہو گئے۔ لیکن عبادت میں فرق نہ آیا۔ یہاں تک کہ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہ رہی بستی والوں نے جو پے در پے بلائیں ان پر آتی دیکھیں تو یہ سمجھے کہ ایوب منحوس آدمی ہیں کہیں ان کی نحوست کا اثر ہم تک نہ پہنچے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ ان کو بستی سے نکال دو۔ چنانچہ ان کو لے جا کر بستی سے دور ایک درخت کے نیچے ڈال دیا ایک غریب بی بی ان کی مونس و غمخوار تھیں وہی سب خدمتیں انجام دیتی تھیں۔ ایک دو دن نہیں پورے سات برس تک خدمت کی۔ اور اس خلوص سے کہ کبھی ماتھے پر بل نہ آیا۔ اوّل تو بستی سے دور تنہائی کا عالم پھر لمبی بیماری دوسری بیوی ہوتی تو چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاتیں۔ مگر وہ ایسی بی بی نہ تھیں۔ صبر و شکر کے ساتھ کڑی منزلوں کو جھیلتی رہیں۔

پھر سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ ہاتھ پیسہ سے خالی تھا۔ یا گھر میں سب کچھ تھا یا اب صفا چٹ میدان ہے نہ دوا کو پیسہ پاس تھا نہ غذا کو۔ روزمرہ بستی میں جاتیں محنت و مزدوری کرتیں اور جو کچھ ملتا اس سے دوا اور غذا خرید کر لاتیں

ایک دن صبح سے شام تک ماری ماری پھریں۔ لیکن کہیں مزدوری نہ ملی۔ ایک عورت کو ان کے سر کے بال بہت پسند آئے۔ اس نے کہا اگر یہ بال مجھے کاٹ کر دے دو تو میں تمہیں کچھ پیسے دے دوں۔ انہوں نے کہا میں بغیر اپنے شوہر کی مرضی کے ایسا نہیں کر سکتی۔ اس عورت نے کہا راضی نہیں ہو تو اپنے گھر جاؤ۔ سوچیں خالی ہاتھ گھر جاکر بیمار شوہر کو کیا کھلاؤں گی مجبور ہو کر بال کٹوا دیئے۔

شیطان کو موقع ہاتھ آیا۔ اس نے جاکر ایوب سے کہا لیجئے آپ کی بی بی کے بال فلاں عورت نے چوری کی علت میں کاٹ لیے۔ یہ سنتے ہی جناب ایوب کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور اس غم میں اتنا روئے کہ عمر بھر کبھی اتنا نہ روئے تھے اور قسم کھائی کہ اچھا ہو جاؤں گا تو رحیمہ (بی بی کا نام) کو سو کوڑے ماروں گا۔ پھر عرض کی کہ پروردگار اب تک تو میں نے صبر کیا لیکن اب مجھے وہ تکلیف پہنچی ہے کہ تاب صبر و ضبط نہیں تو مجھے اس بلا سے نجات دے۔ تو بڑا رحم کرنے والا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ناموس کی بے حرمتی کا معاملہ بڑا سخت ہوتا ہے آدمی مرنا گوارا کرتا ہے مگر اس بے آبروئی کو برداشت نہیں کرتا۔

اس دعا کے بعد فرشتے نے خوشخبری سنائی کہ امتحان کا زمانہ ختم ہوا۔ تم کامیاب ہو گئے۔ خدا کی سرکار میں تمہارا مرتبہ بڑھ گیا۔ اب اٹھو اور باقی زندگی ہنسی خوشی بسر کرو۔ زمین پر پیر مارو اور قوت خدا کا تماشہ دیکھو۔

حضرت ایوب نے پیر مارا زمین سے ٹھنڈے پانی کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ فرشتے نے کہا اس میں نہاؤ۔ اور اسی کو پیو بھی جیسے تھے ویسے ہی ہو جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت ایوب بالکل تندرست ہو گئے اور وہاں سے اٹھ کر ایک پل پر جا پہنچے۔

رحیمہ بی بی پلٹ کر آئیں تو حضرت کو اپنی جگہ نہ پایا گھبرا گئیں۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں پیدا ہوئے تعجب ہوا کہ ایسا مریض جو کروٹ نہ بدل سکتا تھا یہاں سے کہاں چلا گیا۔ روتی ہوئی ہر طرف تلاش کرنے کو نکل پڑیں آخر جناب ایوب کے پاس پہنچیں۔ ان سے پوچھا کہیں تم نے میرے شوہر ایوب کو تو نہیں دیکھا انہوں نے کہا کہ تم ایوب کو دیکھو گی تو پہچان لو گی۔ کہا ضرور فرمایا تم نے کہاں پہچانا میں ایوب ہوں۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگیں۔ تم تندرست کیسے ہو گئے۔ جناب ایوب نے سارا قصہ سنایا۔ اس کے بعد خدا نے جو نعمتیں لے لی تھیں وہ سب ان کے لیے مہیا کر دیں۔

اب حضرت ایوب کو یہ فکر ہوئی کہ اپنی قسم کو پورا کریں یعنی بی بی کو سو کوڑے ماریں۔ فرشتے نے آکر کہا ایسا ہرگز نہ کیجئے۔ آپ کی بی بی بے قصور ہیں وہی تو ایک عورت ہے جس نے اتنی طولانی بیماری میں آپ کا ساتھ دیا۔ اپنی قسم اس طرح پوری کرو کہ سو سینکوں کا ایک مٹھا لے کر ایک ہی مرتبہ اسے مار دو۔

حضرت ایوب کا مختصر سا واقعہ ختم ہو گیا۔ اب اس کے چند ضروری پہلوؤں پر روشنی ڈالنی باقی ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ انبیاء اور اوصیائے انبیاء پر جو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں وہ کسی جرم کی بنا پر نہیں ہوتیں بلکہ ان کے مراتب میں اضافے کے لئے اور ان کی اُمتوں کے سامنے صبر و شکر وغیرہ کا ایک نمونہ عمل پیش کرنے کے لیے اور یہ دکھانے کے لیے کہ ہمارے خاص بندے ابتلاءات سے گھبرایا نہیں کرتے۔ نیز یہ کہ اگر خاصان خدا پر ہمیشہ انعام واکرام ہی ہوتے رہیں اور کبھی کسی مصیبت میں اُن کو مبتلا نہ کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ لوگ ان کی خدائی کے قائل ہو جائیں۔ یا ان کی غیر معمولی شخصیت سے مرعوب ہوکر ان کی ہدایت کو قبول کریں جس کا خلوص سے خالی ہونا لازم ہے۔

نیز یہ کہ جب آدمی کا دل ٹوٹتا ہے تو خدا کی طرف قلب کی رجوع زیادہ ہوتی ہے اور عبدیت کے نمایاں کرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔

انبیاء پر ابتلاءات بمقتضائے محبت ہوتی ہیں۔ مشہور مقولہ ہے۔ البلاء للولا امتحان محبت ہی ہوتا ہے بادشاہوں کے جو مقرب زیادہ ہوتے ہیں ان ہی کے امتحانات بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ بات بات پر ان کی وفاداری کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ دور والوں سے ایسی باتوں کا تعلق نہیں ہوتا۔

نیز یہ کہ مصیبتوں کے وقت اس کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ انبیاء و اولیاء کے سچے دوست کون ہیں اور جھوٹے کون۔ کس کا ایمان خالص ہے کس کا پُر از ریا۔

دوسری بات اس قصے کے سلسلے میں قابلِ بیان یہ ہے کہ اکثر انبیاء پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں ان کا سلسلہ جلد منقطع ہوگیا اور آخر میں ان کا رنج خوشی سے اور تکلیف آرام سے بدل گئی۔

جناب آدم علیہ السلام کے سامنے ان کے بیٹے ہابیل کو ان کے دوسرے بیٹے قابیل نے ختم کر دیا۔ چند روز رو پیٹ کر بیٹھ رہے۔ مصائب کا سلسلہ آگے کو نہ بڑھا۔ اور نہ آدم علیہ السلام کے تمام کنبے تک پھیلایا۔

جناب نوحؑ کا بیٹا نااہل تھا ڈوب گیا۔ فطرتاً جناب نوح کو قلق ہونا چاہیے تھا اور ہوا۔ لیکن اس کی نالائقی اور بے دردی نے اس غم کا دائرہ بڑھایا نہیں۔ نوح علیہ السلام کی قوم نے برسوں ان کو ستایا۔ بڑا سخت امتحان تھا بڑی تکالیف کا سامنا تھا لیکن جب وہ قوم ہلاک ہوگئی۔ جذبۂ انتقام کی آگ بجھ گئی اور غم خوشی سے بدل گیا۔

جناب ابراہیم کا امتحان بھی انتہائی سخت تھا۔ ان کو آگ کے سر بفلک شعلوں میں پھینکا گیا۔ ان ہی کا کلیجہ تھا کہ اس مصیبت کو جھیل گئے۔ لیکن جب آگ گل و گلزار بن گئی تو مصیبت راحت سے بدلی اور غم خوشی سے۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ نمرود سے بدلہ لینے کے لیے البتہ جذبۂ انتقام میں تڑپ ہوئی کیونکہ بشری پیکر میں تھے لیکن جب نمرود ہلاک ہوگیا تو اندھیرے گھر میں چراغاں ہوگیا۔ اور ایمان و یقین خوشی سے پھولے نہ سمائے۔

یعقوب علیہ السلام پر مصیبت آئی اور اپنے پورے ساز و سامان سے آئی۔ صبر کی باگ ہاتھ سے چھوٹی دل پر قابو

نہ رہا روئے اور اتنا روئے کہ بصارت زائل ہو گئی۔ لیکن کچھ دنوں بعد مصیبتوں کے بادل چھٹ گئے۔ بے نور آنکھیں روشن ہو گئیں۔ کھویا ہوا بیٹا مل گیا اور اس شان سے مل گیا۔ کہ تاج سلطنت اس کے سر پر تھا۔ جتنے داغ دل پر تھے سب مٹ گئے۔

ابھی آپ سن چکے ہیں۔ کہ جناب ایوب کا کیسا سخت امتحان تھا۔ دنیا کی مصیبتیں سمٹ کر ان کے اُوپر آگریں۔ ایک دو دن نہیں برسوں ان کا معصوم دل ابتلاءات کے شکنجے میں مسلا جاتا رہا۔ لیکن یہ دور بھی ختم ہو گیا۔ گئی ہوئی کیفاعت پلٹ آئی۔ برسوں کی تکلیف کے بعد پھر راحت کے دن نصیب ہو گئے۔

جناب یوسف علیہ السلام کی ابتلا بھی کچھ کم نہ تھی۔ بھائیوں کے ظلم۔ زلیخا کی آفت جان محبت کئی سال قید کی سختی لیکن پھر ہوا کا رُخ بدلا تو تخت سلطنت پر جلوہ افروز تھے۔

جب جناب موسیٰ اور ان کی قوم کے لیے فرعون کی حکومت تپ دق کی بیماری بنی ہوئی تھی دس ہزار بچے بے قصور ذبح کئے گئے۔ بنی اسرائیل کی لڑکیوں اور عورتوں سے کنیزوں کی طرح خدمت لی گئی۔ جناب موسیٰ علیہ السلام کا ساحروں سے مقابلہ ہوا۔ غرض کہ نہ دن کو چین تھا نہ رات کو لیکن فرعون کے غرق ہونے کے بعد میدان صاف ہو گیا بنی اسرائیل کے گھروں میں گھی کے چراغ جل گئے اور موسیٰ کے انتقامی جذبہ کو تسکین ہو گئی۔ راہ میں جتنے کانٹے تھے صاف ہو گئے۔

جناب ہود، جناب صالح نے بھی ابتلاءات کے سمندروں میں غوطے کھائے۔ لیکن جب ان کی قوموں پر عذاب آگیا تو ان کے دلوں میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

جناب یحیٰ کی مصیبت سب سے زیادہ تھی۔ جس نے ان کی جان ہی لے لی۔ لیکن جب ان کے خون ناحق کے بدلے میں ستر ہزار بنی اسرائیل قتل کر دیئے گئے تو ان کی روح بھی خوش ہو گئی۔

جناب عیسیٰ پر بھی یہودیوں نے مظالم کے پہاڑ گرائے۔ لیکن جب ان کا شر رفع ہو گیا تو مطمئن ہو کر آسمان چہارم پر جا بیٹھے۔

الغرض جس نبی کا جتنا ظرف تھا۔ اسی حد تک اس کا امتحان رہا۔ جب دیکھا کہ آگے سختی جھیلنے کی طاقت ہی نہیں تو امتحان کو فوراً ختم کر دیا گیا۔

لیکن اہل بیت رسول پر رسولؐ کی وفات کے بعد جو مصائب کا سیلاب اُٹھا وہ ختم ہونے کے لیے آیا ہی نہ تھا تکلیفوں کا جو تانتا بندھا ہوا تھا وہ کسی وقت ٹوٹا ہی نہیں رنج کے بعد پھر خوشی نے اس گھر میں آنے کا نام ہی نہ لیا ایک دوامی مصیبت تھی جو کسی وقت اس خاندان سے ہٹی ہی نہیں۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا برابر سخت سے سخت مصیبتیں جھیلتا ہی رہا۔ ایک دو نہیں ان مصائب کی لپیٹ میں پورا خاندان آگیا۔ نہ بچہ بچا نہ جوان نہ بوڑھا۔ نہ مرد نہ عورت

مگر واہ رے صبر کرنے والو کسی منزل پر شکوہ سے زبان آشنا ہوئی ہی نہیں کبھی جذبۂ انتقام نے ابھارا کھایا ہی نہیں۔ جو بلا آئی صبر و شکر سے جھیلتے ہی رہے۔

تمام انبیاء کے مصائب و آرام کو اگر جمع کر لیا جائے تو بھی کربلا کے مصائب کا پلّا ان سب سے بھاری رہے گا۔ انبیاء پر مصائب نازل ہوئے۔ مگر ٹھہر ٹھہر کر تاکہ ہمت پست نہ ہو جائے کسی نبی پر بھی بیک وقت تمام مصائب نے اپنا زور نہیں دکھایا سوائے معرکہ کربلا کے کہ بیک وقت ان گنت مظالم کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ لوہے کے پہاڑ دل، پر بھی اگر یہ مصائب بیک وقت آپڑتے تو موم کی طرح پگھل جاتے، پتھروں کی رگوں سے خون کے فوارے چھوٹ پڑتے کون سی مصیبت تھی جس نے اپنا زور نہ باندھا۔

آوارہ وطنی۔ اہل وطن کی کج ادائی۔ گرمی کے موسم میں سفر کی تکلیف۔ بچوں اور عورتوں کا شدائد سفر جھیلنا۔ بندش آب، بھوک کی تکلیف۔ بدنوں کا زخموں سے چور ہونا۔ سوکھے گلوں کا خنجروں سے کاٹا جانا۔ لاشوں کا پامال ہونا۔ خیموں کا جلایا جانا، ساز و سامان کا لوٹا جانا۔ قید و بند کی تکلیف، عورتوں کا شہروں اور بازاروں میں تشہیر ہونا زندان میں بند کیا جانا۔ ان میں بہت سی تکالیف ایسی ہیں کہ انبیا اور ان کی اولاد کو چھو بھی نہیں گئیں۔ کسی نبی کی ناموس بازاروں میں تشہیر نہیں ہوئی۔ قید خانوں میں بند نہیں ہوئیں۔ سر برہنہ درباروں میں لائی نہیں گئیں۔

یہ سب بلائیں حصّہ میں آئیں اہل بیت رسولؐ کے لیے۔

اس وقت کے قید خانے آج کل کے قید خانے نہ تھے جس میں دونوں وقت غذا بھی دی جاتی ہے۔ جہاں صاف ہوا بھی ملتی ہے ٹھنڈا پانی بھی۔ بلکہ وہ تو دلِ کافر کی طرح تیرہ و تار تھے۔ نہ صبا ہوا کا گزر نہ روشنی کا پتہ نہ خبر کہ دن کب نکلا۔ سورج کب غروب ہوا۔ نہ کھانے کا بروقت انتظام نہ پیاس بھر پانی کا بندوبست' آہ یہ قید خانے اور رسولؐ کی اولاد۔ آہ یہ قبر سے بدتر زندان اور علی و فاطمہ کی بیٹیاں۔

کوفہ کا وہ قید خانہ جس میں اہل حرم کو مقید کیا گیا تھا مسجد کوفہ کے پہلو میں تھا۔ اسی مسجد کے پاس امیرالمومنین کا گھر تھا۔ جو آج تک موجود ہے۔ آہ جو بیبیاں اس ماحول میں کبھی شہزادیاں بن کر رہی تھیں۔ آج وہ وہاں کے قید خانہ میں بند تھیں۔ ابن زیاد کی تاکید تھی کہ کوئی عرب عورت کوئی کنیز اس قید خانے کے پاس سے نہ گزرے یہ امیرِشام کے دشمن خاندان کی عورتیں ہیں۔ ان کو کسی قسم کی سہولت نہ دی جائے گی اور کچھ لوگوں کو حکم دیا کہ وہ شہروں میں جا کر قتل حسینؑ کی لوگوں کو بشارت دیں۔

ابو مخنف نے لکھا ہے کہ ایک راوی بیان کرتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ ابن زیاد کے قصر کے ایک گوشہ میں یکایک آگ لگی، ابن زیاد دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ لوگ غل مچا رہے تھے۔ ناگاہ سر حسینؑ سے آواز آئی جس کو ابن زیاد اور تمام حاضرین نے سنا۔ اے ملعون! تو کہاں بھاگ رہا ہے۔ اگر اس دنیا کی آگ سے بھاگا بھی تو کیا آخرت کی آگ سے بھی بھاگ سکے گا۔ روزِ

قیامت جہنم کی آگ میں تیرا ٹھکانا ہوگا۔ یہ عبرت کا مقام ہے تیرے اور تیری قوم کے لئے۔ جب یہ کلام لوگوں نے سُنا تو خوف زدہ ہو کر گر پڑے۔ اس کے بعد آگ بجھ گئی۔ اور حضرت امام علیہ السلام کے سر سے پھر آواز نہ آئی۔

ابن زیاد نے ۱۳ محرم کو بذریعہ ایک خط کے یزید کو قتل حسینؑ کی اطلاع اپنے ایک قاصد کے ہاتھ بھیجی۔ جو کم سے کم سترہ روز میں دمشق پہنچا۔ اگر اسی روز یزید نے جواب لکھ دیا ہو کہ قیدیوں کو مع سرہائے شہدا اور عورتوں اور بچوں کو دمشق بھیج دے تو ایک قاصد سترہ دن میں کوفہ پہنچا ہوگا۔ یعنی اس مراسلت میں پورے ایک ماہ اور سات دن صرف ہو گئے ہوں گے۔ اس طرح اہل حرم کو ایک ماہ اور سترہ دن زندان کوفہ میں بسر کرنا پڑے۔ جب کوفہ سے روانہ ہوئے تو پہلی منزل کربلا میں ہوئی یعنی یوم اربعین کربلا میں پہنچے۔

قید کی اس مدت میں جو تکلیفیں اہل حرم کو اُٹھانا پڑیں ان کے تصور سے کلیجہ لرزتا ہے۔ اس شقی نے حکم دیا تھا کہ بہت تھوڑا کھانا اور بہت تھوڑا پانی ان لوگوں تک پہنچایا جائے اور آبِ سرد سے ان کو محروم رکھا جائے۔

گرمی کا موسم اور یہ تیرہ و تار قید خانہ۔ تمام بچے تڑپتے اور اپنے اپنے باپ کو یاد کرتے تھے مائیں طرح طرح سے ان کو سمجھاتی تھیں۔ مگر پریشان حالوں کو نیند کہاں۔

ابن زیاد کا دارالامارہ قریب تھا۔ رات کو جب شور و غل کی آواز سنی تو دربانوں کو بلا کر کہا۔ ان سے کہہ دو کہ رونا دھونا بند کریں ورنہ ان کو دربار میں بلا کر سزا دوں گا۔

جب دربانوں نے امام زین العابدینؑ کو یہ پیغام پہنچایا تو آپ کو غصہ آیا اور فرمایا کہ اس ظالم سے کہہ دو کہ تو نے ہمارے کلیجے کاٹے۔ ہمارا گھر برباد کیا اور اب کہتا ہے کہ روؤ مت۔ کیا وہ دُکھیا بیبیاں بغیر روئے رہ سکتی ہیں۔ جن کے سروں سے وارثوں کا سایہ اُٹھ گیا۔ جن کی گودیں بچوں سے خالی ہو گئیں۔ جن کے تمام عزیز گوسفندان قربانی کی طرح ذبح کر دیئے گئے جن کے سروں سے چادریں چھین لی گئیں۔ کہنا ظالم قہر الٰہی سے ڈر۔ میں ان ستم رسیدہ بیبیوں کو نالہ و فریاد سے منع نہیں کر سکتا۔

جب جناب زینبؑ کو خبر ہوئی تو زار زار رونے لگیں اور کہنے لگیں۔

"بی بیو جب نانا جان کا انتقال ہوا تھا تو میری والدہ گرامی شب و روز ان کی یاد میں رویا کرتی تھیں۔ محلہ والوں نے بابا جان سے شکایت کی کہ بنتِ رسولؐ سے کہیے کہ ان کے رونے نے ہماری نیندیں اُڑا دی ہیں۔ لہذا یا تو وہ دن میں رویا کریں یا رات کو۔ یہ سن کر اماں جان

بے قراری سے روئیں اور مجھے چھاتی سے لگا کر کہا، بیٹی ایک دن تجھ کو رونے سے منع کیا جائے گا
آہ! آج وہی دن ہے۔
اس کے بعد کربلا کی طرف رُخ کر کے فرمایا:
مظلوم بھیّا! تیری دُکھیا بہن کو ظالم تیرے ماتم میں رونے بھی نہیں دیتے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

اٹھائیسویں مجلس

حضرت شعیب علیہ السّلام کا قصّہ

فضائل اہلِ بیت و روانگی اہلحرم بہ دمشق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیۡ کِتَابِہِ الۡمَجِیۡدِ وَفُرۡقَانِہِ الۡحَمِیۡدِ

وَاِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ

(سورہ الاعراف ۷/۸۵)

مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا انہوں نے کہا کہ اے قوم اللہ کی عبادت کر تمہارے لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام صالح پیغمبر کی اولاد سے ہیں۔ حضرت رسولؐ خدا نے ان کو خطیب المرسلین فرمایا ہے۔ کیونکہ بہت ہی فصیح و بلیغ کلام کرتے تھے۔ مدین والے نہایت بے ایمان اور خود غرض لوگ تھے۔ اکثر کا پیشہ تجارت تھا۔ مگر سودا ہمیشہ کم تولتے۔ اور ناپ میں بھی کم دیتے۔ حضرت شعیب نے ان کو سمجھایا کہ جب تم کسی چیز کی پوری قیمت لے لیتے ہو۔ پھر ناپ تول میں کمی کرنا بہت بُری بات ہے۔ اللہ ایسے کاموں کو پسند نہیں کرتا۔ روئے زمین پر اصلاح کے بعد فساد برپا نہ کرو۔ مجھے ڈر ہے کہ تم پر کہیں عذاب الٰہی نازل نہ ہو جائے۔ انہوں نے کہا کیا تمہارے کہنے سے ہم اپنے ان معبودوں کو چھوڑ دیں گے جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آرہے ہیں۔ ہمیں اختیار ہے اپنے

مال میں سے جس طرح چاہیں نفع حاصل کریں۔ آپ سمجھ بوجھ کے آدمی ہو کر یہ خلاف عقل باتیں کیوں کر رہے ہیں۔

حضرت شعیب نے کہا میں تو تمہاری ہی بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میری مخالفت میں تم پر بھی ایسا ہی عذاب آئے۔ جیسے قوم نوح و قوم ہود و قوم صالح اور قوم لوط پر آ چکا ہے۔ خدا سے توبہ کرو۔ وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ انہوں نے کہا شعیب! ہماری سمجھ میں تو تمہاری باتیں نہیں آتیں۔ ہم تو تمہیں اپنے اندر ایک کمزور سا آدمی پاتے ہیں۔ اگر تمہارا خاندان تمہارے ساتھ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے۔ تم ہم پر غلبہ حاصل کرنے والے نہیں۔ فرمایا افسوس ہے تمہیں میرے قبیلے کا تو ڈر ہے اور خدا کا ڈر نہیں۔ تم نے اس کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ خیر جو تمہارا دل چاہے کرو۔ عنقریب پتہ چل جائے گا کہ ذلیل و خوار کون ہے اور جھوٹا کون ہے۔ انہوں نے کہا ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے ورنہ تم ہمارے ہی جیسے آدمی ہو۔ ہم تم کو جھوٹا سمجھ رہے ہیں اگر سچے ہو تو بھلا آسمان کا ایک ٹکڑا تو ہمارے اوپر گرا دو۔

الغرض جب وہ کسی طرح نہ مانے تو عذاب الٰہی نے ان کو دھر لیا اور وہ سب ہلاک ہو گئے۔

جناب شعیب ایک پہاڑ پر ایک درخت زیتون اور بعض کے نزدیک بادام کے درخت کے نیچے یاد الٰہی کیا کرتے تھے۔ اس درخت سے ایک روز آواز آئی۔ اے شعیب میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ حضرت شعیب نے ایک شاخ کاٹ کر اس کا ایک عصا بنا لیا اسے ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے اور وہ ان کو بہت عزیز تھا۔

جناب موسیٰ مصر سے نکل کر مدین میں پہنچے تو انہوں نے ایک چشمے پر دیکھا کہ چرواہے اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے ہیں اور دو لڑکیاں الگ کھڑی ان کو دیکھ رہی ہیں۔ موسیٰ نے ان سے پوچھا تم کس غرض سے یہاں کھڑی ہو انہوں نے کہا کہ ہم اس انتظار میں ہیں کہ یہ چرواہے ہٹیں تو ہم پانی بھر کر لے جائیں۔ ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں وہ یہاں آ نہیں سکتے۔

حضرت موسیٰ نے آگے بڑھ کر ان کے گھڑے بھر دیئے اور ایک درخت کے سائے میں جا بیٹھے پھر تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک لڑکی شرماتی ہوئی نیچی نظریں کیے جناب موسیٰ کے پاس آئی اور کہا کہ ہمارے بابا جان آپ کو بلاتے ہیں تاکہ اس مروت کا جو آپ نے ہمارے ساتھ کی ہے اجر عطا فرمائیں۔ موسیٰ اس کے ساتھ گئے۔ جب موسیٰ حضرت شعیب کے پاس پہنچے تو اپنے گزشتہ واقعات ان کو سنائے۔ فرمایا اب تم ڈرو مت خدا نے ان ظالموں سے تم کو نجات دی۔

دونوں لڑکیوں سے ایک لڑکی نے کھڑے ہو کر حضرت شعیب سے کہا بابا جان یہ قوی دیانتدار شخص ہے۔ جو

کچھ زیادہ سے زیادہ اُجرت آپ ان کو دے سکتے ہیں وہ دیجئے۔

حضرت شعیب نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ایک لڑکی کا نکاح تم سے کر دوں۔ لیکن اس کا مہر یہ ہوگا کہ تم آٹھ برس ہماری بکریاں چراؤ اور اگر دس برس پورے کر دو تو اور اچھا ہے مگر میں تمہیں اس پر مجبور نہیں کرتا۔ انشاء اللہ تم مجھے اچھا آدمی پاؤ گے۔ جناب موسیٰ نے کہا بہتر ہے۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو مدت میں چاہوں گا پوری کر دوں گا جب مدت پوری ہوگئی تو جناب موسیٰ اپنی بی بی صفورا کو لے کر مصر کی طرف روانہ ہوگئے جناب شعیب نے چلتے وقت بطور تحفہ اپنی وہی عصا انہیں دیا کہ اس کو احتیاط سے اپنے پاس رکھنا یہ کبھی تمہارے کام آئے گا۔

یہ وہی عصا ہے جس سے جناب موسیٰ نے فرعون اور اس کے گروہ کو زیر کیا تھا۔ جس طرح جناب شعیب نے اپنے داماد کو عصا دیا اسی طرح حضور سرور انبیاء نے اپنے داماد علی کو ذوالفقار دی۔ جس سے انہوں نے کفار و مشرکین کا صفایا کیا۔

جناب شعیب یادِ خدا میں اس قدر روئے کہ ان کی بصارت زائل ہوگئی۔ خدا نے پھر ان کو بینا بنا دیا وہ پھر روئے اور نابینا ہوگئے۔ خدا نے ان کی بصارت پھر پلٹا دی۔ تیسری بار پھر اسی طرح روئے۔ ندا آئی اے شعیب اگر تم شوق جنت میں روتے ہو تو جنت کو تم پر واجب کیا اور اگر خوفِ نار میں روتے ہو تو آتش دوزخ کو تم پر حرام کیا۔ عرض کی خدا وندا نہ میں شوق جنت میں روتا ہوں نہ خوفِ جہنم میں۔ میں تو تیری محبت میں روتا ہوں۔ وحی ہوئی کہ پھر کیا چاہتے ہو۔ عرض کی بس اتنا کر تو ایک بار یہ کہہ دے یَا شُعَیْبُ اَنْتَ حَبِیْبِیْ اے شعیب تم میرے دوست ہو۔ آواز آئی یَا شُعَیْبُ اَنْتَ حَبِیْبِیْ اس پر اس درجہ خوش ہوئے کہ وہ شادی مرگ بن گئی اور ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

امیرالمومنین علیہ السلام بھی رو رو کر فرمایا کرتے تھے۔ اِلٰهِیْ مَا عَبَدْتُكَ طَمَعًا بِجَنَّتِكَ وَلَا خَوْفًا مِّنْ نَارِكَ بَلْ وَجَدْتُكَ مُسْتَحِقًّا لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُكَ (الٰہی نہ میں شوق جنت میں تیری عبادت کرتا ہوں نہ جہنم کے خوف سے۔ بلکہ میں نے تجھ کو مستحق عبادت سمجھا ہے اس لیے تیری عبادت کرتا ہوں) اس عبادت کو آزاد مردوں کی عبادت کہتے ہیں۔ ورنہ جو لوگ شوق جنت میں عبادت کرتے ہیں۔ وہ تاجرانہ ذہنیت کے لوگ ہیں اور جو لوگ خوف دوزخ میں روتے ہیں وہ غلامانہ ذہنیت کے ہیں۔ پہلا گروہ عبادت کی قیمت چاہتا ہے اور دوسرا گروہ غلاموں کی طرح خوف سے کام کرتا ہے۔

غور کیجئے ایک وہ نبی تھے جو خدا سے اپنے کو حبیب کہلوانا چاہتے تھے اور ایک وہ تھے جن کے لیے خدا نے فرمایا۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (سورہ آل عمران ۳/۳۱) (اے رسول کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے

والے ہو۔ تو میری پیروی کرو۔ اللہ تمہیں دوست رکھے گا) یعنی رسول کا پیرو خدا کا دوست ہے کتنا فرق ہے ان دونوں حالتوں میں۔

محبت کا مزہ تو یہ ہے ؏

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

یک طرفہ محبت ناقص محبت ہے خداوند عالم فرماتا ہے:

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ (سورہ المائدہ ۵/۵۴)

(یعنی اے ایمان والو! اگر تم اپنے دین سے پھر جاؤ گے تو ہمیں اس کی پروا نہیں۔ اللہ تمہاری جگہ ایسی قوم کی قوم لے آئے گا۔ جن کو اللہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ اللہ کو دوست رکھتے ہوں گے۔)

مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ علی علیہ السلام کی شان میں ہے۔ اس کی تفسیر حضرت رسولؐ خدا نے جنگ خیبر میں بیان کر دی۔ جب یہ فرمایا۔

لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَةَ غَدًا رَجُلًا كَرَّارًا غَیْرَ فَرَّارٍ یُحِبُّ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَیُحِبُّهُ اللّٰهُ وَالرَّسُوْلُ

(کل میں اپنا علم ایسے شخص کو دوں گا جو کرار غیر فرار ہوگا۔ وہ اللہ اور رسول کو دوست رکھتا ہوگا اور اللہ اور اس کے رسول اسی کو دوست رکھتے ہوں گے۔ چونکہ یہ علم دوسرے روز حضرت علی کو دیا گیا لہٰذا معلوم ہوا کہ علی وہ شخص ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور خدا کو ان سے۔

ایک لطیف نکتہ آیت اور حدیث کے الفاظ میں یہ ہے کہ آیت میں پہلے یحبھم ہے جس کے معنی ہیں اللہ ان کو دوست رکھتا ہے یعنی محبت کا اظہار پہلے اللہ کی طرف سے ہوا اور رسول اللہ نے جو فرمایا وہ یہ ہے یحب اللہ وہ اللہ کو دوست رکھتا ہے اب تو معلوم ہو گیا کہ بلیٹی ہوئی دو طرفہ محبت ہے ادھر سے اللہ اظہار محبت کر رہا ہے اور ادھر رسول علی کی طرف سے خدا کی محبت کا اعلان کر رہے ہیں۔

پھر اتنا ہی نہیں رسولؐ اللہ نے فرمایا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّ عَلِیًّا فَاَحِبَّهٗ وَاَحِبَّ مَنْ یُّحِبُّهٗ (خداوندا! میں علی کو دوست رکھتا ہوں پس تو بھی اس کو دوست رکھ اور اس کو بھی دوست جو اسے دوست رکھے۔)

ایسی ہی محبت کے متعلق شاعر نے کہا ہے۔ ؏

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں

بلکہ اس خدائی محبت نے اتنی ترقی کی کہ امیرالمومنین علیہ السلام نزدِ رسولؐ احب خلق قرار پائے چنانچہ حدیث طیر میں ہے کہ حضرت رسولؐ خدا کے پاس کسی نے ایک بُھنا ہوا پرندہ بھیجا۔ حضورؐ نے دعا فرمائی۔

اَللّٰهُمَّ اٰتِنِیْ بِاَحَبِّ خَلْقِكَ اِلَیْكَ لِیَاْكُلَ مَعِیَ هٰذَا الطَّیْرِ۔ خداوندا اس وقت میرے پاس ایسے شخص کو بھیج جو تیرے نزدیک تیری مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہو۔ چنانچہ علی بن ابی طالبؑ تشریف لے آئے۔ خدا کی محبت یوں ہی نہیں مل جاتی بلکہ اس کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔

خداوند عالم نے جناب موسیٰ سے فرمایا تھا:

یَامُوْسٰی كَذِبَ مَنْ زَعَمَ اَنَّهٗ یُحِبُّنِیْ وَهُوَ یَنَامُ طُوْلَ اللَّیْلِ اَلَیْسَ كُلُّ حَبِیْبٍ یُحِبُّ الْخَلْوَةَ مِنْ حَبِیْبِهٖ یَا ابْنَ عِمْرَانَ لَوْرَاَیْتَ الَّذِیْنَ یُصَلُّوْنَ فِی الدُّجٰی وَقَدْ مَثَّلْتُ نَفْسِیْ بَیْنَ اَعْیُنِهِمْ یُخَاطِبُوْنِیْ وَجَلَلْتُ عَنِ الْمُشَاهَدَةِ اَیُكَلِّمُوْنِیْ وَقَدْ عَزَزْتُ عَنِ الْحُضُوْرِ یَا ابْنَ عِمْرَانَ هَبْ لِیْ مِنْ عَیْنَیْكَ الدُّمُوْعَ وَمِنْ قَلْبِكَ الْخُشُوْعَ ثُمَّ ادْعُنِیْ فِیْ ظُلَمِ اللَّیَالِیْ تَجِدْنِیْ قَرِیْبًا مُجِیْبًا۔

(اے موسیٰ جھوٹا ہے وہ شخص جو اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مجھے دوست رکھتا ہے اور وہ پوری رات پاؤں پھیلا کر سوتا ہے۔ کیا کوئی دوست اپنے دوست کے ساتھ خلوت پسند نہیں کرتا۔ عمران کے بیٹے کاش تو ان لوگوں کو دیکھتا جو اندھیری راتوں میں نمازیں پڑھتے ہیں۔ اور گویا ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوں۔ وہ مجھ سے کلام کرتے ہیں اور گویا میں ان کے مشاہدہ میں ہوتا ہوں تاکہ وہ مجھ سے بات چیت کریں۔ اے عمران کے بیٹے مجھے اپنی آنکھوں کے آنسو دے دو۔ اور اپنے قلب کی رجوع۔ پھر مجھے راتوں کی تاریکی میں پکارو۔ میں تمہارے پاس ہی ہوں گا۔ اور میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا۔)

یہ تمام صفتیں امیرالمومنین علیہ السلام میں پائی جاتی تھیں۔ وہ تمام تمام رات عبادتِ خدا کرتے اور اس کے حضور میں اپنی عاجزی کا اظہار کرتے تھے۔ اتنا روتے تھے کہ ریشِ مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔

کمال محبت یہ ہے کہ محبوب کی مرضی حاصل کرنے میں جو تکالیف انسان کو پہنچیں ان میں اس کو لذت محسوس ہونے لگے۔ دنیا میں تین قسم کے عاشق ہوتے ہیں۔ اوّل وہ جو کہ محبت میں درد اور دکھ پہنچنے سے گھبرا جاتے ہیں۔ اور زبان شکایت کھول دیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو صبر و ضبط سے کام لیتے ہیں۔ شکایت نہیں کرتے۔ اور اضطراب کا اظہار بھی نہیں کرتے جو کچھ گزرتی ہے اُسے جھیل جاتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں عشق مجازی کی ہیں۔ پہلی محبت کی سب سے ادنیٰ قسم ہے۔ دوسری خلوص کی ایک ناقص اور نا تمام صورت ہے۔ تیسری قسم یہ ہے کہ درد میں

لذت محسوس ہونے لگے۔ اور رضائے محبوب کے حصول میں جن تکالیف کا سامنا ہو ان میں مزہ آنے لگے اور شوق اس منزل پر پہنچ جائے کہ دل میں تمام مصائب میں اضافہ کا خواستگار ہو۔ یہ منزل بہت اُونچی ہے۔ بڑے سے بڑے سالک یہاں تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ منزل صرف محمد وآل محمد علیہم السلام سے مخصوص ہے۔ ان مصائب کا ہجوم جتنا ہوتا تھا۔ ان کے چہروں کا رنگ کھلتا جاتا تھا۔

سالکان راہ خدا اور عارفان منازل صدق وصفا نے عاشق صادق کی علامتیں چودہ بیان کی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی نہ پائی جائے گی تو عشق کمال کے درجے کو نہ پہنچے گا۔

۱۔ رات میں کوئی وقت یاد محبوب سے خالی نہ رہے۔

۲۔ وہ ہر کام خدا کی خوشنودی کے لیے کرے۔ اور اس کو انجام دے کر خوش ہو۔

۳۔ فقر و فاقے سے اکتائے نہیں اور اپنی ضرورتوں کا لحاظ کر کے دوسروں کی حاجت روائی سے رُکے نہیں۔

۴۔ روزی کی تنگی کا شکوہ نہ کرے۔ اور دل تنگ ہو کر اس کی یاد سے رُکے نہیں۔

۵۔ پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اتنا خوش ہو گویا لباس حریر در دیبا پہن لیا۔

۶۔ دنیا کی نعمتوں کو حقیر سمجھے اور نجاتِ اخروی پر نظر رکھے۔

۷۔ اپنے ہر عمل میں اطاعت حبیب ملحوظ رکھے۔

۸۔ محبّت کی آگ میں دل و جگر کو جلائے۔ بیماروں کی طرح چہرہ زرد ہو۔ لب خشک ہوں اور دل میں پکتی ایک دیگ کی طرح جوش ہو۔

۹۔ دنیوی ساز و سامان سے دل کو وحشت ہو۔ جس سے دل لگائے لحب اللہ اور جس سے دشمنی کرے وہ لبغض اللہ۔

۱۰۔ بظاہر لَب پر ہنسی ہو لیکن دل آتش سے جل رہا ہو۔

۱۱۔ راتوں کو تاریکیوں میں وہ رو رو کر اپنے دل کی بھڑکتی آگ کو تسکین دیتا ہو۔

۱۲۔ باوجود بے جرم و خطا ہونے کے وہ اپنی تقصیر کا اعتراف کر کے خدا سے عفو کا طالب ہو۔

۱۳۔ اس نے اپنی ہستی کو عشق خدا میں اس طرح فنا کر دیا ہو کہ اپنے نفس کے لئے کوئی کام کرتا ہی نہ ہو۔

۱۴۔ اس کے ہر عمل سے خلوص ٹپکتا ہو۔

آپ ایک ایک دفعہ کو لیجئے اور اہل بیتؑ کی زندگی کی ہر موڑ پر، عمل کے ہر پہلو پر، کردار کی ہر سطح پر اس کو چسپاں کر کے دیکھئے آپ کو کہیں جھول نظر نہ آئے گا۔

اب ایک اعتراض کا جواب دینا باقی ہے اگر اہل بیت علیہم السلام کو ہر درد میں لذت محسوس ہوتی تھی تو پھر وہ اپنی

تکلیفوں کو دوسروں سے بیان کیوں کرتے تھے۔ دشمنوں کے مظالم کا شکوہ کیوں کرتے تھے سینہ زنی اور سینہ کوبی کیوں کرتے تھے آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں کیوں بہاتے تھے۔

جواب یہ ہے کہ اگر ایسے کاموں کا اظہار ان سے نہ ہوتا۔ جو فطرت بشریہ کے لوازم سے ہیں۔ تو پھر وہ انسان سے الگ کوئی نوع ہوتے ان کو انسان کہنا ایک دھوکا ہوتا۔ دوسرے اگر ایسے امور بجا لاتے تو دشمنوں کے مظالم پر پردہ پڑا رہتا اور لوگوں کو پتہ نہ چلتا کہ یہ کیسی تاریک منزلوں سے گزر رہے ہیں۔ اگر ایسے امور ان سے سرزد نہ ہوتے تو انسانی ہمدردی ہرگز ان کی طرف نہ بڑھتی۔ ایسے امور سے اگر اجتناب کرتے تو لوگوں کو ہرگز اس کا یقین نہ ہوتا کہ جو تکلیف ان کو دی گئی ہے وہ باعث اذیت ہے۔

جہاں تک عشق کا تعلق ہے وہ اس امر میں لذت محسوس کرتے تھے۔ کہ وہ ابتلاءات کو محبت الٰہی میں اپنے اُوپر خوشی سے لے رہے ہیں اور ان کی جان ان کا مال اور ان کی آبرو راہِ خدا میں کام آ رہی ہے۔ لیکن جہاں سے بشریت کا تعلق ہے وہ اس کے مقتضیات کو دبانا نہیں چاہتے تھے۔

کربلا والوں نے جن مظالم کو صبر و استقلال سے برداشت کیا اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی، ان کی جگہ دوسرا ہوتا تو میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا یا دشمن کے سامنے سر نیاز خم کر دیتا۔

مردوں کا کیا ذکر ان کی عورتوں اور بچوں نے مرضی الٰہی کے خلاف ایک قدم اٹھانا گوارا نہیں کیا۔ اسیری۔ قید تشہیر سب کچھ گوارا کر لیا مگر امر باطل کو کبھی حق نہیں کہا۔ انہوں نے اپنے حال زار پر لوگوں کو توجہ دلائی۔ انہوں نے ظالموں سے نفرت کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا۔ انہوں نے قوم کے خفتہ احساس کو جگایا۔ انہوں نے اعلانِ حق کی جرأت لوگوں میں پیدا کی۔ باطل کے خوف کو دلوں سے نکالا۔

کوفہ میں ان کی تقریروں سے انقلاب آیا۔ زن و مرد کے دلوں میں ہل چل مچ گئی۔ ناواقفوں کو صحیح حالات کا پتہ چلا۔

منقول ہے کہ جب یزید کا جواب آگیا تو ابن زیاد نے عمر سعد کو بلا کر کہا تو ان اسیروں کو لے کر مع سرہائے شہداء جانب دمشق روانہ ہو اور ایک ہزار سوار اور پانسو پیادے اپنے ساتھ لیتا جا۔ جہاں تک ممکن ہو راستہ کے تمام شہروں اور بستیوں میں حسین کی شہادت کا اعلان کرتے جانا۔ چنانچہ وہ شقی کوفہ سے روانہ ہوا۔ بعض کے نزدیک پہلی منزل کربلا میں کی اور بعض کے نزدیک حران میں اور یہ ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

جب یہ لوگ شام کے قریب اس منزل پر پہنچے تو شراب پینے اور خوشیاں منانے میں مشغول ہوئے قیدیوں کو خالی زمین پر بٹھا دیا اور پہرہ داروں پر مقرر کر دیئے۔ ناگاہ ان کی نظر ایک دیوار پر گئی جس پر ایک نورانی قلم سے یہ شعر لکھا ہوا پایا ؎

اَتَرجُوا اُمَّۃٌ قَتَلَتْ حُسَیْنًا   شَفَاعَۃَ جَدِّہٖ یَوْمَ الْحِسَابِ۔

کیا وہ قوم جس نے حسین کو قتل کیا ہے ——— روز حساب ان کے جد کی سفارش کی امید رکھے گی

یہ شعر پڑھ کر ان پر خوف طاری ہوا اور شراب کے پیالے ہاتھوں سے گر گئے۔ ناگاہ ایک غیبی آواز نے یہ شعر سنایا۔

مَاذَا تَقُوْلُوْنَ اِذْ قَالَ النَّبِیُّ لَکُمْ ——— مَاذَا صَنَعْتُمْ وَاَنْتُمْ اٰخِرُ الْاُمَمِ

کیا جواب دو گے جب تمہارے نبی پوچھیں گے ——— کہ تم نے میری اولاد کے ساتھ کیا کیا

دوسری منزل تکریت تھی یہاں نصرانیوں کا عبادت خانہ تھا۔ جب فوج یزید اس کے قریب جا کر اتری تو راہب نے پوچھا یہ سر کس کا ہے انہوں نے کہا یہ حسین ابن علی کا سر ہے۔ اس نے کہا وہی حسین جو بنت رسولؐ کا فرزند ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ یہ سنتے ہی راہب چیخ پڑا اور کہا تم مسلمان ہو۔ انہوں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا کیسے مسلمان ہو۔ کہ جس نبی کا کلمہ پڑھتے ہو۔ اسی نبی کے نواسے کا خون بہاتے ہو۔ ہمارے معبد میں حضرت عیسیٰ کے گدھے کے سم کا ایک ٹکڑا رکھا ہے۔ دور دور سے عیسائی اس کی زیارت کو آتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں اس کے بعد اس نے کہا خدا وندا لعنت کر ان لوگوں پر جنہوں نے تیرے نبی کے نواسے کا سر کاٹا۔

بروایت ابو مخنف جب چوتھی منزل صاباد پر پہنچے اور وہاں کے لوگوں کو خبر معلوم ہوئی۔ تو مرد عورتیں، بوڑھے جوان اور بچے تماشا دیکھنے نکلے۔ جناب زینبؑ نے دردناک لہجے میں فرمایا۔ اے مسلمانو وائے ہو تم پر کیا اپنے گھروں سے اس سر کو دیکھنے نکلے ہو جو تمہارے نبی کے نواسے کا سر ہے۔ اے غیرت دار بیبیو! کیا تم تماشا دیکھنے اس بی بی کا نکلی ہو جو تمہارے نبی کی نواسی اور علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹی ہے۔ ایک عورت نے پوچھا کیا تم زینبؑ ہو۔ فرمایا ہاں میں زینبؑ ہوں۔ یہ سنتے ہی وہ زن مومنہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور اپنے قبیلے والوں کو بآواز بلند پکارنے لگی کیا کھڑے دیکھ رہے ہو ان ظالموں نے تمہارے رسولؐ کا گھر برباد کر دیا۔ ان ظالموں سے ان قیدیوں کو اور حسین کے سر کو چھین لو۔ اس آواز کے ساتھ تمام عورتوں اور مردوں میں کہرام بپا ہو گیا۔ اور وہ لوگ فوج یزید سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ حال دیکھ کر عمر بن سعد نے حکم دیا کہ یہاں سے جلد از جلد نکل چلو۔

صاحب ریاض المصائب لکھتے ہیں کہ جب یہ قافلہ منزل عین الوردہ پر پہنچا تو ان لوگوں نے حاکم حلب کو لکھا کہ ہم سے آکر مل جاؤ۔ جب یہ خبر شہر میں پھیلی اور عبداللہ بن عمرو بن قیس بن سعد انصاری کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ سر حسینؑ کو لے کر آرہے ہیں اور رسولؐ کے کنبے کو قیدی بنایا ہوا ہے تو اس نے زار زار رونا شروع کیا۔ یہ شخص امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا پروردہ تھا اور بے پناہ محبت ان سے رکھتا تھا یہاں تک کہ جب حضرت امام حسن علیہ السلام کو زہر سے شہید کیا گیا تو اس شخص نے اپنے گھر میں ایک قبر بنائی اور اس پر ریشمی چادر

ڈالی۔ صبح و شام اس کے پاس بیٹھ کر رویا کرتا تھا۔ جب یہ ہولناک خبر اس نے سنی تو روتا ہوا اپنے گھر آیا اور اپنی بیٹی کو سارا ماجرا سنایا۔ اس نے کہا بابا پنج تن پاک میں صرف ایک نام حسینؑ کا باقی تھا ظالموں نے اسے بھی ختم کر دیا۔ اب زندگی کا کیا مزہ ہے۔ واللہ میں اب بھی چین سے نہ بیٹھوں گی۔ اپنی جان حسینؑ پر قربان کر دوں گی۔ میں اپنے رشتہ داروں کو بلاتی ہوں تاکہ وہ مرنے پر تیار ہوں۔ اور ان ظالموں کے پنجے سے قیدی عورتوں کو چھڑالیں تاکہ خدا ہمیں اس کا اجر عطا فرمائے۔ ہم سرِ حسینؑ کو ان سے چھین کر اپنے گھر میں دفن کریں گے جو ہمارے لیئے باعثِ فخر ہو گا۔ اس لڑکی کا نام دُرّۃ الصدف تھا۔ باپ نے کہا بے شک ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

دُرّۃ الصدف گھر سے باحال پریشان نکلی اور حلب کے گلی کوچوں میں آواز دینے لگی۔ اے محبانِ حسینؑ کیا چین سے گھروں میں بیٹھے ہو۔ حسینؑ شہید کر دیئے گئے ہیں۔ اور زینبؑ و ام کلثوم کو اسیر کر کے دمشق لے جایا جا رہا ہے۔ مردو! عورتو! اور بچو گھروں سے نکل پڑو۔ اس مومنہ کا سر برہنہ تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ گریبان چاک تھا۔

اس کی آواز سنتے ہی اس کے قبیلے کی عورتیں سر پیٹتی نکل پڑیں۔ اور اس کے چچازاد بھائیوں میں ستر جوان ہتھیار بدن پر سجا کر لڑنے مرنے کے لیئے تیار ہو گئے۔ اس نے کہا میرے ساتھ چلو اور جیسا میں کہوں ویسا کرو۔ ہم کو چاہیئے کہ ان لوگوں کو حلب میں داخل ہونے سے پہلے جا لیں۔ اور زنانِ اہلِ بیت کو مع سرہائے شہداء ان سے چھین لیں۔ بہت سی عورتیں بھی ساتھ ہو گئیں۔ جب ٹکرے پر پہنچ کر دُرّۃ الصدف نے دیکھا کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ستر آدمی ان کا مقابلہ نہ کر سکیں گے تو اس نے بھی اپنے ساتھیوں سے کہا۔

اس وقت ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم اس وقت پلٹ چلیں، اور اپنے مجمع کو بڑھا کر پھر کسی منزل پر ان سے مقابلہ کریں۔ افسوس ہے کہ دُرّۃ الصدف جلد اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اور اسیروں کا قافلہ دمشق پہنچ گیا۔

ایک منزل کے حال میں لکھا ہے کہ جب اسیروں کا قافلہ شہر کے اندر سے گزرا تو تماشائی عورتوں نے پوچھا۔ اے اسیرو! تم کس قبیلے کے ہو اور کہاں کے رہنے والے ہو اور نیزۂ طویل پر یہ کس کا سر ہے۔

جنابِ زینبؑ نے کہا تم نے مدینہ میں رسولؐ کا نام سنا تو ہو گا۔ انہوں نے کہا وہ کون سا بدبخت مسلمان ہے جو اپنے نبی کے دارالہجرت کو نہیں جانتا۔ فرمایا تم حسینؑ کو جانتی ہو۔ ایک بی بی نے کہا سبحان اللہ کیوں

نہیں جانتے وہ ہمارے نبی کے نواسے ہیں۔ ہماری شہزادی جناب فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا کے فرزند ہیں. خدا ان کو سلامت رکھے۔ میں کبھی مدینہ جاتی ہوں بغیر اپنی شہزادی جناب زینبؑ و اُمّ کلثوم کو سلام کئے واپس نہیں ہوتی۔ میرا نام حُرّہ بنت الحارث ہے۔ یہ سُن کر جناب زینب کو تابِ ضبط نہ رہی کیونکہ آپ نے اسے پہچان لیا. فرمایا اے حُرّہ اب کہاں حسینؑ اور کہاں زینبؑ و ام کلثوم۔ تیرے نبی کا گھر برباد ہوگیا۔ حسینؑ کو ان ظالموں نے کربلا میں شہید کر دیا اور ہم کو قید کر کے دمشق لیے جا رہے ہیں۔ حُرّہ میں وہی زینبؑ ہوں جس کے لئے تو تحفے لایا کرتی تھی آہ! اب ہم اس قابل بھی نہیں کہ کسی کو اپنا منہ دکھائیں۔ یہ سنتے ہی اس مومنہ نے ایک چیخ ماری اور اس کی روح جنت العالیہ کو پرواز کر گئی۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

انتیسویں مجلس

قصّہ جناب موسیٰ و ہارون علیہما السلام
اور
فضائل اہل بیت و دمشق میں اہل حرم کا داخلہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِیَآءً وَّذِکْرًا لِّلْمُتَّقِیْنَ

(سورہ الانبیاء ۴۸/۲۱)

ہم نے موسیٰ و ہارون کو حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب جو نور و ذکر ہے متقیوں کے لیے عطا کی۔

جناب موسیٰ بن عمران فرعون مصر کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ جس کا نام مصعب تھا اس نے چار سو برس عمر پائی۔ حکومت ملنے کے بعد اس پر خدا بننے کا خبط سوار ہوا۔ دولت کے پرستاروں کی دنیا میں کمی کیا ادھر جب سلطنت کی دھمک اور تلواروں کی چمک بھی کلیجے لرزانے والی ہو تو بے شمار خدائی کے گواہی دینے والے بھی مل جائیں گے۔

فرعون قبطی قوم سے تھا اور موسیٰ بنی اسرائیل سے تھے۔ جس زمانے سے اس کی خدائی زور و شور سے چل رہی تھی۔ کاہنوں نے اسے خبر دی کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے جس کا نام موسیٰ ہوگا۔ وہ تیری خدائی کو

کو بھی باطل کر دے گا اور تیری ہلاکت کا بھی باعث ہوگا۔ اس نے کہا اس کا انتظام میں کئے دیتا ہوں حکم دیا کہ اعلان کر دیا جائے کہ بنی اسرائیل میں جب کوئی عورت حاملہ ہو تو اس کی اطلاع سرکاری دفتر میں دیدے اور پھر ایک چوکیدار اس کے دروازے پر جا بیٹھے۔ جوں ہی کہ بچہ پیدا ہو۔ اگر لڑکی پیدا ہو تو اسے چھوڑ دے اور لڑکا ہو تو فوراً ذبح کر ڈالے۔

جناب موسیٰ کے شبہ میں اس نے دس ہزار بچوں کو قتل کرایا۔ مگر جس کو خدا زندہ رکھنا چاہے اسے کون مارے جناب موسیٰ کا حمل اس طرح قرار پایا کہ دیکھنے والوں کو محسوس بھی نہ ہوا۔ جناب موسیٰ تولد ہوئے تو ایک پڑوسی نے مخبری کر دی۔

منقش (جاسوس) تحقیق کو چلا۔ جب مادر موسیٰ نے اس کو آتے دیکھا تو حضرت موسیٰ کو چپکے سے جا کر تنور میں رکھ دیا۔ منقش نے گھر میں داخل ہو کر کہا کیا تمہارے بچہ پیدا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا مجھ سے تو پوچھتا ہے اور منقش ہو کر خود نہیں پہچان سکتا کہ میں بچہ والی ہوں یا نہیں۔ جب اس نے کوئی آثار نہ پائے تو واپس آگیا یہاں تو یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ کنیز نے ناد انستگی کے عالم میں تنور میں لکڑیاں ڈال کر آگ بھڑکا دی۔

جناب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے جب تنور سے شعلے نکلتے دیکھے تو گھبرائیں۔ تنور کے پاس آئیں دیکھا تو موسیٰ علیہ السلام کو صحیح سالم ہیں اور آگ کے شعلوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ خدا تعالیٰ نے جناب ابراہیم کو نمرود کے شعلوں سے بچایا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کو تنور کے شعلوں سے۔

خداوند عالم نے مادر موسیٰ کو وحی کی۔ کہ اس بچے کو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دو۔ دریا اس صندوق کو مناسب جگہ پر کنارے کے ساتھ لگا دے گا۔ اور لے گا اس کو ایک میرا اور موسیٰ کا دشمن۔ اور پھر میری نگرانی میں موسیٰ پرورش پائے گا۔

وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک شریعت کے متعلق جو انبیاء سے متعلق ہوتی ہے۔ دوسری بمعنی الہام جو غیر انبیاء بلکہ جانوروں تک پہ کی جاتی ہے۔ جیسے خدا نے شہد کی مکھی کو وحی کی۔ یا مادر موسیٰ پر وحی کی۔

اس وحی کے مطابق مادر جناب موسیٰ نے صندوق میں موسیٰ کو رکھ دیا۔ اور پھر دریا کی موجوں کے سپرد کر دیا۔ پانی کی کیا طاقت تھی کہ ایک نبی خدا کو ڈبو دیتا۔ آگ نے نہ ابراہیمؑ کو جلایا اور نہ پانی نے جناب موسیٰ کو ڈبویا۔ یہ انبیاء کی خصوصیات سے ہے۔

مادر موسیٰ نے اپنی لڑکی سے کہا کہ تم دریا کے کنارے کھڑی دیکھتی رہو کہ صندوق کہاں جاتا ہے۔ جب فرعون اور اس کی بی بی آسیہ اپنے محل پر سے دریا کی موجوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ناگاہ کوئی چیز بہتی ہوئی نظر آئی۔ فرعون نے نوکر کو بھیج کر صندوق دریا سے نکلوا کر محل میں منگوایا۔ کھولا تو اس میں سے ایک نہایت خوبصورت

بچہ پایا۔ آسیہ نے فوراً گود میں لے کر پیار کیا۔ اور کہا کہ ہمارے ہاں کوئی بچہ نہیں اسے ہم اپنا بچہ بنا لیتے ہیں۔
آسیہ زن فرعون بڑی مومنہ تھیں۔ اور ان چار بیبیوں میں سے تھیں جن کی تعریف حضرت رسولؐ خدا نے کی ہے
چونکہ جناب موسیٰ کی پرورش محل فرعون میں ہونے والی تھی۔ لہذا خدا نے پہلے سے ایک زن مومنہ کا انتظام
اس کافر کے گھر میں کر رکھا تھا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ابو طالب (نعوذ باللہ) کافر تھے۔ وہ ذرا سوچیں
کہ خدا نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش معاذ اللہ ایک کافر کی آغوش تربیت میں کیونکر
منظور کر سکتا تھا۔

جناب آسیہ نے فرعون سے کہا نہ معلوم یہ بچہ کب سے اپنی ماں سے چھٹا ہوا ہے۔ دائیوں کو بلاؤ۔ جب
دائیاں آئیں تو حضرت موسیٰ کی بہن بھی ان کے ساتھ محل فرعون میں داخل ہو گئیں۔ ایک دائی نے چھاتی منہ میں
دینی چاہی مگر موسیٰ نے منہ نہ لگایا۔ دوسری نے بڑھ کر لیا مگر آپ نے اس کا بھی دودھ نہ پیا۔ اب آسیہ اور
فرعون دونوں پریشان ہوئے۔ جناب موسیٰ کی بہن نے کہا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ (سورہ القصص
۲۸/۱۲) کیا میں ایسے خاندان کی عورت لے آؤں جو اس کی کفالت کی ذمہ دار ہوں۔ فرعون نے کہا جا اور ابھی لے
آ۔ جب مادر موسیٰ آئیں تو موسیٰ انہیں دیکھ کر ہمکے اور ان کی چھاتی سے دودھ پینے لگے۔

لوگ کہتے ہیں حضرت رسولِ خدا نے ثویبہ کنیز ابولہب کا دودھ پیا تھا۔ کیسے ممکن ہے کہ جس خدا نے موسیٰ
کو کافر دائیوں کا دودھ نہ پینے دیا وہ ایک کافرہ کا دودھ اپنے محبوب کو پلوا دیتا۔ یا تو ثوبیہ کافرہ نہ تھی بلکہ حلیمہ
کی طرح دین ابراہیمؑ پر تھی۔ ورنہ درایتاً یہ روایت ماننے کے قابل نہیں۔

ایک دن فرعون نے موسیٰ کو گود میں لیا۔ آپ نے اس کی ڈاڑھی پکڑ کر اس زور سے طمانچہ مارا کہ اس کا
جبڑا ہل گیا۔ وہ مارے غصّے کے آگ ہو گیا۔ اور حکم دیا کہ ابھی اسے قتل کر دو۔ یہ وہ بچہ معلوم ہوتا ہے جس کی پیشن گوئی
کاہنوں نے کی ہے۔ آسیہ نے کہا تم کیا خاک خدائی کرو گے جب اتنی بات نہیں سمجھتے کہ نادان بچہ ہے کیا جانے کس
کی ڈاڑھی ہے اور کس کا گال۔ اس نے کہا عام بچوں میں اتنی قوت نہیں ہو سکتی۔ اس کا طمانچہ تھا یا لوہے کا ہتھوڑا
ہامان نے کہا بہتر یہ ہے کہ اس کا امتحان لیا جائے ایک طشت میں دہکتے ہوئے کوئلے ڈالے گئے۔ اور دوسرے
میں چمکتے دمکتے لال بھرے گئے۔ اور جناب موسیٰ کو دونوں طشتوں کے درمیان چھوڑا گیا۔ جناب موسیٰ نے انگارہ
منہ میں رکھ لیا جس سے زبان جل گئی۔ اور ہمیشہ کے لئے ہکلانے لگے۔ آسیہ نے کہا میں نہ کہتی تھی کہ یہ بچہ ہے اس
کے فعل کا کیا اعتبار۔ اگر سمجھدار ہوتا تو جلتا ہوا کوئلہ منہ میں کیوں رکھتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ عالم امری کی مخلوق بطن مادری سے صاحب عقل و فہم پیدا ہوتی ہے اور وقت کی
جیسی ضرورت ہوتی ہے ویسے ہی امور ان سے ظاہر ہوتے ہیں۔

تیس برس تک جناب موسیٰ فرعون کے گھر میں پرورش پاتے رہے ایک دن وہ مصر میں گھوم پھر رہے تھے کہ دو آدمیوں کو لڑتے دیکھا۔ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ (سورہ القصص ۱۵/ ۲۸) ایک ان کا شیعہ تھا یعنی بنی اسرائیل میں سے تھا اور دوسرا ان کا دشمن قبطی تھا۔ جو شیعہ تھا اس نے موسیٰ سے فریاد کی۔ انہوں نے تان کر ایک ایسا گھونسا اس کے مارا کہ وہ مرگیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی کے پیرو پر اس زمانہ میں لفظ شیعہ بولا جاتا تھا بلکہ اس سے بھی بہت پہلے وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (سورہ الصفت ۸۳/ ۳۷) (ابراہیم نوح کے شیعوں میں سے تھے) پس یہ کہنا کس قدر نادانی ہے کہ یہ مذہب حضور کے بعد پیدا ہوا اور اس کا بانی عبداللہ بن سبا ہے۔ جب نبی کا تابع شیعہ کہلاتا ہے تو حضورؐ کے زمانہ میں اس کا وجود ماننا پڑے گا۔ اب حضرت موسیٰ کو یہ خوف ہوا کہ یہ بات جب فرعون کو معلوم ہوگی تو مجھ سے باز پرس ہوگی اور نہ معلوم کیا ہنگامہ برپا ہو۔ اسی فکر میں چلے جا رہے تھے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کہا اے موسیٰ تم یہاں سے جلد از جلد نکل جاؤ اور یہ لوگ تمہارے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں اس شخص کا نام حزتیل تھا۔ اس کو مومن آلِ فرعون کہتے ہیں۔ قرآن میں اس کا ذکر دوسری جگہ یوں ہے۔ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ (سورہ مومن ۲۸/ ۴۰)۔ (ایک مرد مومن نے جو آلِ فرعون سے تھا کہا)

جو لوگ کہتے ہیں لفظ آل اُمت کے لیے بھی بولا جاتا ہے یعنی کسی شخص کے تابعین پر تو وہ اس آیت پر نظر ڈالیں جو مرد مومن یعنی موسیٰ پر ایمان لانے والا ہو اس کو تابع فرعون (یعنی آل فرعون) کیونکر کہا جائے گا۔ کافر و مومن ایک جگہ کیسے جمع ہوں گے۔ لہذا صحیح معنی یہ ہوں گے کہ ایک مرد مومن جو خاندان فرعون سے کہنے لگا۔ یہ مرد مومن فرعون کا چچا زاد بھائی تھا بظاہر یہ جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا اس سے ایک بات اور یہ معلوم ہوئی کہ تقیہ اس وقت بھی تھا۔ اور یہ مقام مدح میں ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ وقتِ ضرورت کتم ایمان کا نام ہی تقیہ ہے۔

بہر حال حضرت موسیٰ وہاں سے خوف زدہ ہو کر نکلے فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ز قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (سورہ القصص ۲۱/ ۲۸) یہی آیت جب امام حسین علیہ السلام مدینے سے نکلے تو تلاوت فرمائی تھی۔

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
این دو قوت از حیات آمد پدید

جناب موسیٰ وہاں سے مدین کو روانہ ہوئے یہاں حضرت شعیب کی بیٹی سے شادی کر لی اور آٹھ برس

تک جناب شعیب کی بکریاں چراتے رہے یہ ان کی بی بی کا مہر تھا۔

چونکہ اپنی والدہ کو مصر میں چھوڑ گئے تھے لہٰذا ان کی یاد ستاتی تھی جب معاہدے کے سال ختم ہو گئے تو مع اپنی بی بی کے مصر کا رُخ کیا۔

سردی کا موسم تھا بی بی حاملہ تھیں راہ میں بچہ پیدا ہوا آگ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دور سے آگ نظر آئی۔ بی بی سے کہا میں جا کر ایک چنگاری لیے آتا ہوں تاکہ تم تاپ سکو۔ جوں ہی اس میدان میں پہنچے جہاں آگ نظر آئی تھی اچانک ایک آواز آئی۔ یٰمُوْسٰی ۝ اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی (سورہ طٰہٰ ۱۲/۱۱/۲۰)(اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں نعلین کو علیحدہ کرو۔ تم وادی مقدس میں چل رہے ہو) یہ آگ نہ تھی ایک درخت پر نور چھا رہا تھا۔ نعلین علیحدہ کرنے سے کیا مراد ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس وادی میں لوگ جوتا پہن کر چلتے پھرتے ہی تھے۔ پھر موسیٰ کی نعلین میں کیا بُرائی تھی۔ ہمارے آئمہ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نعلین سے مراد زن و فرزند کی محبت ہے۔ یعنی اب تم کو نبوت دی جا رہی ہے۔ لہٰذا کچھ دیر کو یہ دونوں محبتیں دل سے نکال کر اس طرف متوجہ ہو اور کان دھر کر بات سنو۔ وَاَنَا اخْتَرْتُکَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی (سورہ طٰہٰ ۱۳/۲۰) (میں نے تمہیں چُن لیا لہٰذا جو وحی ہو اس کو غور سے سنو) میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں میری عبادت کرو اور میرے ذکر سے نماز قائم کرو۔

موسیٰ نے یہ آواز پہلے کہاں سُنی تھی گھبرا رہے تھے لہٰذا کچھ دیر سمجھایا بجھایا گیا۔ جب ان کا دل ذرا قابو میں آیا تو فرمایا۔ وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰی (سورہ طٰہٰ ۱۷/۲۰) (اے موسیٰ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ عرض کی اَتَوَکَّؤُا عَلَیْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ وَلِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی (سورہ طٰہٰ ۱۸/۲۰) (یہ میرا عصا ہے میں اس پر تکیہ کرتا ہوں اور بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور دوسرے کام لیتا ہوں۔

یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ خداوند عالم علام الغیوب ہے اس کی لاٹھی جیسی ظاہر بظاہر چیز کے متعلق یہ سوال کرنا کیوں ضروری ہوا۔ بات یہ ہے کہ آگے چل کر اس لاٹھی کو سانپ بنانا تھا۔ اس لیے موسیٰ سے پہلے اقرار کرا لیا کہ یہ لاٹھی ہے تاکہ سانپ بننے کے بعد ان کو یہ شبہ نہ ہو کہ کہیں غلطی سے میں نے سانپ تو نہیں پکڑ لیا تھا۔ دوسرے سوال تو صرف اتنا تھا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ اس کا جواب صرف اتنا ہی کافی تھا یہ میری لاٹھی ہے۔ یہ اس کے کام کیوں بتائے گئے۔ غالباً اس لیے کہ یہ کوئی بیکار چیز میں نے ہاتھ میں نہیں لے لی ہے۔ جو قابلِ اعتراض ہو۔ بلکہ نہایت کارآمد شے ہے۔ دوسرے یہ سُن چکے تھے کہ نعلین کو نکال دینے کا حکم ہوا ہے لہٰذا یہ ڈرے کہ کہیں آگے یہ حکم نہ ہو کہ اس کو بھی پھینک دو بیکار چیز ہے پس کیوں نہ اپنی ضرورتیں بتا دوں۔ یہ وہی لاٹھی تھی۔ جو حضرت شعیب نے عطا کی تھی۔

اب خدا نے فرمایا۔ اچھا اس لاٹھی کو زمین پر ڈالدو۔ اس کا ڈالنا تھا کہ وہ سانپ بن کر زمین پر دوڑنے لگی۔ یہ دیکھ کر موسیٰ ڈر گئے۔ خدا نے فرمایا پکڑ لو۔ ڈرو مت۔ ہم اسے پھر لاٹھی بنا دیں گے۔ موسیٰ نے ہاتھ پر کپڑا لپیٹا اور ڈرتے ڈرتے اس کو پکڑنے کے لیے بڑھے۔

میں عرض کرتا ہوں موسیٰ آپ تو ماشاءاللہ جوان ہیں۔ گہوارہ میں نہیں ہیں۔ یہ سانپ ہے اژدہا نہیں ہے بے خوف ہو کر پکڑ لیجئے۔ سبحان اللہ! کیا نفس تھا علیؑ کا اور شجاعت تھی نفس نبیؐ کی کہ گہوارہ میں اژدھے کا کلّہ پکڑ کر چیر ڈالا۔

یہ پہلا معجزہ تھا جو جناب موسیٰ کو دیا گیا پھر خدا نے فرمایا اپنے ہاتھ کو گریبان میں ڈال کر نکالو۔ بغیر کسی بیماری کے (برص وغیرہ) وہ چمکتا نکلے گا۔ یہ دوسرا معجزہ ہے علی علیہ السلام کو بھی دو معجزے خاص طور سے دیئے گئے۔ موسیٰ کو عصا دیا گیا اور علی کو ذوالفقار۔ موسیٰ کے ہاتھ میں چمک دی گئی اور علیؑ کے ہاتھ میں قوت۔ وہ ید بیضا کہلایا اور یہ ہاتھ یداللہ کہلایا۔ اس کی چمک نے کافروں کے دلوں کو ہلایا۔ اس کی قوت نے خیبر کی چولوں کو ہلایا۔

خدا نے فرمایا اب تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بڑا سرکش ہوگیا ہے۔ موسیٰ نے عرض کی۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ۝ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۝ هَارُونَ أَخِي ۝ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ۝ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ۝ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ۝ إِنَّكَ كُنتَ بِنَا بَصِيرًا ۝ (سورہ طٰہٰ ۲۵/۳۵)

خداوندا میرے سینے کو کشادہ کردے۔ یعنی فرعونی طاقت کے تصور سے جو میں دل تنگ ہو رہا ہوں اس کو دور کردے اور اس امر نبوت کو میرے اوپر آسان کردے اور میری زبان میں جو بستگی پیدا ہوگئی ہے اس کو کھول دے۔ تاکہ لوگ میری بات کو آسانی سے سمجھ لیں اور میرا وزیر میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو قرار دے میری کمر کو اس سے مضبوط کردے تاکہ ہم دونوں تیری خوب سی تسبیح کریں اور خوب تجھے یاد کریں۔ تو ہمارے حال کا دیکھنے والا ہے۔

ان آیات میں بہت سی باتیں قابل غور ہیں۔

۱۔ جناب موسیٰ کی درخواست پر ان کا شرح صدر ہوا۔ اس سے پہلے یہ فضیلت ان کو حاصل نہ تھی یعنی نبوت ملنے کے بعد شرح صدر ہوا لیکن حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شرح صدر بغیر درخواست کے ہوا۔ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (سورہ الم نشرح ۹۴/۱) کیا ہم نے تمہارا سینہ کشادہ نہیں کیا) پھر وقت

نہیں بتایا گیا کہ شرح صدر کب ہوا۔ یہ روایت بالکل غلط ہے کہ حضورؐ کا سینہ جبریل نے چاک کر کے آپ کے دل سے کثافت نکال لی۔ ایک پیکرِ نور کے لیے اس آپریشن کی ضرورت ہی نہیں جس کے کثافت ہو ہی نہیں سکتی۔ اُس کے لیے اس کی ضرورت کیا جو صاحب خلق عظیم ہو۔ جس کا سینہ علم الٰہی کا خزینہ ہو جو مصداق آیت تطہیر ہو۔ اس کے اندر کثافت کہاں۔ جب موسیٰ کے لیے شرح صدر میں آپریشن کی ضرورت پیش نہ آئی تو پھر حضرت کے لیے کیوں؟ کفار سے مقابلہ کی قوت بچپن ہی سے حضرت کے دل میں پیدا کر دی گئی تھی۔

۲۔ موسیٰ کو امر نبوت دشوار معلوم ہوا اسی لیے تو کہا وَيَسِّرْ لِيٓ أَمْرِي (سورہ طٰہٰ ۲۶/۲۰) مگر حضور سرکار دو عالم نے کبھی ایسی دُعا نہیں کی۔ موسیٰ کی دُعا کے بعد یہ امر آسان کیا گیا۔ وزارت ہارون سے اور آنحضرتؐ کے لیے بغیر دعا فرمایا گیا۔ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيٓ أَنقَضَ ظَهْرَكَ (سورہ الم نشرح ۲/۹۴) ہم نے تمہارے بوجھ کو اُتار دیا اور جو تمہاری پیٹھ کو توڑے ڈالتا تھا) وزر ہی سے وزیر بنا ہے۔ یعنی ہم نے وزیر بنا کر تمہاری مشکل آسان کر دی۔

۳۔ حضرت موسیٰ بطور خود اپنا وزیر نہیں بنا سکے۔ بلکہ اس کے لیے خدا سے دُعا کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کو اپنا وزیر اور جانشین بنانے کا بطور خود حق نہیں۔ چہ جائیکہ اُمت اپنے نبی کا خلیفہ کسی کو بنالے۔ البتہ نبی کو سفارش کرنے کا حق ہے جیساکہ جناب موسیٰ نے ہارون کے متعلق کہا۔

۴۔ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۝ (سورہ طٰ ۲۹/۲۰) سے معلوم ہوا کہ نبی کا وزیر اس کے خاندان سے ہوتا ہے یہ حق دوسروں کو نہیں پہنچتا۔ اور اہل میں بھی جو زیادہ قریب ہو۔ جیسے حضرت موسیٰ نے تخصیص کر دی ہارون اخی کہہ کر۔

۵۔ وَيَسِّرْ لِيٓ أَمْرِي وَأَشْرِكْهُ فِيٓ أَمْرِي کہنے سے ثابت ہوا کہ وزیر شریک کار رسالت و نبوت ہوتا ہے۔ اب حضورؐ سرکار دو عالم کی اس حدیث پر نظر ڈالو یَا عَلِيُّ أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسٰى پس جب منزلت یکساں ہے تو ضرور علیؑ شریک امر نبوت تھے۔ اِلَّا لَا نَبِيَّ بَعْدِي سے حضرت نے نبوت کا استثناء کر دیا۔ وہ اس لیے کہ آپ خاتم النبیین تھے ۔

اگر جہاں میں نبی بعد مصطفیٰ ہوتے
قسم خدا و پیمبر کی مرتضیٰ ہوتے

ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ ہارون تمام عمر جناب موسیٰ کے شریک حال رہے۔ مگر چونکہ حضرت موسیٰ سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ جناب موسیٰ کے جانشین نہ بن سکے۔ بے شک اگر زندہ رہتے تو وہی نبوت کا فرض علیحدہ

سے ادا کرتے۔ اسی طرح حضرت علی علیہ السلام ہمیشہ شریک کارِ رسالت رہے۔ لیکن چونکہ نبوت آنحضرتؐ پر ختم ہوگئی تھی۔ اس لئے ان کی نبوت کا دور نہ آیا۔ اور علیحٰدہ سے نبوت کی تبلیغی خدمات نبی کے نام سے انجام نہ دے سکے۔

جس طرح جناب ہارون سایہ کی طرح حضرت موسیٰ کے ساتھ رہے۔ اسی طرح جناب علی ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے جلوت میں خلوت میں۔ سفر میں، حضر میں۔ بزم میں رزم میں کسی جگہ حضرت کا ساتھ چھوڑا ہی نہیں۔

جناب ہارون کو جناب موسیٰ کی بعثت میں اتنی مشکلات کا سامنا نہیں ہوا جتنا حضرت علی کو ہوا۔ جناب ہارون جب تک زندہ رہے موسیٰ کے مشن کی تکمیل میں اپنی جان لڑاتے رہے اس کے بعد وہ سلسلہ ختم ہوگیا لیکن حضرت علی علیہ السلام نے نہ صرف زندگی بھر اسلام کی خدمت کی۔ بلکہ قیامت تک ان کی اولاد خدمت اسلام کرتی رہے گی۔ کسی نبی کے جانشین نے ایسی دوامی خدمت اسلام کی انجام نہیں دی۔ ان کی نسل کا سلسلہ کچھ دن چل کر ختم ہوگیا۔ اور اسلامی خدمت کا باران سے ہٹ گیا۔ لیکن علی علیہ السلام کے خاندان سے قیامت تک نہ ہٹے گا اسی خاندان والے محافظ شریعت اسلامی ہر زمانے میں رہے اور قیامت تک رہیں گے۔ ان کا وجود اہلِ ارض کے لئے باعث مامون و برکت رہا ہے اسلامی خدمت کے تحت کون سی مصیبت تھی جو انہوں نے نہ جھیلی۔

ذرا کربلا کے واقعہ کا تصور کیجئے۔ صرف اسلام کی آبرو بچانے اور حق کو باطل سے جدا کرنے کے لئے کیا کیا بلائیں اپنے سر نہ لیں اور پھر کس کس نے نہ لیں۔ اس میدان میں جوانوں کے دوش بدوش بوڑھے بھی تھے۔ بچے بھی تھے۔ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی تھیں۔

عورتیں فطرۃً رقیق القلب ہوتی ہیں۔ ذراسی تکلیف میں رو دیتی ہیں لیکن علی کے خاندان کی بی بیوں نے حسینی مشن کی تکمیل میں بڑی سے بڑی مصیبت کی بھی پروانہ کی کوفے سے دمشق کا سفر آسان کام نہ تھا۔ ۱۹ منزلیں طے کرنا تھیں پھر عزیزوں کے ساتھ نہیں دشمنوں کے ساتھ خون کے پیاسوں کے ساتھ بے حمیت و بے غیرت گروہ کے ساتھ پھر زخمی دلوں کے ساتھ پاش پاش کلیجے کے ساتھ۔ حسرت و یاس کے اندھیرے میں کچلی ہوئی تمناؤں کے گھیرے میں کس کا دل ہے کس کا جگر ہے کہ ان پہاڑوں سے ٹکرلے، ان خونی سیلابوں کو کمزور بازوؤں سے ریلے ان اندھیوں کو سر کے کھلے بالوں سے روکے، ان خارزاروں کو آبلے پڑے ہوئے پیروں سے روندے اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

آہ مدینہ کی وہ بی بیاں جن کا کھلا سر چشم آفتاب نے نہ دیکھا تھا۔ جو عفت و عصمت کی چادروں میں لپٹی رہنے والی تھیں۔ جو ہر دم خدا و رسولؐ کی مجاورہ تھیں جن کا کام شب و روز یادِ الٰہی تھا۔ جو زاہدانہ اور عابدانہ زندگی بسر کرنے والی تھیں۔ وہ مدینہ سے مکے گئیں۔ وہاں سے کربلا پہنچیں۔ وہاں سے کوفہ آئیں۔ یہاں بازاروں میں تشہیر ہوئیں

قید ہوئیں وہاں سے دمشق تک ۱۹ منزلیں طے کیں، کیا کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس طرح کی زندگی میں بیبیوں اور بچوں کو کیسی جاں گداز اور روح فرسا تکلیف کا سامنا ہوا ہوگا۔

منقول ہے کہ جب یہ قافلہ سرحد دمشق میں پہنچا تو یزید نے داخلے سے روک دیا اور کہلا بھیجا جب تک شہر آراستہ نہ ہو جائے اور پبلک میں اچھی طرح اعلان نہ ہو اسیروں کو شہر کے اندر نہ لانا۔

چنانچہ دروازہ شہر سے باہر قیام ہوا۔ لوگ جوق در جوق آنے شروع ہو گئے۔ قاتلانِ حسین خوشیاں منا رہے تھے اور لوگوں کے سامنے فخریہ اپنے کارنامے بیان کرنے لگے۔ تین روز تک بیرونِ شہر یہ قافلہ رُکا رہا۔ تیسرے روز یزید نے داخلے کی اجازت دی۔

مقتل ابومخنف میں ہے کہ جب دمشق میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ بازار سجے ہوئے ہیں سڑکیں اور کوچے تماشائیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جا بجا عورتیں کوٹھوں پر عید کی طرح نیا لباس پہنے اور سولہ سنگھار کیے بیٹھی ہیں۔ باب جیرون سے داخلہ شروع ہوا ہے۔ پہلے نیزوں پر رکھے ہوئے سر نظر آئے جن کی حالت یہ تھی کہ خاک و خون میں ایسے اغشتہ کہ کسی کی صورت پہچانی نہ جاتی تھی۔ کچھ سوار نیزے لیے ساتھ ساتھ تھے وہ اشارہ کر کر کے بتلاتے تھے یہ سر حسینؑ بن علیؑ کا ہے۔ یہ سر عباس بن علیؑ علمدار فوجِ حسینی کا ہے۔ یہ علی اکبرؑ کا ہے۔ یہ قاسم بن حسنؑ کا ہے۔ اس کے بعد عورتیں اونٹوں پر بیٹھی ہوئی نظر آئیں۔ ان اونٹوں پر نہ کجاوہ تھا نہ عماری۔ ان کے سر کھلے ہوئے تھے۔ وہ بیچاریاں اپنے بالوں سے اپنے منہ ڈھانپے ہوئے تھیں۔ لباس ان کے میلے کچیلے اور بوسیدہ تھے۔ گودوں میں جن بچوں کو بٹھائے ہوئے تھیں ان کے چہروں سے بیتیمی برستی تھی۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے اور ہونٹ خشک تھے۔ بچے خوف سے سہمے ہوئے اپنی اپنی ماؤں سے لپٹے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ باآواز بلند پکار پکار کر کہہ رہے تھے اے اہل شام یہ علیؑ کی بڑی بیٹی زینبؑ ہے اور یہ دوسری بیٹی ام کلثوم ہے۔ یہ علی کی بہوئیں ہیں۔ حسین بن علی نے جو ایک مرد خارجی تھا امیرالمومنین یزید پر خروج کیا تھا۔ ہم نے اس کو اور اس کے بہتر ساتھیوں کو کربلا میں قتل کیا اور ان کی لاشوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل کر یوں ہی کھلے میدان میں درندوں کے لیے چھوڑ دیا۔

اس کے بعد ایک جماعت سردارانِ لشکر کی باجے بجاتی اور فخر سے اپنے کارنامے سناتی آئی۔ خولی، شمر، سنان بن انس، حرب ابن کعب، اشعث بن قیس، اسود لندی، کوئی کہتا تھا میں نے حسین کے جوان بیٹے کے سینے پر اپنا نیزہ مارا کہ آر پار ہو گیا۔ کوئی کہتا تھا میں نے عباسؑ کے بازو قلم کیے۔ کوئی کہتا تھا میں نے قاسم کا لاشہ پامال کیا۔ کوئی کہتا سب سے پہلے خیام حسینی میں میں نے ہی آگ لگائی۔ کوئی کہتا تھا میں نے چادر سر زینبؑ سے چھینی۔ سکینہ کے کان چیر کر گوشوارے اتارے۔ شمر نے کہا میں وہ ہوں جس نے حسین بن علی کا گلا کاٹا۔

جناب زینبؑ کو تاب ضبط نہ رہی۔ فرمایا او لعین تو اس کے قتل پر فخر کرتا ہے۔ جس کی جبریل و میکائیل نے نازبرداری

کی۔ اسرافیل نے جس کی حفاظت کی۔ محمدؐ نے جس کو اپنے شانوں پر سوار کیا۔ جس کے باپ علی اور فاطمہ ہیں جن کا نام سرادق عرش پر لکھا ہوا ہے جس کے جد پر نبوت ختم ہوئی۔ جس کا باپ خاتم الوصیین اور ماں خیر النساء العالمین ہیں۔

اس شقی نے کہا چپ ہو جا۔ اے قافیہ گو کی بیٹی۔ اگر تو عورت نہ ہوتی تو ابھی تیری گردن مار دیتا۔

اس کے بعد دوسرے قیدیوں کے اونٹ آتے رہے تماشائیوں میں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو آنکھوں پر رومال رکھے رو رہے تھے۔

منقول ہے کہ جس نیزہ پر سرِ حسینؑ تھا اس کے پاس ہی ایک شخص سورہ کہف کی تلاوت کر رہا تھا جب اس آیت پر پہنچا۔

اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ كَانُوۡا مِنۡ اٰيٰتِنَا عَجَبًا (سورہ الکہف ۱۸/۹)

تو سرِ حسینؑ سے آواز آئی: "اے شخص میرا قصہ اصحاب کہف کے قصے سے زیادہ عجیب ہے"! اس نے حیرت سے سرِ حسینؑ کی طرف دیکھا، اور کہا "اے شخص! تو کوئی ولی خدا معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال مجھے اپنے نام و نسب سے آگاہ کر" آواز آئی

انا حسین بن علی

یہ سنتے ہی وہ زار زار رونے لگا، اور کہنے لگا۔ لعنت ہو اس گروہ پر جس نے اپنے نبی کے نواسے کو قتل کیا، اور اُن کی ذریت کو قید کیا۔

ابو مخنف نے لکھا ہے کہ مروان ابن الحکم لعین نے جب سرہائے شہداء اور زنان اہل بیت کو اس حال میں دیکھا تو خوش ہو کر لشکر والوں سے کہنے لگا۔ تم لوگوں نے کیا کیا ہے۔ انہوں نے کہا حسینؑ اور اس کے ساتھی کل بہتر تھے ہم نے ان سب کو قتل کر ڈالا۔ یہاں تک کہ ان کا شش ماہہ بچہ بھی جسے حسینؑ پانی کی طلب کے لیے لائے تھے۔ تیر کا نشانہ بنا دیا۔ ہم نے ان کی لاشوں کو درندوں کے کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ یہ ان کے سر ہیں۔ اور یہ ان کی عورتیں ہیں۔

یہ سن کر مروان خوشی سے اپنے کندھے ہلکانے اور شگفتہ چہرے سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک شخص نے کہا کہ والے مو تیرے اُوپر۔ کیا تو اس نبی کا کلمہ گو نہیں جس کے نواسے حسینؑ بن علیؑ ہیں۔ کیا یہ بی بیاں جو کھلے سر تشہیر ہو رہی ہیں اس نبی کی نواسیاں نہیں"۔ اس نے کہا خاموش ہو یہ امیر المومنین یزید کے دشمن ہیں ان کے ساتھ ہر سختی روا ہے۔ یہ سنا تھا کہ اس نے اپنی کمان مروان، کے سر پر ماری۔ لوگوں نے فوراً اسے گرفتار کر لیا۔ اور یزید کے پاس لے گئے۔ اس نے قتل کا حکم دیا۔ چنانچہ اس کے غلاموں نے تلواروں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

سہیل ساعدی کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ جب اہل حرم کے اونٹ اور سرہائے شہداء ایک کوٹھے کے قریب سے گزرے تو ایک بوڑھی عورت نے پتھر اٹھا کر سر امام پر مارا۔ بیمار کربلا نے جب یہ دیکھا تو رو رو کر بارگاہ باری میں عرض کرنے لگے۔

"خداوندا اس ظالمہ کو ہلاک کر اور ان کو بھی، جو اس کے سامنے عترت رسول کا تماشا دیکھ رہی ہیں اور ان کو نازیبا الفاظ سے یاد کر رہی ہیں۔"

ابھی حضرت کی دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ اس مکان کی چھت گر پڑی اور وہ عورتیں ہلاک ہو گئیں۔ مروی ہے کہ جب یہ قافلہ باب اساعات کے قریب پہنچا تو خلق اللہ کا وہاں بے حد ہجوم تھا۔ شمر، خولی اور سنان وغیرہ نے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ واقعہ کربلا کو بیان کر کے انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔

جناب زینبؑ سے ضبط نہ ہو سکا۔ فرمایا۔

"اے اہل شام، اے بنی امیہ کے ہوا خواہو۔ خدا کا عذاب تم پر نازل ہو۔ تم اولاد رسولؐ کی تباہی و بربادی کے واقعات سن کر ہنس رہے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ خون حسینؑ رائیگاں جائے گا۔ عنقریب! تم سب عذاب الٰہی میں گرفتار ہو گے۔ آہ تم کو کیا خبر کہ ہمارے اوپر کربلا میں فوج یزید نے کیا کیا مظالم ڈھائے ہیں انہوں نے ہم پر پانی بند کیا ہے۔ ہمارے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو گوسفند قربانی کی طرح ذبح کیا۔ ہم کو قید کیا، شہر بہ شہر پھرایا۔ ہمارے سروں سے چادریں تک چھین لیں۔ وائے ہو تم پر ہماری اس حالت پر خوش ہو رہے ہو۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ خدا تمہاری عورتوں کو بھی اسی طرح بیوہ کرے۔ اور بے وارث بنائے جس طرح تم نے ہم کو بنایا ہے۔ خدا تمہارے بچوں کو بھی یتیم کرے۔ جس طرح تم نے ہمارے بچوں کو یتیم کیا۔ خدا تم کو بھی اسی طرح ذلیل کرے۔ جس طرح تم نے ہم کو ذلیل کیا۔ تم سمجھ رہے ہو تمہاری عورتیں ہیں بندیان ترک و دیلم سمجھ کر صدقے کے خرمے ہماری طرف پھینک رہی ہیں۔ آہ! ہم اولاد رسولؐ ہیں، صدقہ ہم پر حرام ہے ہمیں بھوک سے مرجانا گوارا ہے لیکن صدقہ کھانا گوارا نہیں۔

جناب زینبؑ کی یہ تقریر سن کر لوگ زار زار روئے اور یزید کو برا کہنے لگے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ،
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

تیسویں مجلس

قصّہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام
اور
فضائل اہلبیت علیہم السّلام اور بازار شام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیۡ کِتَابِہِ الۡمَجِیۡدِ وَفُرۡقَانِہِ الۡحَمِیۡدِ

ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ مُّوۡسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَاۡئِهٖ فَظَلَمُوۡا بِهَا ۚ
فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُفۡسِدِيۡنَ (سورہ الاعراف ۱۰۳/۷)

پھر ہم نے موسیٰ کو اس کے گروہ کی طرف بھیجا۔ چونکہ وہ ظالم تھے لہذا دیکھو ان مفسدوں کا انجام کیا ہوا۔

جب موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا کا معجزہ مل گیا۔ اور خدا نے ان کی خواہش کے مطابق جناب ہارون کو ان کا وزیر بنا دیا تو ان سے کہا۔ اِذۡهَبَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی (سورہ طٰہٰ ۴۴/۲۰) (تم دونوں اب فرعون کے پاس جاؤ۔ اس نے سرکشی کی ہے) فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوۡ يَخۡشٰی (سورہ طٰہٰ ۴۴/۲۰) (دونوں نرمی سے بات کرنا شاید نصیحت قبول کرے۔ اور ہمارے عذاب سے ڈر جائے۔) چنانچہ دونوں بھائی کمبل کے کرتے پہنے فرعون کے محل

کے دروازے کے پاس پہنچے۔ دربانوں نے روکا۔ لیکن یہ کیوں رکتے۔ آگے بڑھے تو وہاں درندے کھلے پھر رہے تھے ان کو دیکھتے ہی وہ ان کے قدموں پر آنکھیں ملنے لگے۔ الغرض محل کے اندر پہنچے۔ اور فرعون کے تخت کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے۔ فرعون کو انہیں دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا تم کون ہو۔ اور بے اجازت یہاں کیسے آئے۔؟

جناب موسیٰ نے فرمایا: میں تمام عالموں کے پالنے والے خدا کا رسولؐ ہوں۔ میں جو کچھ کہوں گا وہ حق بات ہوگی۔ میں اپنے رب کی طرف سے اپنے رسولؐ ہونے کے متعلق معجزہ لے کر آیا ہوں۔ میرے آنے کا مقصد یہ ہے کہ تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔

فرعون کو یہ سن کر غصہ آیا اس نے غور سے جناب موسیٰ کو دیکھا پھر کہنے لگا۔ کیا تم وہی تو نہیں ہو جس کو میں نے بچپن سے کر جوانی تک پرورش کیا ہے۔ تم نے جو کچھ کرتوت کئے مجھے سب معلوم ہے۔ فرمایا: ہاں وہ عمل غفلت کی حالت میں ہوگیا۔ میں تیرے ظلم سے خائف ہو کر یہاں سے نکل گیا۔ اب چونکہ میرے رب نے مجھے اپنا رسول بنالیا ہے پھر تیرے پاس آیا ہوں۔ اس نے کہا تمہارا رب ہے کون۔ فرمایا میرا رب وہ ہے رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (میرا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو پیدا کیا اور اس کی ہدایت کی۔ میرا رب وہ ہے جس نے آسمان زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے سب کا پیدا کرنے والا اور ان کا پرورش کرنے والا ہے۔

فرعون نے اپنے پاس بیٹھنے والوں سے کہا "تم سن رہے ہو یہ کیا بکواس ہو رہی ہے۔" انہوں نے کہا یہ تو کوئی مجنوں ہے۔" فرعون نے کہا: سنو! اگر تم نے میرے سوا کسی کو اپنا معبود بنایا تو یاد رکھنا قید میں سڑا سڑا کر مار ڈالوں گا۔ یا اس سے بھی زیادہ دردناک سزا دوں گا۔

اس کے بعد فرعون جناب موسیٰ سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا "اگر تیرے پاس کوئی کرامت یا معجزہ ہے تو دکھا۔" حضرت موسیٰ نے عصا کو چھوڑ دیا۔ وہ ایک بڑا اژدھا بن کر فرعون کی طرف لپکا پھر جناب موسیٰ نے اپنا ید بیضا دکھایا جس کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ فرعون نے شور مچایا۔ اے موسیٰ اسے روکو تو ہم بات کریں موسیٰ نے پکڑ لیا وہ پھر عصا ہوگیا فرعون نے کہا اچھا ہمیں مہلت دو۔

جناب موسیٰ وہاں سے چلے آئے فرعون نے اپنے ارکان سلطنت سے مشورہ کیا۔ کہ موسیٰ کے معاملے میں کیا کیا جائے انہوں نے کہا کوئی بڑی بات نہیں یہ کوئی بڑا جادوگر ہے۔ ہم کو اس سرزمین سے نکالنا چاہتا ہے بہتر یہ ہے کہ تمام شہر میں منادی کرا کے جادوگروں کو بلالو۔ اور ان سے مقابلہ کراؤ۔ ان کے جادو کے سامنے موسیٰ کی کیا چلے گی۔

الغرض جادوگروں کو بلا لیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم غالب آجائیں تو کیا انعام ملے گا۔ اس نے کہا کہ تم میرے مقربین میں سے ہو جاؤ گے۔ اب ایک دن مقابلہ کا مقرر ہوا۔ تمام شہر ایک مقام پر جمع ہوا۔ جادوگر بلائے گئے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون بھی آئے۔ حضرت موسیٰ نے کہا تم نے جو چلتر دکھانے ہیں دکھا دو۔

انہوں نے رسیوں کے ٹکڑے ہوا میں اڑائے۔ جناب موسیٰ نے عصا کو چھوڑا تو وہ سانپ بن کر فضا میں دوڑا اور ان تمام جادوگروں کے سانپوں کو نگل گیا۔ یہ دیکھ کر تمام جادوگر سجدے میں گر پڑے اور کہنے لگے ہم اس رب العالمین پر ایمان لے آئے جو موسیٰ و ہارون کا رب ہے۔

فرعون نے ان سے کہا تم بغیر میری اجازت کے کیسے ایمان لے آئے۔ عنقریب تم اس کا مزہ چکھو گے میں تمہارا ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ کر تمہیں سولی پر چڑھا دوں گا۔ انہوں نے کہا کوئی پرواہ نہیں ہم تو اپنے رب کی طرف لوٹ چکے وہ ضرور ہماری خطاؤں کو معاف کر دے گا۔

اس واقعہ میں چند امور قابل غور ہیں۔

۱۔ معجزہ اور جادو کا فرق واضح ہوتا ہے۔ ایک جادو پر دوسرا جادو غالب آسکتا ہے۔ مگر معجزہ پر جادو کو غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

۲۔ جادوگر چاہے کافر تھے مگر جب حقیقت نبوت ان کی سمجھ میں آگئی تو وہ ایمان لے آئے۔ اور جان دینے سے نہ ڈرے وہ ایسے مسلمانوں سے ہزار درجہ بہتر تھے۔ جو باطل پرستوں کے زور و طاقت سے مرعوب ہو کر ان کے سامنے سر اطاعت خم کر دیتے ہیں۔

۳۔ فرعون کی خدائی کا ابطال واضح ہو گیا جو شخص دوسروں سے جان بچانے کے لیے طالب امداد ہو وہ کیونکر خدا ہو سکتا ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون پر فتح پالی۔ تو خدا نے وحی کی کہ اے موسیٰ! اب تم رات ہی رات میں بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاؤ۔ چنانچہ آپ نے تمام بنی اسرائیل کو جمع کر کے کوچ کا حکم دے دیا۔ جب فرعون کو خبر ہوئی کہ موسیٰ اپنی قوم کو نکال کر لے جا رہے ہیں۔ تو اس نے مع اپنے لشکر کے پیچھا کیا۔ بنی اسرائیل دریا کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ جب انہوں نے پیچھے سے فرعون کو آتے دیکھا۔ تو گھبرا گئے اور موسیٰ سے کہنے لگے کہ اب کیا ہو۔ آپ نے ہم سب کو مروا دیا۔ آگے دریا لہریں مار رہا ہے اور پیچھے سے خون کا پیاسا دشمن۔ انہوں نے فرمایا گھبراؤ مت، خدا ہماری مدد کرے گا۔ خدا نے وحی کی۔ اے موسیٰ اپنا عصا پانی پر مارو۔ عصا کا مارنا تھا کہ پانی پھٹ گیا اور دونوں طرف پہاڑوں کی طرح پانی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں، اور بیچ میں سوکھا راستہ بن گیا۔ موسیٰ نے قوم سے کہا آگے بڑھو اب کیا ڈر ہے۔ خدا نے پانی میں راستہ بنا دیا ہے۔ انہوں نے کہا اگر دریا میں پہنچنے کے بعد پانی مل گیا تو کیا ہوگا۔ ہم سب ڈوب جائیں گے۔ پہلے آپ قدم بڑھایئے ہم پیچھے پیچھے چلیں گے۔ جناب موسیٰ نے ہارون علیہ السلام سے کہا، تم بڑھو۔ زور تو اپنے ہی پر ہوتا ہے۔ ہمارے رسول بھی آگے علیؑ ہی کو بڑھایا کرتے تھے۔ الغرض بارہ راستوں میں بنی اسرائیل کے بارہ گروہ چل پڑے۔ دریا میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے غل مچایا کہ ایک گروہ کو دوسرا گروہ نظر نہیں آتا۔ خدا جانے ان کا کیا حشر ہوا۔ خدا نے

بیچ کے پانی کو آئینہ کی طرح بنا دیا۔ اور ایک گروہ کو دوسرا گروہ نظر آنے لگا۔ بنی اسرائیل بخیریت دریا کو عبور کر گئے۔
جب فرعون نے دیکھا کہ یہ صاف نکل گئے تو اس نے بھی اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ انہوں نے کہا آگے آگے آپ چلیں فرعون نے گھوڑے کو بڑھانا چاہا مگر اس نے قدم ہی نہ اٹھایا۔ جبرئیل ایک گھوڑی پر سوار آئے اور آگے چلے۔ فرعون کے گھوڑے نے یوں ہی مادہ کی بو پائی۔ فرّاٹے بھرتا ہوا دریا میں داخل ہو گیا۔ فرعون کے بڑھتے ہی ساری فوج حرکت میں آ گئی۔ جب سب دریا میں پہنچ گئے تو دریا کی دیواریں ٹوٹ گئیں، اور پانی کے گیپ کو بھرنا شروع کر دیا۔ اب جو فرعون کو موت سامنے نظر آئی تو اس نے کہا میں رب موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آیا۔ خدا نے کہا آلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ (سورہ یونس ۹۱/۱۰) (اب ایمان لاتا ہے حالانکہ تو بڑی سرکشی اس سے پہلے کر چکا ہے۔)
فرعون کا سارا لشکر غرقاب ہو گیا اور کسی کی لاش کا پتہ نہ چلا۔ لیکن فرعون کی لاش پانی پر تیرتی رہی تاکہ بنی اسرائیل کو یقین ہو جائے کہ فرعون ہلاک ہو گیا۔

جب فرعون کا قصہ ختم ہو گیا تو حضرت موسیٰ کو وحی ہوئی کہ تم اب مصر میں جا کر آباد ہو جاؤ اور امن و چین سے رہو قبطیوں کے تمام مال و دولت پر بنی اسرائیل قابض ہو گئے۔ بکثرت زیور اور ساز و سامان قوم بنی اسرائیل کے ہاتھ لگا۔

جب فرعون کی طرف سے اطمینان ہوا تو موسیٰ پر وحی ہوئی کہ اب تم کو ایک کتاب (توریت) دی جائے گی اسی کے قوانین پر تم اپنی قوم کو چلاؤ۔ جناب موسیٰ طور پر جا کر اپنی ضرورتوں کو خدا سے بیان کیا کرتے تھے۔ ان کا جواب ان کو ایک درخت کے ذریعے سے ملا کرتا تھا۔ یعنی درخت سے آواز آیا کرتی تھی۔ حضرت موسیٰ وہ مکالمہ اپنی قوم کو سنایا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا ہم یوں نہیں مانتے۔ یہ باتیں ہمیں بھی سنواؤ۔ حضرت موسیٰ نے ستر ہزار بنی اسرائیل میں سے ستر آدمیوں کو جو اُن کی نظر میں بڑے مقدس اور خدا پرست تھے انتخاب کیا تاکہ اپنے ساتھ طور پر لے جائیں جب وہ وہاں پر پہنچے تو انہوں نے یہ ہانک لگائی۔ کہ ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ جب تک آپ خدا کو کھُلم کھلا نہ دکھلا دیں۔ حضرت موسیٰ نے بہتیرا سمجھایا مگر وہ ہٹی اور ضدی کہاں سمجھنے والے تھے اڑ گئے کہ دکھلاؤ ورنہ ہم تمہیں ہلاک کر دیں گے۔ مجبور ہو کر موسیٰ کو کہنا پڑا۔ رَبِّ اَرِنِیْ (خدایا مجھے دکھا دے) آواز آئی لَنْ تَرَانِیْ (تم ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔) اگر تم نہیں مانتے تو میں ایک بجلی چمکاتا ہوں۔ اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ جب بجلی چمکی تو طور پہاڑ جل گیا ان کی قوم مر گئی اور موسیٰ غش کھا کر گر گئے۔ جس کا جیسا ظرف تھا اس نے ویسا ہی اثر لیا۔

جب حضرت موسیٰ کو غش سے افاقہ ہوا تو بارگاہ باری میں عرض کی۔ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا (سورہ الاعراف ۱۵۵) (کیا تو ان بے وقوفوں کے فعل پر ہم کو ہلاک کرے گا۔) خدا نے ان کی خاطر سے ان سب کو زندہ کر دیا۔

اس سلسلے میں چند باتیں قابلِ بیان ہیں ۔

۱۔ جناب موسیٰ نے جو انتخاب مومنین کا کیا تھا وہ غلط ثابت ہوا۔ پس جب نبی کا جو معصوم ہے اور سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہے۔ انتخاب صحیح نہ ہوا تو بھلا اُمت کے انتخاب کا ذکر ہی کیا۔

۲۔ جناب موسیٰ ستر آدمیوں کو اپنے رنگ میں نہ رنگ سکے اور امام حسینؑ نے بہتر آدمیوں کو عزم و ثبات وایمان میں اپنا جیسا بنا کر دکھایا۔

۳۔ موسیٰ ایک تجلی کی چمک کی تاب نہ لائے اور غش کھا گئے اور حضرت رسول خدا نے سرادق جلال ایزدی کا معائنہ بہت قریب سے کیا غش کھانا تو کیسا آنکھ تک نہ جھپکی مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (سورہ النجم، ۵۳/۱۷) کتنا فرق ہے موسیٰ اور محمد مصطفٰےؐ صلی اللہ علیہ وسلم میں۔

۴۔ موسیٰ کے اس قول سے کہ کیا تو ان بے دقوفوں کے عمل پر ہم کو ہلاک کر دے گا۔ معلوم ہوا کہ رَبِّ اَرِنِی جناب موسیٰ نے محض اپنی قوم کے دباؤ سے کہا تھا ورنہ اس کو ان کی طرف منسوب نہ کرتے۔

۵۔ موسیٰ کی معراج طور سے آگے نہ بڑھی لیکن محمد مصطفٰےؐ کی معراج قَابَ قَوْسَیْنِ (سورہ النجم ۵۳/۱۸) تک ہوئی۔ خدا کو نہ موسیٰ نے اپنی معراج میں زمین پر دیکھا اور نہ محمد مصطفٰےؐ نے عالم امکان کی آخری حد پر۔ نہ سلیمان نے ہوا میں، نہ عیسیٰ نے آسمان چہارم پر۔ نہ ادریس نے آسمان اول پر۔ لہذا ثابت ہوا کہ خدا قابل رویت ہی نہیں لہذا قیامت میں اس کے دیدار کی تمنا فضول ہے۔

۶۔ موسیٰ اور خدا کے درمیان بات چیت کا ذریعہ ایک درخت تھا جو لا یعقل و بے جان ہے اور محمد مصطفیٰ سے بات چیت کا ذریعہ علیؑ کا لہجہ تھا۔

۷۔ قوم موسیٰ کا مرنے کے بعد زندہ ہو جانا رجعت کو ثابت کرتا ہے جو خدا ابراہیم کے پرندوں کو۔ عزیر اور ان کے گدھے کو، موسیٰ کی قوم کو مرنے کے بعد زندہ کر سکتا ہے وہ رجعت میں کیوں نہیں کر سکتا۔

جب جناب موسیٰ توریت لینے طور پر چالیس روز کے لیے جانے لگے۔ تو آپ نے اپنی قوم پر جناب ہارون کو اپنا جانشین بنایا۔ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ (سورہ الاعراف ۷/۱۴۲)۔ (تم میری قوم پر میرے جانشین بنو۔ اور مفسدوں کی پیروی نہ کرنا۔) حضرت موسیٰ کے طور پر جانے کے بعد سامری نے یہ کھیل کھیلا کہ قوم فرعون کا جو زیور بنی اسرائیل نے لوٹا تھا اس کو جمع کر کے تپایا اور پگھلا کر ایک بچھڑے کو مورتی بنایا اور جبرئیل کے گھوڑے کے قدم کی خاک جو اس نے دریائے نیل کے کنارے سے اٹھا رکھی تھی اس بچھڑے کے اندر ڈال دی۔ اس کے اثر سے وہ بولنے لگا۔ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ (سورہ طٰہٰ ۲۰/۸۸) سامری نے کہا۔ خدا اس بچھڑے کے اندر بول رہا ہے موسیٰ نے تم کو نہ خدا کی آواز سنوائی اور نہ اس کو کھلم کھلا دکھا دیا۔ میں نے اس بات کو دکھایا ہے پس یہی تمہارا معبود ہے

اسی کو سجدہ کرو، اور موسیٰ کے خدا کا خیال چھوڑ دو۔ وہ بے وقوف اس کے کہنے میں آ گئے اور بچھڑے کی پوجا کرنے لگے۔

جب موسیٰ طور سے الواح توریت لے کر آئے اور قوم کا یہ حال دیکھا تو غصے میں بھر گئے۔ الواح توریت کو زمین پر ڈالا اور ہارون کا گریبان پکڑ کر کھینچا کہ یہ کیا ہوا۔ انہوں نے کہا میرے ماں جائے آپ میری ڈاڑھی اور میرا سر پکڑیئے۔ میں کیا کرتا اس قوم نے مجھے انتہائی کمزور بنا دیا اور میرے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَکَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ (سورہ الاعراف ۷/۱۵۰) آپ دشمنوں کے سامنے مجھے ذلیل نہ کیجئے میں نے اس لیے ان سے جنگ نہ کی کہ آپ آکر کہتے۔ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (سورہ طہٰ ۲۰/۹۴) (تم نے بنی اسرائیل کو فرقہ فرقہ بنا دیا) یہ کلمہ سن کر موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

اس سلسلہ میں چند باتیں قابل غور ہیں۔

۱۔ موسیٰ صرف چالیس روز کے لیے جا رہے تھے اتنی مدت بھی قوم کو بغیر اپنا جانشین بنائے چھوڑ نا پسند نہ کیا اور یقیناً یہ حکم خدا نے کیا پس کیونکر ممکن تھا کہ سرکار دو عالم بغیر اپنا جانشین بنائے دنیا سے رخصت ہو جاتے ضرور آپ نے حضرت علی کو نامزد کیا۔

۲۔ حضرت موسیٰ کو توریت طور پر جاکر ملی اور چالیس دن کی ریاضت کے بعد ملی اور سرکار دو عالم پر قرآن ان کے گھر میں نازل ہوا۔ لیکن کہیں جاکر قرآن لانے کی زحمت نہ دی گئی۔

۳۔ چونکہ جناب ہارون حضرت موسیٰ کے معین و مددگار رہے اور خدا نے جناب موسیٰ کا بازو ان سے قوی کیا تھا سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ (سورہ القصص ۲۸/۳۵) لہٰذا ان کی خدمات پر نظر رکھتے ہوئے ان ہی کو اپنا جانشین بنایا۔ ورنہ قوم موسیٰ میں ستر ہزار آدمی تھے کسی اور کو بھی بنا سکتے تھے۔

۴۔ موسیٰ صرف چالیس روز کے لیے طور پر گئے تھے۔ اتنی قلیل مدت میں قوم گمراہ ہو گئی باوجودیکہ ان کے جانشین موجود تھے۔

۵۔ جب جناب موسیٰ نے ہارون سے تعرض کیا تو انہوں نے تین باتیں بیان کیں۔ ایک یہ کہ قوم نے اکیلا کر دیا اور مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ اور اتنا کمزور بنا دیا کہ میں ان سے لڑنے کے قابل نہ رہا۔ دوسرے یہ میری قوم کے لوگ مجھے قتل تک کی دھمکی دینے لگے۔ تیسرے اگر میں تھوڑے سے اپنے ساتھیوں کو لے کر ان سے لڑتا تو ان میں تفرقہ پڑ جاتا اگر ایک گروہ میرے ساتھ ہوتا اور دوسرا سامری کے ساتھ۔ تیسرا نہ ادھر ہوتا نہ اُدھر۔ پھر رفتہ رفتہ یہ تفرقہ بڑھتا ہی جاتا۔ لہٰذا یہ الزام میں نے اپنے اوپر لینا گوارا نہ کیا۔ بعینہٖ یہ عذر امیر المومنین کا بھی تھا۔ حضرت موسیٰ نے بحکم خدا تمام گوسالہ پرستوں کو قتل کرا دیا اور سامری والے بچھڑوں کو بچھڑوں سے توڑ کر اس کے ٹکڑوں

دریا میں بہا دیا۔

اس کے بعد جناب موسیٰ کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کو ساتھ لے کر عمالقہ قوم سے لڑنے کے لئے جاؤ۔ یہ بڑے سرکش ہیں جناب موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر چلے۔ جب ان کی آبادی کے قریب پہنچے اور حکم دیا کہ اس شہر میں داخل ہو کر ان کو قتل کر ڈالو۔ انہوں نے کہا ہم تو ہرگز نہ جائیں گے۔ یہ لوگ بڑے جبار اور تنومند ہیں جب تک یہ بستی سے نکل نہ جائیں گے ہم وہاں قدم نہ رکھیں گے۔ جناب یوشع اور کالب نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ بڑھو تو خدا ہم کو فتح دے گا۔ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً (سورہ البقرہ ۲۴۹/۲) (خدا کی مدد سے تھوڑے سے لوگ بہت سوں پہ غالب آجاتے ہیں مگر وہ کہاں ماننے والے تھے کہنے لگے۔ فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (سورہ المائدہ ۵/۲۴) (تم اور تمہارا رب جا کر لڑے ہم تو یہاں بیٹھے ہیں) جناب موسیٰ نے یہ حال دیکھ کر بارگاہِ باری میں عرض کی۔ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي (سورہ المائدہ ۵/۲۵) (پالنے والے میں بس اپنے نفس کا مالک ہوں یا اپنے بھائی کے نفس کا) اس سلسلے میں چند باتیں قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ جناب موسیٰ کے ساتھ پچاس ہزار بنی اسرائیل تھے اور دشمن کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ لیکن اصحاب میں اس پر بھی ہل چل مچی ہوتی تھی اور وہ مقابلہ کرنے کی تاب نہ لا سکے۔ کیا کہنا ہے اصحابِ حسین کی شجاعت کا کہ تین دن کی بھوک پیاس چالیس ہزار سیر دسیراب فوج سے لڑے اور ذرا نہ جھجکے ؎

حوصلے تھے یہ جوانانِ حسینی کے فقط
ورنہ لاکھوں سے بہتر کی لڑائی کیسی

۲۔ جناب موسیٰ کو اپنے پچاس ہزار اصحاب میں سے کسی ایک پر بھی اعتماد نہ تھا۔ جب ہی تو کہا میں اپنے اور اپنے بھائی کے نفس کے سوا اور کسی کا مالک نہیں۔ معلوم ہوا صرف صحابیت سے کام نہیں چلتا بلکہ اس کے لئے کچھ اور وجوہ درکار ہیں۔

۳۔ جناب موسیٰ نے ان کو فتح کا یقین دلا دیا تھا۔ بہت سا مال غنیمت ملنے کا لالچ بھی دیا تھا مگر اس پر بھی ان کے ساتھی مرنے کا کیا ذکر اس شہر کے اندر داخل ہونے پر بھی تیار نہ ہوئے۔ اب ذرا اصحاب حسینؑ کو دیکھو کہ امام حسین علیہ السلام نے کسی وقت ان کو اپنی کامیابی کا یقین نہیں دلایا بلکہ کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ جو میرے ساتھ رہے گا وہ یقیناً قتل کر دیا جائے گا۔ مگر اس پر بھی انہوں نے امام علیہ السلام کا ساتھ نہ چھوڑا۔

۴۔ اصحاب موسیٰ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے حضرت موسیٰ کا ساتھ دینا بھی چاہا مگر ان کی عورتوں نے ان کو روکا اور بچوں کو ان کے سامنے لا کر ڈال دیا کہ ان کی پرورش کون کرے گا۔

کیا کہنا انصارِ حسین کی بیبیوں کا کہ انہوں نے روکنا کیسا جان دینے پر اپنے شوہروں کو ابھارا۔ اپنے ہاتھوں سے سجا کر مرنے

کے لئے بھیجا۔ گھر کی عورتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ انصار حسین کی عورتوں کی سی ہمّت وجرأت مردوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

سہل ساعدی کہتے ہیں کہ جب اسیروں کا قافلہ بازار شام سے گذر رہا تھا تو شاہراہوں اور گلی کوچوں میں تماشائیوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ میں دو دن پہلے دمشق میں آیا تھا۔ مجھے قطعاً علم نہ تھا کہ یزید کی جنگ کس سے ہوئی اور یہ لوگ کون ہیں جن کو قید کر کے لایا گیا ہے۔

نیزوں پر جو سر تھے ان کو تو یوں نہ پہچان سکا کہ وہ گرد وغبار اور خاک وخون میں اٹے ہوئے تھے اور بی بیوں کو یوں نہ پہچان سکا کہ ان کے چہرے بالوں سے چھپے ہوئے تھے۔

اونٹوں کی قطار کے آخری ایک اونٹ پر ایک بی بی بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے دُور سے مجھے دیکھا تو پہچان گئیں نحیف آواز میں پکارا۔ اے سہیل ذرا میرے قریب آیئے۔ میں چونکا کہ یہ کون بی بی ہیں جو مجھے پہچانتی ہیں۔ قریب جا کر میں نے پوچھا بی بی تم کون ہو اور کس قوم وقبیلہ سے ہو کہ مجھے جانتی ہو۔ انہوں نے کہا کہ میں عبداللہ بن عمیر کی زوجہ ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ آپ ایک بار کوفہ میں میرے مہمان ہوئے تھے۔ میں نے حیران ہو کر کہا کہ تم کس جرم میں قید ہو کر آئی ہو اس نے کہا کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ کوفہ سے کربلا نصرتِ حسین کے لئے آئی تھی۔ اے سہیل کیا تمہیں خبر نہیں کہ کربلا میں ہم پر کیا گزری۔ سہیل تمام خاندان رسولؐ قتل کر دیا گیا۔ کوفہ کے نامور شیعہ حبیب، زہیر قین، مسلم بن عوسجہ، بریر ہمدانی، عابس، شبیب سب شہید کر دیئے گئے، اور زنانِ اہل حرم کے ساتھ ہم کو بھی قید کر لیا گیا۔

سہیل کہتے ہیں میں نے پوچھا اس وقت بے کسی میں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا اے سہیل مجھے تو کسی خدمت کی ضرورت نہیں، ہماری شہزادیاں زینبؑ وام کلثومؑ سر ننگے اونٹوں پر بیٹھی ہیں اگر ممکن ہو تو کچھ چادریں لا کر ان کو دے دو تا کہ وہ اپنے سر چھپا لیں۔

سہیل کہتے ہیں میں نے جو یہ سنا کہ اس قافلے میں زینبؑ وام کلثوم بھی، ہیں تو میں نے اپنا منہ پیٹ لیا اور دل میں کہا کاش مجھے موت آجاتی کہ میں یہ روح فرسا اور جاں گداز منظر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا۔

میں دوڑا ہوا گیا اور جس طرح ممکن ہوا چار چادریں حاصل کر کے لے آیا۔ جب میں ناقہ جناب زینبؑ کے قریب آیا تو میں نے اپنا تعارف کرانے کے لیے پہلے سلام کیا۔ اس پر انہوں نے کہا اے شخص تو کون ہے کہ اس عالمِ غربت اور ذلت میں ہم پر سلام کرتا ہے۔ میں نے کہا میں آپ کے والد کا جان نثار صحابی سہیل ساعدی ہوں۔ شہزادی میں چند چادریں لایا ہوں انہیں قبول فرمایئے۔ جناب زینبؑ نے فرمایا۔ اللہ تم کو جزائے خیر دے کہ تم نے ناموس رسولؐ کو نامحرموں کی نگاہوں سے بچانے کی تدبیر کی۔ میں نے وہ چادریں دو اونٹوں پر پھینک دیں بی بیوں نے ان کو لے کر اپنے بدن چھپا لیے۔

آہ مجھے خبر نہ تھی کہ میری یہ ہمدردی ان بیکسوں کے لئے ایک مصیبت بن جائے گی۔ جوں ہی شمر نے دیکھا کہ اسیروں کے

سروں پر چادریں ہیں تو اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان چادروں کو چھین لو۔ ان ظالموں نے نیزوں کی نوکیں مار کر ان کے سروں سے چادروں کو اُتار لیا۔ بلکہ بیبیوں نے خوفزدہ ہو کر خود ان کو سروں سے اُتار کر پھینک دیا میں نے دیکھا ایک بی بی کا پہلو نیزہ کی اَنی سے زخمی ہو گیا ہے اور پہلو کو ہاتھوں سے پکڑے فریاد کر رہی ہیں۔ وَا مُحَمَّدَاہُ وَا عَلِیَّاہُ، وَا حَسِیْنَاہُ وَا عَبَّاسَاہُ میں نے کسی سے پوچھا یہ ستم رسیدہ بی بی کون ہیں معلوم ہوا یہ ام کلثوم بنت علیؑ ہیں۔

ان ظالموں نے یہ معلوم کر کے کہ چادریں میں نے دی ہیں مجھے زدوکوب بھی کیا۔ کئی جگہ میرے گہرے زخم آئے اسی اثنا میں میری نظر ایک نہایت نحیف و لاغر جوان پر گئی۔ جو ایک اُونٹ کی مہار پکڑے ہوئے تھا۔ اس کی پنڈلیاں ورم کر آئی تھیں۔ پیروں کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس میں چلنے کی تاب نہ تھی۔ جب ناتوانی کے باعث ذرا دیر کے لیے بیٹھ جاتا تھا تو یزید کے سپاہی اسے تازیانہ مار کر یا نیزہ کی اَنی چبھو کر اُٹھا دیتے تھے۔ مجھے اس جوان پر بڑا رحم آیا۔ کسی سے پوچھا یہ کون ہیں معلوم ہوا یہ علی بن الحسین ہیں۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا، اور عرض کی یا ابن رسول اللہ یہ ساربانی کی خدمت آپ کو کہاں سے سپرد ہوئی ہے؟ یہ سن کر حضرت رونے لگے۔ اور فرمایا کیا بتاؤں کہاں کہاں مجھے ظالموں نے کھینچا ہے کہاں کہاں پیادہ لیے پھرے ہیں۔

اَقَادَ ذَلِیۡلًا فِیۡ دِمِشْقَ کَاَنَّنِیۡ مِنَ الزَّنۡجِ عَبۡدٌ غَابَ عَنۡهُ نَصِیۡرٌ

اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ
وَسَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ

اکتیسویں مجلس

قصہ حضرت موسیٰؑ

اور

فضائل اہل بیتؑ اور دربار یزید

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی فِیْ كِتَابِهِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِهِ الْحَمِیْدِ

سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ ○ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ

(سورہ الصّٰفٰت ۱۲۱ و ۱۲۰/۳۷)

سلام ہو موسیٰ و ہارون پر اور ہم احسان کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔

ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام وادی طے میں وعظ فرما رہے تھے۔ دل میں یہ بات آئی میں توریت کا حافظ بھی ہوں۔ خدا مجھ سے باتیں بھی کرتا ہے پس دنیا میں مجھ سے زیادہ کوئی عالم نہیں۔ اللہ کو بہت برا معلوم ہوا۔ وحی کی موسیٰ میرے بندوں میں تم سے زیادہ علم رکھنے والے بھی موجود ہیں۔ تم اس مقام پر جاؤ جہاں دو دریا ملتے ہیں وہاں ایک شخص ملے گا اس کے ساتھ رہ کر دیکھو تمہارا علم زیادہ ہے یا اس کا۔ جناب موسیٰ ایک آدمی کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ جھولی میں ایک بھنی ہوئی مچھلی اور لپٹا ہوا نمک بھی تھا۔ چلتے چلتے ایک دریا کے کنارے پہنچے وہاں پتھر کی ایک چٹان تھی۔ دونوں نے اس پر بیٹھ کر وضو کیا۔ اتفاقاً پانی کی چھینٹ مچھلی پر جا پڑی۔ وہ زندہ ہو کر تڑپی اور دریا میں تیر گئی۔

آپ کے ساتھی نے مچھلی کو دریا میں جاتے دیکھ لیا۔ موسیٰ ذرا دیر کو سو گئے تھے۔ بیدار ہوئے تو پھر آگے کو چلے۔ جھول وہیں چھوڑ دی۔ راستہ میں جب بھوک لگی تو آپ نے اپنے ساتھی سے کھانا مانگا۔ اب اس کو جھولی یاد آئی اور مچھلی کا زندہ ہو کر دریا میں جانا بھی جسے وہ جناب موسیٰ سے ذکر کرنا بھول گیا تھا۔ ساتھی نے کہا۔ وَمَآ اَنسٰنِیهُ اِلَّا الشَّیطٰنُ (سورہ الکہف ۶۳/۱۸) (ہم کو شیطان نے بھلا دیا۔)

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت کے ساتھ یوشع ابن نون تھے۔ لیکن یہ قابل قبول نہیں کیونکہ جناب یوشع وصی موسیٰ تھے۔ صاحب عصمت تھے نبی تھے اور انبیاء پر شیطان کا تسلّط ہوتا نہیں۔ مفسرین نے اس مقام پر غور نہیں کیا۔ ان کے یہاں چونکہ انبیاء سے صدور خطا ممکن ہے۔ لہٰذا ان کی پرواہ نہیں کی۔ لیکن ہمارے یہاں تو انبیاء سہو و نسیان سے بَری ہوتے ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ جوان جو حضرت موسیٰ کے ساتھ تھے یوشع نہ تھے بلکہ ایک رہنما تھے جیسا کہ صاحب تفسیر لوامع التنزیل نے بھی لکھا ہے۔

حضرت موسیٰ نے اپنے ساتھی سے کہا جس دریا کی تلاش میں ہم نکلے تھے وہ وہی تھا لہٰذا پیچھے لوٹو۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک شخص پانی کی موجوں میں بیٹھا نماز پڑھ رہا ہے سمجھ گئے یہ وہی بزرگ ہے جب وہ فارغ نماز ہوئے تو حضرت موسیٰ نے کہا۔ مجھے خدا نے کہا ہے کہ چند روز آپ کے ساتھ رہوں۔ اور حکمت کی باتیں معلوم کروں۔

جناب خضر نے جواب دیا کہ تم سے میری باتوں پر صبر نہ ہوسکے گا۔ اور وقت سے پہلے ہر چیز کے متعلق سوال کرنے لگو گے۔ حضرت موسیٰ نے کہا کہ میں دخل نہ دوں گا۔ انہوں نے کہا اچھا میرے ساتھ اس کشتی پر سوار ہو کر چلو جب کشتی کنارہ پر لگی تو حضرت خضر نے اس میں ایک بڑا سوراخ کر دیا۔ موسیٰ سے ضبط نہ ہوسکا۔ کہنے لگے آپ نے یہ کیا کیا۔ اچھی خاصی پختہ کشتی کو ناکارہ بنا دیا۔ فرمایا میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم سے صبر نہ ہوگا۔ جناب موسیٰ نے کہا۔ خیر اس بار تو معاف کر دیجئے۔ آگے بڑھے تو ایک نوجوان لڑکا نظر آیا۔ خضر نے بڑھ کر چانٹا اس کے پیٹ میں بھونک دیا۔ جس سے وہ مر گیا۔ حضرت موسیٰ نے کہا حضرت آپ بھی عجیب قسم کے آدمی ہیں۔ خواہ مخواہ ایک بے گناہ کی جان لے لی۔

خضر نے کہا تم اعتراض کرنے سے باز نہیں آتے تم سے صبر نہ ہوگا۔ جاؤ اپنی راہ لو۔ موسیٰ نے کہا معاف کیجئے آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ آگے چلے تو ایک دیوار نظر آئی جو گرا ہی چاہتی تھی۔ حضرت خضر نے پیٹھ لگا کر اسے سیدھا کر دیا۔ حضرت موسیٰ نے کہا بھلا آپ کو یہ کیا سوجی اگر سیدھا ہی کرنا تھا تو کچھ مزدوری لے کر یہ کام کیا ہوتا۔ خضر نے کہا بس معلوم ہوگیا کہ تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اچھا جن باتوں کا تم کو علم نہیں۔ اب میں ان کو بتائے دیتا ہوں۔ کشتی میں سوراخ کرنا اس لیے کہ وہ محتاجوں کا مال ہے۔ یہاں کا بادشاہ بہت ظالم ہے۔ آج کل اس کو کشتیوں کی ضرورت ہے۔ اگر میں اس کو عیب دار

نہ بنا دیتا تو وہ اس کو ضبط کر لیتا۔ لڑکے کو اس لیے قتل کیا کہ اس کے ماں باپ ایمان دار ہیں اور یہ بدچلن اور کافر تھا۔ اور اس وقت وہ ان کو قتل کرنے کو جا رہا تھا۔ میں نے ان مومنوں کی جان بچانے کے لیے اسی کا قتل ضروری سمجھا۔ خدا اس کے بدلے میں ان کو ایک ایسی لڑکی دے گا۔ جس سے ستر نبی پیدا ہوں گے۔ دیوار کو اس لیے گرنے سے روکا کہ اس کے نیچے دو یتیموں کا خزانہ تھا۔ ان کے ماں باپ بڑے نیک اور سخی تھے لوگوں کو قرض حسنہ دیتے تھے۔ دیوار گرنے سے لوگ وہ خزانہ لوٹ لے جاتے اور یتیم اس سے محروم ہو جاتے۔

کیا مقابلہ ہے حضرت موسیٰ کا سرکار دوعالم سے جن کو قدرت نے علم ما کان اور ما یکون دے دیا تھا وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (سورہ النساء ۴/۱۱۳) حضورؐ کی ذات تو اپنے مقام پر ہے موسیٰ تو ان کے شاگرد حضرت علی کے مقابلہ میں نہیں آسکتے۔ کیونکہ وہ مصداق من عندہ علم الکتاب تھے اور قابل قول سلونی تھے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے سامنے کسی نے حضرت موسیٰ کے فضائل بیان کر کے کہا کہ انبیاء میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر اس زمانے میں موسیٰ ہوتے تو ہم سے فیض حاصل کرتے۔

حضرت موسیٰ سب سے زیادہ عزیز اپنے بھائی ہارون کو رکھتے تھے۔ حضرت ہارون بھی ان کے ایسے ہی فرمانبردار تھے۔ کہ اشاروں پر کام کرتے تھے۔ موسیٰ کی نظر میں ان کا یہ اعزاز دیکھ کر موسیٰ کی بی بی صفورہ بہت جلتی تھیں۔ اور نہیں چاہتی تھیں کہ حضرت موسیٰ کے بعد۔ حضرت ہارون ان کے جانشین ہوں۔ لیکن حضرت موسیٰ نے کبھی ان کی بات کو کان لگا کر نہ سنا اور ہمیشہ حضرت ہارون کی شکایت کرنے پر ان کو جھڑکتے رہے۔

اگر حضرت ہارون جناب موسیٰ کے سامنے نہ مر جاتے تو ان کے جانشین وہی ہوتے۔ حضرت ہارون کے تین بیٹے تھے۔ شبر، شبیر و مبشر۔ تیسرے صاحبزادے کا انتقال پیدا ہونے کے بعد ہو گیا۔ دو باقی رہے تھے چونکہ حضرت کی منزلت آنحضرتؐ کے نزدیک وہی تھی جو ہارون کی منزلت موسیٰ کے نزدیک لہذا حضرت علی کے بیٹوں کے نام بھی آنحضرتؐ نے حسن و حسین و محسن رکھے تھے۔ جو عربی میں ہے۔ شبر و شبیر و مبشر کے ہم معنی ہیں۔ جناب محسن بطن مادر ہی میں شہید ہو گئے تھے۔

جناب موسیٰ ہارون علیہ السلام کے بیٹوں کو اپنا بیٹا سمجھتے تھے۔ جناب موسیٰ کے کوئی لڑکا تھا ہی نہیں۔

حضرت موسیٰ خضر کی ملاقات کے بعد واپس آئے تو نبی اسرائیل نے کیفیت پوچھی۔ فرمایا یہ قدرت کے راز ہیں نبی کے سوا دوسرے کو نہیں بتایا جا سکتا۔ حضرت ہارون کو اپنے پاس بلا کر کل ماجرا سنایا۔

یہی صورت سرکار دوعالم کو پیش آئی تھی۔ جب آپ معراج سے واپس آئے تو لوگوں نے وہاں کی باتیں پوچھیں اور فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ (سورہ النجم ۵۳/۱۰) کی توضیح چاہی۔ حضرت نے فرمایا یہ قدرت کے سربستہ راز ہیں میں تم کو نہیں بتا سکتا۔ لیکن حضرت علی علیہ السلام کو خلوت میں جا کر وہ تمام باتیں بتا دیں اسی کی طرف حافظ شیرازی کا بھی

اشارہ ہے۔

سر خدا کہ عارف سالک بکس نگفت　　　در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

جب حضرت ہارون کا انتقال ہوگیا تو حضرت موسیٰ کا غم سے عجیب حال ہوا۔ عرصہ تک یہ عالم رہا کہ جو کوئی ان کے پاس آتا۔ اس سے ہارون کی جان نثاری اور وفاداری کا حال بیان کرتے اور روتے۔ حضرت ہارون کے بیٹوں کو ہر وقت اپنی نظر کے سامنے رکھتے۔ سینے سے لگاتے۔ منہ چومتے۔ حضرت ہارون کے تمام تبرکات ان کے سپرد کر دیئے۔ یہ انہوں نے بڑی احتیاط سے اپنے پاس رکھے۔

حضرت موسیٰ کے انتقال کے بعد حضرت موسیٰؑ کے تبرکات بھی ان ہی کے صاحبزادوں کو ملے۔ انہوں نے یہ سب تبرکات ایک صندوق میں بند کیے اور تالا لگا دیا۔ یہ صندوق جہاں کہیں بنی اسرائیل جاتے پوری تعظیم کے ساتھ اپنے ساتھ لے جاتے ناپاک مرد اور عورت کو اس خیمے میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ جہاں یہ صندوق ہوتا کوئی اس کی طرف پیر کرکے سوتا نہ تھا۔ اس میں دیگر انبیاء کے علاوہ حضرت موسیٰ کا عمامہ، چادر، زرہ، عصا، نعلین۔ حضرت ہارون کا عمامہ، ان کی زرہ اور آلات حرب۔ جناب ہارون کا لباس تھا۔ اس کو تابوت سکینہ کہتے تھے۔ کیونکہ اس سے بنی اسرائیل کو تسکین ہوتی تھی۔

افسوس صد افسوس بنی اسرائیل نے تو اپنے نبی کے تبرکات کی یہ قدر کی۔ اور مسلمانوں نے اپنی نبی کی اولاد کو گوسفندان قربانی کی طرح ذبح کیا اور ان کے تبرکات کو لوٹ کر ان کی بے حرمتی کی۔

جالوت جو عمالقہ میں سے تھا بنی اسرائیل کا دشمن تھا۔ اس نے یہ معلوم کرکے کہ تابوت سکینہ ان کے لیے باعث رحمت و برکت ہے چاہا کہ کسی طرح اس کو حاصل کرے۔ ایک بار اس نے سخت حملہ کیا۔ اور تابوت کو ان سے چھین کرلے گیا۔ اور اس کی بڑی بے ادبی کی۔ نجس مقامات پر رکھا کہ لوگ پاخانہ پیشاب وہاں کریں۔ مگر جیسے ہی ایسا کیا بواسیر میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ اس نے وہاں سے اٹھوا کر ایک بت خانے میں بتوں کے قدموں کے نیچے جا رکھا اس کا رکھنا تھا کہ دھڑا دھڑ بت گرنے لگے۔ آخر مجبور ہو کر بنی اسرائیل کے پاس بھیجا گیا اور وہ طالوت کے یہاں رکھا گیا۔

جالوت نے اپنے اس حملے میں جب وہ تابوت سکینہ لے گیا تھا بہت سے بنی اسرائیل کو قتل بھی کیا تھا۔ قید بھی کیا تھا اور ان کی بستیوں کو ویران بھی کیا تھا۔

جالوت کے مر جانے کے بعد بقیۃ السیف لوگ اس زمانے کے نبی شموئیل کے پاس پہنچے اور رو رو کے کہنے لگے جالوت نے ہم کو تباہ کر دیا۔ اب ہم میں کوئی ایسا سردار نہیں کہ ہم اس کے ساتھ ہو کر جالوت سے لڑیں۔ آپ ہم پر کسی بادشاہ کو مقرر کر لیجیئے۔ انہوں نے فرمایا اگر قتال کو ہم پر واجب کیا گیا تو قتال کرو گے۔ انہوں نے کہا بھلا کیسے نہ لڑیں گے حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے جا چکے ہیں اپنے بچوں سے چھوٹ چکے ہیں لیکن جب ان پر قتال کو واجب کیا۔ تو چند کے

سو اسب بھاگ کھڑے ہوئے۔

بنی اسرائیل میں طالوت نامی ایک غریب آدمی تھا جو لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ شموئیل پر وحی ہوئی تو انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا کہ خدا نے تم پر طالوت کو بادشاہ بنایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ طالوت ہم پر کیسے حکومت کر سکتا ہے ہم اس سے زیادہ اس کے حق دار ہیں۔ اس کے پاس مال و دولت کچھ بھی نہیں انہوں نے فرمایا کسی کا کیا زور اللہ نے اس کا انتخاب کر لیا ہے اور علم اور جسم کے لحاظ سے تم سب سے زیادہ قوی بنایا ہے۔

انہوں نے کہا پھر اس کی حکومت میں ہو گا کیا۔ فرمایا وہ تابوت جو تمہارے پاس آئے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکینہ ہے۔ اور اس کے اندر آل موسیٰ و ہارون نے جو تبرکات چھوڑے ہیں اس کا بقیہ ہے اور ملائکہ اس کو اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ (سورہ البقرہ ۲/۲۴۸)

اس سلسلے میں چند باتیں بیان کرنا ضروری ہیں۔

۱۔ جناب موسیٰ اولادِ ہارون کو اپنی اولاد سمجھتے تھے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ خدا نے ہر نبی کی ذرّیت اس کے صلب سے پیدا کی ہے۔ اور میری ذرّیت صلب علی بن ابی طالب سے ہے۔

۲۔ تابوت سکینہ اس لیے باعثِ احترام تھا کہ اس میں آل موسیٰ و ہارونؑ کے تبرکات تھے۔

۳۔ سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے اولاد نہ تھی تو آل موسیٰ کہا کیوں گیا بعض نے کہا ہے کہ آل موسیٰ و آل ہارون سے خود موسیٰ و ہارون مراد ہیں لیکن پھر آل کا غیر ضروری لفظ کیوں استعمال کیا گیا۔ یہ اللہ کا کلام ہے اس میں زوائد کی گنجائش کہاں لامحالہ ماننا پڑے گا کہ آل موسیٰ سے آل ہارون اور اسی طرح مراد ہیں جیسے آل محمد سے مراد آل علی ہے۔ رہا یہ کہنا کہ اس صندوق میں تبرکات تو تھے موسیٰ و ہارون کے تو پھر آل موسیٰ و ہارون کے تبرکات کیسے مانے جا سکتے ہیں۔ یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ جس زمانہ میں یہ تبرکات صندوق میں رکھے گئے وہ آل ہارون ہی کے پاس سے برآمد ہوئے تھے۔ موسیٰ و ہارون کو مرے برس گزر چکے تھے لہٰذا وہ آل موسیٰ و ہارون ہی کا مال قرار پایا۔ اور عرفِ عام میں ان ہی کی طرف نسبت دی جا رہی تھی۔ لہٰذا اسی لحاظ سے خدا نے بھی آل موسیٰ و ہارون فرما دیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ باپ دادا کی جاگیران کے اخلاف کے نام سے پکاری جانے لگتی ہے۔

۴۔ یہ بات بھی خصوصیت سے قابلِ توجہ ہے کہ اس تابوت سکینہ کو ملائکہ اٹھائے رہتے تھے اور جالوت اور اس کی قوم پر اس کی بے حرمتی کرنے کی وجہ سے تباہی آئی۔ یہ عظیم الشان احترام کن چیزوں سے تھا۔ چند عماموں، چند نعلینوں۔ زرہوں لاٹھیوں وغیرہ کا معلوم ہوا انبیاء سے جو چیز منسوب ہو جاتی ہے یا ان کے جسم سے مس ہوتی

دریا میں بہا دیا۔

اس کے بعد جناب موسیٰ کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کو ساتھ لے کر عمالقہ قوم سے لڑنے کے لئے جاؤ۔ یہ بڑے سرکش ہیں جناب موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر چلے۔ جب ان کی آبادی کے قریب پہنچے اور حکم دیا کہ اس شہر میں داخل ہو کر ان کو قتل کر ڈالو۔ انہوں نے کہا ہم تو ہرگز نہ جائیں گے۔ یہ لوگ بڑے جبار اور قدآور ہیں جب تک یہ بستی سے نکل نہ جائیں گے ہم وہاں قدم نہ رکھیں گے۔ جناب یوشع اور کالب نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ بڑھو تو خدا ہم کو فتح دے گا۔ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً (سورہ البقرہ ۲۴۹ ۲/۲) (خدا کی مدد سے تھوڑے سے لوگ بہت سوں پہ غالب آجاتے ہیں مگر وہ کہاں ماننے والے تھے کہنے لگے۔ فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (سورہ المائدہ ۵/۲۴) (تم اور تمہارا رب جاکر لڑے ہم تو یہاں بیٹھے ہیں) جناب موسیٰ نے یہ حال دیکھ کر بارگاہِ باری میں عرض کی۔ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي (سورہ المائدہ ۵/۲۵) (پالنے والے میں بس اپنے نفس کا مالک ہوں یا اپنے بھائی کے نفس کا) اس سلسلے میں چند باتیں قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ جناب موسیٰ کے ساتھ پچاس ہزار بنی اسرائیل تھے اور دشمن کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ لیکن اصحاب میں اس پر بھی ہل چل مچی ہوتی تھی اور وہ مقابلہ کرنے کی تاب نہ لاسکے۔ کیا کہنا ہے اصحابِ حسین کی شجاعت کا کہ تین دن کی بھوک پیاس چالیس ہزار سیر و سیراب فوج سے لڑے اور ذرا نہ جھجکے ؎

حوصلے تھے یہ جوانانِ حسینی کے فقط
ورنہ لاکھوں سے بہتّر کی لڑائی کیسی

۲۔ جناب موسیٰ کو اپنے پچاس ہزار اصحاب میں سے کسی ایک پر بھی اعتماد نہ تھا۔ جب ہی تو کہا میں اپنے اور اپنے بھائی کے نفس کے سوا اور کسی کا مالک نہیں۔ معلوم ہوا صرف صحابیت سے کام نہیں چلتا بلکہ اس کے لئے کچھ اور وجوہ درکار ہیں۔

۳۔ جناب موسیٰ نے ان کو فتح کا یقین دلا دیا تھا۔ بہت سامال غنیمت ملنے کا لالچ بھی دیا تھا مگر اس پر بھی ان کے ساتھی مرنے کا کیا ذکر اس شہر کے اندر داخل ہونے پر بھی تیار نہ ہوئے۔ اب ذرا اصحابِ حسینؑ کو دیکھو کہ امام حسین علیہ السلام نے کسی وقت ان کو اپنی کامیابی کا یقین نہیں دلایا بلکہ کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ جو میرے ساتھ رہے گا وہ یقیناً قتل کر دیا جائے گا۔ مگر اس پر بھی انہوں نے امام علیہ السلام کا ساتھ نہ چھوڑا۔

۴۔ اصحاب موسیٰ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے حضرت موسیٰ کا ساتھ دینا بھی چاہا مگر ان کی عورتوں نے ان کو روکا اور بچوں کو ان کے سامنے لا کر ڈال دیا کہ ان کی پرورش کون کرے گا۔

کیا کہنا انصارِ حسین کی بیبیوں کا کہ انہوں نے روکنا کیسا جان دینے پر اپنے شوہروں کو ابھارا۔ اپنے ہاتھوں سے سجا کر مرنے

کے لئے بھیجا۔ گھر کی عورتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ انصارِ حسین کی عورتوں کی سی ہمّت و جرأت مردوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

سہل ساعدی کہتے ہیں کہ جب اسیروں کا قافلہ بازارِ شام سے گزر رہا تھا تو شاہراہوں اور گلی کوچوں میں تماشائیوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ میں دو دن پہلے دمشق میں آیا تھا۔ مجھے قطعاً علم نہ تھا کہ یزید کی جنگ کس سے ہوئی اور یہ لوگ کون ہیں جن کو قید کر کے لایا گیا ہے۔

نیزوں پر جو سر تھے ان کو تو یوں نہ پہچان سکا کہ وہ گرد و غبار اور خاک و خون میں اَٹے ہوئے تھے اور بی بیوں کو یوں نہ پہچان سکا کہ ان کے چہرے بالوں سے چھپے ہوئے تھے۔

اونٹوں کی قطار کے آخری ایک اونٹ پر ایک بی بی بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے دور سے مجھے دیکھا تو پہچان گئیں نحیف آواز میں پکارا۔ اے سہیل ذرا میرے قریب آیئے۔ میں چونکا کہ یہ کون بی بی ہیں جو مجھے پہچانتی ہیں۔ قریب جا کر میں نے پوچھا بی بی! تم کون ہو اور کس قوم و قبیلہ سے ہو کہ مجھے جانتی ہو۔ انہوں نے کہا کہ میں عبداللہ بن عمیر کی زوجہ ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ آپ ایک بار کوفہ میں میرے مہمان ہوئے تھے۔ میں نے حیران ہو کر کہا کہ تم کس جرم میں قید ہو کر آئی ہو اس نے کہا کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ کوفہ سے کربلا نصرتِ حسین کے لئے آئی تھی۔ اے سہیل کیا تمہیں خبر نہیں کہ کربلا میں ہم پر کیا گزری۔ سہیل تمام خاندانِ رسولؐ قتل کر دیا گیا۔ کوفہ کے نامور شیعہ حبیب، زہیر قین، مسلم بن عوسجہ، بریر ہمدانی، عابس، شعیب سب شہید کر دیئے گئے، اور زنانِ اہلِ حرم کے ساتھ ہم کو بھی قید کر لیا گیا۔

سہیل کہتے ہیں میں نے پوچھا اس وقت بے کسی میں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا اے سہیل مجھے تو کسی خدمت کی ضرورت نہیں، ہماری شہزادیاں زینبؑ و ام کلثومؑ سر برہنہ اونٹوں پر بیٹھی ہیں اگر ممکن ہو تو کچھ چادریں لا کر ان کو دے دو تا کہ وہ اپنے سر چھپا لیں۔

سہیل کہتے ہیں میں نے جو یہ سنا کہ اس قافلے میں زینبؑ و ام کلثومؑ بھی ہیں تو میں نے اپنا منہ پیٹ لیا اور دل میں کہا کاش مجھے موت آجاتی کہ میں یہ روح فرسا اور جاں گداز منظر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا۔

میں دوڑتا ہوا گیا اور جس طرح ممکن ہوا چار چادریں حاصل کر کے لے آیا۔ جب میں ناقہ جنابِ زینبؑ کے قریب آیا تو میں نے اپنا تعارف کرانے کے لیے پہلے سلام کیا۔ اس پر انہوں نے کہا اے شخص تو کون ہے کہ اس عالمِ غربت اور ذلت میں ہم پر سلام کرتا ہے۔ میں نے کہا میں آپ کے والد کا جان نثار صحابی سہیل ساعدی ہوں۔ شہزادی میں چند چادریں لایا ہوں انہیں قبول فرمالیجئے۔ جنابِ زینبؑ نے فرمایا۔ اللہ تم کو جزائے خیر دے کہ تم نے ناموسِ رسولؐ کو نامحرموں کی نگاہوں سے بچانے کی تدبیر کی۔ میں نے وہ چادریں دو اونٹوں پر پھینک دیں بی بیوں نے ان کو لے کر اپنے بدن چھپا لیے۔

آہ مجھے خبر نہ تھی کہ میری یہ ہمدردی ان بیکسوں کے لئے ایک مصیبت بن جائے گی۔ جوں ہی شمر نے دیکھا کہ اسیروں کے

سروں پر چادریں ہیں تو اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان چادروں کو چھین لو۔ ان ظالموں نے نیزوں کی نوکیں مار کر ان کے سروں سے چادروں کو اُتار لیا۔ بلکہ بیبیوں نے خوفزدہ ہو کر خود ان کو سروں سے اُتار کر پھینک دیا۔ میں نے دیکھا ایک بی بی کا پہلو نیزہ کی اَنی سے زخمی ہو گیا ہے اور پہلو کو ہاتھوں سے پکڑے فریاد کر رہی ہیں۔ وَا مُحَمَّدَاہُ وَا عَلِیَّاہُ، وَا حَسِیْنَاہُ وَا عَبَّاسَاہُ میں نے کسی سے پوچھا یہ ستم رسیدہ بی بی کون ہیں معلوم ہوا یہ ام کلثوم بنت علیؑ ہیں۔

ان ظالموں نے یہ معلوم کر کے کہ چادریں میں نے دی ہیں مجھے زدوکوب بھی کیا۔ کئی جگہ میرے گہرے زخم آئے اسی اثنا میں میری نظر ایک نہایت نحیف و لاغر جوان پر گئی۔ جو ایک اُونٹ کی مہار پکڑے ہوئے تھا۔ اس کی پنڈلیاں ورم کر آئی تھیں۔ پیروں کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس میں چلنے کی تاب نہ تھی۔ جب ناتوانی کے باعث ذرا دیر کے لیے بیٹھ جاتا تھا تو یزید کے سپاہی اسے تازیانہ مار کر یا نیزہ کی اَنی چبھو کر اُٹھا دیتے تھے مجھے اس جوان پر بڑا رحم آیا۔ کسی سے پوچھا یہ کون ہیں معلوم ہوا یہ علی بن الحسین ہیں۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا، اور عرض کی یابن رسول اللہ! یہ ساربانی کی خدمت آپ کو کہاں سے سپرد ہوئی ہے؟ یہ سن کر حضرت رونے لگے۔ اور فرمایا کیا بتاؤں کہاں کہاں مجھے ظالموں نے کھینچا ہے کہاں کہاں پیادہ لیے پھرے ہیں۔

اَقَادَ ذَلِیْلًا فِیْ دِمِشْقَ کَاَنَّنِیْ ۔ مِنَ الزَّنْجِ عَبْدٌ غَابَ عَنْهُ نَصِیْرٌ

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

(بنی ہاشم نے ملک و دولت حاصل کرنے کے لیے نبوت کا ایک کھیل کھیلا تھا ورنہ ان پر نہ کوئی فرشتہ آیا تھا اور نہ کوئی وحی نازل ہوئی تھی)

جب یہ بکواس کر چکا تو اس نے شمر سے کہا ان قیدیوں کا تعارف کراؤ۔

شمر نے کہا یہ مرد علی بن الحسین ہے چونکہ کربلا میں بیمار تھا اس لیے یہ قتل ہونے سے بچ گیا۔ یہ بی بی جو کنیزوں کے حلقے میں ہے۔ رسولؐ کی نواسی اور علیؑ و فاطمہؑ کی بڑی بیٹی زینبؑ ہے۔ اس کی برابر یہ اس کی بہن ام کلثومؑ ہے۔ یہ بی بی زوجہ عباس ہے۔ یہ زوجہ مسلم بن عقیل ہے۔ یہ حسینؑ کی بی بی ام لیلیٰ و رباب ہیں۔ اسی طرح تعارف کراتا ہوا ان بی بیوں کے متعلق بتانے لگا جو حسینؑ کے انصار کی ازواج تھیں۔ اور کوفے سے اپنے شوہروں کے ساتھ آئی تھیں۔

یزید نے امام زین العابدین علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ تمہارے باپ نے مجھ سے بغاوت کی۔ میری اطاعت سے منہ موڑا۔ دیکھا خدا نے تم لوگوں کو کیسا ذلیل و خوار کیا۔ اس کے بعد اس نے یہ آیت پڑھی۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (سورہ آل عمران ۳/۲۶) اللہ دنیا کا مالک ہے اسی کو دیتا ہے جس کو اس کا اہل سمجھتا ہے تم کو اہل نہ سمجھا۔ لہٰذا اس نے تمہاری چند روزہ حکومت کو ختم کر دیا خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم لوگوں کو اس بغاوت کی سزا دی۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

> اے یزید آگاہ ہو کہ خاصانِ خدا کبھی ذلیل نہیں ہوتے۔ اپنی اس چند روزہ حکومت پر مغرور نہ ہو۔ بہت جلد وقت آنے والا ہے کہ تیرا معاملہ خدا کے سامنے پیش ہو گا۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ جس نبی کا تو کلمہ پڑھتا ہے۔ اسی کی اولاد کو قتل کراتا اور اسی کی ناموس کو بازاروں میں تشہیر کراتا اور درباروں میں ذلت کے ساتھ بلاتا ہے۔ میرے مظلوم باپ نے جو کچھ کیا حق بجانب تھا وہ یقیناً حق پر تھے۔ اور تو یقیناً باطل پر ہے تجھ جیسا فاسق و فاجر ہرگز اس قابل نہیں ہو سکتا کہ خدا تجھے ملک و دولت کا وارث بنائے تو غاصب حقوقِ آلِ محمدؐ ہے۔"

بھرے دربار میں جب امام نے اسطرح تقریر کی تو یزید کو غصہ آگیا اور حکم دیا کہ اس کو قتل کر دو۔ جب تلوار لے کر جلاد آگے بڑھا تو جناب زینبؑ روتی ہوئی بھتیجے سے لپٹ گئیں اور فرمانے لگیں۔ او ظالم کیا تجھے ہمارا تمام گھر برباد کر کے ہمارے نوجوانوں، بوڑھوں اور بچوں تک کو قتل کرا کے چین نہیں آیا۔ اب اس بیمار کے سوا کوئی ہمارا والی و سرپرست نہیں۔ تو اب اس کو بھی قتل کرانا چاہتا ہے۔ تیری کیا مجال ہے کہ نسل محمدؐ سے دنیا کو خالی کر دے۔ اگر اس کو قتل کرانا چاہتا ہے تو پہلے ہم بیکسوں کو قتل کرا دے۔ یزید نے حکم دیا کہ اس بی بی کو بھی قتل کر دو۔ یہ سنتے ہی دربار میں ہلچل مچی اور ہر طرف

سے آواز آئی۔ اگر عورت کو قتل کو کیا گیا تو دربار میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ عورت کا قتل کرنا کسی مذہب میں بھی جائز نہیں۔ یزید یہ حال دیکھ کر خائف ہوا۔ اور اپنے حکم کو واپس لے لیا۔

اب اس نے کہا میں زینبؑ بنت علی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ان سب کنیزوں کو اس کے سامنے سے ہٹا دو۔ شمر تازیانہ لے کر بڑھا اور ایک ایک کو ہٹانے لگا۔ اور تو ہٹ گئیں مگر ایک زن حبشیہ (فضہ) نے کسی طرح ہٹنا گوارا نہ کیا۔ شمر نے تازیانہ اُٹھایا کہ بوڑھی فضہ کو اذیت پہنچائے۔ یزید کی پس پشت جو حبشی غلام برہنہ تلواریں لیے کھڑے تھے۔ جناب فضہ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے میری قوم کے جوانو تمہاری غیرت کہاں گئی۔ قومی حمیت کو کیا ہوا کہ شمر تمہاری قوم کی ایک بے کس عورت کو مارنا چاہتا ہے۔ یہ بات سنتے ہی وہ سب حبشی پس پشت سے ہٹ کر یزید کے سامنے آگئے اور کہنے لگے شمر سے کہہ دے کہ اس ضعیفہ کو ہاتھ نہ لگائیے۔ یہ ہماری قوم کی عورت ہے۔ ورنہ ابھی دربار میں خون کی ندیاں بہنے لگیں گی۔ یزید نے شمر کو روکا۔

اس وقت جناب زینبؑ سے ضبط نہ ہو سکا۔ کربلا کی طرف رُخ کر کے فرمایا اے غیرت دار بھیا ایک حبشی عورت کو بچانے کے لیے کتنے جوان تلواریں سونت کر یزید کے سامنے آگئے۔ مگر آہ تیری دکھیا بہن کا کوئی حامئی اس بھرے دربار میں نہیں۔ جناب زینبؑ کی اس فریاد سے اہل دربار کے دل دہل گئے۔ بہت سے تو منہ پر رومال رکھ کر رونے لگے۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

بتیسویں مجلس

جناب داؤد و سلیمان علیہما السلام کا قصّہ

فضائل اہل بیتؑ ۔ دربار یزید

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِی کِتَابِہِ الۡمَجِیۡدِ وَفُرۡقَانِہِ الۡحَمِیۡدِ

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ وَسُلَیۡمٰنَ عِلۡمًا ۚ وَقَالَا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّنۡ عِبَادِہِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (سورہ النمل ۱۵/۲۷)

(ہم نے داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو علم دیا۔ انہوں نے کہا حمد ہو اس خدا کے لیے جس نے فضیلت دی ہم کو اپنے کثیر مومن بندوں پر)

حضرت داؤد نے جب جالوت کو قتل کیا تو بنی اسرائیل میں ان کی عزّت و وقعت بہت زیادہ ہوگئی ۔ جناب داؤد کو چالیس سال بادشاہت کرنے کے بعد نبوت ملی۔ خدا کے فضل سے ان کی کچھ ایسی ہوا بندھی کہ کوئی بادشاہ ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔

حضرت داؤد ایسی خوش الحانی سے توریت پڑھتے تھے کہ جنگل کے پرندے چرندے اور درندے ان کے چاروں طرف جمع ہو کر کچھ ایسے محو ہو جاتے تھے کہ ایک کو دوسرے سے خطرہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ دریا کا بہتا ہوا پانی رُک

جاتا تھا۔ سُریلے پن کے علاوہ ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ زبور پڑھتے وقت دُور دُور سے لوگ اسے سُن لیتے تھے اور ان کو وجد آتا تھا۔

دوسرا معجزہ یہ تھا کہ لوہا ان کے ہاتھ میں آتے ہی موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا۔ اور وہ بغیر کسی آواز کے لوہے کی کڑیاں بنا کر زرہ تیار کر لیتے تھے۔ دنیا میں سب سے پہلے لوہے کی زرہ حضرت داؤد نے بنائی تھی۔ ان کی بنائی ہوئی زرہ اس وقت چار سو روپے میں فروخت ہوتی تھی۔ اس کی قیمت سے آدھی رقم تو محتاجوں کو دے ڈالتے اور سو درہم اپنے رشتہ داروں پر تقسیم کرتے۔ اور سو درہم اپنے اُوپر صرف کرتے۔

اگر ہم امیرالمومنینؑ کا معجزہ بیان کرتے ہیں کہ اُن کی انگلیاں خیبر کے آہنی دروازے میں درآئیں تو لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ لیکن حضرت داؤدؑ کے لیے جب لوہا نرم ہوتا ہے تو اس سے انکار کیے نہیں بنتی۔ حالانکہ حضرت داؤد سے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کا مرتبہ کہیں زیادہ ہے۔

خداوند عالم نے انبیاء میں پانچ نبیوں کو نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی عطا کی تھی۔ یوسف، داؤد، سلیمان سکندر ذوالقرنین اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ دنیا والوں کو یہ دکھا دیں کہ زمامِ سلطنت ہاتھ میں لے کر فقر کی مسند پر کس طرح بیٹھا جاتا ہے۔ اور زہد و قناعت کی منزلیں کیوں کر طے کی جاتی ہیں اگر انبیاء کو بالکلیہ سلطنت سے محروم رکھا جاتا تو دنیا کے بادشاہ کہتے کہ اگر حضرات انبیاء تاج و تخت کے مالک ہوتے تو وہ بھی ایسے ہی اعمال کرنے لگتے جیسے ہم کر رہے ہیں۔

جناب داؤد نے اپنے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک حصّہ میں عبادت خدا کرتے تھے اور دوسرے میں لوگوں کے مقدمے چکاتے تھے اور تیسرے حصّے میں اپنے ذاتی کام انجام دیتے تھے۔

حضرت داؤد کو ایک روز یہ خیال پیدا ہوا کہ کسی ایسی جگہ چل کر عبادت کروں۔ جہاں میرے سوا کوئی دوسرا ذکرِ الہٰی کرنے والا نہ ہو۔ بڑی تلاش کے بعد ایک کفِ دست میدان میں تالاب کے کنارے اپنے مصلّے بچھایا اور ذکرِ الہٰی میں مشغول ہوئے۔

ناگاہ ایک مینڈک نے ٹرانا شروع کیا۔ اس کی آواز جناب داؤدؑ کو ناگوار ہوئی۔ فرمایا اے مخلوق خدا چُپ ہو جا مجھے ذکرِ الہٰی کرنے دے۔ اس نے کہا سبحان اللہ وہ آپ ہی کا خالق ہے ہمارا نہیں جسے آپ یاد کر رہے ہیں۔ میں بھی اسی کو یاد کر رہا ہوں۔ حضرت داؤد نے فرمایا اس تالاب میں اور کتنی مینڈکیں ایسا کرتی ہیں اس نے کہا شمار سے باہر ہیں اور آپ مینڈکوں پر ہی تعجب کر رہے ہیں۔ یہاں تو ہزاروں قسم کی مخلوق اپنی اپنی زبان میں یادِ خدا کر رہی ہے۔ یہ سُن کر حضرت داؤد علیہ السلام سجدے میں گر گئے اور عرض کی کہ خداوندا! داؤد کی خطا معاف کر، بیشک تیری ذات ایسی ہے کہ تیری ہر مخلوق کی زبان پر تیری حمد ہو۔

اور ایک دن حضرت داؤد علیہ السلام کے دل میں خیال گزرا کہ مجھ سے بہتر معاملات کا فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں۔ خدا نے ان کا امتحان لینا چاہا ایک دن وہ عبادت میں مشغول تھے کہ دو شخص دیوار پھاند کر ان کے سامنے آگئے۔ حضرت داؤد نے تعجب سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور کیسے آئے ہو۔ انہوں نے کہا ہم دونوں کے درمیان ایک جھگڑا ہے۔ اس کا فیصلہ کر دیجئے۔ پوچھا کیا معاملہ ہے۔ ایک نے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک ہے۔ یہ کہتا ہے کہ وہ بھی مجھے دے دے۔ حضرت داؤد نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا ظلم ہے اس کے بعد آپ نے بغیر مدعی سے گواہ طلب کیے اور مدعا علیہ سے اقرار کرائے یک طرفہ فیصلہ کر دیا۔

وحی ہوئی اے داؤد! ہم نے تم کو روئے زمین کا خلیفہ اس لیے بنایا تھا کہ لوگوں کے درمیان حق فیصلہ کرو، اب حضرت داؤد سمجھے کہ یہ دونوں فرشتے میرے امتحان کے لیے آئے تھے۔

امیرالمومنین نے ایک دو نہیں سینکڑوں پیچیدہ سے پیچیدہ قضیے فیصل کئے کیا ممکن ہے کہ کوئی غلطی ہو جائے یہاں تک کہ یہ قول زبان زد خاص و عام ہوگیا۔ قَضِيَّةٌ وَلَا اَبَا حَسَنٍ لَّهَا (قضیہ ہے اور اس کے فیصلے کرنے والے ابوالحسن نہیں) اور رسول اللہ نے فرمایا اَقْضَاكُمْ عَلِیٌّ (تم میں سب سے زیادہ مبنی برانصاف فیصلہ کرنے والے علی ہیں۔)

ایک بار امیرالمومنینؑ نے کوئی نہایت پیچیدہ قضیہ فیصل کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کا ثبوت قرآن سے مانگا آپ نے فوراً آیت پڑھ دی۔ انہوں نے کہا آپ فیصل قضایا میں ایسی جلدی نہ کیا کیجئے۔ ممکن ہے کہ غلطی ہو جائے۔ فرمایا ذرا تم یہ تو بتاؤ کہ تمہارے ہاتھ میں کتنی انگلیاں ہیں۔ انہوں نے فوراً جواب دیا۔ پانچ۔ فرمایا تم نے جواب میں جلدی کی۔ انہوں نے کہا یہ کیا سوچنے کی بات تھی۔ پانچوں انگلیاں ہر وقت میری نظر کے سامنے ہیں۔ حضرت علیؑ نے فرمایا اسی طرح تمام احکام قرآن میری نظر کے سامنے ہیں۔ ایک دن حضرت داؤد کے بارے میں دو کسان جھگڑا کرتے آئے۔ ایک نے کہا کہ اس کی بکریوں نے میرا کھیت کھا لیا۔ اس کا فیصلہ کیجیے۔ آپ نے کچھ لوگوں کو بلا کر بکریوں اور کھیت کی قیمت کا اندازہ کرایا۔ معلوم ہوا کھیتی کی قیمت بکریوں کی قیمت سے زیادہ ہے۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ تمام بکریاں کھیتی والے کے حوالے کر دی جائیں۔ یہ سنکر بکریوں والا وہاں سے روتا ہوا نکلا۔ حضرت سلیمان نے جن کی عمر سات برس کی تھی۔ اس سے پوچھا تم کیوں روتے ہو۔ اس نے حال بیان کیا۔ فرمایا تم جاؤ اور کہو کہ میرے حال پر رحم کر کے اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی فرمایئے۔ حضرت داؤد نے پوچھا یہ تم کو کس نے بتایا۔ اس نے کہا سلیمان بن داؤد نے۔ آپ نے سلیمان کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک کیا فیصلہ ہونا چاہیئے۔ انہوں نے کہا میری رائے تو یہ ہے کہ کھیت والے سے کہیئے کہ یہ بکریاں اپنے پاس رکھے۔ اور ان کا شیر لیتا رہے اور بکریوں والے سے کہیئے کہ وہ

کھیتی کو پانی دیتا رہے۔ جب کھیتی پہلے کی طرح لہلہا جائے تو کھیت والا بکریاں واپس دے دے۔ اس صورت میں کسی کو نقصان نہ ہوگا۔ بیٹے سے یہ فیصلہ سُن کر حضرت داؤد حیران رہ گئے۔ اور اس کے بعد ہر فیصلہ بیٹے کی رائے سے کرنے لگے۔

جناب داؤد علیہ السلام کے کئی بیٹے تھے سلیمان ان میں سب سے چھوٹے تھے۔ جب حضرت داؤد کی وفات کا وقت آیا۔ تو ہر بیٹے نے یہ چاہا کہ نیابت کی میرے حق میں وصیت کریں۔ ہر ایک ان کے سامنے اپنی اپنی قابلیت کا اظہار کر رہا تھا۔ جناب داؤد نے کہا میں بغیر وحی کے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ وحی نے بتایا کہ تمہارے بعد سلیمان تمہارے جانشین ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کو اپنا جانشین معین کرنے کا حق نہیں اُمّت کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

جناب سلیمان نے خدا سے دُعا کی رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ (سورہ صٓ ۳۸/۳۵) خداوندا مجھے بخش دے اور ایسا ملک عطا کر جو میرے بعد پھر کسی کو ویسا نہ ملے۔ بے شک تو بڑا بخشش کرنے والا ہے۔) خدا نے ان کی دُعا قبول کی۔ اور یہ بھی فرما دیا هَٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (سورہ ص ۳۸/۳۹) (یہ ہماری بے حساب عطا ہے۔) پس اسے لوگوں کو دے کر احسان کرو یا سب اپنے پاس رکھو۔

اہل بیت علیہم السلام کی یہ خصوصیت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انہوں نے اپنے لیے کبھی کچھ نہ مانگا۔ صحیفہ علویہ پڑھو، صحیفہ کاملہ پڑھو کسی جگہ اس قسم کی دُعا کہیں نہیں ملے گی۔ دوسرے جناب سلیمان کو خدا نے بتایا کہ چاہے یہ سب اپنے ہی لیے رکھ لو۔ چاہے اس کو تقسیم کر دو۔ اہل بیت علیہم السلام کو اس طرح بتانے کی ضرورت پیش نہیں آئی انہوں نے سب دوسروں ہی کے لیے رکھا۔ اپنے لئے کچھ رکھا ہی نہیں۔

امیرالمومنین نے دنیا سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ میں نے تجھے تین طلاقیں دے دیں۔ جس کے بعد رجوع ممکن ہی نہیں یعنی مجھے مال دنیا کی حاجت نہیں اور اس کی طرف توجہ کرنا میرے لیے حرام ہے اور یہ بھی فرمایا یا صفراء و یا بیضاء غری غیری (اے چاندی سونے کسی اور کو دھوکا دینا مجھے تیری حاجت نہیں۔) کتنا بلند پایہ تھا قناعت میں اہل بیت علیہم السلام کا۔

جناب سلیمان کا تابع فرمان خدا نے جن، دیو، پری، حیوان، انسان سب ہی کو بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ ہوا بھی ان کے قبضے میں تھی۔ وہ پرندوں کی بولیاں بھی سمجھتے تھے۔ جب ان کا تخت ہوا میں اُڑتا تھا تو پرندے سر پر سایہ بھی کر لیتے تھے۔ زمین پر آتا تو انسان دائیں طرف، پریاں بائیں طرف اور جن پیچھے کھڑے ہو جاتے تھے۔ تمام جانور صفیں باندھ کر تخت کے سامنے حاضر رہتے تھے۔ تخت اتنا بڑا تھا کہ ایک لشکر کو بٹھا کر جہاں چاہتے لے جاتے۔ صبح کو اس پر ایک ماہ

کی راہ طے کرتے اور شام کو ایک ماہ کی۔

روئے زمین کے خزانے ان کو آواز دیتے تھے کہ ہم کو نکال لیجئے۔ آپ نے ایک عالی شان محل بنوایا تھا جس کا سلسلہ کوسوں تک چلا گیا تھا۔ اس میں بہت مکانات چاندی سونے کی اینٹوں سے بنائے گئے تھے جن میں ان کی تین سو بی بیاں رہتی تھیں۔

بہت فرق ہے اس زندگی میں اور محمدؐ و آل محمدؐ کی زندگی میں جن کے ٹوٹے پھوٹے گھروں میں بوریے کے سوا کچھ نہ تھا۔

جس تخت پر آپ دربار کیا کرتے تھے وہ ایسا شاندار تھا کہ کسی بادشاہ کو میسر ہی نہ آیا۔ اس کے چاروں کونوں پر چاندی کے درخت تھے۔ جن کی ڈالیاں سونے کی اور پتے زمرد کے تھے۔ تخت کے سامنے ہزاروں سونے چاندی کی کرسیاں بچھی رہتی تھیں جن پر بڑے بڑے امراء انسان اور جن بیٹھا کرتے تھے۔

لاکھوں آدمی صبح و شام آپ کے لنگر خانے سے کھانا کھاتے تھے۔ لذیذ سے لذیذ کھانے ان کے سامنے چُنے جاتے تھے۔ مگر خود اس میں سے ایک لقمہ بھی نہ کھاتے تھے۔ بلکہ زنبیل بُن کر فروخت کرتے اور اس سے آذوقہ بہم پہنچاتے اپنی روٹی اپنے ہاتھ سے پکاتے۔ راتوں کو یاد خدا میں بے چین ہو کر روتے تھے۔

ایک دن حضرت سلیمان کا تخت چیونٹیوں کی وادی سے گزرا۔ ان میں سے ایک چیونٹی کہنے لگی اے چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان کا لشکر تم سب کو کچل ڈالے۔ اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ حضرت سلیمان یہ سُن کر مسکرائے اور اپنے دل میں کہا کہ یہ چیونٹی اپنی قوم پر کس قدر مہربان ہے آپ نے اس کو اُٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور فرمایا تو کون ہے۔ اس نے کہا میں ان چیونٹیوں کی بادشاہ ہوں فرمایا تو نے اپنی رعایا سے یہ کیوں کہا کہ تم اپنے گھروں میں چلی جاؤ۔ کیا مجھے کسی پر ظلم کرتے دیکھا تھا اس نے کہا ایسا تو نہیں ہے میں نے تو صرف احتیاطاً ایسا کہا تھا۔ حضرت سلیمان نے کہا تیری سلطنت میں کتنی چونٹیاں ہیں۔ اس نے کہا ان کی تعداد خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ فرمایا تیری سلطنت بہتر ہے یا میری۔ اس نے کہا آپ کی سلطنت میں تکلفات بہت ہیں۔ ایک تو تخت آپ کا ہوا اُٹھاتی ہے۔ تخت آپ کو اُٹھاتا ہے۔ ہمارے یہاں اس کھٹراگ کی ضرورت نہیں جیسی سب رعایا ہے ویسا ہی میں ان کا بادشاہ ہوں۔ کوئی امتیاز نہیں۔ ایسی سلطنت محمد و آل محمدؐ کے سوا کس نے کی۔ حضرت سلیمان نے کہا تیرا مرتبہ بلند ہے یا میرا۔ کہا اس وقت تو میرا ہی مرتبہ بلند ہے۔ آپ کی سواری ایک گھوڑا ہے جو ایک جانور ہے اور میری سواری ایک نبی کا ہاتھ ہے۔ یہ سن کر حضرت سلیمان ہنس پڑے۔

کتنا مرتبہ بلند ہوگا اس ولی خدا کا۔ جس کے قدم خاتم الانبیاءؐ کی مہر نبوت پر ہوں گے۔

ایک دن حضرت سلیمان اپنے تخت پر بیٹھے جا رہے تھے۔ پرندوں کا سایہ سر پر تھا۔ ایک طرف سے جو دھوپ پڑی

نظر اٹھا کر دیکھا ہدہد کو نہ پایا، فرمایا یہ کہاں گیا۔ میں ضرور اس کو ذبح کر ڈالوں گا۔ کچھ دیر بعد وہ آگیا۔ فرمایا تو کہاں تھا۔ اس نے کہا میں ایک خوشخبری لے کر آیا ہوں۔ اڑتا اڑتا شہر سبا کی طرف جا نکلا۔ وہاں ایک نہایت حسین عورت حکمران ہے مگر مذہباً آفتاب پرست ہے اس کا نام بلقیس بنت شراجیل ہے۔ ابھی کنواری ہے آپ نے فرمایا ہمارا خط لے کر پھر جا۔ اس میں لکھا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے قبل اس کے کہ ہمارا لشکر تم تک پہنچے بہتر ہے کہ تم مسلمان ہو کر ہمارے پاس چلی آؤ۔ ہدہد نے یہ خط کھڑکی سے بلقیس کے تخت پر ڈال دیا۔ اس نے پڑھ کر درباریوں کو سنایا۔ اور کہا تمہاری کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ بادشاہ ہے تو ہوا کرے۔ ہمارے پاس بھی فوج کم نہیں ہے ڈٹ کر مقابلہ کریں گے آگے جیسے آپ کی رائے ہو۔ اس نے کہا بادشاہ لوگ جب حملہ کرتے ہیں تو عزیزوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ ہر طرف لوٹ مار مچاتے ہیں۔ جس سے ملک تباہ و برباد ہوتا ہے۔ میرا تو یہ ارادہ ہے کہ میں پہلے کچھ تحفے بھیجوں۔ اگر قبول کر لیے تو سمجھوں گی کہ لالچی ہے خدا کا فرستادہ نہیں۔

غرض سب سے قیمتی تحفے دے کر اس نے اپنے آدمیوں کو بھیجا۔ جب انہوں نے دربار سلیمانی کی شان دیکھی تو ہکا بکا رہ گئے۔ تحفے پیش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر بہزار ندامت پیش کئے۔ آپ نے فرمایا کیا تمہارا مقصد مجھے مال فائدہ پہنچانا ہے تو خدا کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے۔ لہٰذا انہیں واپس لے جاؤ۔ اپنی ملکہ سے کہہ دینا میں بہت جلد ہی ایسا لشکر بھیجنے والا ہوں کہ تم سے اس کا مقابلہ ناممکن ہوگا۔ وہ واپس گئے ملکہ نے کہا کہ ایک امتحان اور کرلوں ایک ڈبیہ میں بڑا سا ہیرا رکھا۔ اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ اسے سلیمان کے پاس لے جاؤ اور کہنا کہ بغیر لوہے کے اس میں سوراخ کر دیں۔ اگر کر دیا تو میں سمجھوں گی کہ پیغمبر ہے۔ ورنہ معمولی بادشاہ۔ جب یہ ہیرا آیا تو حضرت نے ایک کیڑے کو حکم دیا کہ اس میں اپنے ڈنگ سے سوراخ کر دے۔ آپ نے ایلچیوں کو انعام دے کر مع ہیرے کے رخصت کیا اسے دیکھ کر بلقیس نے کہا کہ اب میں خود ان کے پاس جاؤں گی۔ وہاں سامان سفر درست ہونے لگا۔ یہاں ہوا نے آکر خبر دے دی۔ دیوؤں نے کہا حضور وہ تو بڑی بدصورت عورت ہے۔ اس کی پنڈلیوں پر بڑے بڑے بال ہیں۔ حضرت نے اس کی جانچ کے لیے تخت کے سامنے شیشے کی ایسی زمین بنوائی جو دور سے پانی معلوم ہوتی تھی۔ اور اس پر جا بجا مچھلیاں اور مرغابیاں چھوڑ دیں تاکہ وہ پانی سمجھ کر پائنچے اوپر چڑھائے۔

ایک روز دربار جما ہوا تھا اور بلقیس کے آنے کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ آپ نے فرمایا تم میں کون ایسا ہے جو اس کو مع تخت کے جلد سے جلد اٹھا لائے۔ ایک دیو نے کہا میں آپ کا دربار برخاست ہونے سے پہلے یہاں لا رکھوں گا۔ آصف برخیا وزیر سلیمان نے جن کے پاس کتاب خدا کا تھوڑا سا علم تھا۔ مِنْ عِنْدِهٖ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ) کہا میں ابھی پلک جھپکتے اٹھائے لاتا ہوں، چنانچہ وہ آنا لائے۔

قرآن میں یہ واقعہ موجود ہے۔ آصف میں یہ قدرت صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ ان کو کتاب خدا کا تھوڑا سا علم تھا تو کیا اندازہ کر سکتا ہے اس شخص کی طاقت کا جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہو۔ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝ (سورہ الرعد ۱۳/۴۳)۔ وہ ذات گرامی ہے امیرالمومنین علیہ السلام کی یہ وہ ہیں جن کا تابع فرمان کائنات کا ہر ذرّہ ہے۔

ایک دن حضرت سلیمان گھوڑوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ اور ان کا حُسن دیکھنے میں ایسے محو ہوئے کہ روزانہ کے اوراد و وظائف بھول گئے۔ اور سورج غروب ہوگیا۔ یاد آیا تو زار زار رونے لگے۔ اور خدا سے توبہ اور استغفار کی۔ کتنی عظمت ہے عنداللہ علی بن ابی طالب کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نماز ادا کرنے کے لیے مغرب میں گئے ہوئے سورج کو پلٹا دیا۔

جناب سلیمان کے تین سو بی بیاں تھیں۔ مگر لڑکا ایک سے بھی نہ ہوا۔ اور ایک بی بی سے ہوا بھی تو ادھورا۔ جناب سلیمان کو اس کا بڑا قلق تھا۔ مگر مشیت میں کیا زور ساری نعمتیں دے کر ایک روک لی۔

ایک روز حضرت سلیمان دربار میں عصا پر تکیہ کیے کھڑے تھے کہ ان کی روح قبض ہوگئی۔ دو مہینہ تک ان کا تن بے جان اسی طرح عصا کے سہارے کھڑا رہا۔ جب نظام سلطنت درست ہوگیا۔ تو دیمک نے آپ کے عصا کو کھا لیا۔ اور لاش گر پڑی۔ تب جنوں کو مرنے کا حال معلوم ہوا ورنہ وہ فساد برپا کر دیتے۔

قرآن میں ہے۔ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (سورہ سبا ۱۳/۳۴) جن اور دیو حضرت سلیمانؑ کے لیے ان کے حسب الحکم محرابیں انبیاء کے مجسمے اور حوضوں جیسے پیالے اور بڑی بڑی دیگیں بناتے تھے اس آیت میں لفظ تماثیل آیا ہے۔ جو جمع ہے تمثال کی اور تمثال مجسمے کو کہتے ہیں جیسے ابراہیم نے اپنی قوم سے فرمایا تھا۔ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (سورہ الانبیاء ۲۱/۵۲) (یہ کیسے بت ہیں جن کو تم گھیرے بیٹھے ہو۔)

یہ مجسمے انبیاء کے حضرت سلیمان نے تذکرے کے لیے بنوائے تھے۔ نہ کہ برائے عبادت۔ مسلمان ذرا سوچیں کہ تعزیہ داری کیوں بدعت ہے اس میں کسی جاندار کا کوئی مجسمہ نہیں بنایا جاتا ہے۔ گھوڑا مجسمہ (بت) نہیں ہے بلکہ اصلی جانور ہے۔ تعزیہ قبر کی نقل ہے کسی جاندار کی نہیں۔

یہ تمام چیزیں اس لیے جلوس کی صورت میں نکالی جاتی ہیں۔ تاکہ لوگوں کی نظر کے سامنے واقعہ کربلا آجائے۔ اور پتہ چل جائے کہ اولاد رسولؐ پر کیا کیا ظلم ہوئے۔

جو جو ظلم ہوئے ہیں۔ وہ نہ بیان میں آسکتے ہیں اور نہ جلوس میں۔ ان کو یاد دلانے والی کوئی چیز رکھی جا سکتی ہے۔

آہ دربار یزید کا موقع کیونکر لوگوں کے سامنے رکھیں۔ نبی کی نواسیاں اور سر دیا برہنہ بھرے دربار میں انتہائی ذلّت و حقارت کے ساتھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ملکوں ملکوں کے سفیر موجود تھے۔ یزید کی نظر ایک کم سن بچّی پر پڑی۔ جو بار بار اُٹھتی اور بیٹھتی تھی۔ اس نے پوچھا اے لڑکی تیرے اضطراب کی وجہ کیا ہے۔ سکینہ نے کہا ایک رسّی میں سب کے بازو باندھے گئے ہیں۔ میں چونکہ چھوٹی ہوں اس لیے جب میرے اِدھر اُدھر کی بی بیاں کھڑی ہوتی ہیں تو میری گردن کی رسّی کھنچتی ہے لہذا میں کھڑی ہو جاتی ہوں۔ اور جب وہ بیٹھتی ہیں تو میں بھی بیٹھ جاتی ہوں۔

یزید نے شمر سے کہا اس کی گردن کی رسّی کھول دے پھر پوچھا۔ یہ لڑکی کون ہے۔ شمر نے کہا یہ سکینہ بنت الحسین ہے۔ یہ حسین کی بہت پیاری تھی۔ یزید نے کہا اے سکینہ میں جب جانوں کہ حسینؑ تجھے پیار کرتے تھے کہ حسینؑ کا سر تیری گود میں آجائے۔ اس بچّی نے ننھے ننھے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ بابا میری اور آپ کی محبّت کا امتحان امیر شام کر رہا ہے۔ بابا میری گود میں آجایئے ابھی بچّی یہ دُعا کر ہی رہی تھی کہ حسین کا سر طشتِ طلاء سے بلند ہوا اور سکینہ کی گود میں آگیا آہ وہ بچی ابھی باپ سے کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ شمر نے بڑھ کر چھین لیا۔

ایک رومی سفیر نے کہا اے یزید مجھے یہ بچّی بہت پسند آئی ہے اگر تیری اجازت ہو تو میں اس کو اپنی کنیزی میں لے لوں۔ اس نے کہا مجھے منظور ہے۔ یہ سننا تھا کہ بی بیوں میں کہرام برپا ہوگیا۔ جناب زینبؑ نے مدینے کی طرف رُخ کر کے کہا یا جداہ آپ کی اولاد کنیز بنائی جا رہی ہے۔ نانا ہماری مدد کو آیئے۔ ہر بی بی زار زار رو رہی تھی۔ امام زین العابدین سے ضبط نہ ہو سکا۔ فرمایا کس کی مجال ہے کہ نبی زادیوں کو کنیز بنا سکے۔ اگر کسی کا ہاتھ اُٹھا تو ہم سب اپنی جانیں اس پر قربان کر دیں گے۔ اے یزید مجھے اجازت دے کہ تیرے اہل دربار کے سامنے میں بھی کچھ کہہ سکوں۔ یزید نے منظور نہ کیا۔ لیکن درباریوں نے زور کے ساتھ کہا کہ اس مظلوم کی داستان بھی سننی چاہیے۔ غیر ملکی سفیروں نے کہا کہ ہم سننا چاہتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اور ان پر کیا گزری ہے۔ جب یزید مجبور ہوا تو امام کو منبر پر آنے کی اجازت دی۔

آج کا اجلاس مسجد بنی اُمیہ میں تھا۔ جہاں کے مجاور وہ مقام بھی بتاتے ہیں۔ جہاں یزید کا تخت تھا اور وہ جگہ جہاں اہل حرم کو کھڑا کیا گیا تھا۔

امام علیہ السلام منبر پر تشریف لے گئے اور بعد حمد و نعت کے فرمایا۔

اے اہل شام جو مجھے پہچانتا ہے وہ پہچانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا وہ پہچان لے میں علی بن الحسین ابن علی ہوں میرے باپ پیغمبر اسلام کے نواسے تھے۔ میرے باپ کو رسولؐ خدا نے اپنی زبان چُسا چُسا کر پالا تھا۔ ان کو اپنے شانوں پر سوار کیا تھا اور فرمایا کرتے حُسَیْنٌ مِنِّیْ وَاَنَا

مِنَ الحُسَینؑ آہ! آج ہمارے تمام خاندان کو فوجِ یزید نے بے جرم و قصور تہ تیغ کر دیا۔ ہمارے اُوپر پانی بند کیا گیا۔ پیاس سے تڑپایا گیا۔ ہمارے گھروں میں گھس کر لوٹا گیا۔ خیموں میں آگ لگائی گئی۔ بے وارث بی بیوں اور یتیم بچوں کو قید کیا گیا۔ ہمارے لاشے پامال کرائے گئے۔ اے اہلِ شام یہ سامنے جو سر و پا برہنہ بی بیاں رسیوں میں جکڑی ہوئی کھڑی ہیں۔ یہ مسلمانوں کے نبی کی نواسیاں اور ہمارے خاندان کی معزز و محترم بی بیاں ہیں۔

ابھی امام نے اتنا ہی فرمایا تھا کہ درباریوں کے دل ہل گئے اور منہ پر رومال رکھ کر رونے لگے۔ جب یزید نے یہ حال دیکھا تو موذن سے کہا کہ اذان دے۔ مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا ہے اور امام کو حکم دیا کہ منبر سے اُتر آئیں۔ آگے بیان کی اجازت نہیں۔

جب موذن نے کہا اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدً اً رَّسُوْلُ اللّٰہ۔ تو امام نے کھڑے ہوکر کہا اے یزید بتا کہ محمدؐ تیرے جد ہیں یا میرے جد۔ اگر تو کہے کہ میرے جد تھے تو تو جھوٹا ہے اور اگر کہے کہ یہ تمہارے جد تھے تو بتا روزِ حشر ان کو کیا جواب دے گا۔ کیا وہ تیرے اس عمل سے خوش ہوں گے۔ یزید تیری حمیت و غیرت کو کیا ہوگیا۔ آہ تیری عورتیں تو محلوں کے اندر پردہ میں بیٹھی ہیں اور نبی زادیاں ننگے سر نامحرموں کے سامنے ترے دربار میں اس ذلت سے کھڑی ہوں۔ اس مہلت پر جو خدا نے دے رکھی ہے مغرور نہ ہو۔ ایک وقت آرہا ہے کہ تجھ سے ان مظالم کی باز پرس ہوگی۔

صاحب ریاض المصائب نے لکھا ہے کہ یزید کی بی بی ہندہ پس پردہ یہ تقریر سن رہی تھی۔ وہ بے تاب ہوکر پردہ سے نکل آئی اور کہا اے یزید خدا کی لعن ہو تجھ پر۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ بے پردہ اسیر بی بیاں ہمارے نبی کی نواسیاں ہیں آہ تو نے مجھے ابھی تک یہی کہا کہ ایک خارجی نے خروج کیا تھا۔ اب پتہ چلا کہ تو نے نبی کا گھر برباد کر دیا۔ یزید کو اس پر بڑا غصہ آیا اور کہنے لگا تجھ کو کس نے اجازت دی کہ اس طرح بے پردہ بھرے دربار میں آجائے۔ یہ سننا تھا کہ جناب زینبؑ کو تاب ضبط نہ رہی اور سر حسینؑ کی طرف رُخ کر کے کہا۔ غیرت دار بھیا یزید کو اپنی بی بی کے پردہ کا تو اتنا خیال ہے اور آہ تمہاری بہنیں بی بیاں بھاوجیں بیٹیاں اور بھتیجیاں بے پردہ شہروں اور بازاروں میں پھرائی جا رہی ہیں اور کوئی ان کے سر پر چادر ڈالنے والا نظر نہیں آتا۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

تینتسویں مجلس

حضرتِ زکریا و یحییٰ کا قصہ اور فضائل اہلبیتؑ اور زندانِ شام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فِىْ كِتَابِهِ الْمَجِيْدِ وَفُرْقَانِهِ الْحَمِيْدِ

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝۷

(سورہ مریم ۷/۱۹)

(اے زکریا ہم بشارت دیتے ہیں تم کو ایک لڑکے کی، جس کا نام یحییٰ ہے اور یہ نام اس سے پہلے کسی کا نہیں رکھا گیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ ایک دن بارگاہ باری میں یہ دعا کی کہ اے میرے رب میری ہڈیاں سست پڑ گئی ہیں۔ سر کے بال سفید ہو گئے۔ بڑھاپے نے آگھیرا ہے۔ مگر اب تک میں تیری رحمت سے محروم ہوں۔ لاولد ہونے کی وجہ کی وجہ سے مجھے ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ میرے بعد اس قوم کا ہادی کون ہوگا۔ مجھے اپنے فضل سے ایک لڑکا دے۔ جو میرا بھی وارث ہو اور پھر اولاد یعقوب کا۔ خدا نے اس دعا کو قبول کر لیا اور حضرت یحییٰ کے پیدا ہونے کی بشارت فرشتہ نے آکر دی۔ حضرت زکریا تعجب سے کہنے لگے۔ یہ کیسے ہوگا میں بوڑھا میری بی بی بانجھ۔ فرشتے نے کہا تمہارے نزدیک ناممکن

ہے۔ خدا کے لیے سب آسان ہے۔ غور تو کرو جب اس نے آدمؑ کو بے ماں باپ کے پیدا کر دیا تو بھلا بوڑھے ماں باپ سے بچے کا پیدا کرنا کون سا دشوار کام ہے۔

حضرت زکریا نے پوچھا اس کی کوئی علامت بھی ہوگی۔ فرشتے نے کہا تم تین دن کسی سے کلام نہ کر سکو گے۔ اس کے بعد سمجھ لینا کہ بچہ حالت حمل میں ہے۔ چھ ماہ کے بعد حضرت یحییٰ پیدا ہوتے۔ سوائے ان کے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے اور کوئی بچہ چھ ماہ کا پیدا ہو کر زندہ نہیں رہا۔ انجام بھی دونوں کا ایک ہی ہوا۔ ان کا سر بھی کاٹ کر ایک فاسق و فاجر بادشاہ کو بطور تحفہ پیش کیا گیا اور امام حسینؑ کا سر بھی ایک فاسق بادشاہ کے سامنے لا کر رکھا گیا۔

حضرت یحییٰ بچپن میں کبھی اپنے ہم سن بچوں کے ساتھ کھیلے نہیں۔ اگر کوئی کہتا تو فرماتے خدا نے مجھے کھیلنے کے لئے پیدا نہیں کیا جس لیے پیدا کیا ہے بس وہی کرتا ہوں (عبادت) خدا کی محبت ان کے دل میں اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ ہر وقت اس کی یاد میں روتے تھے۔

ایک دن حضرت زکریا وعظ فرما رہے تھے۔ اثنائے تقریر میں دوزخ کا ذکر بھی آ گیا۔ حضرت یحییٰ ایک کونے میں بیٹھے سن رہے تھے۔ سنتے سنتے دل میں ایسا خوف پیدا ہوا کہ یکایک دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ پھر وہاں سے اٹھ کر پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ سات دن برابر پہاڑ کے دامنوں اور گھاٹیوں میں روتے رہے۔

ادھر ماں باپ کی بے چینی کا یہ عالم تھا کہ جا بجا ڈھونڈھتے پھرتے تھے آخر پتہ چلا کہ ایک غار کے اندر چھپے ہوئے ہیں اور یاد خدا میں رو رہے ہیں۔ ان کی والدہ بے چاری تمام دن غار کے منہ پر بیٹھی رہیں۔ جب شام کو نکلے تو ماں کو دیکھا وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے روک کر کہا بیٹا کہاں جاتے ہو ٹھہرو مجھ سے دو دو باتیں کر لو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا رونا کس وجہ سے ہے۔ کہنے لگے میں دوزخ کا خیال کرتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ خدا مجھے نا معلوم کس جگہ ڈالے اس تصور سے میرا قلب لرزنے لگتا ہے۔ اور سوائے رونے کے مجھے کوئی بات اچھی معلوم نہیں ہوتی۔

ان کی والدہ نے بہت کچھ سمجھایا بجھایا اور اپنے ساتھ گھر لے آئیں۔ جب آپ کی عمر سات سال کی ہوئی تو دنیا سے قطع تعلق کر کے مسجد کے ایک گوشے میں جا بیٹھے۔ شب و روز وہیں یاد خدا کیا کرتے۔

بنی اسرائیل بڑی سرکش قوم تھی۔ اس لیے انبیاء کی بہت بڑی تعداد ان کی ہدایت کے لئے آئی شرارت ان کی گھٹی میں تھی۔ انتہائی ہٹی اور ضدی تھی اور ایسے شقی کہ انبیاء خدا کو ناحق ستاتے۔ بلکہ قتل کر ڈالتے تھے۔ جناب زکریا باوجودیکہ اس بدبخت قوم کو برابر سمجھاتے رہتے تھے۔ مگر ان کے کان پر جوں نہ رینگتی تھی۔ انسانیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کے شکر گذار ہوتے۔ مگر وہ الٹے ان کے جانی دشمن ہو گئے۔ ایک دن ان کے قتل پر سب نے کمر باندھ لی آپ کو بھی پتہ چل گیا جنگل میں ایک کھوکھلے درخت کے اندر جا چھپے۔ وہ تو چاروں طرف ڈھونڈھ ہی رہے تھے ابلیس نے آکر پتہ بتا دیا۔ درخت نے ان کو اس طرح اپنے اندر لے لیا تھا۔ جیسے ماں بچے کو پیٹ میں لیے ہوتی ہے۔ اب ان کو یہ فکر ہوئی کہ

اس درخت کو کاٹیں کیسے۔ شیطان نے ایک نیم کے درخت کا پتہ لاکر دیا کہ اس قسم کا ایک آرہ بناؤ۔ جب تک آرہ بناوہ لوگ درخت کو گھیرے کھڑے رہے۔ اور ایک نبی خدا اس کے اندر بھوکا پیاسا یادِ خدا کرتا رہا۔ جب آرہ تیار ہوگیا تو انہوں نے درخت کو کاٹنا شروع کیا۔ حضرت زکریا خاموش بیٹھے رہے۔ آخر آرہ چلتے چلتے ان کے سر پر آگیا اور درخت کے اندر آرہ نے اس برگزیدہ نبی کے دو ٹکڑے کردیئے۔

حضرت یحییٰ نے اس قوم کی شقاوت جب اس حد تک دیکھی تو ان سے جدا ہوکر ایک الگ تھلگ مقام پر جا رہے ان کے معاملات سے کوئی سروکار ہی نہ رکھا۔

اس وقت بنی اسرائیل کا بادشاہ ایک بدکار انسان تھا۔ اس کی ایک بی بی ملکہ نامی تھی۔ اس کی ایک لڑکی پہلے شوہر سے نہایت حسین وجمیل تھی۔ جب یہ عورت بوڑھی ہونے لگی۔ تو اس نے چاہا کہ اپنی اس لڑکی کی شادی اپنے شوہر سے کردے اس کے خاندان کے سب لوگ اس پر راضی ہوگئے۔ جب حضرت یحییٰ کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے سختی سے روکنا چاہا۔ ملکہ کو اس بات پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے بادشاہ سے یحییٰ کی مخالفت کا ذکر کیا۔ بادشاہ بھی اس لڑکی پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ ملکہ نے کہا یحییٰ تمہارے مزے میں خلل ڈالنا چاہتا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ یحییٰ کو باندھ کر میرے سامنے حاضر کرو۔ جب آپ آئے تو اس نے غصے سے کہا تم مجھے عقد سے روکنا چاہتے ہو۔ فرمایا جو امر خلاف شرع ہو اس سے کیوں نہ روکا جائے۔ اس نے کہا کہ خیر اسی میں ہے کہ اپنا حکم واپس لو۔ ورنہ ابھی تمہارا سر قلم کردوں گا۔ فرمایا مجھے قتل ہونا گوارا ہے مگر حکم خدا کے خلاف کرنا گوارا نہیں ہے۔

یہ سنتے ہی اس نے حکم دیا کہ ان کو باہر لے جا کر قتل کردو۔ چنانچہ جلاد نے ایک کھلے مقام پر ان کو بٹھا کر تلوار سے سر اڑا دیا۔ جس مقام پر یہ بے گناہ خون گرایا گیا تھا زمین نے اس کو جذب نہیں کیا بلکہ وہ شب و روز جوش مارتا رہا ہر چند اس کو دبانے کی کوشش کی گئی مگر وہ دبا نہیں جس قدر مٹی اس پر ڈالی جائی وہ اوپر آجاتا یہاں تک کہ اس مقام پر ایک ٹیلہ ہوگیا۔

اس کے بعد بنی اسرائیل میں سخت پھوٹ پڑی اور آپس میں جنگ شروع ہوگئی یہاں تک کہ ستر ہزار بنی اسرائیل ایک دوسرے کے ہاتھ سے تہ تیغ ہوگئے۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ تب جناب یحییٰ کے خون کا جوش ختم ہوا۔

یہی صورت خون حسینؑ کے لئے ہوئی کہ وہ برابر جوش مارتا رہا۔ یہاں تک کہ کربلا سے اور بیت المقدس سے جو پتھر اکھاڑا جاتا تھا۔ اس سے تازہ خون جوش مارتا ہوا نکلتا تھا۔ جناب یحییٰ کا خون ستر ہزار بنی اسرائیل کے قتل ہوجانے کے بعد جوش کھانے سے رک گیا لیکن حسین علیہ السلام کا خون اب تک نہیں رکا۔ عاشورہ کے روز تسبیح کے دانوں پر نمودار ہو جاتا ہے۔ یہ خون اس وقت تک جوش مارتا رہے گا جب تک اس خون ناحق کے ولی حقیقی حضرت حجت اللہ عجل اللہ فرجہ قاتلان حسین اور ان کے ہوا خواہوں سے بدلہ نہ لیں گے۔

جناب یحییٰ کا ایک خون ناحق تھا جس نے ستر ہزار بنی اسرائیل کو تہ تیغ کرا دیا۔ اور کربلا میں تو بہتر کا خون بہایا گیا ان کا انتقام کتنے لوگوں سے لیا جائے گا اس کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

دنیا میں بے شمار لوگ بے جرم و خطا شہید ہوئے اور پانی کی طرح ان کے خون بہائے گئے لیکن ان کے غم کے اثرات ایک محدود حلقے میں رہ کر ختم ہو گئے۔ مگر فاطمہؑ کے لال کا خون ایسا تھا کہ دنیا کی کوئی مخلوق ایسی نہ رہی جس پر اس غم کا اثر نہ ہوا۔ ساکنانِ ملاءِ اعلیٰ میں ہل چل پڑی۔ جنہوں نے نوحہ خوانی کی۔ حیوانات بے چین ہوئے۔ آفتاب دماہتاب کو گہن لگا۔ آسمان پر شفق کی سرخی اس غم میں ظاہر ہوئی۔ سیاہ آندھی چلی۔ زمین کربلا میں زلزلہ آیا۔ آسمان سے خون برسا۔ انتہا یہ ہے کہ زمین و آسمان اس پر روئے۔ جب فرعون کا بیڑا غرق ہوا تو قرآن بتاتا ہے فَمَا بَکَتْ عَلَیْہِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (سورہ الدخان ۲۹/۴۴) (ان پر آسمان و زمین نہیں روئے) اس سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین میں رونے کی اہلیت تو ہے مگر ان پر روئے نہیں پس اگر وہ کسی پر بھی نہ روئیں تو اس کی آیت کی صداقت کیسے ثابت ہو گی۔ ضرور کسی خونِ ناحق کے بہائے جانے پر ان کو رونا چاہیے۔

سوائے امام حسینؑ کے کسی شہید کے متعلق آسمان و زمین کا رونا ثابت نہیں ہوتا۔ مفسرین نے اس آیت کے متعلق لکھا ہے کہ زمین کا رونا یہی ہے کہ زمین سے خون نے جوش مارا اور آسمان سے اتنا خون برسا کہ لوگوں کے لباس سُرخ ہو گئے۔ ظروف کے اندر پانی سُرخ ہو گیا۔ درودیوار پر دھبے نظر آنے لگے۔ آسمان پر شفق کی سُرخی زیادہ گہری نظر آئی۔ بلکہ بعض مورخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ واقعہ کربلا سے پہلے شفق ہوتی ہی نہ تھی۔ یہ سُرخی آسمان پر واقعہ کربلا کے بعد ظاہر ہوئی ہے۔

جناب یحییٰ کا قتل انتہائی دردناک تھا لیکن اس کی نوعیت شہادت حسینؑ سے مختلف ہے۔ کربلا میں صرف ایک ہی دردناک حادثہ شہادت کا نہ تھا بلکہ اس کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔ جناب یحییٰ بھوکے پیاسے شہید نہیں ہوئے جناب یحییٰ کے ساتھ ان کے خاندان والے نہیں تھے اور نہ قتل ہوئے۔ جناب یحییٰ کے خاندان کی بی بیاں اسیر نہیں ہوئیں۔ شہروں شہروں تشہیر نہیں کی گئیں۔ درباروں میں سر برہنہ مجرموں کی طرح کھڑی نہیں کی گئیں۔ تیرہ و تار قید خانوں میں مقید نہیں ہوئیں۔

یہ تمام بلائیں صرف خاندانِ رسول سے مخصوص ہوئیں۔ ان کے سوا کوئی دوسرا ان جان فرسا منازل میں ثابت قدم نہیں رہ سکتا تھا۔

قید و بند کی تکلیفیں مرد تو خیر کسی نہ کسی طرح جھیل ہی جاتے ہیں۔ لیکن عورتیں چونکہ رقیق القلب ہوتی ہیں اس لیے ان سے ایسے مصائب برداشت نہیں ہوتے۔ یزید نے جس قید خانہ میں اہل بیت رسولؐ کو مقید کیا تھا وہ اس زمانے کے جیل خانے نہ تھے جہاں قیدیوں کو بروقت کھانا ملتا ہے کھلی فضا میں رکھا جاتا ہے۔ بیماری میں ان کا علاج کیا جاتا ہے

یزید کا قید خانہ تو خدا کی پناہ جان لیوا تھا قید خانہ کیا تھا ایک پرانا شکستہ حال خرابہ تھا جس میں دن کو بھی رات کی سی تاریکی رہتی تھی۔ تازہ ہوا کا گزر نہ تھا روشنی کا نام نہ تھا۔ چھت سے مٹی گرتی تھی۔ در و دیوار میں حشرات الارض کا گھر تھا۔ سوائے کچی ناہموار زمین کے کوئی فرش نہ تھا۔ کھانے کو بھنا ہوا غلہ دیا جاتا تھا۔ پینے کو گرم پانی۔ ٹھنڈا پانی کبھی ان غریبوں تک پہنچا ہی نہیں۔ جو کھانا آتا تھا وہ بھی اتنا کم کہ سب کے لیے کافی نہ ہوتا تھا۔ ایک روز بیمار کربلا نے جناب زینبؑ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے دیکھا۔ گھبرا گئے طوق و زنجیر سنبھالے۔ پھوپی کے پاس آئے اور عرض کرنے لگے۔ پھوپھی اماں میں نے آج کے سوا کبھی آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ بیماری کی حالت میں بھی آپ نے ایسا نہیں کیا۔ کیا وجہ ہے کہ آج آپ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔ فرمایا بیٹا علی بن الحسین اس کی وجہ نہ پوچھو۔ تم کمزور ہو تمہارے دل میں اتنی طاقت نہیں کہ اس غم کی داستان کو سن کر اپنے کو قابو میں رکھ سکو۔ جب زیادہ اصرار کیا تو جناب زینبؑ نے ام کلثومؑ سے کہا۔ بہن آؤ ذرا بیمار بھتیجے کے بازو پکڑ لو۔ ایسا نہ ہو کہ ان کو غش آ جائے اس کے بعد فرمایا۔

بیٹا! سنو۔ جب سے ہم قید یزید میں آئے ہیں۔ اتنا کھانا کبھی اس نے نہیں بھیجا کہ ہم سب کو کافی ہو۔ میں اپنے حصے کا کھانا اب تک بچوں کو کھلاتی رہی ہوں۔ اور خود فاقے کئے ہیں۔ جب تک بدن میں طاقت رہی کھڑے ہو کر نماز پڑھی لیکن بیٹا! اب زینبؑ میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رہی۔

آہ! ذریت رسولؐ اور دانے پانی کو ترسے۔

یہ تو حال تھا کھانے کا۔ اب دوسری غم انگیز داستان سنیئے۔ جب تازہ ہوا نہ ملتی تھی تو بچے ماہی بے آب کی طرح خاک پر تڑپتے تھے اور بی بیوں کا یہ حال تھا کہ شب و روز بد حواسی میں گزارتی تھیں۔ ایک روز جب امام زین العابدینؑ کا گرمی کی شدت سے برا حال ہوا تو آپ نے زندان بان سے کہا کہ اگر تیری اجازت ہو تو میں ذرا دیر کے لیے زندان سے نکل کر تازہ ہوا کھا لوں۔ وہ اہل دل تھا رحم آ گیا قفل زندان کھول کر کہا۔ اچھا تھوڑی دیر کے لیے باہر آ جائیے۔ امام علیہ السلام طوق و زنجیر کو سنبھالتے زندان سے نکلے۔ اور دروازے کے باہر کھلی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اتفاقاً ایک دوست دار اہل بیت کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ایک مرد ضعیف و ناتوان ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا آہنی طوق پہنے سر جھکائے بیٹھا ہے۔ قریب آ کے کہا اے قیدی تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ اور تم نے کیا جرم کیا ہے۔ جس کی یہ سزا ملی ہے۔ ایک آہ سرد کھینچ کر آپ نے فرمایا۔ ہمارا جرم حق پرستی ہے۔ اور ہم مدینہ کے رہنے والے ہیں۔ اس نے کہا تم کس قوم و قبیلہ سے ہو۔ فرمایا اے بھائی! ان باتوں کے پوچھنے سے کیا فائدہ۔ کبھی تھے جو کچھ تھے۔ اب تو امیر شام کے قیدی ہیں۔ اس نے کہا آخر کچھ تو پتہ بتاؤ۔ فرمایا ہم قبیلہ بنی ہاشم سے ہیں۔ یہ سن کر وہ گھبرا گیا اور کہا بنی ہاشم میں آپ میرے سید و آقا امام حسینؑ سے بھی واقف ہیں۔ آپ نے فرمایا اے بھائی اب حسینؑ کہاں

قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا عَطْشَانَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا یہ سنکر اس نے منہ پیٹ لیا۔ اور کہا آہ میرے مولا قتل کر دیئے گئے۔ کاش میں مر جاتا اور یہ خبر نہ سنتا۔ پھر اس نے کہا اور ان کے فرزند علی بن الحسین کہاں

ہیں۔ فرمایا کیا تم علی بن الحسین کو جانتے ہو۔ اس نے کہا کیونکر نہ جانوں۔ ان کے بڑے احسان میرے اوپر ہیں۔ ایک مرتبہ سفر میں میرا اونٹ کھو گیا۔ میں مدینہ پہنچا اور اپنی پریشانی حضرت علی بن الحسینؑ سے بیان کی تو انہوں نے مجھے راحلہ دیا اور پانچ سو درہم زادِ سفر کے لیے دیئے۔ حضرت نے سر اٹھا کر فرمایا اے شخص تو نے کہاں علی بن الحسین کو پہچانا۔ میں علی بن الحسینؑ ہوں۔ وہ پیروں پر آنکھیں مل مل کر کہنے لگا۔ کاش یہ بیڑیاں میرے پاؤں میں ہوتیں۔ یہ ہتھکڑیاں میرے ہاتھوں میں ہوتیں۔ یہ طوق میری گردن میں ہوتا۔ مولا یہ بتائیے کہ یہ تباہی آپ کے خاندان پر کیوں آئی۔ آپ نے مختصر لفظوں میں واقعہ کربلا بیان کرنا شروع کیا۔ کہ زندان سے ایک نحیف دکمزور آواز آئی۔ بیٹا سجاد! تمہاری مفارقت پھوپھی کو گوارا نہیں۔ اب زندان میں آجاؤ۔ اگر کسی نے یزید کو خبر دے دی تو نہ معلوم وہ ظالم کیا ظلم کرے۔" یہ سن کر بیمار کربلا اٹھ کھڑے ہوئے، اور اس محب سے فرمایا۔ اچھا بھئی خدا حافظ۔ میری پھوپھی یاد فرما رہی ہیں۔ جب زندان میں آئے تو جناب زینب نے پوچھا۔ بیٹا! تم عالم غربت میں کس سے باتیں کر رہے تھے۔ فرمایا پھوپھی جان یہ ہمارا دوست تھا۔ آہ دوستوں کو ترسی زینبؑ نے جب یہ سنا تو فرمایا۔ بیٹا اگر وہ نہ گیا ہو تو ذرا دیر کے لیے در زندان کے قریب بلا لو۔ مجھے اس سے کچھ کہنا ہے۔ آپ نے آواز دی اے بھائی! ذرا قریب آ۔ میری پھوپھی تجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ وہ قریب آیا تو جناب زینبؑ نے فرمایا۔ بیٹا ہمارا سلام اس دوست سے کہو۔ جونہی امام نے کہا: میری پھوپھی جان سلام کہتی ہیں اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور رو رو کر عرض کی شہزادی میں اس قابل کہاں کہ علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹی نبی کی نواسی مجھے سلام میں مجھ پر سبقت کرے۔ فرمایا بیٹا ان سے کہو کہ تمہارا آقا تین روز کا پیاسا شہید ہوا ہے۔ جب ٹھنڈا پانی پینا تو ان کی پیاس یاد کر لینا دوسرے ہم بہتر شہیدوں کے سوگوار ابھی تک صف ماتم نہیں بچھا سکے۔ لہذا جب گھر جانا تو حسینؑ کی مجلس غم برپا کرنا اور ہمارے مصائب و آلام پر گریہ کرنا۔ اپنی بی بیوں کو ہمارا سلام پہنچانا۔ اور کہنا علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹی قید یزید میں ہے۔ وہ اپنے بھائی پر جی بھر کے رو نہیں سکی۔ اس کے بدلے تم صف ماتم بچھا کر ہمارے شہیدوں پر رونا۔

اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ

وَسَيَعۡلَمُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَىَّ مُنۡقَلَبٍ يَّنۡقَلِبُوۡنَ

چونتیسویں مجلس

حضرت مریم و حضرت عیسیٰ علیہما السّلام کا قصہ

اور

فضائل اہلبیتؑ اور زندانِ شام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیۡ کِتَابِہِ الۡمَجِیۡدِ وَفُرۡقَانِہِ الۡحَمِیۡدِ

یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰکِ وَطَہَّرَکِ وَاصۡطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الۡعٰلَمِیۡنَ

(سورہ آلِ عمران ۴۲/۳)

(اے مریم! اللہ نے تم کو چن لیا۔ اور تم کو پاک کر دیا اور تم کو چن لیا عالمین کی عورتوں پر)

حضرت زکریا کے زمانے میں حسینہ نامی ایک بڑی نیک بخت اور عبادت گزار بی بی تھیں۔ ان کے میاں کا نام عمران بن ماثان تھا حضرت زکریا حسینہ کے بہنوئی تھے۔ حسینہ بیت المقدس کی خدمت میں لگی رہتی تھیں۔ آخر عمر میں جب حاملہ ہوئیں تو خدا سے یہ نذر کی کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے میں اس کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گی۔ اس وقت یہ دستور تھا کہ ماں باپ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو اللہ کی نذر کر دیتے تھے۔ اور پھر اس سے عمر بھر دنیا کا کوئی کام نہ لیتے تھے کاہنوں نے ان کو یقین دلایا کہ لڑکا ہوگا۔ جب وقت آیا تو لڑکی پیدا ہوئی۔ حسینہ کو بڑا صدمہ ہوا کہ نذر قبول نہ ہوئی کیونکہ لڑکی کو نذر کرنے کا دستور نہ تھا۔ بڑی عاجزی کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں عرض کی۔ کہ میں نے تو لڑکی جنی ہے اور تو جانتا

ہے کہ عورت مرد کی طرح نہیں ہوتی۔ میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا۔ خداوندا اس کو اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ شیطان کے مکر سے ان کو بچائے رکھنا۔

آواز آئی اے حسینہ! ہم نے تمہاری نذر قبول کی۔ پس وہ خوش ہو گئیں۔ جب مریم سات برس کی ہو گئیں تو ان کی ماں ان کو ساتھ لیئے ہوئے بیت المقدس میں آئیں۔ اور حضرت زکریا سے کہنے لگیں۔ میں نے ایسی ایسی نذر کی تھی۔ اب آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔ انہوں نے ان رہبانوں سے جو بیت المقدس میں رہا کرتے تھے۔ پوچھا کہ اس لڑکی کی نگرانی اور پرورش کا بار کون اپنے اُوپر لیتا ہے۔ ہر ایک نے اپنی رضامندی ظاہر کی جب آپس میں جھگڑا ہوا تو قرعہ اندازی کی گئی تو حضرت زکریا کا نام نکلا۔ چنانچہ انہوں نے اس خدمت کو اپنے ذمّہ لے لیا۔

بیت المقدس میں چھت پر ایک علیحدہ کمرہ مریم کو دے دیا گیا۔ وہاں رات دن عبادت میں مشغول رہتی تھیں حجرہ باہر سے بند رہتا تھا کنجی اس کی حضرت زکریا کے پاس رہتی تھی۔ صبح و شام کھانا پہنچانے جاتے تو اس کو کھولتے ایک بار جو حجرہ کھولا تو دیکھا مریم مشغول نماز ہیں۔ اور طرح طرح کے میوے اور کھانے سامنے رکھے ہیں بڑا تعجب ہوا کہ بند کمرے میں یہ کہاں سے آئے ہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئیں تو پوچھا۔ یہ کہاں سے آئے۔ انہوں نے کہا اللہ نے بھیجا ہے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ جناب زکریا سمجھ گئے کہ یہ غیر معمولی لڑکی ہے۔

یہ قصہ صاف لفظوں میں قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن جب ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ فاطمہ زہراؑ کے لیے طعام جنت سے آیا۔ درآنحالیکہ وہ مشغول نماز رہیں تو ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہیں۔

یہاں زکریا نے سوال کیا تھا وہاں خاتم الانبیاء نے بیٹی سے پوچھا تھا کہ یہ کہاں سے آیا۔ جو جواب جناب مریمؑ نے دیا تھا وہی جواب حضرت سیدہ عالمؑ نے دیا کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے۔

حضرت مریم کی عمر ۱۴ سال کی تھی کہ ایک دن غسل کر کے نکلیں۔ تو ایک خوبصورت نوجوان کو اپنے کمرہ میں کھڑا پایا۔ ڈر کر کہنے لگیں اگر تو نیک و پرہیزگار ہے تو میں تیرے معاملہ میں خدا سے پناہ مانگتی ہوں۔ اس نے کہا مریم ڈرو نہیں میں تمہارے خدا کا رسول (جبرئیلؑ) ہوں۔ اور اس غرض سے آیا ہوں کہ تم کو ایک صاف ستھرے بچے کی بشارت دوں۔ مریمؑ نے کہا یہ کیسے ممکن ہے۔ مجھے تو آج تک کسی مرد نے مس کیا ہی نہیں اور نہ میں بدکار عورتوں میں سے ہوں۔ اس نے کہا تمہارے رب کا حکم یہی ہے۔ یہ کام خدا کے نزدیک آسان ہے۔ تیرا بیٹا خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہو گا۔ اس کے بعد پھر عبادت میں مشغول ہو گئیں۔ اور یہ واقعہ کسی پر ظاہر نہ کیا۔ جب ولادت کا وقت قریب آیا چاہا کہ یہاں سے نکل کر کہیں چلی جاؤں تاکہ ولادت کا یہ حال یہاں کے کسی رہنے والے کو معلوم نہ ہو۔ دل

میں کہتی تھیں۔ کاش میں اس سے پہلے مرجاتی۔ اور بھولی بسری ہو جاتی، تاکہ مجھے بدنامی نہ ہوتی۔

دروازہ باہر سے بند تھا جوں ہی اس کے قریب پہنچیں وہ کھل گیا۔

اگر ہم بیان کرتے ہیں کہ جب فاطمہ بنت اسد مادر امیرالمومنین علیہ السلام دردِ زہ کی حالت میں دیوار کعبہ مس کررہی تھیں تو ایک دَر دیوار میں کھل گیا اور وہ اس کے ذریعے سے اندر داخل ہوگئیں تو لوگ اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن جناب مریمؑ کے متعلق ان کو انکار کرتے نہیں بنتی۔

الغرض جناب مریمؑ چپ چاپ بیت المقدس سے نکل کر ایک میدان کی طرف چلی گئیں اور ایک کھجور کے درخت کے نیچے جو بالکل سوکھ چکا تھا بیٹھ گئیں اور ایک چادر کی آڑ کرلی۔ وہیں جناب عیسیٰ پیدا ہوئے۔ جناب مریمؑ کو بھوک بھی معلوم ہوئی اور پیاس بھی۔ خداوند عالم نے وحی کی وَ هُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (سورہ مریم ۱۹/۲۵) اے مریمؑ اس درخت کی جڑ پکڑ کر ہلاؤ۔ تمہارے اوپر پکے ہوئے تازے تازے خرمے گریں گے۔ پیروں کو زمین پر رگڑو پانی نکل آئے گا۔ چنانچہ حضرت مریمؑ نے اس درخت کی جڑ پکڑ کر ہلائی۔ وہ سوکھا درخت تروتازہ ہوگیا اور اس سے پکے رسیلے پھل گرنے لگے۔ وہ ان کو کھانے لگیں۔ کھاتے ہی چھاتیوں میں دودھ بھر آیا۔ چشمہ کا پانی پیا۔ سیر و سیراب ہوگئیں۔

یہ جناب مریم تھیں جن کے لیے خدا نے دنیا کے ایک درخت کے پھلوں کو ان کی غذا قرار دیا اور وہ حضرت فاطمہ بنت اسد تھیں۔ جن کے لیے خانہ کعبہ کے اندر جنت کے میوے آئے۔ یہ مریم تھیں جن کو خانہ کعبہ میں بچہ جننے کی اجازت نہ ہوئی۔ اور یہ فاطمہ بنت اسد تھیں۔ جن کے لیے ندا آئی اُدْخُلِیْ فِی الْبَیْتِ

جب جناب مریمؑ حضرت عیسیٰ کو لے کر چلیں تو یہودیوں نے آگھیرا۔ اور انہوں نے کہا۔ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا (سورہ مریم ۱۹/۲۸)

ہارون بنی اسرائیل کا ایک بدکار آدمی تھا۔ اور ازراہ طنز اس کی بہن کہہ کر خطاب کیا۔ (اے ہارون کی بہن نہ تو تمہارا باپ ہی بُرا تھا اور نہ ماں ہی بدکار تھیں) پھر یہ بچہ کہاں سے آگیا۔ خدا نے وحی کی کہ تم خاموش رہو۔ لہٰذا حضرت مریم نے اشارہ کیا کہ اس بچہ سے پوچھ لو۔ انہوں نے کہا کہ ہم کیوں کر بولنے کی تکلیف دیں اس بچہ کو جو گہوارہ میں ہے یعنی گود میں ہے۔ اشارہ سے کہا پوچھو تو۔ آخر کار انہوں نے حضرت عیسیٰ سے کہا۔ تمہارا باپ کون ہے۔ یہ سُن کر حضرت عیسیٰ نے کہا۔ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا (سورہ مریم ۱۹/۳۰) میں اللہ کا بندہ ہوں (زنا زادہ شیطان کا بندہ ہوتا ہے) اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔)

یہاں چند باتیں قابل غور ہیں۔ اوّل حضرت عیسیٰ کا بولنا پھر یہ کہنا مجھے بچپن میں خدا نے کتاب دی ہے۔ پھر یہ کہنا کہ مجھے نبی بنایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے برگزیدہ بندے بچپن میں بھی ویسا ہی کلام کرتے ہیں۔ جیسا عام لوگ

بڑے ہوکر۔ پس اگر علی بن ابی طالبؑ نے آغوشِ مادر میں کلام کیا تو لوگوں کو تعجب کیوں ہے اور اس کو غلط کیوں سمجھتے ہیں۔ علی علیہ السلام مرتبے میں عیسیٰ علیہ السلام سے کم نہ تھے۔ دوسرے حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ خدا نے مجھے کتاب دی ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ بچپن میں انجیل پڑھے پڑھائے آتے ہیں تو حضرت علیؑ اگر پیدا ہوتے ہی قرآن سنا دیں تو کیا محل تعجب ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ پر انجیل کا نزول جوانی میں ہوا۔ پھر یہ کون سی کتاب تھی۔ جس کا وہ ذکر کر رہے ہیں۔ لامحالہ یا تو اس کو کتاب وجودی ماننا پڑے گا۔ پھر یہ کہ نزول کتاب سے پہلے انجیل کا علم ان کو دے دیا گیا تھا پس جس طرح ان کو علم کتاب دیا گیا تھا۔ اسی طرح حضرت علی کو دے دیا گیا۔ قبل نزول کتاب علم دیا جانا قرآن سے ثابت ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (سورہ رحمٰن ۱تا۴/۵۵) یعنی خلق انسان (مراد وجود ختم انبیاء) سے پہلے اس کو علم قرآن دیا گیا اور اس کے بعد بیان سکھایا گیا یعنی نزول قرآن کے بعد۔

علی علیہ السلام چونکہ شریک نور محمدی ہیں۔ لہٰذا اگر ان کو قبل نزول قرآن یہ علم عطا کر دیا گیا تو کیا محل اعتراض ہے ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا (سورہ مریم ۱۹/۳۰) یعنی کتاب ملنے کا ذکر پہلے ہے اور نبی بننے کا بعد میں جس سے معلوم ہوا کہ خدا جس کو نبی بناتا ہے کتاب کا علم اس کو پہلے دے دیتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ نبی ہونے سے پہلے محتاج تعلیم نہیں ہوتا۔ کتاب خدا بجائے خود مخزن علوم الہیہ ہوتی ہے اس کا علم سینے میں آ جانے کے بعد پھر کسی سے علم حاصل کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

امام رضا علیہ السلام نے فرمایا۔ اگر ہمارا علم بھی عام لوگوں کی طرح ہو تو پھر ہم میں اور ان میں کیا فرق رہے

تیسرے خداوند عالم نے مریم کی عظمت کی گواہی حضرت عیسیٰ سے دلوائی۔ جو آغوشِ مادر میں تھے۔ حالانکہ جناب زکریا جیسا پیغمبر موجود تھا اور یہودی ان کو مانتے بھی تھے۔ وہ معصوم بھی تھے۔ لیکن ان کو عصمت مریم کا گواہ نہ بنایا۔ بلکہ ایسے کو بنایا۔ جس کی گواہی خرق عادات سے تعلق رکھتی ہو۔ اور زبان زد خاص و عام ہو جائے۔ کیونکہ یہ ایک انوکھی بات ہوگی۔ اسی طرح حضرت یوسفؑ کی گواہی بھی ایک بچے ہی سے دلوائی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سن رسیدہ لوگوں سے زیادہ قابلِ وثوق گواہی بچوں کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب سرور انبیاء نصاریٰ نجران کے مقابل اپنی رسالت کی تصدیق کرانے کو چلے تو ہر صنف کا ایک گواہ اپنے ساتھ لیا۔ عورتوں کی قائم مقامی فاطمہ زہراؑ نے کی مردوں کی علی بن ابی طالب نے اور بچوں کی حسنؑ و حسینؑ نے لیکن مرد عورت کی گواہی سے مقدم رسولؐ نے بچوں کی گواہی رکھی اور ایک چھوڑ دو کی۔ تاکہ نصاب گواہی کا پورا ہو جائے۔ لہٰذا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اہل بیتؑ کے بچے بھی اپنی گواہی میں اسی طرح معتبر ہیں جس طرح بڑے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ بعد بعثت جب سب سے پہلے علیؑ نے اظہار اسلام کیا تو وہ اس لئے نظرانداز کر دیا جائے کہ وہ دس سال کے تھے اور بالغ نہ تھے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا ہم اہل بیتؑ نبوت میں دوسروں کا قیاس ہم پر نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔

صَغِيْرُنَا وَكَبِيْرُنَا سَوَآءٌ چوتھی بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے قول سے ثابت ہوا کہ نبی ماں کے پیٹ ہی سے نبی پیدا ہوتا ہے۔ اَلنَّبِیُّ نَبِیٌّ وَلَوْ كَانَ صَبِيًّا (نبی نبی ہے چاہے وہ بچہ ہی ہو) اور جب ماں کے پیٹ سے نبی بن کر آتا ہے پھر اس کے لیے یہ کہنا کہ قبل نبوت اس سے صدور گناہ ممکن ہے ایک بے معنی بات ہے قبل نبوت کا کوئی وقت اس کے لیے باقی ہی نہیں رہتا۔ پانچویں بات یہ ہے۔ کہ مریم کی گواہی ان کے لڑکے ہی نے دی جس سے معلوم ہوا کہ اولاد کی گواہی ماں باپ کے حق میں جائز رکھی۔ اور قابل قبول ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ فاطمہ زہراؑ کے حق میں درباب فدک حسینؑ کی گواہی قابل قبول نہ ہو۔ دنیا نہ مانے یہ دوسری بات ہے لیکن قانون قدرت کی رو سے وہ قابل قبول ہے۔ چھٹے خدا نے جناب مریمؑ کو بولنے سے منع کر دیا اور ان کو یہودیوں کے جھوٹے الزام کی تردید میں کچھ کہنے کی اجازت نہ دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہودی ان کے بیان کو قبول ہی نہ کرتے اور یہ قبول نہ کرنا ان کے لیے اور زیادہ مولم ہوتا۔ دوسرے اگر کچھ بول لیتیں تو یہ بھی گمان ہو سکتا تھا کہ انہوں نے بچے کو سکھا دیا ہے۔ اسی کی بناء پر یہ بول رہا ہے۔ مریم کا روزہ صمت یعنی خاموشی کا روزہ مشہور ہے۔

یہودی اوّل روز ہی سے حضرت عیسیٰ کے دشمن ہو گئے۔ اور ان کے قتل کی فکر میں رہنے لگے۔ وہ ان کی کسی فضیلت کو تسلیم ہی نہ کرتے تھے۔ مگر ان کے تسلیم نہ کرنے سے ہوتا کیا کیونکہ خدا کے نزدیک وہ صاحبِ فضل تھے اللہ نے ان کو اپنا کلمہ کہا ہے۔ اپنی روح کہا ہے۔

جس طرح عیسیٰ اللہ کا کلمہ ہیں۔ اسی طرح محمد و آل محمدؐ بھی کلمۃ اللہ ہیں اور یہی وہ کلمات تھے جن کی بدولت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی۔ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ (سورہ البقرہ ۲/۳۷) اور یہی وہ کلمات تھے جن کی محبت کا امتحان ابراہیم خلیل اللہ کو دینا پڑا۔ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (سورہ البقرہ ۲/۱۲۴)

اور یہی وہ کلمہ ہے جس کی مثال شجرہ طیبہ سے دی گئی ہے۔ مَثَلُ كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (سورہ ابراہیم ۱۴/۲۴)

جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ تم اپنی نبوت کی کوئی علامت تو دکھاؤ۔ تو آپ مٹی سے ایک پرندہ کی صورت بنا کر اور اس پر کچھ دم کر کے باذن خدا ہوا میں اڑا دیا۔ اگرچہ یہودیوں نے اس معجزے کو جادو سے تعبیر کر دیا۔

حضرت عیسیٰ کے زمانے میں طبیبوں کا بڑا زور تھا لہذا خدا نے ان کو یہ معجزہ عطا فرمایا کہ جس کوڑھی یا مبروص پر وہ اپنا ہاتھ رکھ دیتے۔ وہ اچھا ہو جاتا اور جس مردہ کو وہ ٹھوکر مار دیتے وہ زندہ ہو جاتا۔ یہودیوں نے

اس کو بھی تسلیم نہ کیا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ نے کہا بس تم کو یہاں تک بتا سکتا ہوں کہ تم اپنے گھروں میں کیا کھاتے ہو۔ اور کیا جمع کرتے ہو۔ اس پر بھی وہ اپنے کفر پر اڑے رہے۔

یہودیوں نے باہم یہ طے کر لیا تھا کہ حضرت عیسیٰ سے کوئی اپنی لڑکی کی شادی نہ کرے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ وہ عمر بھر کنوارے رہے۔

حضرت عیسیٰ کے اصحاب خاص حواری کہلاتے ہیں۔ یہ دھوبی لوگ تھے۔ انہوں نے وفاداری اور جانثاری کے دعوے تو بہت کیے تھے۔ لیکن جب حضرت عیسیٰ پر مصیبت کا وقت آیا۔ تو کئی حواری ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

یہودی بادشاہ نے حضرت عیسیٰ کو سولی دینے کا ارادہ کیا تو آپ ایک گھر میں پوشیدہ ہو گئے۔ آپ نے اپنے حواریوں سے کہا کہ تم صبح سے پہلے میری نبوت کے منکر ہو جاؤ گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب بادشاہ کے سپاہی حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرنے آئے تو ایک حواری نے اس گھر کا پتہ بتا دیا جہاں آپ پوشیدہ تھے۔ ایک نے اپنی جان بچانے کے لیے کہہ دیا کہ میں ان کو جانتا ہی نہیں۔ ایک دیوار پھاند کر باہر چلا گیا جس نے کہا تھا کہ میں جانتا ہی نہیں۔ اس کو خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہمشکل بنا دیا اور اسی کو پکڑ کر لوگ لے گئے اور اسی کو سولی پر چڑھا دیا۔

خدا نے حضرت عیسیٰ کو آسمان پر بلا لیا۔ یہودیوں کو اس رفع کا پتہ بھی نہ چلا۔ وہ سمجھے کہ ہم نے سولی دے دی۔ قرآن حکیم کہتا ہے۔ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (سورہ نساء ۴/۱۵۷) انہوں نے ان کو قتل کیا اور نہ سولی دی۔ بلکہ ان کو شبہ ہو گیا کہ ان کے ہم شکل کو سولی دے کر سمجھا کہ حضرت عیسیٰ کو سولی دی ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ انبیاء کے اصحاب خاص اکثر اپنی بے وفائی کا ثبوت دیتے رہے۔ جب نبی پر مصیبت آ پڑی تو صاف الگ ہو گئے۔

حضرت موسیٰ کے اصحاب نے صاف کہہ دیا تھا اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (سورہ المائدہ ۵/۲۴) آپ اور آپ کا رب جا کر لڑیں۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

طالوت کے ساتھیوں نے وقت جنگ جالوت کا ساتھ چھوڑ دیا۔ عیسیٰ کے ساتھیوں نے چھوڑ دیا۔ یہاں تک حضرت محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں نے بھی جنگ احد میں ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ باوجود کہ حضرت بلند آواز سے ایک ایک کا نام لے کر پکار رہے تھے مگر کوئی نہ سنتا تھا۔

حضرت علیؑ کے اصحاب نے بھی دھوکا دیا اور جنگ صفین میں ایک گروہ آپ سے الگ ہو گیا۔ امام حسن علیہ السلام کے ساتھیوں نے دھوکا دیا اور آپ کو معاویہ کے سپرد کر دینے کا ارادہ کر لیا۔

یہ صرف حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات تھی جن کو خدا نے ایسے اصحاب و انصار دیئے جو نہ کسی نبی کو ملے نہ ولی کو خود امام علیہ السلام نے شب عاشور اس پر فخر کیا ہے۔

آپ نے کئی بار لوگوں کو کھلے لفظوں میں سمجھایا کہ جو میرا ساتھ دے گا وہ زندہ نہ بچے گا۔ میں نے اپنی بیعت تم لوگوں کی گردنوں سے اٹھا لی ہے جس کا دل جدھر چاہے چلا جائے۔ مگر ان وفاداروں میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ اور بڑی

خوشی سے اپنی جانیں امام علیہ السلام کے قدموں پر نثار کر دیں۔

یہ خصوصیت بھی امام حسین علیہ السلام کی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کسی نبی کے زمانے میں بھی خالص مومنوں کا مجمع ان کے ساتھ نہیں رہا۔ بلکہ مخلوط مجمع رہا یعنی مومن و منافق ملے جلے رہے۔ یہاں تک کہ نہ سرور انبیا کے زمانے میں یہ مجمع نکھرا اور نہ حضرت علیؑ کے زمانے میں یہی وجہ تھی منافقوں نے دوستی کی آڑ میں بڑے بڑے نقصان پہنچائے لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ جو مجمع تھا۔ وہ بالکل نکھرا ہوا تھا کسی منافق کا نام بھی نہ تھا۔ سب مومن ہی مومن تھے۔ کیا کہنا حضرت امام حسین علیہ السلام کا نہ صرف اپنا مجمع نکھارا بلکہ دشمن کے مجمع کو بھی نکھار دیا۔ اور اب دونوں طرف خالص لوگ رہ گئے۔ ایک طرف سب مومن ہی مومن تھے۔ اور دوسری طرف سب منافق ہی منافق تھے۔ ایک طرف حق ہی حق رہ گیا تھا اور دوسری طرف باطل ہی باطل۔ منافقوں میں حُر وغیرہ دو چار مومن داخل تھے۔ امام علیہ السلام نے ان کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔

جس طرح مرد کامل الایمان حسینؑ کے ساتھ تھے۔ اسی طرح کامل الایمان عورتیں جناب زینبؑ سلام اللہ علیہا کے ساتھ تھیں۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ زنان اہل بیت کے چودہ عورتیں وہ تھیں۔ جو انصار حسینؑ کے ساتھ کوفے سے آئی تھیں۔ انہوں نے کسی وقت بھی اپنے دل میں اس خیال کو نہیں آنے دیا کہ امام حسین علیہ السلام کی وجہ سے اس مصیبت میں پڑے۔ ان کو اپنے سے زیادہ جناب زینبؑ و ام کلثومؑ اور دیگر زنان اہل حرم کی راحت کا خیال تھا۔

زندانِ شام میں انہوں نے کبھی کھانے پینے میں سبقت نہیں کی۔ ہر وقت یہی چاہا کہ پہلے شہزادیاں کھا لیں۔ تب ہم کھائیں۔ جب جناب زینبؑ ان کے وارثوں کو یاد کرکے پُرسا دیتی تھیں تو وہ کہتی تھیں شہزادی ان کا غم نہ کیجئے۔ وہ آپ کے غلام تھے آپ کے بھائی کے فدائی تھے۔ ذکر کیجئے ہمارے امام مظلوم کا۔ حقیقت یہ ہے کہ زندانِ شام میں اہل حرم نے بڑی تکالیف اُٹھائیں۔ رات دن ان کو سوائے رونے کے اور کام ہی کیا تھا۔

یزید کا محل زنداں کے قریب تھا ایک رات جو رونے کی آواز بلند ہوئی تو ہندہ زوجہ یزید نے کہا یہ کن بے کسوں کو تو نے قید کر رکھا ہے۔ جو رات دن روتے ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ زندان میں جاکر ان کا حال معلوم کروں۔ یزید نے کہا یہ ہمارے دشمن کی بیبیاں ہیں۔ میں نے ممانعت کر دی ہے کہ کوئی شامی عورت ان سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ سحر بیان لوگ ہیں۔ بہت جلد دوسروں کو اپنے قابو میں کر لیتے ہیں۔

ہندہ نے کہا مجھے اجازت دے کیونکہ میرا دل ان کو دیکھنے کو چاہتا ہے۔ یزید نے اجازت دی۔ ہندہ نے پہلے ایک کنیز کو بھیجا کہ جاکر اسیروں کو خبر کر دے کہ ہندہ زوجہ یزید آپ لوگوں کو دیکھنے کو آرہی ہیں۔
کون اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اس خبر کو سن کر ان خستہ حالوں کے دل پر کیا گزری ہوگی۔

زمانہ کا انقلاب ہے کہ کل جس ہندہ کو جناب زینبؑ اور اُم کلثوم کی خدمت پر فخر تھا آج وہ شاہانہ شان سے قید خانہ میں ان کو دیکھنے آ رہی ہے۔

سیدانیاں سروں کو گھٹنوں میں دبا کر بیٹھ گئیں۔ ہندہ زرق برق لباس کے ساتھ کنیزوں کے جھرمٹ میں داخل زنداں ہوئی۔ تاریکی میں کسی کی صورت نظر نہ آئی۔ حکم دیا کہ شمعیں روشن کی جائیں۔ وہ بہت سی سوگوار بی بیوں کے درمیان آکر بیٹھی اور پوچھنے لگی۔ تم کس قبیلہ و قوم کے لوگ ہو۔ اور تم کو کیا ایسی تکلیف ہے کہ تمام رات رو کر گزارتے ہو۔ جناب زینبؑ نے کہا ہم بے کسوں کی احوال پرسی سے کیا فائدہ ہم اس قابل ہی نہ رہے کہ اپنی قوم و قبیلے کو بیان کریں۔ کبھی مدینہ رسولؐ میں رہا کرتے تھے۔ اب تو غریب الوطن ہیں۔ یزید کے مجرم ہیں۔ اپنے کو مدینہ کا کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہندہ نے گھبرا کر کہا۔ بی بی مدینہ کے کس محلے کی رہنے والی ہو؟ فرمایا ایک محلہ بنی ہاشم تھا جو کبھی آباد تھا اب تو ویران ہو گیا۔ ہندہ نے کہا اے بی بی ایسا نہ کہو۔ جب تک میرے مولا حسینؑ کا دم باقی ہے اور میری بی بی زینبؑ و اُم کلثوم موجود ہیں ان کا محلہ ویران نہیں کیا جا سکتا۔ رات دن لوگ ان کی زیارت کو آتے رہتے ہیں۔ جناب زینبؑ نے فرمایا۔ کیا تم زینب کو پہچانتی ہو۔ اس نے کہا وہ شہزادی ہیں میں ان کی غلام ہندہ ہوں۔ یہ سن کر جناب زینبؑ نے رو کر فرمایا اے ہندہ تو نے کیا پہچانا ہے میں زینبؑ بنت علیؑ۔ حسینؑ کی سوگوار بہن ہوں۔ اے ہندہ اب حسینؑ کہاں۔ تیرے شوہر نے ہمارے گھر کا ایک ایک بچہ کربلا میں قتل کرا دیا۔ آہ! ہم ایسے وقت مدینے سے نکلے تھے کہ پھر خیر سے جانا نصیب نہ ہوا ہماری گودیں بچوں سے خالی ہو گئیں۔ ہمارے وارثوں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ہمارے نوجوان ہمارے بوڑھے ہمارے بچے تین دن کے بھوکے پیاسے کربلا میں گوسفندان قربانی کی طرح شہید ہو گئے۔ اس نے کہا قمر بنی ہاشم کہاں تھے۔ شبیہ پیغمبر علی اکبر کہاں تھے۔ جناب زینبؑ نے چھاتی کوٹ کر فرمایا۔ اے ہندہ عباسؑ کے شانے نہر کے کنارے پر کاٹے گئے۔ علی اکبر کے چاند سے سینے پر برچھی ماری گئی۔ آہ کس کس کو پوچھے گی۔ کوئی باقی نہیں رہا۔ آہ ہمارے شہیدوں کے لاشوں پر گھوڑے دوڑائے گئے۔ ہمارے خیموں میں آگ لگائی گئی۔ ہمیں بری طرح لوٹا گیا۔ ہمارے سروں پر ایک چادر تک نہ چھوڑی گئی۔ ہمیں قید کر کے کوفے لے گئے۔ بازاروں میں تشہیر کیا۔ سر برہنہ پسر زیاد کے دربار میں لے جائے گئے۔ قید خانہ میں بند کیا گیا۔ وہاں سے ہمیں دمشق بھیجا جہاں کے گلی کوچوں میں ہم کو بے عماری کے اونٹوں پر بٹھا کر اور شہیدوں کے سر نیزوں پر چڑھا کر تشہیر کیا گیا۔ ہم کو رسیوں سے باندھ کر یزید کے دربار میں لائے وہاں سے اس قید خانہ میں لا کر بند کیا گیا۔ یہ سننا تھا کہ ہندہ چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ اپنا سر جناب زینبؑ کے قدموں پر رکھ دیا اور کہنے لگیں۔ آہ مجھے خبر نہ تھی کہ اس زنداں میں عالم کی خونزادیاں میری شہزادیاں علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹیاں بند ہیں۔ خدا لعنت کرے اس سفاک یزید پر جس نے آل رسولؐ کو یوں قید تباہ و برباد کیا۔ آپ لوگوں کے رونے نے میری نیند حرام کر دی

تھی۔ مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ کسی خارجی نے خروج کیا تھا۔ اس کو قتل کر کے اس کے کنبے کو اسیر کر کے لائے ہیں کاش میں اندھی ہو جاتی کہ یہ سماں میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتی۔ بی بی یہ بچّی کون ہے جو ہر رات کو اپنے باپ کی یاد میں الیبا بلبلا کر روتی ہے کہ اس کی آواز سے میرا دل تڑپنے لگتا ہے۔ جناب زینبؑ نے کہا وہ میرے ماں جائے حسینؑ کی لاڈلی بیٹی سکینہ ہے جو یادِ پدر میں ہر وقت روتی ہے۔ اس نے کہا میں بھی اس بچّی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جناب زینبؑ نے سکینہ کو پاس بُلا کر گود میں بٹھالیا۔ ہندہ نے دیکھا کہ پھٹا ہوا کُرتہ خون آلود ہے۔ پوچھا یہ خون اس بچّی کے کُرتے پر کیسا ہے؟ جناب زینبؑ نے رو رو کر فرمایا۔ اے ہندہ اس بچّی پر وہ ظلم فوجِ یزید نے کیے ہیں جن کے بیان کرنے کی تاب نہیں ہے۔ خولی نے اس کے کان چیر کر گوشوارے اُتارے۔ شمر نے اس معصوم بچّی کے طمانچے مارے۔ اس کی ننھی سی گردن میں رسی باندھی۔ یہ سُن کر قریب تھا کہ ہندہ کو غش آجائے رہ رہ کر آہ کے نعرے مارتی تھی۔ آخر یہ کہہ کر چلی میں پورے زور کے ساتھ یزید سے کہوں گی کہ وہ جلد سے جلد رہا کر دے۔ بی بی اس ظالم پر میرا کیا زور۔ میں اس کے پنجے میں پھنسی ہوئی ہوں ورنہ آج ہی اس کے محل کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتی۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْآ اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

پینتیسویں مجلس

فضائل جناب سلمان
و
فضائل اہل بیتؑ وحال زندانِ شام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِی کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ

وَمَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَۃً نَّزِدْ لَہٗ فِیْھَا حُسْنًا ط اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ

(سورہ الشوریٰ ۴۲/۲۳)

جو کوئی نیکی کو حاصل کرتا ہے ہم اس کی نیکی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ بیشک اللہ بخشنے والا اور شکر ادا کرنے والا ہے۔

خداوند عالم کی توفیق ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ رہتی ہے۔ جو نیکی کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو بدی کی طرف جاتے ہیں۔ ان سے یہ توفیق سلب ہو جاتی ہے۔

حصول نیکی میں اخیار کی صحبت کو بھی بڑا دخل ہے ؎

صحبت صالح ترا صالح کند　　صحبت طالح ترا طالح کند

یہی صحبت تھی جس نے نوحؑ کے بیٹے کو ان کی اہل بیت سے خارج کر دیا ؎

پسرِ نوح با بداں بہ نشست خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحابِ کہف روزے چند پئے نیکاں گرفت مردم شد

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اغوائے شیطانی اور وساوس نفسانی سے انسان نیکی کے راستے سے ہٹ جاتا ہے اور باوجود نیک صحبت کے اس کا میلان طبع بدی کی ہی طرف رہتا ہے۔ جیسے زن نوح و لوط کو ان کو نبی کی صحبت نے کوئی فائدہ نہ بخشا۔ لیکن جو جوہر قابل ہوتے ہیں اور جن میں تزکیۂ نفس کرنے کی اہلیت موجود ہوتی ہے تو اخیار کی صحبت کے فیض سے منازل سلوک و رشاد میں اتنی ترقی کر لیتے ہیں کہ روشن ضمیر ہو جاتے ہیں۔

جناب سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات پر نظر ڈالیے۔ ایک کافر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ نصرانی راہبوں کی صحبت میں عمر کا ایک بڑا حصہ گزارا۔ مگر چونکہ نفس میں صلاحیت تام تھی۔ اس لیے حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر اور محمد و آل محمد کی صحبت میں رہ کر اتنی حیرت انگیز ترقی کی کہ حضور سرور انبیاءؐ نے ان کو اپنے اہل بیت میں شامل کر لیا۔ اَلسَّلْمَانُ مِنَّا اَهْلُ الْبَيْتِ غور کیا جائے تو یہ بات معمولی نہ تھی۔ ہزارہا صحابی تھے۔ اور بڑے بڑے پائے کے تھے مگر یہ مرتبہ کسی اور کو نہ ملا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلمان کی نفس کی پاکیزگی اور تابندگی ایک غیر معمولی حد تک پہنچ گئی یہ مرتبہ نہ ابوذرؓ کو ملا اور نہ عمار بن یاسر کو نہ مقداد کو اور نہ اویس قرنی کو حالانکہ یہ سب حضرات دنیائے زہد و ورع اور صفائے نفس و تزکیہ باطن کے مسند نشین اور دبستان ایمان و یقین کے روشن چراغ تھے۔

اہل بیت کا مرتبہ رسولؐ کے بعد بلحاظ تقرب سب سے بلند تر تھا۔ ان کی محفل میں سلیمان کا جگہ پانا ان کے فضائل و مناقب کا حرف آخر ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام سے کسی نے دریافت کیا کہ سلیمان کے متعلق کچھ بیان فرمائیے۔ ارشاد ہوا سلمان کا کیا کہنا ہے وہ ہمارے اہل بیت میں سے ہیں۔ وہ لقمان حکیم کی مانند ہیں۔ وہ علم اوّلین و آخرین کے جاننے والے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ سلمان علم کا ایک ایسا دریا ہیں جس کی مثال حدیث میں نہیں۔ محمد و آل محمد کی دعاؤں کی برکت اور شب و روز کی عبادت و ریاضت کی وجہ سے وہ روشن ضمیر ہو گئے تھے۔ ایک جگہ آپ نے ایک شخص کو مجمع عام میں وعظ و پند کرتے دیکھا۔ آپ نے اس کے قریب جا کر کہا جو کچھ تو نے کل رات اپنے گھر میں عمل بد کیا ہے۔

خدا کی بارگاہ میں توبہ کر دے۔ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ لوگوں نے اس سے کہا۔ سلمان نے تجھے بدی کی طرف نسبت

دی ہے اور تونے کچھ نہ کہا۔ اس نے کہا وہ سچے ہیں۔ جو بات انہوں نے بتائی ہے اس کو سوائے میرے اور خدا کے کوئی نہیں جانتا تھا۔

سلمان صاحب کرامت بھی تھے۔ ابوذرؓ کا بیان ہے کہ ایک روز میں سلمان سے ملنے گیا۔ اس کے سامنے شوربے کا ایک بھرا پیالہ رکھا تھا۔ وہ زمین پر اوندھا ہوگیا سلمان نے اسے اٹھا کر سیدھا کر دیا۔ مگر اس کا شوربہ نہ گرا مجھے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا مگر دریافت نہ کر سکا۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ وہ پھر گر گیا سلمان نے پھر بدستور سیدھا کر دیا میرے تعجب کی انتہا نہ رہی خوفزدہ ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ میں نے امیرالمومنین سے یہ واقعہ بیان کیا۔ فرمایا اے ابوذر اگر سلمان تمہیں ان امور کی خبر دے دیں جو وہ جانتے ہیں تو تم ضرور کہو گے کہ خدا قاتل سلمان پر عذاب نازل کرے۔ اے ابوذر سلمان اسرار الٰہیہ کا خزانہ ہیں۔ جس نے ان کو پہچانا وہ مومن ہے اور جس نے نہ پہچانا وہ کافر ہے آگاہ ہو سلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں۔

ایک روز امام محمد باقر علیہ السلام کے سامنے سلمان کا ذکر آگیا۔ آپ نے فرمایا وہ سلمان محمدی ہیں اور ہم اہل بیت میں سے ہیں۔

کسی شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہا کیا وجہ ہے کہ آپ سلمان فارسی کا ذکر سننا بہت پسند کرتے ہیں۔ فرمایا ان کو سلمان فارسی نہ کہو۔ بلکہ سلمان محمدی کہا کرو۔ میں ان کو تین خصلتوں کی وجہ سے بہت زیادہ دوست رکھتا ہوں۔ انہوں نے امیرالمومنین کی خواہش کو ہمیشہ اپنی خواہش پر مقدم رکھا۔ دوسرے فقراء کو وہ بہت دوست رکھتے تھے۔ تیسرے علم اور علماء کے دوست رکھنے والے تھے۔

جناب سلمان کے زہد کا یہ حال تھا کہ مدت العمر اپنے لیے کوئی گھر نہیں بنایا۔ دیواروں اور درختوں کے سائے میں بسر کی۔ ایک شخص نے کہا میں آپ کے لیے مکان بنوانا چاہتا ہوں۔ فرمایا چند روزہ زندگی کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ اس نے کہا میں ایسا گھر بنواؤں گا۔ جسے آپ پسند کریں۔ فرمایا بھلا کیسا۔ اس نے کہا کھڑے ہونے سے چھت ٹکرائے، پاؤں پھیلا کر سونے کی جگہ نہ ہو۔ در و دیوار بوسیدہ ہوں۔ فرمایا خیر ایسے گھر کا مضائقہ نہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ سلمان محدّث تھے۔ یعنی ملائکہ سے باتیں کرتے تھے اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ ان کے محدّث ہونے کے معنی یہ ہیں کہ امام ان سے احادیث بیان کرتے تھے اور اپنے اسرار تعلیم فرماتے تھے اور یہ بھی فرمایا کہ سلمان اسم اعظم جانتے تھے۔

فضل بن عیسیٰ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا مطلب ہے اس کا کہ سلمان ہم اہل بیت سے ہیں جب کہ وہ نہ اولاد عبدالمطلب سے ہیں اور نہ اولاد ابوطالب سے۔ آپ نے فرمایا کہ آگاہ ہو کہ خدا نے ہماری طینت کو علیین سے خلق فرمایا ہے اور ہمارے شیعوں کی طینت کو ایک درجہ

اس سے پست کرکے پس سلمان ان لوگوں میں سے ہیں اور سلمان لقمان سے بہتر ہیں۔

حضرت رسولؐ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلمان وابوذر کے درمیان اخوت قائم کرکے فرمادیا تھا کہ اے ابوذ کبھی سلمان کی مخالفت نہ کرنا۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ سلمان کا پیش خدا یہ مرتبہ ہے کہ جب جبرئیل میرے پاس آتے ہیں۔ تو خدا کا سلام سلمان کو بھی پہنچاتے ہیں۔ سلمان ہم سے ہیں جس نے ان پر ظلم کیا اس نے ہم پر ظلم کیا۔

جناب سلمان کو ہم اہل بیت سے بے پناہ محبت تھی جس مجمع میں جاتے فضائل آل رسول ضرور بیان کرتے ایک بار کسی نے ٹوکا۔ فرمایا میں ان لوگوں کے فضائل کیوں نہ بیان کروں جس کی تعریف خدا نے جا بجا قرآن میں بیان کی ہے اور رسولؐ کے نزدیک جن سے زیادہ کوئی محبوب نہیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد سلطنت میں حضرت سلمان کو مدائن کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اہل مدائن ان کے استقبال کے لیے شہر سے باہر گئے۔ جب حجازی قافلہ مدائن پہنچا تو انہوں نے اپنے گورنر کو ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا ان کی نظر میں پہلے گورنروں کا تزک واحتشام سمایا ہوا تھا۔ جب وہ نظر نہ آیا تو لوگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ہمارے گورنر جناب سلمان تشریف لائے یا نہیں کسی نے ایک طرف اشارہ کیا کہ وہ کھڑے ہیں۔ جناب سلمان ایک کمبل کا کرتہ پہنے اور ایک آدھا بوریا بنا ہوا بغل میں دبائے اور ایک مٹی کا لوٹا ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ دنیا پرستوں کی نظر میں یہ زاہدانہ شان کیا جچتی۔ ایک نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا اللہ خیر کرے یہ قلندرانہ حکومت کیسے کامیاب ہوگی۔

بہرحال امراء آگے بڑھے۔ عرض کی دارالامارہ میں تشریف لے چلیں۔ فرمایا مجھے کسی دارالامارہ کی ضرورت نہیں اور نہ کسی قصر زرنگار کی، مجھے مسجد میں لے چلو۔ اسی کے حجرے میں قیام کروں گا۔ یہ سن کر امراء نے چرچے کیے کہ اس مسجد کے ملا سے حکومت کیسے چلے گی۔ انہوں نے کھانے کے متعلق پوچھا کیا حاضر کیا جائے۔ فرمایا میرا کھانا میرے ساتھ ہے۔ سوکھی روٹیوں کے کچھ ٹکڑے ایک جھول سے نکال کر رکھے اور نمک کے پانی میں ڈبو دیئے فرمایا میرے کھانے کا آپ لوگ کوئی بندوبست نہ کریں۔ یہ آدھا بنا ہوا بوریا میرے پاس ہے اس کو تمام کرکے فروخت کروں گا اور اسی سے اپنا کھانا چلاؤں گا اور یہی میرا معمول رہے گا۔

امراء یہ سن کر چلے گئے۔ جب شہر میں ان باتوں کے چرچے پھیلے تو غنڈوں اور بدمعاشوں کی بن آئی۔ ادھر اُدھر چوریاں ہونی شروع ہوگئیں۔ کیونکہ حکام نے گورنر کو نرم دل پاکر اپنے فرائض انجام دینے چھوڑ دیئے جب اس بدنظمی کی خبر جناب سلمان کو پہنچی کہ آپ نے منادی سے فرمایا کہ تمام مدائن میں ندا کردے کہ نصف شب کے بعد جو شخص گھر سے نکلے گا ہم اس کی جان کے ذمہ دار نہیں۔ لوگوں نے اس کا بھی مذاق اُڑایا کہ یہ بیچارے مسجد میں بیٹھے بیٹھے کریں گے کیا۔

آپ نماز مغرب پڑھ کر ایک بلند مقام پر تشریف لے گئے اور بلند آواز سے فرمایا کہ اے مدائن کے کتو تم کو سلمان

صحابی رسول بلاتا ہے فوراً حاضر ہو۔ یہ صدا سنتے ہی ایک کتا حاضر خدمت ہوگیا۔ فرمایا اے مخلوق خدا آج رات کا انتظام تمہارے سپرد ہے۔ جو شخص بھی نصف شب کے بعد نکلے اس کو چیر پھاڑ ڈالنا وہ یہ فرما کر مسجد میں واپس آگئے۔

مدائن کے چور اور ڈاکو اس طرف کیا توجہ کرتے۔ وہ بدستور نصف شب کے بعد چوری کرنے کے لیے نکلے کتوں نے ان کی ٹانگ لی۔ اور کسی کو بغیر زخمی کیے نہ چھوڑا۔ بہت سے گرتے پڑتے بھاگ گئے۔ اور بہت سے وہیں کھیت رہے۔

صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ جابجا لاشے پڑے ہیں۔ اور زخمی سسک رہے ہیں۔ اب تو ان کے دل پر جناب سلمان کا ایسا رعب بیٹھا۔ کہ ان کے نام سے کانپنے لگے۔ جب یہ خبر جناب سلمان نے سنی تو لوگوں کے مجمع میں فرمایا۔ لوگو! آگاہ ہو کہ اس دنیا کا انتظام کتے کر سکتے ہیں تو ایک صحابی رسولؐ کا تو ذکر ہی کیا۔

اس کے بعد جناب سلمانؓ نے رشوت ستانی کے انسداد اور شر پسندوں کی سرکوبی کی طرف توجہ کی۔ ان کے لیے سخت سزائیں مقرر کیں جو لوگ مال غیر کھانے کے عادی ہو رہے تھے انہوں نے شکایتی خطوط دار الخلافہ کو روانہ کیے کہ آپ نے یہ کیسے حاکم کو بھیجا ہے۔ رات دن عبادت کرتا ہے حکام کو ان کی مرضی کے مطابق کام نہیں کرنے دیتا حضرت عمر نے ان سے باز پرس کی۔ تو آپ نے ان کے خط کے جواب میں لکھا۔

میرے اوپر پہلا اعتراض یہ ہے کہ میں زنبیل بنتا ہوں۔ اور نانِ جو کھاتا ہوں۔ اس کو امور سلطنت سے واسطہ۔ میرے نزدیک زنبیل بننا اور نانِ جو کھانا اس سے کہیں زیادہ محبوب ہے کہ مال غیر غصب کر کے لذیذ کھانے کھاؤں۔ رہا نانِ جو کھانا تو رسولؐ اللہ نان جو کھا کر بے حد خوش ہوتے تھے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جو جمع کرتا ہوں لوگوں کو دے ڈالتا ہوں۔ اس پر اعتراض کیوں۔ بے شک میں محتاجوں کی خبر لیتا ہوں۔ خدا کی قسم میں خلق خدا کو بھوکا نہیں دیکھ سکتا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ میں نے حکومت کو حد درجہ کمزور بنا دیا ہے۔ اور اپنے نفس کو اتنا ذلیل کر رکھا ہے کہ اہل مدائن مجھے امیر نہیں سمجھتے تو جواب یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں نے مجھے ایک پُل کی مثل سمجھ رکھا ہے کہ اس پر عبور کریں۔ اور اپنا بوجھ میرے کندھوں پر رکھیں۔ میں اطاعتِ الٰہی میں ذلیل ہونے کو معصیت کی عزت سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ رسولؐ خدا باوجود شانِ رسالت و نبوت کے اس طرح لوگوں سے ملتے تھے۔ گویا ان ہی میں سے ایک ہیں۔ اگرچہ بادشاہ دین و دنیا تھے مگر طعام ناخوشگوار نوش فرماتے تھے اور موٹا کپڑا پہنتے تھے۔

میں نے خود حضورؐ سے سنا ہے کہ جو کم از کم سات آدمیوں پر حاکم ہوا اور ان کے درمیان عدل نہ کرے تو روز جزا خدا کا غضب اس پر نازل ہوگا۔

میں نے حکومت مدائن کو عیش طلبی کے لیے منظور نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلاؤں اگر ان میں صلاحیت ہوتی اور احکامِ خداوندی کی پابندی کرتے ہوئے تو وہ خود یہاں حکومت کرتے میرے یہاں آنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اس کے بعد آپ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگئے۔ اور وہیں پر سکونت اختیار کرلی۔

اصبغ بن نباتہ کہتے ہیں کہ جب سلمان بیمار ہوئے تو میں برابر ان کی عیادت کو جاتا رہا۔ بیماری روز بروز طول پکڑتی گئی۔ اور ان کو موت کا یقین ہوگیا۔ ایک روز مجھ سے فرمایا۔ اے اصبغ مجھے رسولؐ اللہ نے خبر دی ہے کہ میری موت کا زمانہ جب قریب آئے گا۔ تو مُردہ میری بات کا جواب دے گا۔ لہٰذا مجھے قبرستان لے چلو جب وہاں پہنچے تو اہلِ قبور پر سلام کیا۔ ایک قبر سے ندا آئی۔ سلام خدا ہو ان لوگوں جن کو عنقریب منادی کوچ کی ندا دینے والا ہے آپ نے فرمایا۔ اے بندہ خدا مجھے اتنا بتادے کہ تو نے موت کو کیسا پایا اس نے کہا اے سلمان ٹھہرو جلدی نہ کرو۔ قسم خدا کی آرہ سے بدن کا کاٹا جانا اور قینچی سے ٹکڑے ٹکڑے ہونا موت کی سختی سے زیادہ آسان ہے۔

المختصر سلمان وہاں سے واپس آئے اور سمجھ گئے کہ اب وقت موت قریب ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو غسل کون دیگا۔ فرمایا وہی جس نے رسولؐ اللہ کو غسل دیا تھا وہی مجھے غسل دے گا کفنائے گا اور دفن کرے گا۔

میں نے کہا علی علیہ السلام تو کوفہ میں ہیں۔ وہ یہاں کیسے آئیں گے۔ انہوں نے کہا میرے حبیب حضرت محمد مصطفٰےؐ نے مجھے جو خبر دی ہے وہ غلط نہیں ہو سکتی۔ جب سلمان کا انتقال ہوگیا تو میں امیرالمومنین علی علیہ السلام کا انتظار کرنے لگا۔

حضرت علی علیہ السلام نماز صبح مسجد میں ادا فرما رہے تھے۔ بعد فراغت حاضرین مسجد سے فرمایا۔ خدا تمہارے اجر کو مصیبت سلمانؓ کو زیادہ کرے۔ یہ سن کر سب غمگین ہوگئے۔ حضرت نے عمامہ رسولؐ سر پر باندھا۔ پیراہن آنحضرتؐ زیب تن فرمایا۔ شمشیر رسولؐ حمائل کی اور ناقہ عضبا پر سوار ہوکر قنبر سے فرمایا کہ ایک سے دس تک شمار کرو۔ قنبر کہتے ہیں کہ جب میں دس تک پہنچا تو ہم نے اپنے آپ کو سلمان کے گھر کے سامنے مدائن میں پایا۔

اصبغ کہتے ہیں میں انتظار ہی میں تھا کہ امیرالمومنین سامنے سے آتے نظر آئے۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی میں حضرت کو لے کر گھر آیا۔ آپ نے ردا چہرۂ سلمان سے ہٹائی۔ تو سلمان کا چہرہ شگفتہ دیکھا۔ اس کے بعد آپ تجہیز و تکفین سلمان میں مصروف ہوئے خود ہی غسل دیا۔ کفن پہنایا۔ اور اس کے بعد سپرد خاک کردیا۔

امیرالمومنین دیر تک سلمان کو یاد کرکے روتے رہے۔ اصبغ سے فرمایا سلمان ہم اہل بیت سے خاص محبت رکھنے والے تھے۔ امیرالمومنین کو وہ وقت یاد آرہا تھا کہ جب امیرالمومنین علیہ السلام کو لوگ بہ جبر گھر سے بیعت کرانے کے لیے لے گئے تو جناب سیدہ نے زہرا آسمان اپنے سر کے بال کھول کر فریاد کی کہ خداوندا تو دیکھ رہا ہے کہ تیرے نبی کی آل پر کیا مصیبت

نازل ہو رہی ہے۔ جناب سلمان سے سیدہ عالم کا یہ حال نہ دیکھا گیا۔ تلوار کھینچ کر چاہا کہ دشمنوں پر حملہ کر دیں۔ مگر سیدہ عالم نے روکا کہ سلمان ایسا نہ کرو۔ اگر لڑنا مقصود ہوتا تو ابوالحسن کی تلوار نیام میں نہ رہتی۔ سلمان کہتے ہیں کہ اس واقعہ کو یاد کر کے میں عمر بھر رویا کرتا تھا۔

آہ سیدہ عالم کا سر کھلا تو سلمان موجود تھے۔ دل تڑپ گیا۔ سیدہ کا گھر میں کھلا تھا لیکن آہ ثانی زہرا کا جب سر کھلا تو سلمان جیسا کون تھا کہ تلوار لے کر کھڑا ہو جاتا اگر کوئی غیرت مند سر چھپانے کو چادریں دیتا بھی تھا۔ تو ظالم نیزوں کی انیاں مار مار کر چھین لیتے تھے۔

یہاں تک کہ جناب سکینہ کا جو جناب زینبؑ کی آغوش میں تھیں بازو زخمی ہو گیا۔ بچی نیزہ کی انی لگنے سے بلبلا گئی۔ یتیم بچی اب کس کو پکارے۔ نہ سر پر باپ، نہ چچا نہ بھائی، رو رو کر رہ گئی۔

حسینؑ کی اس نازپروردہ بچی نے کون سی مصیبت تھی جو نہ اٹھائی۔ بھوک پیاس کے صدمے سہے۔ باپ چچا اور بھائی وغیرہ کی موت کے داغ دل پر اٹھائے۔ کان چیر کر گوشوارے نکالے گئے۔ باپ کی لاش سے لپٹنے کی سزا میں شمر کے طمانچے کھائے۔ راہ کوفہ میں اونٹ پر سے گریں۔ کوفہ و شام میں باحال تباہ تشہیر ہوئیں۔ رسی میں گلا باندھا گیا۔ زندان میں ٹھنڈے پانی کو ترسیں۔ جب سے زندانِ شام میں آئیں ایک گھڑی رونے سے نہ رکیں رات دن باپ کی یاد تھی۔ بالخصوص جب رات آتی تھی تو باپ کا سینہ یاد آتا تھا۔ باپ کے سینے پر سونے والی آہ خاک پر غش کھا کر پڑی رہتی تھی۔ جب ہوش آتا تو پھر ہائے بابا ہائے بابا کے نعرے ماریں۔

ایک رات کو خواب سے بیدار ہوئیں تو زندان میں ہر طرف تلاش کرنے لگیں۔ رو رو کر کہتی تھیں میرے بابا کہاں گئے۔ جناب زینبؑ نے کہا بیٹی تمہارے بابا یہاں کہاں آہ! انہیں تو کربلا میں ظالموں نے قتل کر دیا۔ بچی نے کہا پھوپھی اماں میرے بابا ابھی تو یہیں تھے۔ مجھے گود میں بٹھائے پوچھ رہے تھے۔ بیٹی سکینہ تمہارے کانوں کا درد کیسا ہے۔ بابا جان کے ساتھ ایک بی بی بھی تھیں۔ وہ میرے حالِ زار پر رو رہی تھیں۔ اور رہ رہ کر پیار کرتی تھیں۔ بابا جان نے بتایا کہ یہ دادی اماں ہیں۔ میرے دادا جان بھی موجود تھے۔ سید مجھے تسلی دے کر کہہ رہے تھے سکینہ تمہاری تکلیفوں کا زمانہ ختم ہوا۔ بیٹی اب جلد تم کو ہم اپنے پاس بلا لیتے ہیں۔

سکینہ کا یہ بیان سن کر سیدانیوں میں کہرام بپا ہو گیا۔ سب نے سمجھ لیا سکینہ نے خواب میں یہ سماں دیکھا ہے اور یہ بھی سمجھا کہ سکینہ عنقریب ہم سے جدا ہونے والی ہیں۔ ایک ایک بی بی اس بچی کو سینہ سے لگا کر پیار کرتی تھی مگر سکینہ کے دل کو قرار کہاں۔ جناب زینبؑ سے برابر یہی کہے جاتی تھیں۔ پھوپھی اماں میرے بابا جان کو بلاؤ میں اب اس تیرہ و تار گھر میں نہ رہوں گی۔ میں تو اب بابا کے پاس جاؤں گی۔

آہ اسی کرب و بے چینی میں اس بچی کا زندان میں انتقال ہو گیا۔ سیدانیوں نے ایسے دردناک بین کیے کہ زمین

آسمان ہل گئے۔ یزید نے پوچھا آج یہ قیدی اس قدر بے چین ہو کر کیوں رو رہے ہیں۔ کسی نے خبر دی کہ جو بچی راتوں کو یادِ پدر میں رویا کرتی تھی۔ رات وہ غم زدہ دنیا سے گزر گئی۔ یزید نے کہلا بھیجا کہ میں نے حکم دے دیا ہے کہ غسل و کفن کا سامان کر دیا جائے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا ہم کو کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ اس بچی کا کفن یہی اس کا خون آلود کرتہ ہے۔ یہی پہنے ہوئے روزِ قیامت خدا کے سامنے جائے گی۔ ہاں اتنا پانی بھجوا دے کہ ہم غسل دیدیں اور ایک ننھی سی قبر مقابر قریش میں کھدوا دے۔

ایک روایت میں ہے کہ یزید نے غسالہ کو بھیجا۔ جب اس نے نہلانے کے لیے کرتہ اتارا تو بدن پر کچھ نشان نظر آئے۔ پوچھا بی بی یہ بچی کیا بیمار تھی۔ جناب زینبؑ نے فرمایا۔ بی بی یہ شمر کے طمانچے اور تازیانوں اور رسی کے پھندوں اور نیزوں کی انیوں کے نشان ہیں۔ جب میت تیار ہوئی تو امام علیہ السلام نے اس بچی کی میت کو جس طرح بنا سپرد خاک کیا۔

جب لوگ دمشق جاتے ہیں۔ اور حسینؑ کی اس لاڈلی بچی کی قبر آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ تمام واقعات آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

چھبیسویں مجلس

فضائل حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

فضائل اہلبیتؑ اور قید یزید سے رہائی

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ۔ مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِيْ كَمَثَلِ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَّنْ رَكِبَهَا نَجٰى وَمَنْ تَخَلَّفَ

(میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے کہ جو اس پر سوار ہوگیا نجات پاگیا اور جس نے روگردانی کی وہ ڈوب گیا اور ہلاک ہوگیا۔

کشتی نوحؑ کی یہ خصوصیت سب کو معلوم ہے کہ وہ ذریعہ نجات تھی۔ ان لوگوں کے لیے جو اس پر سوار تھے نیز یہ کہ جس طوفان میں وہ بے خرخشہ چلتی رہی وہ ایسا شدید طوفان تھا کہ دنیا میں کبھی ایسا طوفان نہیں آیا۔ لہذا اہل بیت علیہم السلام کی تشبیہ اس کشتی سے دینا یہ بتاتا ہے کہ ان سے تمسک کرنے والے بھی کبھی بحر ضلالت میں غرق نہ ہوں گے اور یہ بد دعا کا سخت سے سخت طوفان ان کو صراط مستقیم سے نہ ہٹا سکے گا۔

نوحؑ کی کشتی میں بیٹھنے والے سب مومن ہی تھے۔ نہ کوئی کافر اس میں سوار ہوسکا اور نہ کوئی منافق کیونکہ وہ اللہ کے لیے بنی ہی نہ تھی۔ لہذا اہل بیت سے تمسک کرنے والے بھی خالص مومن ہی ہوسکتے ہیں۔ رسولؐ خدا نے صاف لفظوں میں فرما دیا۔ يَا عَلِيُّ مَا يُحِبُّكَ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَمَا يُبْغِضُكَ اِلَّا كَافِرٌ نہیں دوست نہیں رکھے گا مگر مومن اور بغض نہیں رکھے گا تم سے مگر کافر۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مومنین میں وہ کون کون تھے۔ جنہوں نے حضورؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں ہی اہل بیتؑ کو ذریعہ نجات سمجھ کر ان کی محبت کا نقش اپنے دل پر لیا۔ اور مرتے دم تک ان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا یوں تو بہت سے ایسے لوگ تھے مگر صف اوّل میں کھڑے ہونے والے تھے۔ سلمان، ابوذر، عمار یاسر، مقداد اویس قرنی اور مالک اشتر وغیرہ تھے ان حضرات کے فضائل و مناقب حد بیان سے باہر ہیں۔ میں اس مجلس فیض آثار میں جناب ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چند فضائل بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ان کے مشرف باسلام ہونے کے متعلق علامہ مجلسی حیات القلوب میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ایک روز ابوذر مقام مرجو میں جو مکہ معظمہ سے ایک منزل ہے اپنی بکریاں چرا رہے تھے ایک بھیڑیا یکایک ان کی بکریوں پر حملہ آور ہوا۔ ابوذر نے اپنا عصا اس پر مارا اور کہا تو بڑا ہی خبیث جانور ہے کہ کسی طرح یہاں سے ہٹتا ہی نہیں وہ بقدرت خدا گویا ہوا کہ اے ابوذر اہل مکہ مجھ سے بھی زیادہ خبیث ہیں۔ خدا نے اپنے فضل سے ان کی طرف اپنا نبی بھیجا اور بجائے اطاعت کرنے کے اسے جھٹلاتے اور ناسزا الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

ابوذر اس حیوان صحرائی سے یہ سُن کر دل میں کہنے لگے۔ اس نبی کو تلاش کرنا ضروری ہے۔ اس کی صداقت و عظمت کا کیا کہنا جس کی گواہی درندے تک دے رہے ہیں۔ اپنی زوجہ سے کہا میرا لوٹا اور عصا اور تھوڑا سا کھانا مجھے دیدو۔ میں نبی خدا کی جستجو میں جاتا ہوں۔ غرض کہ پیادہ پا چل کھڑے ہوئے۔ دو پہر کو طے مسافت کرتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے پیاس کا غلبہ تھا۔ چاہ زمزم پر پہنچ کر ایک ڈول پانی کا بھرا۔ دیکھا تو پانی کی جگہ اس میں دودھ ہے۔ دل میں کہا سبحان اللہ یہ دوسرا معجزہ اس نبی آخر الزمان کا ہے دودھ پی کر حرم کے ایک گوشے میں جا بیٹھے۔ قریش کے کچھ لوگ آئے اور حضرت کو ناسزا الفاظ سے یاد کرنے لگے۔ اسی اثنا میں حضرت ابو طالب وہاں پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے ان کو دیکھ کر خاموشی اختیار کی۔ جب وہ چلنے لگے تو میں ان کے پیچھے ہو لیا۔ انہوں نے پوچھا تمہاری کیا حاجت ہے۔ میں نے کہا جو پیغمبر تم میں مبعوث ہوا ہے اس کی خدمت میں جانا چاہتا ہوں تاکہ ان پر ایمان لاؤں، وہ مجھے لیے ہوئے خانہ امیر حمزہ میں لائے۔ وہاں مجھے حضرت کی خدمت میں پہنچایا۔ حضرت نے دریافت فرمایا کہاں سے آرہے ہو۔ میں نے کل حال بیان کر کے کلمہ شہادتین زبان پر جاری کیا۔ فرمایا ابوذر! اب تم اپنے وطن چلے جاؤ تمہارا چچا زاد بھائی مرگیا ہے اس کا کوئی وارث نہیں۔ اس کے مال کو اپنے قبضہ میں لو۔ اور اس وقت تک وہیں رہو کہ امر نبوت کا اعلان ہو۔ چنانچہ ابوذر حضور نبی اکرمؐ کی ہجرت تک وہاں رہے۔

ابوذر نہایت نیک دل اور پاک خصلت انسان تھے۔ شب و روز عبادت خدا میں بسر کرتے تھے۔ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر گھنٹوں مسائل دینیہ دریافت کرتے تھے۔ اور خوف خدا میں رویا کرتے تھے۔ بہ نسبت

مال داروں کے فقراء سے زیادہ ملتے تھے۔ ابوذر کے دل میں درد دین اس درجہ تھا کہ اگر کسی کو خلاف حکم خدا کوئی کام کرتے دیکھتے تو فوراً آثار غضب چہرہ پر ظاہر ہو جاتے۔

ابوذر کی صداقت کے بارے میں حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ آسمان نے سایہ نہیں ڈالا اور زمین نے غبار نہیں بلند کیا کسی ایسے شخص پر جو ابوذر سے زیادہ راست گو ہو۔ اور یہ بھی فرمایا۔ میری اُمت میں ابوذر کا زہد عیسیٰ مریمؑ کے زہد سے زیادہ مشابہ ہے۔

ابوذر فرمایا کرتے تھے مجھے دُنیا کی تمام چیزوں سے نفرت ہے سوائے ان دو روٹیوں کے جن میں سے ایک صبح کو کھاتا ہوں اور ایک شام کو تاکہ طاقت عبادتِ خدا کرنے کی بدن میں باقی رہے۔

امیرالمومنینؑ نے فرمایا کہ ابوذر نے اس قدر علم حاصل کیا کہ لوگ اس کے اُٹھانے سے قاصر ہیں۔ لیکن اس پر ایسی گرہ لگائی کہ کوئی شے باہر نہ آسکی۔

ابوذر کا زیادہ وقت امور دین میں فکر کرنے اور واقعات عالم پر غور کرنے میں گزرتا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے میرا سب سے بڑا سرمایہ ایمان باللہ و بالرسول اور محبت علی بن ابی طالب ہے میرے لیے یہ دولت تمام کائنات کی دولت سے بہتر ہے۔

ابوذر خاندان رسول کے فدائیوں میں تھے۔ معمول تھا کہ ہر روز بعد نماز صبح امیرالمومنین کے دروازے پر سلام کرنے آتے اور حسنؑ و حسینؑ کو بلا کر پیار کرتے اور فرماتے میری جان تم پر فدا ہو تم گلشن رسالت کے پھول ہو ابوذر کو تمہاری غلامی پر فخر ہے۔

حضرت رسولؐ خدا کی وفات کا ابوذر کو اتنا صدمہ ہوا کہ شب و روز رو رو کر گزارتے تھے۔ بعد وفات رسولؐ جو واقعات اہل بیت کو پیش آئے۔ ابوذر پران کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ اکثر اوقات خدمت امیرالمومنین میں حاضر رہتے اور احادیث رسول کو آنحضرت سے سنتے۔ حضورؐ کی وفات کے تیسرے سال شام کی طرف روانہ ہو گئے۔

امیرالمومنین کا خلافت سے محروم رہنا آپ سے برداشت نہ ہوسکا۔ خلافت ثالثہ میں مدینہ واپس آئے اسلام میں جو انقلاب آیا ہوا تھا اس کا تصوّر کر کے مسجد رسولؐ میں رویا کرتے تھے۔ ابوذر سرمایہ داری کے سخت مخالف تھے۔ بیت المال میں شخصی تصرفات دیکھ کر اور لوگوں کو مال جمع کرنے کی طرف متوجہ پاکر ان کو بہت غصّہ آیا۔ مدینہ کے گلی کوچوں میں آیۂ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (سورہ التوبہ ۹/۳۴) الخ کو بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ بنی اُمیہ اور ان کے ہوا خواہوں کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ حکومت کی طرف سے پیغام ملا کہ ایسا نہ کرو ورنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔

ابوذر کو بڑا غصّہ آیا۔ اور فرمایا اللہ اللہ اب یہ وقت آگیا ہے کہ آیات قرآنی کا پڑھنا بھی گناہ ہو گیا۔ میں ہرگز

امر حق کی تبلیغ سے باز نہ آؤں گا۔ جب ابوذر کسی طرح سرمایہ داری کے خلاف تقریریں کرنے سے نہ رُکے تو حضرت عثمان نے حکم دیا کہ تم یہاں سے شام چلے جاؤ، اور مدینہ خالی کر دو۔

وہ وہاں پہنچے تو امیر شام کے ٹھاٹھ دیکھ کر عنانِ صبر ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، وہ اہل بیتؑ کی زاہدانہ زندگی دیکھے ہوئے تھے۔ یہ امیرانہ تزک و احتشام جو حقوقِ مسلمین کو پامال کر کے جلوہ نمائی کر رہا تھا انہیں کیوں پسند آتا۔ بے محابا لوگوں کے مجمع میں دشمنانِ دین کی برائیاں اور حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب بیان کرنے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ ان کے ہم خیال ہو گئے۔ اور محبت اہل بیتؑ کا دم بھرنے لگے۔ اور ان کی طرز زندگی کو پسندیدہ نظر سے دیکھنے لگے۔

ابوذر بڑے دلیر آدمی تھے۔ انہیں حکومت کے تشدّد کا ذرا خوف نہ تھا۔ بے دھڑک لوگوں کو افعال شنیعہ پر ڈانٹتے تھے۔ اور امیر شام کی کھلم کھلا مذمت کرتے تھے۔

جب قصر خضرا تعمیر ہو گیا تو ابوذر امیر معاویہ سے ملنے گئے۔ فرمایا اگر تم نے یہ مال خدا سے بنوایا ہے تو خیانت کی۔ اور اگر اپنے مال سے بنوایا ہے تو اسراف کیا۔ امیر موصوف سے جواب تو بن نہ پڑا۔ مگر ابوذر سے عداوت اور زیادہ ہو گئی۔

ابوذر کا معمول تھا کہ روز قصر حکومت کے گرد چکر لگایا کرتے تھے اور با آواز بلند کہتے۔ خداوند العنت کر ان پر جو دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور خود نہیں کرتے اور دوسروں کو بدی سے روکتے ہیں اور خود مرتکب ہوتے ہیں۔

امیر شام کے کانوں میں یہ آوازیں پہنچی تھیں۔ ڈرا کر، دھمکا کر، لالچ دے کر ہر طرح روکنا چاہا۔ جب ابوذر نہ رُکے تو حضرت عثمان کو ان کی شکایت لکھ کر بھیجی۔ اور آخر میں درخواست کی کہ ابوذر کو بُلا لیجئے ورنہ میری سلطنت کو نقصان پہنچ جائے گا۔ وہاں سے جواب آیا کہ ابوذر کو فوراً ایک شوخ و بدمزاج مرکب پر سوار کر کے بھیج دو اور ایک سنگدل رہنما کو ان کے ساتھ کر دو۔

اس خط کے پہنچتے ہی تعمیل کی گئی اور بیچارے ابوذر کو ایک شتر برہنہ کی پشت پر سوار کر کے ایک درشت خو جفا پسند انسان کے ساتھ روانہ کر دیا۔

ابوذر دراز قد اور لاغر اندام شخص تھے اور سن رسیدہ ہو چکے تھے۔ ظالم رہنما تیز رو اونٹ کو برابر دوڑاتے چلا گیا۔ جب مدینہ پہنچے تو ان کی دونوں رانیں زخمی تھیں اور ساق پا سے خون جاری تھا اسی حالت میں دربار خلافت میں پیشی ہوئی۔ حضرت عثمان نے ڈانٹا کہ تم اپنی حرکات سے باز نہیں آتے۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا انہوں نے کہا میری زبان امرِ حق کے اظہار سے کبھی نہیں رُک سکتی۔ لوگ احکامِ خدا کی خلاف ورزی چھوڑ دیں میں خاموش ہو جاؤں گا۔

اتفاقاً اس وقت ایک ہزار درہم کی تھیلی حضرت عثمان کے سامنے رکھی تھی۔ ابوذر نے پوچھا یہ مال کہاں سے آیا ہے۔ انہوں نے کہا فلاں مقام کے لوگ ہمارے لیے لائے ہیں ابھی اور بھی آنے والا ہے۔ اسی کا انتظار ہے۔ فرمایا اس مال کا مصرف کیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ میرا حق ہے۔ مجھے اختیار ہے چاہے کسی کو دوں یا اپنے پاس رکھوں۔ فرمایا میں تم کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک شام کو جب میں رسولؐ اللہ کی خدمت میں گیا تو آپؐ کو بیحد ملول پایا۔ حضورؐ نے مجھ سے گفتگو نہ کی۔ دوسرے روز صبح کو پہنچا۔ تو خنداں اور خوش حال پایا۔ میں نے اس کا سبب دریافت کیا فرمایا کل شام مال مسلمین سے چار درہم میرے پاس موجود تھے انہیں تقسیم نہ کر پایا تھا۔ میرے دل میں یہ خوف تھا کہ اگر ایسی حالت میں مرگیا تو یہ رقم میرے پاس رہ جائے گی۔ آج میں نے اس کو تقسیم کر دیا لہذا اطمینان ہوگیا۔

پس آپ غور کیجئے۔ جب رسول نے چار درہم روکنے نہ چاہے تو آپ یہ مال روکنے کے حق دار کیسے ہوگئے۔ انہوں نے کعب الاحبار سے جو دارالخلافہ کے مفتی تھے۔ پوچھا کہ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے انہوں نے کہا آپ امام المسلمین ہیں آپ کو ہر طرح کا اختیار ہے۔ ابوذر نے جو سنا تو اپنا عصا زور سے کعب کے سر پر مارا۔ اور کہا اے یہودی بچے تم بھی مفتی شرع رسول بن گئے۔

اس قسم کی باتیں چونکہ مزاج حکومت کے خلاف تھیں لہذا ابوذر کو جلا وطن کیے جانے اور ربذہ جیسے ویران اور غیر آباد مقام پر بھیجنے کا حکم صادر ہوا۔ مروان ابن الحکم سے کہا گیا کہ فوراً اس حکم کی تعمیل کرو اور اعلان کرادو کہ ابوذر کی مشایعت کو کوئی شخص شہر کے ناکے تک نہ جائے۔

جب یہ خبر اہلبیت علیہم السلام کو پہنچی تو حد درجہ ملول ہوئے اور ابوذر کو رخصت کرنے کے لیے باہر آئے حضرت علیؑ امام حسنؑ امام حسینؑ اور عمار یاسر نے بیرون شہر تک ان کی مشایعت کی۔ وقت رخصت امیرالمومنین نے فرمایا۔ اے ابوذر گھبرانا نہیں تم نے امر حق کی تبلیغ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو اس کی جزا دینے والا ہے۔ تم مدینہ رسولؐ سے نکالے جارہے ہو اور ایسے مقام پر بھیجے جارہے ہو۔ جہاں کوئی مونس تنہائی نہ ہوگا۔ لیکن آج کے عوض اللہ تعالیٰ جنت عالیہ میں تمہیں بہترین قصر عطا فرمائے گا۔ ہم تم کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے پرہیزگار بندوں کا محافظ و کفیل رہتا ہے۔ تمہاری تنہائی کی مونس تمہاری حقیقت پسندی ہوگی اس کے بعد سب نے رُو رُو کر حضرت ابوذر کو رخصت کیا۔

ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مدت دراز ربذہ میں گزار دی۔ رات دن خدا سے دُعا کرتے تھے کہ آل محمدؐ کے حقوق کی حفاظت کر۔ ابوذر کے پاس بسر اوقات کے لیے چند بکریاں تھیں۔ ساتھ میں ایک بی بی ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکا جس کا نام ذر تھا۔ اسی عالم غربت میں انتقال کر گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ بی بی کا بھی انتقال ہوگیا صرف ایک لڑکی مونس تنہائی تھی۔

جب ابوذر مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور بیماری نے شدت پکڑی تو ابوذر کی لڑکی سخت پریشان ہوئی کہ اس دشتِ غربت میں باپ کے مرنے کے بعد میرا کیا ہوتا ہے۔

جب وقت موت قریب آیا تو جناب ابوذر نے اپنی لڑکی کو پاس بٹھا کر فرمایا۔ بیٹی اب دُنیا سے میرے جانے کا وقت قریب آگیا ہے جب میں مرجاؤں تو میرے منہ پر چادر ڈال دینا۔ اور سرِراہ عراق جاکر بیٹھ جانا جو قافلہ سب سے پہلے وہاں آئے ان سے کہنا اے بندگانِ خُدا ابوذر صحابی رسولؐ نے وفات پائی ہے۔ ان کی تجہیز و تکفین میں میری اعانت کرو۔ میرے حبیب محمد مصطفٰےؐ نے مجھے خبر دی ہے کہ میں عالم غربت میں مروں گا۔ اور میری تجہیز و تکفین مردانِ شائستہ کریں گے۔ اور جب وہ لوگ میرے دفن سے فارغ ہوں تو ان سے کہنا میرے باپ کی وصیت ہے کہ یہ بکری جو ہمارے گھر میں ہے اس کو ذبح کر کے پکاؤ اور بغیر کھانا کھائے یہاں سے نہ جاؤ۔ اتنا کہہ کر اس عاشق ربانی اور مصاحبِ خاص محبوب سبحانی نے دُنیا سے کوچ کیا۔ اس عالم غربت میں رونے پیٹنے والا کون تھا۔ ایک کم سن بچی تھی وہ رو لی جتنا رو سکتی تھی۔

آہ اگر ابوذر کا انتقال مدینہ میں ہوتا تو ان کے اہل و عیال کے پہلو بہ پہلو اہل بیت عصمت و طہارت گریہ و بکا کرتے۔ شیعیان امیرالمومنین کا کافی مجمع ہوتا۔ بڑی دھوم سے جنازہ اُٹھتا۔ خدا کسی کو عالم غربت میں موت نہ دے۔ بڑی بے کسی کی موت ہوتی ہے۔ اس کا حال کوئی کربلا والوں سے پوچھے۔

بہرحال ابوذر کی یتیم بچی باپ کی میّت کو گھر میں چھوڑ کر سرِراہ جاکھڑی ہوئی۔ مالک اشتر کا قافلہ جس میں بہت سے دوستانِ اہل بیت تھے اُدھر سے گزرا۔ لڑکی نے دردناک لہجہ میں کہا مَاتَ الْغَرِیْبُ الصَّلٰوۃَ مَاتَ الْغَرِیْبُ الصَّلٰوۃَ

مالک اشتر نے جو آواز سُنی تو اہل قافلہ سے کہا۔ سواریوں کو روکو کسی پردیسی کا انتقال ہوگیا ہے۔ اس کے دفن میں شرکت کرنے کے بعد یہاں سے چلیں گے۔ قافلہ رُک گیا۔ سب لوگ اپنی اپنی سواریوں سے اُترے مالک نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ اے لڑکی تو کون ہے اور کس کا انتقال ہوا ہے۔ اس نے رو کر کہا ابوذر صحابی رسولؐ مرگئے ہیں۔ میں ان کی لڑکی ہوں۔ میرے سوا یہاں اور کوئی نہیں۔ یہ سُن کر قافلے والے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ ابوذر کی غریب الوطنی اور پریشان حالی کا تصور ہر دل کو تڑپا رہا تھا۔ مالک نے بچّی کو گود میں لے کر پیار کیا۔ اور اس کے ساتھ ابوذر کے مکان پر آئے۔

آہ جب اس گھر میں آکر دیکھا کہ ابوذر کا کوئی سوگوار نہیں تو ایک ایک کا دل ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ مالک نے صعصعہ بن صوحان سے فرمایا کہ ہمارے قافلے میں جتنی عورتیں ہیں ان کو بلالاؤ۔ تاکہ اس غریب الوطن صحابی رسولؐ پر گریہ کریں۔ اور اس یتیم بچی کے لیے باعث تسکین ہوں۔

الغرض سب نے مل کر ابوذر رضی اللہ عنہ کو غسل و کفن دے کر سپرد خاک کیا۔ اور ان کی وصیت کے مطابق بکری کو ذبح کر کے پکایا۔ یہ ابوذر کی حاضری کا کھانا تھا۔ جو لوگوں نے آنسوؤں کی جھڑی کے ساتھ کھایا۔ اس کے بعد یہ مسئلہ زیر غور آیا کہ اس بچی کو کس کی کفالت میں دیا جائے۔ ہر شخص اس کے لیے اپنی خواہش ظاہر کرنے لگا۔ مالک اشتر نے کہا میری رائے یہ ہے کہ اس کو اہل بیت رسولؐ کے سپرد کیا جائے۔ ان سے بہتر کوئی اس کی کفالت نہ کر سکے گا۔ ابوذر خاندان اہل بیت کے سچے عاشق اور جاں نثار تھے۔

لکھا ہے جب مدینہ میں یہ بچی آئی اور اہل بیتؑ کو وفات ابوذر کی خبر معلوم ہوئی تو ایک کہرام بپا ہو گیا۔ جس طرح سیدانیاں اپنے عزیز خاص کو روتیں۔ اسی طرح ابوذر پر نوحہ و ماتم ہوا۔ ایک ایک بی بی اس بچی کو گلے سے لگاتی۔ پیار کرتی اور تسلی و دلاسہ دیتی تھی۔

خوش نصیب تھے ابوذر کہ عالم غربت میں ان کو محبان اہل بیت نے عزت کے ساتھ دفن کر دیا قافلہ کی عورتوں نے ان پر نوحہ خوانی بھی کی۔ خوش نصیب تھی یہ بچی کہ اس کو ڈھارس دینے والے لوگ آ گئے اور انہوں نے اس دل شکستہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ لیکن آہ! آہ! کیسی دردناک موت تھی کربلا والوں کی جن کو کوئی دفن کرنے والا میسر نہ آیا۔ تین دن تک ان شہیدوں کے لاشے خاک کربلا پر بے غسل و کفن پڑے رہے۔ ان کے بچوں کو تسلی دینے والا کون تھا، البتہ جھڑکنے والے دھمکیاں دینے والے اور طمانچے مارنے والے بکثرت تھے۔ ابوذر کی بچی باپ سے چھوٹ کر اہل حرم کی شفقت کے سایہ میں آ گئی۔ لیکن حسینؑ کی لاڈلی بچی اپنے باپ سے چھوٹ کر اسیر ہوئی۔ شہروں شہروں بھوکی پیاسی پھرائی گئی۔ اور زندان میں بند ہوئی۔

آہ سکینہ کو قید سے رہا ہو کر مدینہ میں آنا نصیب نہ ہوا لکھا ہے کہ جب اہل حرم کو زندانِ شام سے رہائی کا حکم ہوا تو سکینہ کو یاد کر کے بی بیاں دھاڑیں مار مار کر روئیں۔

مروی ہے کہ ایک روز یزید کا غلام زندان کے دروازہ پر آیا اور خبر دی کہ یزید نے علی بن الحسین کو بلایا ہے یہ سن کر سیدانیوں کے کلیجے سینے میں دھڑکنے لگے کہ خدا جانے وہ ظالم کیا سلوک کرے جب امام زین العابدینؑ نے جانے کا ارادہ کیا تو جناب زینبؑ نے فرمایا: بیٹا! میں تمہیں تنہا نہ جانے دوں گی۔ تمہارے ساتھ میں بھی چلوں گی۔ فرمایا پھوپھی اماں مجھے جانے دیجئے۔ دیکھوں تو وہ ظالم کیوں بلاتا ہے جو مرضی خدا ہے وہ ہو کر رہے گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ الغرض بیمار کربلا یزید کے غلام کے ساتھ زندان سے نکلے۔ زندان بان نے بحکم یزید پاؤں سے بیڑیاں اور ہاتھوں سے ہتھکڑیاں اور گردن سے طوق آتارا اور آپ یزید کے دارالامارۃ میں پہنچے۔ دیکھا یزید دروازہ پر کھڑا ہے آپ کو آتے دیکھ کر اس نے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور ہاتھ پکڑ کر اپنے تخت پر بٹھانا چاہا۔ حضرتؑ نے فرمایا اے یزید ہمارے زخموں پر نمک نہ چھڑک۔ کئی دن کی بات ہے کہ اس تخت کے نیچے میرے باپ کا سر رکھا ہوا تھا کیونکر ممکن ہے کہ میں اس

پر بیٹھوں۔ اچھا جہاں آپ کی مرضی ہو بیٹھ جائیے۔

اس کے بعد اس نے کہا اے علی بن الحسین میں چاہتا ہوں کہ حسینؑ کا خون بہا آپ مجھ سے لے لیں۔ میرا خزانہ کھلا ہوا ہے جتنا روپیہ آپ مانگیں دے دوں۔ یہ سن کر امام علیہ السلام رونے لگے۔ اور فرمایا اے یزید میں حسینؑ کا خون بہا لینے والا کون۔ یہ حشر کے روز حضرت رسول خدا کو دینا۔ جنہوں نے حسین کو اپنے سینے پر رکھ کر پالا تھا جن کو اپنے شانوں پر سوار کیا تھا جن کے لیے کہا کرتے تھے کہ حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔ یہ خون بہا فاطمہ زہراؑ کو دینا جنہوں نے چکیاں پیس پیس کر حسین کو پالا تھا۔ آہ یہ خون ایسا نہیں ہے کہ تو اس کی قیمت دے سکے۔ ان کے خون کے ایک قطرہ کی قیمت تمام عالم نہیں ہو سکتا۔

یزید سر جھکائے سنتا رہا۔ پھر کہنے لگا اچھا اب میں نے تم کو رہا کیا تمہیں اختیار ہے چاہے یہاں رہو چاہے مدینہ چلے جاؤ۔ فرمایا میں اس بارے میں اپنی پھوپھی جناب زینبؑ سے مشورہ کروں گا۔

اس کے بعد آپ وہاں سے زندان میں آئے۔ جب سے آپ یزید کے پاس گئے تھے۔ جناب زینبؑ کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ کبھی در زندان پر آتی تھیں۔ اور کبھی ہاتھ اٹھا کر بارگاہ باری میں دعا کرتی تھیں۔ جب حضرت داخل زندان ہوئے۔ تو آپ بھتیجے سے لپٹ گئیں اور فرمانے لگیں بیٹا یزید نے کیوں بلایا تھا۔ فرمایا پھوپھی اماں آج اس نے ہم کو رہا کر دیا ہے اب یہ بتائیے کہ آپ یہاں رہنا چاہتی ہیں یا مدینہ جانا چاہتی ہیں۔ فرمایا بیٹا میں تو ابھی شہیدوں کی صف ماتم بھی نہیں بچھا سکی۔ ابھی اپنے ماں جائے کو دل کھول کر رو بھی نہیں سکی۔ یزید سے کہو کہ ہمارے لئے ایک گھر دمشق میں خالی کرا دے تاکہ ہم مجلس غم برپا کر سکیں۔ امام علیہ السلام نے جب یزید سے کہا تو اس نے ایک مکان خالی کرا دیا۔

آہ! ایک مدت کے بعد مصیبت کی ماری بی بیاں کنبہ موتی بی بیاں۔ بیکس و بے لس بی بیاں زندان سے نکلیں اور اس مکان میں منتقل ہوئیں۔ جناب زینب نے فرمایا کہ اس گھر پر ایک علم سیاہ نصب کرو تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ بہتر کے سوگوار اس گھر میں مصروف نوحہ و بکا ہیں۔ اور ہمارے لیے سیاہ لباس تیار کراؤ اور یزید سے کہو کہ زنان دمشق کو ہمارے پاس پرسے کے لیے آنے کی اجازت دی جائے اور یہ کہ ہمارے لوٹے ہوئے تبرکات واپس دے اور ہمارے شہیدوں کے سر ہمارے پاس بھیج دے۔

جب دمشق کی عورتوں کو پتہ چلا کہ اہل حرم قید سے چھوٹ کر فلاں گھر میں آگئے ہیں تو شہر کی وہ عورتیں جن کو اہل حرم سے ہمدردی تھی آنی شروع ہو گئیں۔

ایک ایک بی بی سے پرسان حال ہوئی۔ کوئی جناب رباب کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ بی بی تم پر کیا گزری ہے انہوں نے رو رو کر کہنا شروع کیا۔ آہ کیا بتاؤں۔ میرا چھ مہینہ کا بچہ تین دن کا بھوکا پیاسا ظالموں نے تیر ستم سے شہید کر دیا اور اس معصوم کا سر نیزے پر بلند کیا۔

کسی نے جناب ام لیلیٰ سے پوچھا بی بی تمہارا کون مارا گیا۔ انہوں نے فرمایا آہ میرا کڑیل جوان بیٹا حسین بیٹا شبیہ پیغمبر جسے اٹھارہواں سال تھا۔ ظالموں نے نیزے مار مار کر شہید کیا۔ اُم فروہ سے کسی عورت نے پوچھا آپ نے کہا میرے بچے کو جو یتیم تھا۔ ظالموں نے تیغوں سے ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ اس کی لاش کو پامال کیا۔ اُم کلثوم سے کسی نے پوچھا تو فرمایا میرا ۳۴ برس کا بھائی جو علمدار فوج حسینی تھا۔ ظالموں نے اس کے شانے کاٹے۔ گرز مار کر اس کا سر شق کیا۔ ایک عورت نے جناب زینب سے پوچھا بی بی! تم کس کی سوگوار ہو۔ فرمایا آہ کس کس کو بتاؤں میری ماں کا ہرا بھرا باغ اُجڑ گیا۔ میرا بھائی پنج تن کی آخری نشانی۔ پیغمبر خدا کا جانی، فاطمہ زہرا کا لال، علی کا جگر گوشہ حسین زخموں سے چُور چُور ہو کر شہید ہوا۔ میرے دو لال ظالموں نے ذبح کر دیئے۔ بی بی ہم بہتر کے سوگوار ہیں۔ اپنی کس کس مصیبت کو بیان کریں۔ ہم پر پانی بند کیا گیا۔ ہم کو بعد شہادت حسین اس طرح لوٹا گیا کہ کسی بی بی کے سر پر چادر تک نہ چھوڑی۔ ہمارے خیموں میں آگ لگائی گئی۔ برہنہ پشت اونٹوں پر بٹھا کر کربلا سے کوفہ لائے۔ بازاروں میں تشہیر کیا۔ دربار ابن زیاد میں ننگے سر لے گئے۔ وہاں سے اسی طرح ہمیں دمشق تک لائے ہم تمہارے شہر میں ایک تماشہ بنے۔ تمہارے شہر کی عورتوں نے ہم پر صدقہ کی روٹیاں پھینکیں خرمے پھینکے۔ ہماری اسیری پر عید منائی۔ ہم کو رسیوں میں باندھ کر سر و پا برہنہ دربار یزید میں لے گئے۔ پھر ہمیں ایک تیرہ و تار قید خانہ میں بند کیا گیا۔ کسی نبی کی اولاد کو اُس کی اُمّت نے اتنا نہیں ستایا جیسا کہ ہم ستائے گئے۔ کسی نبی کا کنبہ اس طرح ذلیل نہیں کیا گیا جس طرح ہم کئے گئے۔ آہ جس نبی کا مسلمان کلمہ پڑھتے ہیں۔ اس کی اولاد اس کے کنبے سے یہ سلوک۔ بے گناہوں پر یہ ظلم ایک روز ظالموں کو پیش خدا و رسول اس ظلم کا جواب دینا ہوگا۔

یہ باتیں سن کر زنانِ شام نے اپنا منہ پیٹ لیا اور رو رو کر کہنے لگیں۔ آہ ہمیں اس ظلم کی خبر نہ تھی۔ خدا یزید پر لعنت کرے۔ اور اس کی حکومت تباہ ہو کہ اس ظالم نے اولاد رسول کو ذبح کیا اور ناموسِ رسول کو بے پردہ بازاروں میں پھرایا اور درباروں میں بلایا۔

أَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

ستتسویں مجلس

فضائل حضرت عمّار یاسرؓ

فضائل اہل بیتؑ و روانگی اہل حرم دمشق سے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیۡ کِتَابِہِ الۡمَجِیۡدِ وَفُرۡقَانِہِ الۡحَمِیۡدِ

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ

(سورہ التوبہ ۱۱۹/ ۹)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین میں سے ہو جاؤ۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صادقین کا وجود ہر زمانہ میں ضروری ہے۔ اور ان کا معصوم ہونا بھی لازم ہے کیونکہ ایمان والوں کو ان کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ساتھ رہنے سے یہ مراد نہیں کہ ان کے ساتھ چلو پھرو۔ بلکہ یہ مقصد ہے کہ ان کا اتباع کرو۔

صادقین سے مراد وہی ہو سکتے ہیں، جنہوں نے مدت العمر کبھی جھوٹ نہ بولا ہو ورنہ جزئی صداقت والے تو دنیا میں بے شمار ہیں بلکہ کوئی مسلمان بھی ایسا نہیں جس نے کبھی سچ بولا ہی نہ ہو۔ اور کچھ نہیں تو کم سے کم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ جب زبان پر جاری کیا ہو گا تو یہی سچا کلمہ ہے۔

ان صادقوں کے اتباع سے بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان غلط راستہ پر چلنے سے بچ جائے گا۔

اصحاب رسول میں سے جناب عمار یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے صحبت رسولؐ سے پورا پورا فیض حاصل کیا اور اسلام کی وہ گراں قدر خدمات انجام دیں جن کو انصاف پسند اور حق گو مسلمانوں کے دل جانتے ہیں جب سے رسول کے قدم پکڑے اس وقت تک نہ چھوڑے جب تک حبیب خدا سے دنیا خالی نہ ہوئی۔ حضور نبی اکرمؐ کے مرنے کے بعد اسی عقیدت اور خلوص محبت کو ان لوگوں کے ساتھ باقی رکھا جن سے تمسک کا حکم رسولؐ اللہ نے دیا تھا اور جو صادقین تھے۔

دُنیا والوں نے بہت بہکایا طعنے بھی دیئے اذیتیں بھی دیں۔ شہر سے نکالا بھی مگر اس مضبوط محبت کی زنجیر کی ایک کڑی نہ ٹوٹی۔ عقیدت کے پیر کو بال برابر جنبش نہ ہوئی جو وعدہ رسول سے کیا تھا اسے آخر وقت تک نبھایا۔

جناب عمار باوجودیکہ دُبلے پتلے آدمی تھے۔ بالخصوص ان کی ساقیں بہت پتلی تھیں لیکن قوت ایمانی نے ان کو ایسا قوی دل بہادر بنا دیا تھا کہ کبھی کسی معرکہ میں وہ پیٹھ دکھا کر نہ بھاگے بلکہ شیروں کی طرح جم کر لڑے۔

عمار بڑے رحم دل آدمی تھے۔ وہ کبھی کسی کی تکلیف برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اکثر اوقات اس ہمدردی و رواداری میں ان کو بڑے بڑے مصائب کا سامنا پڑ جاتا تھا۔ مگر وہ سب ان باتوں کو برداشت کر لیتے تھے۔

حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا کہ عمار کو جب دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا جاتا ہے تو وہ اس چیز کو اختیار کرتے ہیں جو زیادہ دشوار ہوتی ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا۔ عمار وہ شخص ہے جس کے گوشت و خون کو آتش جہنم پر حرام کر دیا گیا ہے آتش جہنم اس کے جسم کو مَس نہ کرے گی۔

جب عمار کے والد یاسر اور ان کی والدہ کو مشرکین مکہ نے سخت سے سخت اذیتیں دے کر شہید کر دیا تھا جناب عمار ماں باپ کے مرنے کے بعد تنہا رہ گئے۔ مگر ایمان میں ذرا لغزش نہ ہوئی۔ ابوجہل ان کو بہت زیادہ ستاتا تھا۔ ایک روز وہ عمار کو مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ قدرت خدا سے وہ انگوٹھی اس کی انگلی میں ایسی تنگ ہوئی کہ وہ بیقرار ہو کر زمین پر تڑپنے لگا۔ اور اس کے بدن کا پیراہن زرہ سے زیادہ وزنی ہو گیا۔ اور وہ سخت اذیت اس کو پہنچی کہ بلبلا گیا۔ وہ بڑی عاجزی کے ساتھ کہنے لگا کہ اے عمار یہ بلا مجھ پر تمہاری وجہ سے آئی ہے۔ لہذا مجھے بچاؤ اب کبھی تمہیں اذیت نہ دوں گا۔ آپ نے اس کی انگلی سے انگوٹھی اور پیراہن اس کے جسم سے اُتار لیا۔

کسی نے کہا اے عمار یہ کیا بات ہے کہ خدا نے تمہارے ماں باپ کی اذیت کے وقت مدد نہ کی اور دشمنوں کے پنجے سے نہ چھڑایا۔ عمار نے فرمایا یہ تو اس کی مشیت ہے۔ ابراہیمؑ کو اس آگ سے نجات دی۔ اور یحیٰؑ اور زکریاؑ کو قتل ہونے سے نہ بچایا۔ جب رسولؐ اللہ نے سنا تو فرمایا۔ اے عمار تم افضل فقہا و علما ہو۔

عمار نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں میرے لیے اتنا علم کافی ہے کہ آپ خدا کے رسول اور افضل و اشرف

خلائق ہیں۔ اور آپ کے بھائی علیؑ آپ کے وصی و جانشین ہیں۔ اور آپ کے بعد جملہ مخلوق سے اکمل و اولیٰ ہیں آپ دونوں کا ہر قول و فعل حق ہے۔

شارح صحیح بخاری نے خیر جاری میں لکھا ہے کہ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا کہ جو کوئی عمار کو دشمن رکھے گا خدا اس کو دشمن رکھے گا اور جو عمار سے بغض رکھے گا خدا اس سے ناراض ہوگا۔

آنحضرتؐ کے انتقال کے بعد لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ عمار علی علیہ السلام کے گروہ سے نکل آئیں۔ انہوں نے کھلے لفظوں میں جواب دیا کہ میں محبت علیؑ کو ذریعۂ نجات آخرت سمجھتا ہوں اگر تم لوگ میرے حلق پر تلوار بھی رکھ دو گے تب بھی میں علیؑ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔

تاریخ اعثم کوفی میں ہے کہ ۳۴ھ ہجری میں جب حضرت عثمان سے اصحاب رسولؐ کو بہت سی شکایات پیدا ہوئیں اور بنی امیہ کی دست برد سے لوگ عاجز آگئے تو اصحاب رسول نے جمع ہو کر تجویز کیا کہ عمار یاسر کے ذریعے سے ان کو سمجھایا بجھایا جائے تاکہ کتاب و سنت کے خلاف جو امور ہو رہے ہیں ان کا سدباب ہو جائے۔ عمار نے ایک کاغذ پر شکایات کو لکھوا لیا تھا۔ جب عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عثمان کے پاس آئے تو وہ کاغذ ان کے ہاتھ میں دیا۔ انہوں نے چند سطریں پڑھ کر غصہ سے اس کو پھینک دیا۔ انہوں نے کہا یہ تحریر اصحاب رسول کی ہے۔ زمین پر پھینک کر اس کی توہین نہ کیجئے۔ اس پر چند غلاموں کو حکم دیا گیا کہ عمار کو زدوکوب کریں۔ غلاموں نے مارنا شروع کیا اس پر صبر نہ ہوا۔ تو خود خلیفہ نے چند لاتیں اس زور سے اعضائے تناسل پر ماریں کہ عمار بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اور اس روز سے عارضہ فتق ان کو لاحق ہوگیا۔ اسی بے ہوشی میں ظہرین و مغربین کی نمازیں بھی قضا ہوگئیں۔ مگر سوائے صبر چارہ کار کیا تھا۔

جناب عمار کے متعلق امیرالمومنینؑ نے فرمایا کہ عمار صاحب ایمان ہیں۔ کسی مومن کے لیے اس وقت تک ذلت نہیں جب تک کہ وہ اپنے دین میں شک پیدا کرنے والا نہ ہو اور اس کے یقین کے بارے میں تزلزل نہ آئے۔

ایمان عمار کا یہ حال تھا کہ جنگ صفین میں لشکر معاویہ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا اگر تم مجھے اور میرے اصحاب کو مارتے مارتے موضع ہجر الیمن میں ایک مقام تک لے جاؤ تب بھی ہم اس علم و یقین سے نہ ہٹیں گے کہ ہم حق پر ہیں۔

ایک بار دو شخص عمار کے بارے میں جھگڑا کر رہے تھے۔ ہر ایک کہتا تھا ان کو میں نے قتل کیا ہے عبداللہ ابن عمر نے یہ سن کر کہا کہ یہ لوگ اس بارے میں جھگڑا کر رہے ہیں کہ کون ان میں سے آتش جہنم میں جلے۔ میں نے رسول اللہ سے سُنا ہے کہ عمار کا قاتل اور ان کے ہتھیار اور لباس لینے والا جہنمی ہے۔

حمیدی نے جمع بین الصحیحین میں نقل کیا ہے کہ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا اے عمار! تم کو باغی گروہ قتل کرے گا۔ تم ان کو جنت کی طرف بلاؤ گے اور وہ تم کو دوزخ کی طرف۔ جنگ صفین میں قول رسول اللہؐ کی تصدیق ہو گئی۔ حضرت عمار یاسر اس معرکہ میں امیرالمومنینؑ کے ساتھ ساتھ تھے، اور اسی معرکے میں شہید ہوئے۔ جب معاویہ کو قتل عمار کی خبر پہنچی تو کہنے لگا۔ عمار کا قاتل وہی شخص ہے جو اُن کو میدانِ جنگ میں لے کر آیا۔ ابن عباس نے سُنا تو فرمایا اس بنا پر حضرت حمزہ کے قاتل رسولؐ پاک قرار پاتے ہیں، کیونکہ جنگ اُحد میں وہی ساتھ لائے تھے۔

۹ سنہ ہجری میں جب امیرالمومنین علیہ السلام جنگ صفین کو جا رہے تھے تو حضرت عمار یاسر کا سن اس وقت ایک سو پانچ سال کا ہو چکا تھا۔ پیرانہ سالی مدینہ میں رہ جانے پر مجبور کرتی تو کوئی تعجب نہ تھا مگر جوشِ محبت علیؑ نے اجازت نہ دی کہ عمر بھر کا ساتھ چھوڑ دیں۔ آخر امیرالمومنین علیہ السلام کے ساتھ ہو لیے۔ محبتِ اہل بیت کا خون جب رگوں میں جوش مارتا تھا تو شباب کا ولولہ لوٹ آتا تھا۔ جب صفین پہنچے تو ترتیب لشکر شروع ہوئی تو امیرالمومنینؑ نے پیادوں کا سردار عمار کو بنایا۔

صفین کی لڑائی ایک دو دن کی نہ تھی ایک لمبا معرکہ تھا ہر روز صفیں جمتیں اور خون کے دریا بہتے۔ جب عمار نے اذنِ جہاد طلب کیا تو امیرالمومنینؑ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور عمار کو سینے سے لگا کر کہا تمہاری پیرانہ سالی کا تقاضا اب میدان میں جا کر لڑنا نہیں۔ اس بوڑھے مجاہد نے آبدیدہ ہو کر فرمایا۔ امیرالمومنینؑ کیا مجھے شرف شہادت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔

آخر امیرالمومنینؑ نے اجازت دی۔ عمار شیروں کی طرح ہمہمہ کرتے میدان میں آئے اور ایسا دلیرانہ حملہ کیا کہ ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ لڑے جتنا لڑ سکتے تھے آخر ایک دشمن نے ایسا تیر سینہ پر مارا کہ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے اور شرفِ شہادت حاصل کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کے مرتبہ شناسوں میں یوں تو بہت سے لوگ تھے مگر چند اصحاب رسول ان سب میں پیش پیش تھے۔ سلمان، ابوذر، عمار، مقداد، اویس قرنی۔ حذیفہ یمانی وغیرہ وغیرہ۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے وقت کے بڑے عابد و زاہد و معرفت و یقین کے پیکر تھے ان کو اہل بیتؑ سے یہ نسبی تعلق تھا نہ جیسی۔ کیا وجہ تھی کہ یہ لوگ ان کے شمع رخ کے پروانے تھے۔ صرف رسولؐ سے رشتہ رکھنے کی وجہ سے تو اتنی گہری عقیدت نہیں ہو سکتی تھی ضرور ان کے روحانی کمالات ان کو اتنی بلندی پر نظر آتے تھے کہ وہاں تک کسی کا پہنچنا محال نظر آتا تھا۔ انہوں نے اہلبیت علیہم السلام کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور ان کے کردار کو مختلف صورتوں سے آزمایا تھا۔ ان کو اس بات کا یقین حاصل ہو گیا تھا کہ یہی وہ ہستیاں ہیں جن کی پیروی ذریعہ نجات ہے۔

اہل بیت علیہم السلام کی معرفت بہت کم لوگوں کو ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی فضیلت کے پرکھنے کا

معیار لوگوں کے پاس نہ تھا۔ زر پرستی اور جاہ طلبی کے جب گہرے پردے انسان کی عقل پر پڑ جاتے ہیں تو وہ اس قابل رہتا ہی نہیں کہ تزکیہ نفس کے نازک اور لطیف پہلوؤں کو سمجھ سکے۔ غلط جذبات کے سائے میں پلنے والے افعال انسانی کے وہ کھوٹے سکے ہیں جن کی صفائے نفس اور پاکیزگی باطن کے بازار میں کوئی قیمت نہیں۔

ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کی مخالفت بھی اسی وجہ سے رہی کہ لوگ اس دھوکہ میں رہے کہ ہماری طرح یہ بھی بشر ہیں۔ مَآ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ہماری طرح یہ بھی کھاتے پیتے ہیں چلتے پھرتے ہیں پھر ہم میں ان میں فرق کیا ہے۔

ابوجہل نے خانہ کعبہ کے اندر قریش کے مجمع میں کہا تھا کہ یہ محمد وہی تو ہیں جو ہم میں پلے بڑھے۔ آخر ان میں وہ کیا خاص بات ہے۔ کہ ہم اپنے اوپر ان کو ترجیح دیں۔ دو باتوں میں ایک بات ضرور ہے یا تو یہ شخص مجنون ہے یا کھلا جادوگر۔

امام موسیٰ کاظمؑ کے بہت سے روحانی کمالات دیکھنے کے بعد شاہک سندی نے جس کی حراست میں آپ برسوں رہے تھے ایک روز کہا آپ اپنے ساحرانہ کرشمے کب تک دکھاتے رہیں گے۔

اس سلسلے میں ایک نکتہ اور قابل بیان ہے دنیا میں نفس کے اکتسابی کمالات عام طور پر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوتے ہیں جن کے متعلق یہ عقیدہ راسخ ہے کہ جو محنت کرے گا کمال کی منزل تک پہنچے گا۔

دوسرا گروہ ان حضرات کا ہے جن کے کمالات اکتسابی نہیں بلکہ وہبی ہیں۔ ان کا سمجھنا عام لوگوں کے بوتے کا کام نہیں۔

جب مامون نے اپنی بیٹی کا نکاح امام محمد تقی علیہ السلام سے کرانا چاہا تو عباسیوں کی ایک بڑی جماعت مخالف ہوگئی۔ اور انہوں نے کہنا شروع کیا۔ کہ آپ ایک ایسے نوجوان کو اپنا داماد بنا رہے ہیں جس کے اندر کوئی کمال نظر نہیں آتا۔

مامون نے کہا یہ اہل بیت رسولؐ ہیں ان کا علم من اللہ ہوتا ہے۔ ان کے نفسانی کمالات کو تم نہیں سمجھ سکتے۔

انہوں نے کہا ایسے کمالات کے جامع صرف انبیاء و مرسلین ہی ہوتے ہیں۔ مامون نے کہا۔ تم ان کا امتحان کرلو۔ انہوں نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ اور یحییٰ بن اکثم کو جو دربار مامون کے قاضی القضاۃ تھے۔ امام محمد تقی علیہ السلام کے مقابلے کے لیے تیار کیا۔

مامون کا بھرا ہوا دربار تھا ایک طرف اسی برس کا سن رسیدہ عالم یحییٰ بن اکثم ایک طرف دس سال کا امام وقت علی مرتضیٰ کا پوتا رسولؐ خدا کا جانشین امام محمد تقی علیہ السلام۔ لوگ حیرت میں تھے کہ مامون کی عقل کو کیا ہوگیا ہے کہ اتنے بڑے عالم کے مقابلے میں ایک لڑکے کو بٹھایا ہے۔

مامون نے یحییٰ سے کہا آپ فرزند رسول سے کوئی سوال کیجئے۔ انہوں نے امام سے مخاطب ہوکر کہا۔ اچھا یہ بتائیے کہ

اگر کسی شخص نے بحالت احرام شکار کیا ہے تو اس کا کفارہ کیا ہے۔
امام نے فرمایا یہ سوال مہمل ہے پہلے یہ بتاؤ کہ وہ احرام حج ہے یا احرام عمرہ۔ مقام حل میں شکار کیا۔ یا مقام حرم میں۔ شکاری آزاد تھا یا غلام۔ شکار پرندہ تھا یا سُم رکھنے والا چھوٹا تھا یا بڑا۔ عمداً کیا یا سہواً۔ نادم تھا یا مصر۔ پہلی بار کیا یا اس سے پہلے بھی کیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کا کفارہ جدا جدا ہے۔
یہ سُن کر سارا مجمع دنگ رہ گیا یحییٰ سے کچھ کہے نہ بن پڑی۔
مامون نے کہا حسب قرارداد اب ایک سوال آپ بھی دریافت کیجئے۔
حضرت نے فرمایا اے یحییٰ یہ بتاؤ کہ ایک شخص نے صبح ایک عورت پر نظر کی تو وہ حرام تھی۔ چاشت کے وقت حلال ہوگئی۔ زوال کے وقت حرام ہوگئی۔ عصر کے وقت حلال ہوگئی۔ مغرب کے وقت حرام ہوگئی۔ نصف شب کے بعد حلال ہوگئی۔ صبح کو حرام ہوگئی چاشت کے وقت حلال ہوگئی سہ پہر کو حرام ہوگئی۔
اب تو مجمع کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ایک دوسرے کو دیکھتا تھا اور رہ جاتا تھا۔
جب یحییٰ سے جواب نہ بن پڑا تو مامون نے امام سے عرض کی۔ کہ آپ ہی اس کا جواب بیان فرمائیں۔
فرمایا سنو! صبح کو ایک کنیز کو دیکھا حرام تھی۔ خرید لیا حلال ہوگئی۔ آزاد کر دیا حرام ہوگئی۔ نکاح کر لیا حلال ہوگئی۔ طلاق رجعی دے دی حرام ہوگئی۔ رجوع کر لی حلال ہوگئی ظہار کر لیا حرام ہوگئی۔ کفارہ دے دیا حلال ہوگئی پھر طلاق دے دی حرام ہوگئی۔ پھر رجوع کر لیا حلال ہوگئی۔
مامون نے مجمع سے کہا میں نہ کہتا تھا کہ یہ اہل بیت رسول ہیں، ان کا علم من اللہ ہے۔ یہ دنیا میں کسی سے حاصل نہیں کرتے۔
امام رضا علیہ السلام جب مامون کے طلبیدہ خراسان کو تشریف لے جا رہے تھے راہ میں آپ نے نماز پڑھنی چاہی۔ لوگوں نے کہا یہاں پانی نہیں آپ نے ایک جگہ کو کھودا تو وہاں سے پانی کا چشمہ اُبل پڑا۔ جو چشمہ رضا کہلاتا ہے۔ آپ نے ایک سوکھے درخت کے نیچے وضو کیا۔ وہ ہرا بھرا ہوگیا۔ اس کے پتے اور پھل پھول بے شمار امراض کی دوا تھے۔ وہ شجرۃ الرضا کہلاتا تھا۔ دشمنوں نے اسے کاٹ کر جڑ تک نکال پھینکی۔
یہی کمالات ہیں جو ان کی امامت کے منصوص من اللہ ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ چونکہ ان حضرات کا علم وہبی ہوتا ہے اور ان کے اعمال پر عصمت سایہ فگن رہتی ہے۔ لہذا نہ ان کی پیشین گوئیاں غلط ہوتی ہیں اور نہ واقعات کی ترتیب سے نکالے گئے نتائج میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔
اگرچہ ریاضت نفس سے اور لوگ بھی اظہار کرامات کرتے ہیں لیکن ان کا دائرہ عمل محدود ہوتا ہے۔ تمام کائنات پر ان کو حق تصرف حاصل نہیں ہوتا اس لیے ان کی ریاضت میں اتنی قوت پیدا نہیں ہوتی کہ کائنات کے ہر ذرہ کو

تحت تسرف میں لے آئے۔

مرنے کے بعد ان کے نفوس مقدس اپنے کمالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ امام حسین علیہ السلام کے سرِ اقدس کا تن سے جُدا ہونے کے بعد سورہ کہف کی تلاوت کرنا لوگوں کو جھوٹی روایت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ ریڈیو کا سیٹ لوگ ہاتھوں میں لیے پھرتے ہیں اور اس سے دنیا بھر کی خبریں سنتے ہیں جو وائرلیس کے ذریعہ ان تک پہنچتی ہیں۔ کوئی پوچھے کہ یہ بے جان چیز کیسے بول رہی ہے۔ جب کہ کسی برقی تار سے اس کا کنکشن بھی نظر نہیں آتا۔ جواب یہی ہوگا کہ فضا میں جو برقی رو ہے وہ اس آلے کے اندر اپنا کام کرتی ہے۔ تو کیا وہ ارواحِ مقدسہ جو عام روحوں سے بالاتر ہیں۔ اور جن کو خدا نے غیر محدود طاقتیں بخشی ہیں اجسام سے بظاہر جُدا ہونے کے بعد اس کے کسی حصّہ سے اتصال پیدا کر کے اس کو ناطق نہیں بنا سکتیں۔ بندوں میں تو یہ طاقت ہے۔ کہ وہ ایک بے جان آلے سے آواز نکالیں۔ بے جان آلے تو دوسروں کی تقریر سنا سکتے ہیں۔ لیکن ایک برگزیدہ باری کا سر اپنے خالق کا کلام نہیں سنا سکتا۔ لوگ ریڈیو کی سوئی گھما کر جس ملک کے مقرر کی تقریر چاہیں کنکشن پیدا کر کے سن سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم زیارت کے لیے انگلی اٹھا کر سلام پڑھیں تو یہ تعلق امامِ معصوم سے پیدا نہیں کر سکتے۔ کیا قوت ایمانی قوت برقی سے بھی کمزور ہے۔ اسی قوت ایمانی کا کنکشن ہے کہ جب ہم مدد کے لیے اپنے امام کو پکارتے ہیں تو ضرور ہی ہماری مدد کو آجاتے ہیں۔

جناب مفتی محمد عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ نے ایک سناری کا واقعہ نظم میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ میکے سے سسرال جا رہی تھی، ایک پٹھان نے جو اس پر عاشق تھا۔ راستہ میں آگھیرا عورت اُسے آتا دیکھ کر گھبرا گئی۔ شوہر سے کہا تو گاڑی سے اُتر کر سامنے والی جھاڑی میں چھپ جا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ پٹھان نے اس کی گاڑی روک کر کہا۔ بتا تیرا شوہر کہاں ہے۔ اس نے کہا کسی کو ضامن دے تو بتاؤں۔ کہا جس کو تو کہے میں ضامن دے دوں۔ اس نے کہا جس حسینؑ کے تعزیے اُٹھتے ہیں ان کو ضامن دے۔ اس نے ضمانت دے دی۔ عورت نے شوہر سے کہا وہ نکل آیا۔ پٹھان نے فوراً اس کو قتل کر دیا۔ اور گاڑی سے اُتار کر عورت کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اُس نے کہا کیا دیکھتی ہے۔ کہا میں اپنے ضامن کو دیکھتی ہوں۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک نقاب پوش بزرگ گھوڑا دوڑاتے وہاں پہنچے اور تلوار مار کر اس پٹھان کا سر اُڑا دیا۔ اور ایک برگد کے درخت میں اس کی لاش لٹکا دی۔

عورت نے رو کر کہا اس ظالم نے میرے شوہر کو قتل کر دیا۔ فرمایا اس کا سر تن سے ملا کر کپڑا ڈال دے اس نے ایسا ہی کیا۔ آپ نے دُعا فرمائی۔ وہ زندہ ہو گیا۔ عورت کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ پوچھنے لگی آپ کون ہیں فرمایا میں وہی ہوں جس کی تو نے ضمانت لی تھی۔

مرّوی ہے کہ جب اہلِ حرم قید یزید سے چھوٹ کر دمشق کے ایک مکان میں آئے اور صفِ ماتم بچھی تو دمشق کی عورتیں پُرسے کے لیے سیدانیوں کے پاس آنے لگیں۔ ایک نابینا عورت بھی آئی وہ محبانِ اہل بیت میں سے تھی۔ جناب زینبؑ کے قدموں پر گر کر بے تحاشا رو دی۔ اسی وقت جو تبرکات فوجِ یزید نے کربلا میں لوٹے تھے یزید کے بھیجے ہوئے آئے۔ سیدانیوں میں کہرام بپا ہوا۔ سروں سے اُتری ہوئی چادریں واپس ملیں۔ شہیدوں کے خون آلود لباس علم حسینی کا خون سے بھرا ہوا پھریرہ بھی آیا۔ ایک ایک چیز کو دیکھ کر بی بیاں زار زار روتی تھیں۔ اس نابینا عورت نے کہا بی بی ان تبرکات میں سے مجھے بھی کچھ دے دو۔ جناب زینبؑ نے عمامہ حسینؑ سے تھوڑا سا کپڑا جُدا کر کے اس عورت کو دے دیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے لگایا اور عرض کی مولا حسینؑ میری آنکھوں کو روشن کیجئے۔ بقدرت خدا اس کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔

کوئی صاحب اس پر تعجب نہ کریں۔ بعید از عقل نہ سمجھیں۔ اگر یوسف کے پیراہن میں یہ کرامت ہوسکتی ہے کہ یعقوب کی گئی ہوئی بینائیؑ واپس لے آئے تو حسینؑ کے عمامہ میں یہ اثر کیوں نہیں ہوسکتا۔

منقول ہے کہ جب اہلِ حرم قید سے رہا ہو کر اس گھر میں آئے تو جناب زینبؑ نے امام زین العابدین علیہ السلام سے فرمایا۔ یزید سے کہو کہ وہ ہمارے شہیدوں کے سر بھی دے دے تاکہ ہم اپنے بچھڑوں سے مل لیں اور اپنے ساتھ کربلا لے جا کر دفن کر دیں۔ چنانچہ یزید نے منظور کر لیا۔ اور سرہائے شہداء روانہ کیے گئے جس شہید کا سر آتا تھا جو بی بی اس سے متعلق ہوتی تھی وہ اس کے سر کو گود میں لے لیتی تھی۔ اور سیدانیاں اس پر ماتم کرتی تھیں۔

کسی کی گود میں حُر کا سر تھا اور کسی کی گود میں حبیب کا۔ کسی کی گود میں مسلم بن عوسجہ کا کسی کی آغوش میں بریر کا۔ انصار کے سروں کے بعد بنی ہاشم کے سر آئے۔ قاسم کا سر آیا۔ اُم فروہ نے بڑھ کر لیا سیدانیوں نے یتیم حسن پر دل کھول کر ماتم کیا پھر عون و محمد کے سر آئے۔ زینبؑ نے دوڑ کر اپنے بچوں کو چھاتی سے لگایا۔ جب شبیہ پیغمبر علی اکبر کا سر آیا۔ تو ماں پھوپھی اور دوسری خاندانی بی بیاں وَعَلِیْ اَکبراہُ وَاثَمرَۃَ فُؤَادَہُ کے نعرے مارتی دوڑیں۔ زینبؑ نے اپنے بچوں کے سر زمین پر رکھ کر علی اکبر کا سر آغوش میں لیا اور وہ دلخراش بین کیے کہ زمین و آسمان ہل گئے۔ اس کے بعد قمر بنی ہاشم سقائے اہل حرم کا سر آیا تو وَاعَبّاسَاہُ وَاعَبّاسَاہُ کی صداؤں سے حشر بپا ہوگیا۔ جناب ام کلثوم نے بڑھ کر سرِ عباس کو یہ کہہ کر اپنی گود میں لے لیا۔ بھیّا عباس آپ کربلا میں میری طرف سے فدیہ راہ خدا بنے تھے۔ میری آغوش میں آئیے۔

آہ آہ!! جب ایک چھوٹا سا سر جھنڈولے بال سوکھے ہونٹ علی اصغر شیر خوار کا آیا تو رباب چھاتی

کوٹتی اور سر پیٹتی دوڑیں۔ علی اصغر آہ دکھیا ماں کو چھوڑ کر کہاں گئے تھے۔ بیٹا تیرا خالی جھولا جب یاد آتا ہے تو کلیجے پر خنجر چلتے تھے۔ آہ ظالموں نے تجھ جیسے معصوم کی پیاس تیر ستم سے بجھائی۔ آہ! میری کوکھ اجڑ گئی۔ میری آرزوٗں پر پانی پھر گیا۔

آہ جب مظلوم کربلا کا سر آیا تو کہرام بپا ہوگیا۔ وَاحُسَیْنَاہُ، وَامُحَمَّدَاہُ، وَاعَلِیَّاہُ کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں۔ ہر بی بی دوڑی اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ

جناب زینبؑ نے بڑھ کر مظلوم امام کے سر کو لے لیا اور رو کر کہنا شروع کیا ؎

اَخِیْ یَا اَخِیْ اَیَّ الْمَصَائِبِ اَشْتَکِیْ فَوَاقُکَ اَوْ ھَتْکِیْ وَذُلِّیْ وَغُرْبَتِیْ

میرے پیارے بھیا کس مصیبت کو بیان کروں آپ کی جدائی کا صدمہ یا اپنی ہتک عزت یا اپنی ذلت یا اپنی عالم غربت کی تکالیف۔

یَاھِلَالًا لَمَّا اسْتَتَمَّ کَمَالًا غَالَہٗ خَسْفُہٗ فَاَبْدَاءَ غُرُوْبَا

اے میری ماں کے چاند ابھی تو کمال کو بھی نہ پہنچا تھا کہ تجھے گہن لگا اور تو غروب ہوگیا۔

یَا اَخِیْ یَا اَخِیْ فَاطِمَۃُ الصَّغِیْرَۃُ کَلِّمْھَا فَکَادَ قَلْبُھَا اَنْ یَّذُوْبَا

میرے بھیا چھوٹی سی فاطمہ سے کچھ تو باتیں کرلو۔ قریب ہے کہ اس کا قلب صدمے سے پگھل جائے۔

ایک ہفتہ تک یہ صفِ ماتم بچھی رہی۔ رات دن ماتم ہوا۔ اس کے بعد مدینے جانے کی تیاری ہوئی۔ یزید نے حکم دیا۔ کہ اونٹوں پر شاندار عماریاں چاندی سونے کی رکھی جائیں۔ اور ان پر ریشمی پردے ڈالے جائیں۔ جب یہ سجے سجائے اونٹ دروازے پر آکر کھڑے ہوئے اور جناب زینب کی نظر ان عماریوں پر پڑی تو سر پیٹ لیا۔ آہ ہم کہاں ان عماریوں کے قابل رہے۔ شہر شہر، کوچہ کوچہ، دیار دیار تشہیر کے بعد اب ان میں کون بیٹھے گا۔ آہ! تمام کنبہ کو گنوا کر اپنا سارا گھر لٹا کر میں ان عماریوں میں بیٹھوں گی۔ بیٹا علی بن الحسین ان کو واپس کرا دو یزید سے کہو کہ ان عماریوں پر کالے پردے ڈلوا دے تاکہ معلوم ہو کہ بہتّر کے سوگوار آرہے ہیں۔ ہر عماری پر ایک سیاہ نشان نصب ہو یزید نے ایسا ہی کیا اور بشیر بن جذلم کی ماتحتی میں پچاس سوار دے کر کہا کہ ان بی بیوں کو بحفاظت تمام مدینہ پہنچا دے

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ۔

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْآ اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

اڑتیسویں مجلس

نفسِ انسانی کا بیان

فضائل اہل بیتؑ ورود اہل حرم کربلا میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیۡ کِتَابِہِ الۡمَجِیۡدِ وَفُرۡقَانِہِ الۡحَمِیۡدِ

وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡھَا (سورہ النحل ۱۸/۱۶)

اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو شمار نہ کر سکو گے۔

ہر وہ چیز جس سے انسان کو کسی قسم کا بھی فائدہ ہو نعمت ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ چونکہ انسان کی پرورش میں لگا ہوا ہے۔ لہذا نعمت ہے کس کی طاقت ہے کہ نعماتِ الٰہی کا شمار کر سکے۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں فَلَا یُحۡصِیۡ نَعۡمَآءَہُ الۡعَادُّوۡنَ (شمار کرنے والے اس کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے۔ وَلَا یُؤَدِّیۡ حَقَّہُ الۡمُجۡتَہِدُوۡنَ اور نہ کوشش کرنے والے اس کے حق کو ادا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ شمار ہو سکتی ہیں خدا کی نعمتیں جب کہ ایک ایک نعمت کے اندر ہزار ہزار نعمتیں مخفی ہیں۔ ہم جس کو ایک نعمت سمجھتے ہیں وہ ایک نہیں بلکہ بے شمار نعمتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے چونکہ ہم حقیقت سے واقف نہیں لہذا در پردہ نعمتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔

ہم ایک پھل کھاتے ہیں لیکن ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ اس کے اندر کتنی نعمتیں اور چھپی ہوئی ہیں۔ اس کا عرق اس کا گودا، اس کا بیج، اس کا چھلکا ہر ایک جُداگانہ نعمت ہے۔ اس کے کچے کھاتے ہیں اور نفع ہے پکا کر کھاتے ہیں اور نیم برشت میں اور ان کا عرق کشید کرتے ہیں اور منفرد صورت میں اور نفع ہے۔ مرکب میں اور کتنے امراض کا علاج اس کے اندر ہے۔ اس کو کون جانے اور کون سمجھے۔ اطبّا نے انتہائی کوششوں سے جو خواص معلوم کیے ہیں وہ مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ وہ بھی یقینی نہیں ظنی ہیں پس انسان کی طاقت سے باہر ہے کہ اس کی نعمتوں کو شمار کر سکے۔ ایک جانور کو لو۔ اس کے بال، اس کی کھال، اس کے ناخون، اس کی ہڈی۔ اس کا خون، اس کا ہر عضو، اپنے مقام پر کسی مرض کا علاج ہے لہٰذا وہ من حیث المجموع تو ایک ہی نعمت ہے لیکن تجزیہ کرو تو ہزار نعمت۔

ہر نعمت پر منعم کا شکر کرنا بھی لازم ہے لیکن جس طرح نعمتیں شمار میں نہیں آسکتیں۔ اسی طرح ان نعمتوں کا شکر بھی ہم سے ادا نہیں ہو سکتا کہ اوّل تو نعمتوں کی حقیقت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ پھر اس کے شکریے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں جب تک نعمت کو پوری طرح سمجھ نہ لیا جائے۔ حق شکر ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ ہم بہت سی چیزوں کی تعریف میں محدود الفاظ سے کام لیتے ہیں جو اس کی نعمت کی صحیح تعریف نہیں ہوتی مثلاً شہد کو ہم کہتے ہیں میٹھا ہے۔ دودھ کو کہتے ہیں میٹھا ہے۔ خربوزے کو کہتے ہیں میٹھا ہے، انگور میٹھا ہے۔ گنّا میٹھا ہے۔ حالانکہ یہ سب ذائقے میں مختلف ہیں لیکن ہمارے پاس سوائے ایک لفظ میٹھے کے دوسرا لفظ نہیں ایسی صورت میں ہم کیونکر شکریہ ادا کریں۔

ہم ہر وقت پانی پیتے ہیں لیکن اس کا مزا نہیں بیان کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہیں میٹھا ہے ٹھنڈا ہے۔ آگے ہماری قوت گویائی کا ناطقہ بند ہے۔ ایک شخص نے امام رضا علیہ السلام سے کہا کہ پانی کا ذائقہ کیسا ہے فرمایا وہی ذائقہ ہے جو زندگی کا ہے۔ اس نے پوچھا روح کا ذائقہ کیسا ہے۔ فرمایا وہی ہے جو عیش کا ہے کس کی طاقت ہے کہ زندگی اور عیش کا ذائقہ بیان کر سکے۔ اوّل تو ہمارے پاس کسی زبان میں بھی الفاظ نہیں۔ دوسرے نعمتوں کی حقیقتوں سے کما حقہٗ آگاہی نہیں پس انسان کی کیا طاقت ہے کہ نعمت الٰہی کا شکریہ ادا کر سکے۔

اور سب نعمتوں کو چھوڑیئے ایک سانس کو دیکھئے جو باہر آتا ہے وہ مفرح ذات ہے اور جو اندر جاتا ہے وہ ممد حیات ہے۔ چونکہ ہر سانس نعمت ہے لہٰذا ہر نعمت پر اگر صرف انسان اتنا ہی کہے کہ شکر ہے اللہ کا تو ساری عمر اس کی صرف سانس کے شکریہ میں ختم ہو جائے گی۔ جب سانس لے گا تو کہے گا شکراً للہ اور جب نکالے گا تو کہے گا شکراً للہ۔ لیجئے ساری عمر اسی میں ختم ہوئی۔ اب بتلایئے باقی نعمتوں کا شکر وہ کب ادا کرے گا۔

خدا نے انسان کو دو قسم کی نعمتیں عطا فرمائی ہیں ایک دنیوی نعمتیں دوسرے دینی نعمتیں۔ جو مرنے کے بعد انسان کو ملیں گی۔ ان دونوں نعمتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آخرت کی نعمات کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ ایسی

ہوں گی۔ لَاعَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ فِيْ قَلْبِ بَشَرٍ۔ یعنی نہ آنکھوں نے دیکھی ہوں گی۔ نہ کانوں نے سنی ہوں گی۔ نہ انسان کے دل میں ان کا خطورہ ہوا ہوگا۔

دنیا کی نعمات انسان کے بدن کی منفعت و تفریح کے لیے ہیں اور آخرت کی روح انسانی کی لذت اندوزی کے لیے ہیں۔ بدن چونکہ مٹی کا بنا ہوا ہے لہذا اس کی ساری نعمتیں بھی مٹی کے کھلونے ہیں۔ انسان حلوا پراٹھا کھا کے خوش ہوتا ہے لیکن وہ یہ نہیں سمجھتا کہ مٹی کھا رہا ہے۔ یہ قدرت الہیہ کا کرشمہ ہے کہ اس نے مٹی کو حلوا بنا کے کھلا دیا حلوے کو زمین پر رکھ دو کچھ دن بعد وہ مٹی ہی نظر آئے گا۔ پھر حلق سے جب تک نہیں اترا وہ حلوہ تھا۔ جوں ہی حلق سے نیچے اترا وہ ایک بدبودار نفرت انگیز مادہ تھا جو بول و براز کی صورت میں اس کے جسم سے خارج ہوگیا انسان کی عقل کا ماتم کرو۔ کہ وہ صرف کام و دہن کی لذت کے لیے مرا جاتا ہے اور حلال و حرام میں تمیز کیے بغیر کھائے چلا جاتا ہے۔ جو لوگ اس راز کی تہ تک پہنچے ہوئے تھے انہوں نے لذات دنیا کی طرف توجہ ہی نہ کی بلکہ نعمات آخرت پر نظر رکھی کیوں کہ وہ مٹی کے کھلونے نہ ہوں گے۔ ان سے بول و براز پیدا نہ ہوگا۔ بلکہ ایک ایسا روحانی کیف ہوگا۔ جس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے۔ وہاں کی ہر نعمت جسم و بدن ہوکر رہ جائے گی اور پھر خوبی یہ کہ نہ بدن موٹا ہونے دے گی نہ لاغر۔

آخرت کی ہر نعمت دوامی نعمت ہوگی عارضی نہیں۔ دنیا کی نعمتیں ان خصوصیات سے محروم ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ایک چیز ایک وقت باعث تفریح بدن ہے اور انسان بے چینی سے اس کا مشتاق نظر آتا ہے۔ ذرا سی حالت بدلتے ہی وہی باعث نفرت اور تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ دودھ کیسی مفید و لذیذ نعمت ہے۔ لیکن ذرا سا بخار آتے ہی اس کی ساری لذت ختم ہو جاتی ہے۔ اور انسان اس کا اپنے منہ کے قریب آنا پسند نہیں کرتا۔ جنت کی نعمتیں ہر وقت و ہر حالت میں مرغوب جمع ہوں گی۔

خاصان خدا ہمیشہ ان ہی کے مشتاق بنے رہے۔ انہوں نے اپنی نظر میں دنیا اور دین دونوں کی نعمتوں کو تول لیا تھا۔

دینی اور دنیوی دونوں قسم کی نعمتوں کی معرفت نفس انسانی پر موقوف ہے لہذا ہم کو ماننا پڑے گا کہ نفس خدا کی سب سے بڑی نعمت ہمارے لیے ہے۔ اس نفس سے نہ ہم نعمات کی حقیقتوں کو بقدر طاقت بشری سمجھتے ہیں۔ بلکہ خدا کی معرفت بھی اسی نفس کی معرفت پر موقوف ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے خوب فرمایا ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ (جس نے خود کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔)

رب کی معرفت موقوف ہے آثار قدرت میں غور و فکر کرنے پر اور یہ غور و فکر کرنا بدن سے متعلق نہیں بلکہ نفس سے متعلق ہے جس قدر نفسِ انسانی میں قوت بڑھتی جائے گی اور اس میں جلا اور صفائی زیادہ ہوتی رہے گی

اسی قدر وہ معرفت کے مدارج کو زیادہ آسانی سے طے کر سکے گا۔

تامل درآئینہ دل کنی　　صفائی بتدریج حاصل کنی

خلاق عالم نے نفسِ انسانی کے اندر کتنی طاقتیں ودیعت فرمائی ہیں اس کا سمجھنا بہت دشوار ہے جسم کی قوتوں کو اس کی قوتوں سے کوئی تعلق ہی نہیں لیکن یہ تمام قوتیں علم کے تحت کام کرتی ہیں۔ بے علم آدمی خدا کو نہیں پہچان سکتا۔ کیونکہ اس کے نفس میں آثارِ قدرت سے معرفت حاصل کرنے کی قوت ہی نہیں ہے۔

نفس انسانی کی دو متضاد حالتیں ہیں۔ یہ فجور کی طرف بھی مائل ہے اور تقویٰ کی طرف بھی ــــ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (سورہ الشمس ۱۰ ا و ۹ و ۸ / ۹۱)

جب تک علم کا نور دل میں پیدا نہ ہوگا نفس سے تاریکی دور نہ ہوگی۔ اور عقل انسانی اس پر پوری طرح کنٹرول نہ کر سکے گی۔

خلاق عالم نے تین قسم کے نفس انسان کو دیئے ہیں یا یوں کہیے کہ تین حالتیں اس کی ہیں پہلی قسم نفس امارہ ہے وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (سورہ یوسف ۱۲/۵۳) کا کام یہ ہے کہ ہر وقت انسان کو برے کام کی طرف رغبت دلاتا ہے۔ جب یہ زیادہ قوت پکڑ جاتا ہے تو عقل اس سے مغلوب ہو جاتی ہے پھر انسان نیکی کی طرف یا تو مائل ہی نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو بہت کم۔

اسی نفس پر کنٹرول کر لینا خطا سے محفوظ رکھتا ہے اور اسی کنٹرول کا پورا پورا تعلق علم حقائق اشیا اور واقعات عالم سے صحیح نتائج تک پہنچاتا ہے۔ جذباتِ بد کا ابھار اسی نفس سے متعلق ہے جس نے اسے دبا لیا وہ بے انتہا قوت کا مالک بن جاتا ہے شیطانی تصرفات روز بروز کم ہوتے چلتے ہیں۔

بنی اسرائیل کا ایک عابد سالہا سال سے تزکیۂ نفس کے لیے عبادت خانے میں ریاضت کر رہا تھا اور اس کے نفس میں پوری روحانی طاقت پیدا ہو گئی تھی ایک روز اسے خبر ملی کہ فلاں مقام پر ایک درخت ہے لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ ایمانی حرارت نے جوش مارا۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس درخت کو کاٹ ڈالے۔ کلہاڑی لے کر چلا۔ راستہ میں شیطان سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا کہاں جاتے ہو۔ کہا فلاں درخت کاٹنے۔ اس نے کہا ایسا ہرگز نہ کرنا لوگ تمہارے جانی دشمن ہو جائیں گے۔ اس نے کہا میں ضرور کاٹوں گا۔ شیطان جو بشکل انسان تھا اس سے لڑ پڑا۔ عابد نے اسے ڈھا دیا۔ اور سینہ پر سوار ہو کر چاہا کہ اپنی کلہاڑی سے اس کی گردن کاٹ دے۔ شیطان نے کہا میرے مار ڈالنے سے تم کو کیا فائدہ ہوگا۔ وہ کام کرو جس سے غمہائے روزگار سے آزادی مل جائے۔ لو یہ پچاس اشرفیاں ہیں۔ اور ہر روز فلاں مقام پر تم کو پچاس اشرفیاں ملتی رہیں گی بشرطیکہ تم اس درخت کو نہ کاٹو۔ عابد حرص و طمع کے جال میں پھنس گیا اور پچاس اشرفیاں

لے کر واپس آیا۔ رات بھر اسی دُھن میں رہا کہ پچاس اشرفیاں ملتی رہیں گی تو میں بڑا مالدار بن جاؤں گا۔ یہ ریاضت بیکار ہے۔ اب ایک دولت مند کی سی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ دوسرے روز صبح ہوتے ہی اس مقام پر پہنچا جہاں کا پتہ شیطان نے دیا تھا۔ وہاں دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ شیطان کے جھوٹے وعدے پر غصہ آیا اور کلہاڑی لے کر پھر درخت کاٹنے چلا۔ شیطان پھر سدِ راہ ہوا۔ عابد نے کہا تو بڑا جھوٹا ہے۔ اب میں درخت کاٹے بغیر نہ ہوں گا۔ شیطان پھر اس کے مقابل آیا۔ اس مرتبہ شیطان نے اسے پٹکا۔ اور سینہ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا پچاس اشرفیاں واپس کر ورنہ تجھے مار ڈالوں گا۔ عابد نے مجبور ہو کر اشرفیاں واپس کیں اور شیطان سے کہا یہ کیا بات ہے کہ آج تو مجھ پر غالب آگیا۔ اس نے کہا کل جو تیرے نفس میں طاقت تھی وہ آج باقی نہ رہی تو اپنے نفس امارہ سے مغلوب ہو گیا۔

ممکن ہے یہ قصہ فرضی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ بغیر نفس امارہ پر قابو حاصل کیے انسان اپنے اندر روحانی قوت پیدا نہیں کر سکتا۔

دوسری قسم نفس کی نفس لوامہ کی ہے جو انسان کو برائی پر ملامت کرتا ہے اسی کو ضمیر کی بیننن زنی کہتے ہیں اگر انسان نے اس نفس کو کمزور نہیں بنایا تو بدی کے ترک کی اس سے کیا امید کی جا سکتی ہے اور اگر ضمیر مردہ ہو گیا تو سمجھو اس کی انسانیت مر گئی۔

تیسری قسم نفس کی نفس مطمئنہ ہے۔ جب اس نفس میں قوت پیدا ہو جاتی ہے تو انسان کا دل مستغنی ہو جاتا ہے اور وہ اپنی لَو خدا سے لگا لیتا ہے اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (سورہ یونس ۱۰/۶۲) لیکن یہ حالت بڑی ریاضت سے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔

اطمینان قلب ذکر الٰہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سورہ الرعد ۱۳/۲۸) ہمارے ائمہ علیہم السلام صاحب نفس مطمئنہ تھے۔ کیونکہ شب و روز وہ یادِ الٰہی میں رہتے تھے۔ اسی نفس مطمئنہ کی بنا پر ان کا نفس اتنا قوی تھا کہ دُنیا کی ہر شے ان کی تابع فرمان تھی کیا کہنا اس نفس کا جس کو خدا نے اپنا نفس بنا لیا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (سورہ البقرہ ۲/۲۰۷)

یہ مرتبہ امت محمدی میں کسی کو نصیب ہوا ہی نہیں۔ کیا کہنا اس نفس کا جس کو رسول نے اپنا نفس بنا لیا۔ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ امت محمدی میں یہ دولت کسی کو نہیں ملی۔ کیا کہنا اس نفس کا جو خدا کے گھر سے نکلا اور خدا کے گھر ہی سے رخصت ہوا۔ اور جس نے مدت العمر سوائے کار خدا اپنے لیے کوئی کام ہی نہ کیا۔

کیا کہنا اس نفس مطمئنہ کا جو حوادث دہر میں ہمیشہ ثابت قدم رہا۔ جس نے ہر مصیبت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جس نے جو کی روٹی نمک کے پانی میں چور کر کھائی اور شکر خدا کیا۔ جس نے پیوند پر پیوند لباس میں لگائے اور کبھی

لب شکایت وا نہ کیے۔ جس نے دین اسلام کی خدمت کے لیے بار بار اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔ اور آنِ واحد کے لیے ہراس کو اپنے پاس نہ آنے دیا۔

رسول کی بعثت کی غرض تزکیہ نفس تھی اِنِّیْ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کو مکمل کر دوں۔) یعنی کوئی اخلاقی کمزوری میری تعلیم کے بعد باقی رہے اس کا تعلق تمامی اُمّت سے نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ آنحضرتؐ نے مکارم اخلاق کا پیکر تمام اُمّت کو نہیں بنایا۔ کون سا اخلاقی عیب تھا جو آنحضورؐ کے عہد میں نہ پایا جاتا تھا۔ کہ یہ مانا کہ بہت سی اخلاقی برائیاں اُمّتِ محمدی سے دُور ہوگئیں۔ لیکن تکمیل و تعلیم تو اسی صورت میں کہی جائے گی۔ جبکہ کوئی اخلاقی کمزوری باقی ہی نہ رہے اگر اہل بیت علیہم السلام کو علیٰحدہ کرکے اُمّتِ محمدی کے اخلاق کا جائزہ لیا جائے تو کسی ایک فرد کو بھی مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ آپ اخلاق حسنہ کا مکمل نمونہ نہ پائیں گے۔ بہت سے ایسے تھے۔ جو اپنی عمر کا ایک حصّہ کفر میں گزار کر آئے تھے۔ لہٰذا اسلام سے پہلے زمانے کے اخلاق اسلامی اخلاق کی فہرست میں داخل نہ ہونگے بہت سے ایسے تھے جو وفات رسولؐ سے چند سال پہلے اسلام لائے۔ ان کو رسولؐ سے تعلیم حاصل کرنے کا وقت کم ملا۔

علاوہ بریں جہاں خطا و نسیان کا امکان باقی ہے وہاں تزکیہ نفس میں نقصان کا امکان بھی ہے۔

اہل بیت علیہم السلام چونکہ مصداق آیت تطہیر ہیں لہٰذا ان کے نفوس قدسیہ میں کسی طرح کی کثافت کا امکان ہی نہیں۔ رسول نے اپنا کمال ان ذوات مقدسہ کو تعلیم دے کر دکھایا اور مکارم اخلاق کی تکمیل کر دی۔ یہ حضرات اخلاق رسول کے نمونے تھے۔ کوئی پہلو ان کے اخلاق کا تشنۂ تکمیل نہ تھا۔

ارباب سلوک رشاد میں جو لوگ اعلیٰ منازل ریاضت پر فائز تھے۔ اور جن کو روشن ضمیری کا مرتبہ حاصل ہوگیا تھا وہ اسی وجہ سے امیرالمومنین علیہ السلام کا اپنے کو غلام سمجھتے تھے کہ ان کا تزکیۂ نفس اس حد کو نہیں پہنچا تھا جہاں نفس امیرالمومنین پایا جاتا تھا۔ اویس قرنی جیسا روشن ضمیر انسان یہ کہنے پر فخر محسوس کرتا ہے کہ علیؑ کے قدم کی خاک میری آنکھوں کا سُرمہ ہے۔

اگر علی علیہ السلام کا نفس تزکیہ میں نفس رسول کی مانند نہ ہوتا۔ تو آیہ مباہلہ میں انفسنا کا مصداق امیرالمومنین علیہ السلام قرار نہ پاتے جو لوگ کہتے ہیں کہ انفسنا سے مراد خود نفس رسولؐ ہیں تو وہ ہم کو بتائیں کہ علی علیہ السلام کو جو رسولؐ نے اپنے ساتھ لیا تھا۔ آیہ مباہلہ میں کون سا لفظ ان کی معیت پر دال ہے۔ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ (سورہ آل عمران ۳/۶۱) تین گروہ ہیں۔ ابناءنا حسنین ہیں۔ نساءنا فاطمہ زہراؑ انفسنا سے مراد اگر رسولؐ ہیں تو پھر علی کو خواستہ آیت کے خلاف اپنے ساتھ کیوں

لیا۔ کیا یہ حکم الہٰی کی خلاف ورزی نہ ہوگی۔ رسول بُلانے والے اور تین گروہ ان کے ساتھ جانے والے۔ یہ سب چار ہوئے۔ چونکہ بیٹے دو تھے۔ لہذا پورے پانچ تن ہو گئے۔ اگر لڑکیاں ایک سے زیادہ ہوتیں تو ان کو بھی ساتھ لیتے اور اگر نفس ایک سے زیادہ ہوتا تو وہ بھی ساتھ ہوتا۔

یہی وہ چار ہستیاں تھیں جن کو پیش کرکے رسولؐ نے تعمیم مکارم اخلاق کرائی۔ ورنہ اُمت کے ذریعے سے تو پوری ہو نہیں سکی۔

ان کا تزکیہ نفس کچھ اس شان سے تھا کہ ان کی روحانی طاقت کا اقرار کفار کو بھی تھا کہتے ہیں۔ نصاریٰ نجران کے سب سے بڑے پادری نے کہا کہ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ خدا سے دُعا کردیں کہ پہاڑ جگہ سے ہٹ جائے تو ہٹ جائے گا۔ یہ معمولی بات نہ تھی۔ غور کیا جائے تو اہلبیتؑ کی بڑی فضیلت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ تزکیہ کے بعد نفس میں روشنی کے ساتھ قوّت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ روشنی دل ہی کے اندر رہتی ہے۔ برخلاف اہل بیت علیہم السلام کے کہ وہ ان کے چہروں سے اس حد تک نمودار ہوئی کہ ایک کافر کی آنکھ نے بھی اسے محسوس کرلیا۔

ایک لطیف بات اس میں یہ ہے کہ اسقف نجران نے کہا تھا اِنِّیْ لَاَرٰی وُجُوْھًا لَوْ سَأَلُوْا اللّٰہَ اَنْ یُّزِیْلَ الْجَبَلَ لَاَزَالَہٗ (اگر یہ خدا سے دعا کریں کہ پہاڑ جگہ سے ہٹ جائے تو اللہ اسے ہٹا دے گا) جن صورتوں کو سامنے سے اس نے دیکھا وہ آنحضرتؐ کی صورت تھی یا حسنینؑ کی۔ کیونکہ وہی آگے تھے۔ جناب فاطمہؑ برقع میں تھیں۔ امیرالمومنین علیہ السلام ان کے پیچھے تھے لہذا ان کے چہروں پر تو نظر پڑی نہ ہوگی۔ پس معلوم ہوا کہ بچوں کے چہروں پر بھی پاکیزگی نفس کا نور چھایا ہوا تھا جس سے ان کے مستجاب الدعوات ہونے کا پتہ اس عالم نصاریٰ نے چلالیا۔ اسی لیے رسولؐ نے فرمایا تھا۔

صَغِیْرُنَا وَکَبِیْرُنَا سَوَآءٌ اور اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَّ اَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَّ آخِرُنَا مُحَمَّدٌ

افسوس ہے کہ پہچانا تو ان کو عالم نصاریٰ نے اور نہ پہچانا تو مسلمانوں نے۔ آہ جو حسین مباہلہ میں رسولؐ کی رسالت کے گواہ بن کر گئے تھے ان کو کس بیدردی سے شہید کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یزید کو اس خاندان سے قلبی عداوت تھی وہ ان کے روحانی اقتدار کو خاک میں ملانا چاہتا تھا اسی وجہ سے اس نے مخدرات عصمت و طہارت کو سر برہنہ شہر بہ شہر پھرانے کا حکم دیا۔ تاکہ اچھی طرح تذلیل ہوں۔ عورتوں کی ذلّت چونکہ مردوں کی ذلّت سے زیادہ ہوتی ہے اس نے دختران علیؑ و فاطمہؑ کی تحقیر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

لیکن ان بیکس بی بیوں نے اعلان کلمۃ الحق میں کسی جگہ ذرا پس و پیش نہ کیا اور نصرت دین میں ہر سخت سے سخت مصیبت کو برداشت کرلیا۔

ان ہی مظلوموں کی فریاد کا اثر تھا کہ دُنیائے اسلام میں بعد شہادت امام مظلوم ہل چل مچ گئی اور ہر طرف سے بے چینی کے آثار نظر آنے لگے۔ یزید اہل حرم کو قید میں گھٹا گھٹا کر مار دیتا۔ لیکن ہر طرف شورش کے آثار دیکھ کر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔

چنانچہ جب بشیر ابن حذلم کی نگرانی میں یہ قافلہ روانہ ہوا۔ تو پھر ایک ایک منزل پر ستم رسیدہ بی بیوں کو یزید کے مظالم بیان کرنے اور اس کی بدکرداری کی قلعی کھولنے کا موقعہ ملا۔ اگر یزید کچھ دن زندہ رہتا تو پھر مسلمان اس کی سلطنت کو درہم و برہم کر کے اس کے ٹکڑے اُڑا دیتے۔ جو حشر قاتلان حسینؑ کا مختار کے ہاتھوں ہوا وہی یزید کا بھی ہوتا۔

بہر حال، جب اہل حرم کا قافلہ دمشق سے روانہ ہوا تو جناب زینبؑ نے امام زین العابدینؑ سے فرمایا بشیر سے کہو کہ ہم کو کربلا کی راہ سے مدینے لے جائے۔

لکھا ہے کہ جب قتل حسینؑ کی خبر مدینہ پہنچی تو تمام مدینہ میں عموماً اور بنی ہاشم میں خصوصاً قیامت برپا ہو گئی اصحاب رسول تڑپ گئے۔ جناب جابر بن عبداللہ انصاری جو اہل بیت رسول کے بہت بڑے محب تھے اسی روز سے اس خیال میں رہنے لگے کہ کسی طرح جلد سے جلد کربلا پہنچ کر قبر حسینؑ کی زیارت کروں۔ اول تو وہ نابینا، پھر عالم پیری پھر حکومت کی تشدد پسندی سے کسی قافلہ کا عازم کربلا نہ ہونا ایک سال تک جابر کو کربلا جانے سے روکے رہا۔

آخر دوسرے سال کوفہ جانے والے ایک قافلے کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ ایک منزل پر قافلے سے جدا ہو کر کربلا کا راستہ اختیار کیا۔ اپنے غلام سے کہا کہ جب کربلائے حسین آجائے تو مجھے خبر کر دینا۔

جب جابر میدان کربلا میں پہنچے تو غلام نے ایک دہقان سے پوچھا اس سر زمین کا کیا نام ہے۔ اس نے کہا کربلا۔ یہ سنتے ہی جابر نے رونا شروع کیا اور غلام سے کہا اونٹ کو بٹھا دے تاکہ وہ یہاں سے پا پیادہ فرزند رسولؐ کی قبر تک پہنچوں۔ غلام نے جابر کا ہاتھ پکڑا اور لے کر چلا۔ جب مقتل میں پہنچے تو غلام نے کہا۔ اے صحابی رسولؐ یہ تو سنسان مقام ہے۔ یہاں کس سے پوچھوں کہ قبر حسینؑ کہاں ہے۔ جابر نے فرمایا تو مجھ کو قبروں کے درمیان لے جا کر کھڑا کر دے میں خود معلوم کر لوں گا کہ حسین علیہ السلام کی قبر کہاں ہے غلام نے ہاتھ پکڑ کر جب قبروں کے درمیان کھڑا کیا تو جناب جابر نے باآواز بلند کہا۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَبَا عَبْدِ اللهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا بْنَ رَسُوْلِ اللهِ ناگاہ ایک قبر سے آواز آئی وَعَلَيْكَ السَّلَامُ يَا جَابِرُ جابر نے کہا بس یہی قبر فرزند رسول کی ہے۔ بے تاب ہو کر قبر پر گر پڑے اور سینے سے لگا کر زار زار رونے لگے اور کسی طرح قبر سے جُدا ہونا گوارا نہ کیا۔

ناگاہ غلام نے کہا اے صحابی رسولؐ قبر سے اُٹھ کر جلد کسی گوشہ میں روپوش ہو جائیے۔ غالباً آپ کے یہاں آنے کی خبر کسی نے ابن زیاد کو کر دی ہے اس نے فوج کا ایک دستہ آپ کی گرفتاری کے لیے غالباً بھیجا ہے۔ جناب جابر نے فرمایا کیا اچھا ہو کہ یہ بے دین دشمن ایمان مجھے بھی قتل کر دیں۔ جب رسول کا تمام گھر تباہ ہو گیا۔ بنی ہاشم کا ایک ایک جوان چن چن کر مارا گیا تو اب جینے کا کیا مزہ، تو نظر جما کر دیکھ کہ اس فوج کا رُخ کدھر ہے۔

جب دامن گرد پھٹا۔ تو غلام نے کہا میرے آقا میری عقل حیران ہے کہ یہ سامنے سے آنیوالا قافلہ کن لوگوں کا ہے، ہر اُونٹ پر ایک ایک سیاہ علم ہے عماریوں پر سیاہ پردے نظر آتے ہیں۔ کچھ فوجی جوان ان اونٹوں کے دائیں بائیں ہیں رُخ سب کا ادھر ہی کو ہے۔ جابر نے فرمایا یہ کیا واقعہ ہے۔

جب اہل حرم کو معلوم ہوا کہ کربلا میں پہنچ گئے تو بیقراری سے صدائے واحسیناہ واحسیناہ بلند کی۔ وہ دردناک نوحے تھے کہ زمین و آسمان ہل رہے تھے۔ جناب زینبؑ کے نوحے کا ایک شعر کیسا دردناک ہے۔

یاں کس کے ساتھ داغ لے کر بلا ہوا لایا تھا جو مدینے سے ہم کو وہ کیا ہوا

الغرض بی بیاں اونٹوں سے اُتریں۔ نظروں میں پچھلا سماں پھر گیا۔ یہاں دشمن کی ٹڈی دل فوج تھی۔ یہاں ہمارے خیام تھے۔ یہاں شہیدوں کے لاشے رکھے گئے تھے۔ یہاں ہمارے نوجوان اور بوڑھے قتل ہو ہو کر گرے تھے۔ آہ! یہ وہ ٹیلہ ہے جہاں زینبؑ وقت شہادت حسینؑ خیمے سے نکل آئی تھیں۔

اسی طرح سر و سینہ پیٹتے قبروں کے پاس پہنچے ایک ایک بی بی قبروں کو سینے سے لگائے فریاد کر رہی تھی۔ واحسیناؑ واعلی اکبراہ۔ واعباساہ کے نعرے فضائے کربلا میں گونج رہے تھے۔

جابر سمجھ گئے کہ اسیران کربلا رہا ہو کر آئے ہیں جب امام زین العابدین کی نظر اپنے جد کے بوڑھے صحابی پر پڑی تو فرمایا

السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ انہوں نے کہا تم کون ہو فرمایا يَا جَابِرُ اَنَا عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ یہ سنتے ہی جابر بے تابانہ امام زین العابدین سے لپٹ گئے اور امام حسین کا پرسا دینے لگے فرمایا اے جابر کس کس کا پرسا دو گے۔ آہ ہمارا سب گھر تیغوں سے کٹ گیا۔ جوانوں میں میرے سوا کوئی باقی نہیں۔ جابر! بڑی بڑی مصیبتیں جھیل کر آئے ہیں۔ بعد شہادت حسین نبی زادیاں اسیر ہوئیں۔ ان کے سروں سے چادریں چھینی گئیں۔ ان کے بازوؤں میں رسیاں باندھی گئیں ان کو برہنہ پشت اونٹوں پر سوار کر کے بے کجاوہ و عماری کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے تا شام لے گئے ہمیں بازاروں میں تشہیر کیا گیا۔ ہمیں درباروں میں لے گئے۔ میرے پاؤں میں بیڑیاں تھیں ہاتھ میں ہتھکڑیاں اور گلے میں طوق خاردار، آہ بیماری کی حالت میں ظالموں نے مجھے پا پیادہ چلایا۔ میرے تلوؤں میں کانٹے چبھے۔ میری ساقیں ورم کر آئیں۔ مگر ان کو میری حالت پر رحم نہ آیا۔

آہ عالم غربت میں جب کوئی دوست نظر پڑتا ہے تو انسان کا دل بھر آتا ہے۔ پہلے واقعات یاد آتے ہیں جب جناب

زینبؑ نے جابر کو دیکھا تو سیّد سجاد سے فرمایا بیٹا علیؑ و فاطمہؑ کی ستم رسیدہ بیٹی زینبؑ کا جابر سے سلام کہو جابر دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے کاش میں مرگیا ہوتا کہ آل رسول کی روح فرسا داستان کو نہ سنتا۔

جابر نے پوچھا قمر بنی ہاشم ابوالفضل کی قبر کہاں ہے۔ امام نے فرمایا اے جابر ان کے شانے نہر کاٹے گئے وہیں حسینؑ کے اس فدائی نے اپنا دم توڑا۔ بابا جان ان کی لاش یہاں تک نہ لا سکے۔ وہ وہیں دفن ہیں۔ جابر نے کہا مجھے لے چلو میں اس قبر کا طواف بھی کر لوں۔ اس لحد کو بھی سینے سے لگا لوں۔ امام جابر کو لیے ہوئے فرات کے کنارے پہنچے وہاں دیکھا ایک دہقان مصروف کاشت ہے۔ جب قبر جناب عباس پر آواز گریہ سنی تو وہ قریب آیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگا۔ کہ ایک سال کا عرصہ ہوا کہ اس سرزمین پر میں نے ایسا ہولناک واقعہ دیکھا کہ عمر بھر نہ بھولوں گا۔ محرم کی دوسری تاریخ یہاں تھوڑے سے آدمیوں کا ایک قافلہ اترا تھا جس میں کچھ جوان تھے کچھ بوڑھے، کچھ بچے تھے، کچھ عورتیں تھیں۔ یکایک شاہی فوج نے ان کو گھیر لیا۔ اور ان کے خیمے اس دریا کے کنارے سے ہٹا دیئے گئے۔ ساتویں محرم سے ان غریبوں پر پانی بند ہوگیا دسویں محرم کی رات کو میں نے شب بھر ان خیموں سے آواز العطش سنی۔ تمام رات میں ان کی بے کسی پر روتا رہا صبح کو میدان کارزار گرم ہوا۔ اس چھوٹے سے لشکر نے تین دن کی بھوک پیاس میں وہ دلیرانہ جنگ کی کہ دشمن پر ہراس طاری ہوگیا۔ اس چھوٹی سی فوج کے کیسے کیسے خوبصورت جوان مارے گئے۔ ان کی نورانی صورتیں میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہیں۔ ایک جوان تو ہو بہو ہمارے پیغمبر سے مشابہ تھا۔ آہ ظالموں نے اسے نیزہ مار کر گھوڑے سے گرادیا۔ ایک بار دو بھائی چاند سے مکھڑے گھوڑوں پر سوار لڑتے لڑتے نہر تک آئے مگر پانی نہ پیا۔ آہ ظالموں نے ان کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جس قبر پر تم رو رہے ہو۔ یہ اس فوج کا علمدار تھا۔ جب وہ لڑنے کو آیا تو ایک سوکھی سی مشک بھی ان کے ساتھ تھی۔ میں نے اس کی جنگ دیکھی کیا کہنا اس بہادر کی تیغ آزمائی کا۔ تین دن کی بھوک پیاس میں ایسا لڑا کہ دشمن کی صفیں کی صفیں تلپٹ کر دیں۔ دشمنوں نے اس کے شانے قلم کیے۔ سر پہ گرز مارا اور وہ اسی جگہ بے دم ہوکر گر پڑا۔ پھر اس مختصر فوج کا سردار لڑنے کو نکلا۔ میں کیا بتاؤں کہ اس وقت خیموں میں کیسا کہرام بپا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بھرے گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔ یہ بادشاہ میدان میں جب آیا تو زخموں سے چور چور تھا۔ تمام لباس خون سے رنگا ہوا تھا۔ بڑی جرأت و ہمت سے اس بادشاہ نے دشمن کا مقابلہ کیا۔ لیکن آخر ہزاروں سے کہاں تک لڑتا۔ جب وہ گھوڑے سے گرا تو خیموں میں کہرام بپا ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بی بی با حال پریشان خیمے سے نکلی اور ٹیلہ پر آکر فریاد کرنے لگی مگر اس بیکس کی فریاد کو کون سنتا۔ دشمنوں نے اس بادشاہ کا سر نیزہ پر چڑھا دیا۔ پھر ظالموں نے بے کس عورتوں کو لوٹا خیموں میں آگ لگادی۔

امام زین العابدین نے رو رو کر فرمایا اے بھائی جس جوان کو سینے پر برچھی لگی وہ میرا بھائی علی اکبر شبیہ پیغمبر تھا جو دو بھائی ایک ساتھ نکلے تھے وہ میری پھوپھی کے بیٹے تھے۔ یہ قبر جس پر ہم رو رہے ہیں۔ میرے چچا عباس بن علی کی

ہے وہ بادشاہ دین و دنیا جو سب سے آخر میں شہید ہوئے میرے بابا حسین بن علی تھے۔ جو بی بی ان کی شہادت کے وقت خیمے سے نکلیں وہ میری پھوپھی زینب دختر فاطمہ زہرا تھیں۔ یہ سن کر اس دہقان کو تابِ ضبط نہ رہی سر و سینہ کوٹ کر کہنے لگا آہ مجھے خبر نہ تھی کہ یہ میرے رسول کا گھرانہ ہے۔ خدا لعنت کرے ان ظالموں پر۔ جنہوں نے اپنے رسول کی اولاد کو اس بے دردی سے ذبح کیا۔

الغرض تین روز تک اہل حرم کا قیام کربلا میں رہا۔

ماتم میں تین روز رہے شور و شین سے
روئے لپٹ لپٹ کر ضریح حسین سے

اس کے بعد کربلائے حسینؑ سے رخصت ہو کر جانب مدینہ روانہ ہوئے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

انتالیسویں مجلس

ایمان کی صورتیں

فضائل امیرالمومنینؑ وروداہلحرم مدینہ میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فِیْ كِتَابِهِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِهِ الْحَمِیْدِ

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (سورہ محمد ۷/۴۷)

(محمدؐ) اگر تم اللہ کی مدد کرو گے۔ تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور تمہارے قدم جما دے گا۔)

اس آیت میں خدا نے اپنی مدد کرنے کا حکم اپنے بندوں کو دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہم محتاج بندے کمزور بندے ایک قادر مطلق کی کیا مدد کر سکتے ہیں لیکن ضرور کوئی امر ایسا ہے کہ وہ ہماری مدد چاہتا ہے۔

جہاں تک دنیوی معاملات کا تعلق ہے اس کی مدد کا ہم سے کوئی تعلق ہی نہیں کیونکہ ہر ہر قدم پر ہم اس کی مدد کے محتاج ہیں۔ اس نے اپنی بے شمار نعمتیں ہم کو دی ہیں جن کا شکر ہم ادا نہیں کر سکتے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اس کی نعمتوں کا صحیح استعمال کریں تاکہ جو ہماری غرض خلقت ہو۔ وہ پوری ہو۔ اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ ہم اس کے احکام کو خلوص

کے ساتھ بجالائیں بغیر اس کے نہ ہمارے لیے دنیوی فلاح و بہبودی ہے نہ آخرت میں نجات۔
اسلام خدا کا دین ہے اس کے احکام ہماری تمام دینی و دنیاوی ضرورتوں پر جاری ہیں۔ پس جو اس کے دین کی حفاظت کرے گا۔ وہ خدا کی مدد کرنے والوں میں قرار پائے گا۔ جس کا فائدہ خود اسی کی طرف لوٹے گا۔ یعنی وہ ہر منزل جد و جہد میں ثابت قدم رکھے گا۔
دین میں سب سے پہلے چند چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔
اوّل خدا پر ایمان۔ دوسرے روزِ قیامت پر ایمان، تیسرے اس کے ملائکہ پر ایمان، چوتھے اس کی کتابوں پر ایمان۔ پانچویں اس کے نبیوں پر ایمان۔ بغیر ان پانچ پر ایمان لائے کوئی عمل قابل قبول ہوگا ہی نہیں کیونکہ ہر عمل کی صحت موقوف ہی ان پر ہے۔ ان پانچ چیزوں کو ہم ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔
اوّل ایمان باللہ۔ خدا کا وجود اور اس کی توحید کا صرف زبان سے اقرار کر لینا کافی نہیں۔ سورہ بقرہ میں فرماتا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ (سورہ البقرہ ۲/۸) کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لائے۔ درآں حالانکہ وہ مومن نہیں) دوسری جگہ فرماتا ہے قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا، قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ (سورہ الحجرات ۴۹/۱۴) بدو عرب کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اے رسولؐ تم کہہ دو تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو اسلام لائے ہیں اور ایمان تو تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔
اس سے معلوم ہوا کہ زبان سے اقرار کرنے والا دائرہ اسلام میں تو داخل ہو جاتا ہے لیکن ایمان کے دائرے سے الگ رہ جاتا ہے۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام زبان تک ہے اور ایمان کا تعلق قلوب سے ہے جب تک دل نہ مان لے۔ اس وقت تک ایمان باللہ کا اطلاق نہ ہوگا۔
عہدِ رسالت کی ایک خاص اصطلاح یہ تھی کہ تالیف قلب کے لیے ہر اس شخص کو جو دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے مومن کہلاتا ہے۔ حالانکہ ایمان بہت سے لوگوں سے کوسوں دور تھا۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا (اے ایمان والو ایمان لے آؤ) اس سے معلوم ہوا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا محض تالیف قلب کو کہا گیا ہے۔ جیسے کسی عربی مدرسہ میں نیچی جماعت کے طلباء کو بھی تالیف قلب کے لیے مولوی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہیں سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام اور ہے اور ایمان اور ہے اس راز کو نہ سمجھنے والے ہر مسلمان پر ایمانی احکام کو نافذ کر دیتے ہیں۔ اور اس کے مرتبے سے زیادہ اس کو سمجھنے لگتے ہیں۔ اور ان کی برائیاں بیان کی جاتی ہیں تو کہتے ہیں مومن کی عیب جوئی گناہ ہے۔ حالانکہ انہوں نے مومن کے معنی سمجھے ہی نہیں۔
جو شخص ایمان باللہ رکھتا ہے وہ خدا کی تمام ثبات ثبوتیہ اور سلبیہ کا بھی صدق دل سے قائل ہوتا ہے

اور اس کے احکام کی خلاف ورزی پر کسی حالت میں تیار نہیں ہوتا اور ایک بار غلطی ہو جاتی ہے تو اس کو دہراتا نہیں۔ اور اپنے پہلے عمل پر نادم ہوتا ہے۔ غور کیجئے جو شخص اس کا قائل ہے خدا موجود ہے اور ہر جگہ موجود ہے اپنے بندوں کے ایک ایک عمل کا دیکھنے والا بھی ہے اور اس کا بھی قائل ہے کہ وہ عادل ہے ہر گناہ کی سزا پر وہ قدرت بھی رکھتا ہے۔ تو پھر اس کو گناہ کرنے کی ہمت کیسے ہوتی ہے۔ ضرور یا تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا دیکھتا نہیں یا یہ کھتا ہے کہ وہ مواخذہ کرنے والا نہیں ان دونوں صورتوں میں اس کا ایمان ختم۔

پس جب تک احکام الہیٰ کی خلاف ورزی ہوتے رہے ایمان اس سے الگ رہے گا۔ ایمان کے جو بے شمار مدارج قرار دیئے گئے ہیں وہ اسی لحاظ سے ہیں کہ جتنے گناہ کسی سے ہوں گے اتنا ہی مرتبہ اس کا ایمان بھی کم ہوگا۔ دس گناہ کرنے والے کا مرتبہ اور ہوگا۔ بیس والے کا اور پچاس والے کا اور۔ لیکن جہاں گناہوں کا سلسلہ ختم ہو جائے گا وہاں ایمان کی مکمل صورت نظر آئے گی اور جہاں ترک اولیٰ تک کو کسی کے عمل میں راہ نہ ملے گی۔ اس کا مرتبہ کل ایمان کا ہوگا۔

اُمت محمدی کے اعمال پر ایک گہری نظر ڈالو تو کوئی ایک دامن بھی داغ دھبے سے خالی نہ آئے گا کسی پر کم دھبے ہوں گے کسی پر زیادہ کسی کے دامن پر پہلے پڑے ہوں گے۔ کسی کے دامن پر بعد میں۔ کوئی کفر میں رہ کر مجرم بنا ہوگا کوئی اسلام کے بعد صرف ایک گروہ آپ کو ایسا نظر آئے گا جس کے دامن عمل پر من المہد الی اللحد گناہ کا کوئی دھبہ تو کیا ہلکی سی چھینٹ بھی نظر نہ آئے گی اسی گروہ کا نام اہل بیت اور آل محمد ہے۔ اسی گروہ کے رأس رئیس کو جنگ خندق میں رسول اللہؐ نے کل ایمان فرمایا تھا بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّہٗ اِلَی الْکُفْرِ کُلِّہٖ یہ ہی وہ لوگ ہیں جن کی پاک دامنی کی گواہی آیہ تطہیر نے دی۔ یہی وہ گروہ ہے جس سے تمسک کو حدیث ثقلین میں گمراہی سے بچنے کا ذریعہ قرار دیا۔ یہ ہی وہ گروہ ہے جسے رسول اللہ نے سفینہ نجات فرمایا۔

اس گروہ نے کبھی حکم خدا کی خلاف ورزی کی ہی نہیں۔ یہ ایسے توحید پرست تھے کہ ان کی پیشانی کسی بت کے سامنے کبھی جھکی ہی نہیں اسی لیے ان کو کرم اللہ وجہہ کہا جاتا ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے کار خدا میں کبھی اپنے نفس کو دخل دیا ہی نہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے مقدس نفسوں کو خدا و رسولؐ نے اپنا نفس کہا۔

یاد رکھیئے ایمان باللہ کے بغیر نہ انسانی تمدن میں اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ معاشرتی آئین کی نگہداشت یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس عقیدہ کو سب سے مقدم رکھا ہے دوسرے ایمان لانا روز آخرت پر ضروری ہے۔

قیامت کا مسئلہ ہر زمانہ میں عقل انسانی کے لیے امتحان بنا رہا ہے۔ ایک گروہ جو تناسخ کے چکر میں پھنسا ہے۔ قیامت کی ضرورت ہی نہیں سمجھا ایک گروہ اس لیے منکر ہے کہ اس کی سمجھ میں یہ مسئلہ نہیں آتا کہ مرنے کے بعد لوگ

زندہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ اور بوسیدہ ہڈیوں میں جان کیسے پڑ سکتی ہے۔ ایک گروہ اہل کتاب کا یہ سمجھتا ہے کہ ہم اللہ کے احباب اور اولاد سے ہیں۔ ہمیں اوّل تو عذاب ہوگا ہی نہیں اور اگر ہوگا بھی تو چند روز نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ (سورہ المائدہ ۵/۱۸) لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً (سورہ البقرہ ۲/۸۰) ایک گروہ کہتا ہے۔ مسیح سب کے گناہوں کے بدلے سولی چڑھ گئے ہیں۔ لہذا اب ان کی امت سے حساب و کتاب کا سوال ہی نہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے۔ قیامت میں اجسام عرصہ محشر میں حاضر نہ ہوں گے بلکہ ارواح ہوں گی۔ ایک گروہ کہتا ہے۔ یہی وجود مادی پھر زندہ ہوگا اور اس سے حساب و کتاب ہوگا اور نیکوں کو جنت میں جگہ ملے گی اور بدوں کو جہنم میں جھونکا جائے گا۔

مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے لیکن عملاً دیکھا جائے گا تو بہت لوگ اس عقیدہ پر ثابت قدم نظر آئیں گے۔ اگر پرسش احوال کا ڈر ہے اور فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ (سورہ الزلزال ۹۹/۷) پر ایمان ہے تو پھر انسان اس دن کی تیاری کیوں نہیں کرتا۔ وہ اعمال بد سے گریز کیوں نہیں کرتا۔ وہ اس روز خدا کے بدلہ لینے اور ہر مظلوم کی دادرسی کرنے کا یقین کیوں رکھتا۔ اور اگر یقین رکھتا ہے تو ظالم کسی پر ظلم کیوں کرتا ہے۔

اس منزل میں بھی اہل بیت کا قدم سب سے آگے ہے۔ انہوں نے ہزار ہا ظلم سہے مگر اس یقین کامل کے ساتھ روز قیامت ان کے ظالموں سے بدلہ لیا جائے گا اور ان کی مظلومیت بے دادرسی کے نہ رہے گی دنیا میں جو تکالیف اعمال خیر بجالانے میں اٹھائی جاتی ہیں۔ ان کا بدلہ ضرور ملے گا۔ وہ اپنے ظالموں سے برابر یہی کہتے رہے کہ ایک روز آنے والا ہے کہ تم سے اس ظلم و ستم کی باز پرس ہوگی۔ یہ ہی ان کے قیامت پر پورا پورا یقین رکھنے کی دلیل قوی ہے۔ ان کے دل میں کبھی شک نے راہ نہیں پائی۔

تیسرا عقیدہ ملائکہ پر ایمان لانے کا ہے۔

مسلمانوں میں ایک گروہ اس عقیدہ کا ہے کہ ملائکہ کا خارج میں کوئی وجود ہی نہیں۔ بلکہ انسان کی نیک قوتوں کا نام ملائکہ ہے اور بد قوتوں کا نام شیطان ہے۔ سر سید احمد خان اسی عقیدے کے آدمی تھے۔ قرآن میں جابجا ملائکہ کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جداگانہ مخلوق ہے۔

چوتھے اللہ کی کتابوں پر ایمان لانا واجب ہے۔ توریت، انجیل، زبور، قرآن اور تمام صحف انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مسلمانوں میں صرف ایک ذات امیرالمومنین علیہ السلام کی ایسی تھی جس کے سینے میں تمام کتب آسمانی کا علم تھا۔

آپ نے بر سر منبر فرمایا تھا اگر مسندِ حکومت میرے لیے بچھادی جائے تو میں اہل توریت کے درمیان توریت

سے حکم کروں گا اور اہل زبور کے درمیان زبور سے اور اہل انجیل کے درمیان انجیل سے اور اہل قرآن کے درمیان قرآن سے۔ یہاں تک کہ ہر کتاب اپنی زبان سے بول اُٹھے گی کہ علی نے میرے بارے میں وہی حکم دیا ہے۔ جو خدا کا حکم ہے۔

اسی سے ہم کہتے ہیں کہ علیؑ کا علم وہبی تھا۔ وہ خدا کے یہاں سے ان سب کتابوں کا علم لے کر آئے تھے۔ اگر عیسیٰؑ وقتِ پیدائش یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ قف اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا (سورہ مریم ۱۹/۳۰) (میں اللہ کا بندہ ہوں اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔) تو علیؑ جن کا مرتبہ عیسیٰ سے زیادہ ہے کیوں نہیں تمام کتابوں کے عالم ہو سکتے ہیں۔ علیؑ اور عیسیٰؑ کے فرق کو بھی یہاں سمجھ لیجئے۔

عیسیٰ وہ ہیں جو مہدی آخر الزمان کے پیچھے نماز پڑھیں گے لیعنی ان کا سر امام مہدی کے قدموں میں ہوگا۔ اور امام مہدی وہ ہیں جن کا سر امام حسن عسکری کے قدموں میں رہا۔ اور امام حسن عسکری کا سر امام علی نقی کے قدموں میں اور ان کا سر امام محمد تقی کے قدموں میں اور ان کا سر امام رضا علیہ السلام کے قدموں میں اور ان کا سر امام موسیٰ کاظم کے قدموں میں اور ان کا سر امام جعفر صادقؑ کے قدموں میں اور ان کا سر امام محمد باقر کے قدموں میں اور ان کا سر امام زین العابدین کے قدموں میں اور ان کا سر امام حسینؑ کے قدموں میں اور ان کا سر علی علیہ السلام کے قدموں میں پس یہاں گیارہ امام ایک شخص کے قدموں کے پیچھے ہوئے اس کا کتنا بڑا مرتبہ ہوگا۔

عیسیٰ کا کیا مقابلہ علی علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام کو جو شرف ملا صرف ماں کی طرف سے اور علی کو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے عیسیٰ کی والدہ وقت ولادت عیسیٰ بیت المقدس سے نکالی گئیں اور علی علیہ السلام کی والدہ کے لیے دیوار کعبہ شق ہوئی اور وہ باہر سے اندر لائی گئیں۔ عیسیٰؑ کی نسل مفقود اور علی کی نسل سے ایک دو نہیں گیارہ امام ہوئے جن کا سلسلہ قیامت تک چلے گا۔ پس اگر عیسیٰؑ کو علم کتاب پیدائش سے قبل ہو سکتا ہے تو علی علیہ السلام کو کتبِ سماوی کا علم پیدائش سے پہلے کیوں نہیں ہو سکتا۔

علیؑ وہ ہیں جن کی شان میں ہے

وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (سورہ الرعد ۱۳/۴۳)

تو جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہو تو اس سے زیادہ کتاب خدا پر ایمان رکھنے والا کون ہو سکتا ہے۔ جب تک ماہیت کتاب اور مضامین کتاب پر کوئی پوری واقفیت کتاب نہ رکھتا ہو اس کا ایمان بالکتاب ناقص ہی سمجھا جائے گا۔ کتابوں پر کمال ایمان کا شرف صرف محمدؐ آل محمدؐ کو حاصل تھا۔

پانچوں نبیوں پر ایمان لانا بھی واجب ہے۔ عام لوگوں کی تکلیف تو صرف اتنی ہی ہے کہ آدم سے لے کر خاتم الانبیاء تک جتنے نبی گزرے ہیں ان کی نبوت کا اقرار کر لینا۔ لیکن انبیاء پر ایمان لانے کا اصلی مقصد تو یہ ہے کہ ان کو خدا کا فرستادہ سمجھ کر جو صفات ان کے اندر تھیں وہ اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ مقصد ایمان حاصل ہو۔ بالخصوص حضرتِ رسولؐ خدا کی سیرتِ مبارکہ کو اپنانا۔ لیکن یہ مکمل تصویر سوائے اہل بیت رسولؐ دوسرے آئینوں میں نظر نہیں آتی۔ انبیائے سابقین کی نمایاں خصوصیات کی آئینہ داری علی بن ابی طالب علیہ السلام نے کی۔ اور اس طرح کہ ان میں جو صفات مخفی تھیں۔ وہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کے چہرے سے پھوٹ نکلیں۔ رسولؐ خدا نے فرمایا کہ جو شخص چاہتا ہے کہ آدم کو صفوت میں نوحؑ کو خضوع میں، ابراہیم کو خلّت میں، موسیٰ کو ہیبت میں اور عیسیٰؑ کو زہد میں دیکھے تو وہ علیؑ کے چہرے پر نظر کرے۔ مقصد یہی تھا کہ ان کا چہرہ دیکھ کر ایک نظر باز انسان یہ پتہ چلا سکتا ہے کہ وہ صفاتِ انبیاء ان کے اندر بدرجہ کمال موجود ہیں۔

اب رہے سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفےٰ تو ان کی صفات حسنہ کا مکمل نمونہ علی علیہ السلام تھے۔ ورنہ نفس رسولؐ نہ بنتے۔ حضورؐ نبی اکرم کے تمام کمالات ذات علی بن ابی طالب میں تھے اور کیوں نہ ہوتے جب کہ دونوں ایک ہی نور کے دو پیکر تھے۔ ایک ہی درخت کی دو شاخیں تھے ایک ہی نفس کے دو جلوے تھے۔

اب رہا رسولؐ پر ایمان تو علیؑ سے زیادہ خدا اور رسول پر ایمان رکھنے والا دوسرا کون تھا۔ انہوں نے نہ آن واحد کے لیے شرک باللہ کیا، اور نہ ایک سیکنڈ کے لیے ایمان بالرسوؐل میں کوئی جھول پیدا ہوا۔ اگر کافر سے مسلمان ہوئے ہوتے تو دامنِ ایمان میں جھریاں پڑی ہوئی ہوتیں۔ سابقہ زندگی کا غلیظ دُھواں ضرور اسلام کے دامنوں پر اُڑ اُڑ کر آتا اور کہیں نہ کہیں بغیر داغ ڈالے نہ رہتا۔ بڑے چھوٹے شک پیدا ہوتے ہی رہے لیکن علی علیہ السلام تو پیدا ہی مسلمان ہوئے تھے نہ انہوں نے کفر کی فضا میں سانس لیا تھا اور نہ ان کے ماں باپ نے ایسی صورت میں کفران کے دامنِ دل کو کھینچتا کیسے اور شیطان ان کو بہکانے میں کامیاب کیسے ہوتا۔ جنگ اُحد میں جب مسلمان سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ حضرت رسولؐ خدا نے پوچھا۔ یا علیؑ تم کیوں نہ سب کے ساتھ بھاگے فرمایا لَا كُفْرَ بَعْدَ الْاِيْمَانِ یعنی ایمان کے بعد کفر کیسا۔ یہ تھا ایمان علی نبوت سے متعلق۔

اگر ایمان بالنبی میں ذرا سا بھی بغض ہوتا تو علی حمایت رسولؐ میں نہ تو بار بار اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے تو نہ ہر قول رسولؐ پر آمنا و صدقنا کہتے۔ یہ کمال ایمان ہی کی دلیل تھی کہ رسولؐ کو علیؑ سے زیادہ کسی پر اعتماد نہ تھا وہ جلوت و خلوت میں ہمیشہ علیؑ کو اپنے ساتھ رکھتے۔

رسولؐ اللہ نے ہر مسلمان کے ایمان کو اچھی طرح جانچ لیا تھا۔ چنانچہ جب آپ نے مہاجرین و انصار کے درمیان اخوت قائم کی۔ تو ہر مہاجر کو جس انصار سے ملایا وہ سیرت میں ایک دوسرے ملتے جلتے تھے۔ اس موقع پر علی علیہ السلام کو اپنے لیے مخصوص کیا اور فرمایا یَا عَلِیُّ اَنْتَ اَخِیْ وَ وَارِثِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ اگر ایمان میں جھول ہوتا تو ہرگز یہ خصوصیت علی علیہ السلام کو نہ فرماتے۔

خدا اور رسولؐ پر یہ وہ پختہ ایمان رکھنے والے لوگ تھے کہ زندگی کے ہر موڑ پر انقلاب روزگار کے کسی چکّہ میں مصائب و آلام کے کسی ہجوم میں ان کے ایمان کے اندر ضعف نہیں پیدا ہوا۔ واقعہ کربلا اس کا بہترین ثبوت ہے۔ اگر کربلا والوں کے ایمان میں ذرا سا جھول بھی پیدا ہوتا تو ہرگز اپنی جانیں اس جوش اور ولولہ کے ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ اگر شہیدوں کے متعلق خدا و رسولؐ کے وعدوں راہ خدا میں مرنے کے دوسرے اور ظالموں کو آخرت میں سزا دیے جانے اور مظلومیت کے درجے تقرب حاصل کرنے پر ان کا ایمان نہ ہوتا تو شوق شہادت میں ایک دوسرے پر سبقت نہ کرتا۔ کربلا والے کر گئے جو کچھ کرنا تھا۔ لیکن ان کے مشن کی بقا اور ان کے اصول حیات کو اہل عالم سے روشناس کرانے میں کمال ایمان کا مظاہرہ جیسا علی بن الحسین علیہ السلام نے کیا۔ اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی وہ ظالموں کے ہاتھوں میں انتہائی بے کسی کے عالم میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔ مگر اپنے ایمان پر جمے ہوئے تھے۔ اپنے اصول حیات سے بال برابر ہٹنا گوارا نہ کرتے تھے۔ اگر خدانخواستہ ایمان میں ضعف ہوتا۔ تو یقیناً اپنے موقف سے ہٹ جاتے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کی یہ خصوصیت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جہاد کا ایک نیا طریقہ انہوں نے دنیا میں جاری کیا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

زین العبا جہاد کا عنواں بدل گیا جانبازیاں وہی رہیں میداں بدل گیا

اب تک جہاد بالسیف ہوتے رہے۔ دشمنان دین کا خون تلواروں سے بہایا گیا۔ لیکن امام زین العابدین کے عہد سے ہمارے آئمہ نے بجائے تلوار کے جہاد کے جہاد بالنفس شروع کیا۔ اس کا آغاز امام زین العابدینؑ سے ہوا اور ایک اعتبار سے یہ جہاد، جہاد بالسیف سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔

کربلا سے کوفہ تک، اور کوفہ سے شام تک امام زین العابدین علیہ السلام اور اُمّ المصائب جناب زینب صلواۃ اللہ علیہا نے جابجا جو دردناک خطبے بیان کیے انہوں نے اسلامی سلطنت کے ہر گوشہ میں آگ لگادی اور یزید پر

ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ شروع ہوگئی جہاد کے اس عنوان میں تبدیلی سے ایک خاص اثر یہ پیدا ہوا کہ لوگ خاموش مقابلے کی طاقت سے واقف ہوگئے اور صبر وضبط کے بل بوتے پر کامیابی کا طریقہ سمجھ میں آگیا۔
اس میں شک نہیں کہ مصائب و آلام کی کڑی منزلیں امام زین العابدین علیہ السلام کی قیادت میں اہل حرم نے جھیلیں۔ وہ انہی کا کام تھا۔ دوسرا ہوتا تو گھبرا کر حکومت کے قدموں میں گر پڑتا۔
مگر آل رسول کے ثباتِ قدم میں کسی منزل پر بال برابر فرق نہ آیا۔ ایک مدّتِ دراز تک دشمن کے قبضہ میں رہنا اور ہر ہر سانس پر روح فرسا مصائب کا سامنا کرنا ان ہی کا کام تھا۔ امام زین العابدین کے ایک شعر سے صرف شہر دمشق کے مصائب کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اُقَادُ ذَلِیلًا فِیْ دِمِشْقَ کَاَنَّنِیْ مِنَ الذنج عَبْدٌ غَابَ عَنْہُ النَصِیْرُ

میں دمشق میں اس طرح ذلّت کے ساتھ کھینچا کھینچا پھرا گویا ایک لاوارث زنگی غلام ہوں۔
بیمارِ کربلا نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ باوجودیکہ ہم اسلام کے شاہی خاندان سے تھے۔ باوجودیکہ رسولؐ کا خون ہماری رگوں میں موجود تھا مگر اس پر بھی ظالموں نے طرح طرح ذلیل کیا۔
جب مدینہ کا یہ عزیز ترین قافلہ جب قیدِ یزید سے رہا ہوکر مدینہ کی طرف لوٹا تو اپنا پہلا وقار یاد آیا۔ چنانچہ منقول ہے کہ جب اہل حرم کا قافلہ بشیر بن جذلم کی حفاظت میں قریبِ مدینہ پہنچا اور در و دیوار مدینہ نظر آئے تو جناب اُم کلثوم کو اپنا پہلا زمانہ یاد آیا۔ اپنے خاندان کی عظمت جوانانِ بنی ہاشمی و علوی کی آن بان کا تصور بندھا تو یہ اشعار بے ساختہ زبان پر آئے۔

مَدِیْنَۃُ جَدِّنَا لَا تَقْبَلِیْنَا فَبِالْحَسَرَاتِ وَالْاَحْزَانِ جِئْنَا
خَرَجْنَا مِنْکِ بِالْاَھْلِیْنَا جَمْعًا رَجَعْنَا لَا رِجَالَ وَلَا بَنِیْنَا

اے نانا کے مدینے ہم تجھ میں آنے کے قابل نہ رہے کیونکہ ہم حسرت واندوہ کے مارے ہوئے آئے ہیں۔ جب یہاں سے چلے تھے تو بھرا کنبہ ساتھ تھا اور اب اس طرح واپس ہورہے ہیں کہ نہ کوئی مردوں میں باقی ہے نہ اولاد میں۔
ہیں تو یہ دو شعر لیکن غور کرو تو بیکسی و بے لبسی، تباہی و بربادی کا وہ دردناک مرقع ہے کہ سننے والوں کے دل ماہی بے آب کی طرح تڑپ اُٹھتے ہیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا اُبل پڑتا ہے۔ روضہ رسول، مزار فاطمہ زہرا اور قبر امام حسنؑ تک جب یہ آواز پہنچی ہوگی تو قبریں لرز گئی ہوں گی۔
بیرون مدینہ اس لٹے ہوئے قافلہ کے خیام نصب ہوئے امام زین العابدینؑ نے بشیر کو بُلا کر فرمایا ہمارے آنے کی خبر

اہل مدینہ کو پہنچا دے۔ ہر جگہ ایک ایک بار یہ ندا دینا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَاۤءِ لیکن جب محلہ بنی ہاشم میں داخل ہو تو چند بار با آواز بلند کہنا اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَاۤءِ اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَاۤءِ بشیر وہاں سے شہر میں آیا اور جب روضہ رسولؐ پر آیا تو با آواز بلند یہ شعر پڑھا ؎

یَا اَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَکُمْ بِهَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ فَاَدْمُعِیْ مِدْرَارَا

اس آواز کے سنتے ہی ہر طرف سے زن و مرد باحال پریشان نکل پڑے اور بشیر کے گرد جمع ہو کر پوچھنے لگے۔ کیا حسینؑ ابن علیؑ فرزند رسولؐ الثقلین قتل کر دیئے گئے اور ان کے ساتھ جو بی بیاں اور بچے گئے تھے وہ کہاں ہیں اس نے کہا بیرونِ شہر مدینہ خیمہ زن ہیں۔ بشیر کی اس آواز نے مدینہ میں ہل چل مچادی۔ لوگ زار زار رو رہے تھے اور بی بیاں سر پیٹ رہی تھیں۔ جب بشیر یہ ندا کرتا ہوا محلہ بنی ہاشم میں پہنچا تو کئی بار یہ صدا بلند کی قتل الحسین بکربلا۔ فاطمہ صغرا نے جب یہ آواز سنی تو بے تابانہ دوڑتی ہوئی دروازہ پر آئیں۔ اور دریافت کرنے لگیں کیا میرے بابا شہید کر دیئے گئے اور ہمارا کنبہ کہاں ہے۔ اس نے کہا بیرون مدینہ رکے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر وہ روتی ہوئی گھر میں آئیں جناب محمد حنفیہ سو رہے تھے۔ شانہ پکڑ کر ہلایا۔ چچا جان آپ کیا سو رہے ہیں۔ ذرا باہر نکل کر سنیئے تو یہ ایک شخص کہہ رہا ہے۔ قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَاۤءِ ہائے چچا میں یتیم ہو گئی۔ محمد حنفیہ یہ سن کر مضطربانہ حالت میں باہر نکلے اور بشیر سے حالات سن کر روتے ہوئے گھر میں آئے اور فاطمہ صغرا کو لے کر کنبہ سے ملنے چلے۔ جب قریب پہنچے تو کالے کالے نشان نظر آئے فَلَمَّا رَاٰی اَعْلَامًا اَسْوَدَ فَخَرَّ مَغْشِیًّا عَلَیْهِ جب کالے کالے جھنڈے دیکھے تو غش کھا کر گر پڑے۔ ہوش میں آئے تو پھر چلے۔ جب امام زین العابدینؑ نے محمد حنفیہ کو آتے دیکھا تو روتے ہوئے آگے بڑھے سلام کیا۔ محمد نے دوڑ کر سینے سے لپٹا لیا۔ حضرت نے فرمایا اے چچا مجھے زور سے مت دبایئے۔ پوچھا کیوں۔ بیمار کربلا نے عبا کا تکمہ کھول کر دکھایا تو طوق خاردار نے سینے پر ناسور ڈال دیا تھا۔ فرمایا چچا جان ظالموں نے مجھے ہتھکڑیاں لگا بیڑیوں میں جکڑا۔ آہنی خاردار طوق میرے گلے میں ڈال دیا محمد حنفیہ نے کہا میرے بھائی عباسؑ کہاں ہیں۔

فرمایا وہ دریا کے کنارے شہید کئے گئے۔

پوچھا۔ علی اکبر و قاسم اور عون و محمد کہاں ہیں؟

فرمایا کس کس کو پوچھو گے۔ کربلا میں ہمارا ایک ایک جوان گوسفندان قربانی کی طرح تین روز کا بھوکا پیاسا قتل کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ شش ماہہ علی اصغر بھی تیر ستم کا نشانہ بنا دیا گیا لاشوں کو پامال کیا گیا ہماری بیبیوں کو لوٹا گیا خیموں میں آگ لگائی گئی ہمیں قید کر کے کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے گئے۔

جب بھائیوں کی ترسی بہن کو پتہ چلا کہ محمد حنفیہ آئے ہیں تو رو رو کر کہا بھیا محمد کیا اس کنبہ موئی بہن کو اٹھارہ بنی

ہاشم کا اور بہتر شہیدوں کا پرسا نہ دو گے۔ محمد حنفیہ رو پڑے۔ بہن کے گلے میں بانہیں ڈال کر بے تحاشا رو ئے اور فرمانے لگے آہ یہ تمہاری صورتوں میں کیسا تغیر ہو گیا کہ پہچان میں نہیں آتیں۔ جناب زینبؑ نے فرمایا بھیا کیا کیا مصیبتیں بیان کروں جو جو مصائب ہم پر پڑے اگر پہاڑوں پر پڑتے تو پگھل کر پانی کی طرح بہہ جاتے۔

فاطمہ صغرا جب پہنچیں تو ایک ایک بی بی سے گلے مل مل کر روتی تھیں اور ایک ایک کا حال پوچھتی تھیں۔ ساتھ ہی ہر بی بی کی گود پر ایک متجسسانہ نظر بھی ڈالتی جاتی تھیں۔ جناب زینبؑ نے پوچھا بیٹی کیا دیکھتی ہو عرض کی میں اپنے ننھے منے بھیا علی اصغر کو تلاش کر رہی ہوں۔ فرمایا بیٹی علی اصغر کہاں ہیں جن سے تم ملو۔ وہ تو کربلا میں تیر ستم کا نشانہ بنا دیئے گئے۔ الغرض یہ وقت قیامت کا تھا۔ خیموں میں کہرام بپا تھا۔

وَا محمدّاہ وَا علیاہُ وَا حسیناہُ واعباساہ واکبراہ

کے نعروں سے زمین و آسمان ہل رہے تھے۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

چالیسویں مجلس

شانِ رسالت و امامت

اہلِ حرم کا مدینہ میں داخلہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ③ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ④ (سورہ النجم ۴/۵۳)

رسول اپنی خواہش نفسانی سے کلام نہیں کرتا مگر وہی جو اس پر وحی ہو۔

وحی ہی وہ خصوصیت ہے جس نے رسول کو عام سطح انسانی سے اتنا بلند کر دیا ہے کہ عقول انسانی اس امتیاز خصوصی کے ادراک سے قاصر ہیں قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (سورہ الکہف ۱۱۰/۱۸) (کہہ دو اے رسول کہ میں بھی تم ہی جیسا انسان ہوں) نے بہت سے لوگوں کو اس دھوکہ میں ڈال رکھا ہے کہ رسول بھی ہم ہی جیسے انسان تھے بلحاظ تقدس نفس اور پاکیزگی صورت ہونے کے عام انسانوں کے ان کا درجہ بلند تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے حقیقت رسالت کو سمجھا ہی نہیں بیشک وہ صورت بیں بشری صورت میں تھے۔ بے شک وہ چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے تھے انسانی ضروریات کا تعلق ان سے بھی تھا لیکن ان کی اور عام انسانوں کی خصوصیات کی خصوصیات میں زمین و آسمان کا فرق تھا ان کے اندر وہ روح نبوتی کارفرما تھی جو منزل قرار پائی۔ جواہرات بھی پتھر ہیں لیکن عام پتھروں سے ان کو کیا نسبت' اکسیر بھی خاک ہے لیکن اس کو معمولی خاک سے کیا نسبت۔ رسالت کمالاتِ انسانی کا ایک ایمان افروز مرقع ہوتا ہے۔ رسول خواہش نفسانی سے کلام کرتے ہی نہ تھے' اس

آیت کا مفہوم سمجھنے میں لوگوں نے سخت غلطی کی ہے لیعنی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول جو کچھ بولتے تھے اور جو کچھ کرتے تھے اس کے لیے ہر آن محتاج وحی ہوتے تھے اس غلط فہمی کی بناء پر بعض لوگوں کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ رسولؐ نے بہت سے کام خلافِ وحی کیے۔ مثلاً بعض ایسی ازدواج سے ان کو شادی نہ کرنا چاہیے تھی۔ جس کی مذمت خدا نے کی یا ایسے لوگوں کی گردن مار دینی چاہیے تھی۔ جن سے مفادِ اسلامی کو نقصان پہنچتا تھا۔ ایسے اعتراضات عدم تدبر کا نتیجہ ہیں حضورؐ بے شک پابندِ وحی تھے۔ جو کچھ احکام قرآن میں نازل ہو چکے تھے۔ آپ ہمیشہ ان ہی کے مطابق کام کرتے تھے۔ جن ازدواج سے شادی کی شرعاً ان سے شادی ممنوع نہ تھی۔ لہذا شادی کرنا مطابق حکم قرآنی تھا۔ رہا یہ امر کہ بعد میں ان ازدواج سے کیا ظہور میں آیا۔ اس کی سزا قبل از وقت تو شرعاً نہیں دی جا سکتی۔ ارتکابِ فعل کے بعد قرآن نے ان کی مذمت کر دی اور روزِ قیامت خدا ان سے مواخذہ کرے گا کسی کو قتل بھی اثباتِ جرم کے بعد کیا جا سکتا ہے قبل نہیں شریعت ظاہر پر حکم کرتی ہے جب کوئی شخص مسلمان ہو گیا تو اب اس کا قتل کرنا پہلے جرم کی سزا میں کیوں کر جائز ہوگا۔ بعد میں وہ جو کچھ کرے گا اس کی سزا بعد میں ہوگی بہت سے شرعی مصالح بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی بنا پر کسی کے در پردہ عیب کی گرفت نہیں کی جاتی۔

ہر رسول صاحبِ وحی ہوتا ہے اور وحی تین طریقے سے ہوتی ہے۔ اول پس پردہ سے آواز آنا۔ دوسرے خواب میں مطلع کرنا۔ تیسرے فرشتے کا سامنے آکر بیان کرنا۔ حضورؐ سرورِ انبیاءؑ کے لیے یہ تینوں صورتیں تھیں۔

وحی ذریعہ علم نبی ہے۔ اس سے عام لوگوں سے اسے امتیاز حاصل ہوتا ہے اور یہی چیز ہے جو اس کو اہل دنیا سے کسبِ علم کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے علم کا تعلق براہِ راست خدا سے ہوتا ہے۔ نبی کا علم علم لدنی کہلاتا ہے۔ اس علم میں کبھی خطا واقع نہیں ہوتی۔

انبیاء میں جو درجات قائم ہوتے ہیں۔ وہ اسی علم کی بناء پر ہیں۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (سورہ البقرہ ۲/۲۵۳) جس رسول کی ہدایت کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا ہے۔ اسی کے لحاظ سے اس کو علم دیا جاتا ہے۔ چونکہ سرکار دو عالمؐ کی ہدایت کا تعلق کافۃ الناس سے تھا اور آپؐ کی رسالت کا سلسلہ قیامت تک چلنے والا تھا لہذا تمام انبیاء سے زیادہ آپ کو علم دیا گیا۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (سورہ النساء ۴/۱۱۳) اے رسول جو بھی تم نہ جانتے تھے وہ سب تم کو بتا دیا گیا۔ اور یہ علم آپ کو اس کتاب کے ذریعے سے حاصل ہوا جس کی صفت یہ بیان کی گئی ہے تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (سورہ النحل ۱۶/۸۹) ہر شے کا اس میں بیان ہے اور وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (سورہ الانعام ۶/۵۹) اس کتاب مبین میں ہر خشک و تر ہے۔

چونکہ آپ کی رسالت کا سلسلہ قیامت تک چلنے والا تھا۔ لہذا اس بات کی ضرورت تھی کہ آپ کے بعد جو لوگ آپ کی شریعت کے محافظ ہوں ان کا علم بھی وہبی ہو اور اس کتاب کا پورا پورا علم ان کو ہو جو آنحضرتؐ پر نازل ہوئی کیونکہ یہ کتاب جس میں ہر شے کا بیان ہے قیامت تک چلنے والی ہے لہذا جو اس کا محافظ اور خدا اور رسولؐ کا معین کردہ ہادیٔ امت

ہو لازم ہے کہ اس کے سینے میں بھی اس کتاب کا پورا پورا علم ہو حضورؐ کے بعد سوائے حضرت علیؑ کے اصحاب رسولؐ میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا۔ جو اس کا مدعی ہو کہ میں پوری کتاب کا عالم ہوں۔

اس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ سوائے حضرت علیؑ کے کسی نے بر سر منبر یہ دعویٰ نہیں کیا کہ سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ یہی ایک چیز علاوہ دیگر فضائل کے ہمارے اس دعوے کو ثابت کرتی ہے کہ حضرت علیؑ تمام صحابہ سے افضل تھے بلکہ بلا خوف تردید میں کہتا ہوں کہ صحابہ کا ذکر کیا آنحضرتؐ سے سوا تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل تھے۔ اگر یہ مسلّم ہے کہ سرکار دو عالمؐ تمام انبیاء سے افضل تھے۔ تو علیؑ بھی افضل تھے۔ آیۂ مباہلہ میں لفظ انفسنا کا مصداق جب امیر المومنین مسلمہ فریقین ہیں تو جو خصوصیت نفس نبی میں ہے وہ نفس علی میں ہونی ضروری ہے۔ ورنہ نفسِ نبی ہونا ان پر صادق نہ آئے گا۔

کسی کا یہ کہنا کہ نبی غیر نبی سے افضل ہوتا ہے پس علیؑ چونکہ نبی نہ تھے لہذا وہ انبیاء سے افضل نہیں ہوسکتے اس کا جواب یہ ہے کہ افضلیت کا دارومدار علم پر ہے اور چونکہ حضرت علیؑ اعلم تھے۔ اور تمام کتب سماوی کا علم رکھتے تھے لہذا ان کا افضل ہونا محلِ تعجب نہیں۔ انہوں نے اس رسول کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی تھی جو تمام رسولوں سے افضل و برتر تھے۔ اور رسولؐ نے ان کو اس طرح تعلیم دی تھی کہ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے اِذَا سَاَلْتُهٗ فَاَنْبَاَنِیْ وَاِذَا سَکَتُّ فَابْتَدَاَنِیْ۔ جب میں نے کوئی بات پوچھی تو حضرت نے بتائی اور جب میں چپ ہوا تو تعلیم کی ابتدا حضورؐ نے اپنی طرف سے کی۔ ایسی صورت میں کون سی چیز تعلیم سے رہ سکتی ہے کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی صورت تعلیم کی ہوسکتی ہے کہ بیک وقت ایک ہزار باب علم کے تعلیم کر دیئے جائیں اور کیا سیکھنے والے ہیں اس سے بھی زیادہ تعلیم کی صورت ذہن میں آسکتی ہے کہ ہر باب سے ایک ایک ہزار باب علم کے اور منکشف ہو جائیں۔ کیا انبیاء سابقین کے علم کے متعلق تاریخ اسلام میں کوئی اور بھی ایسی روایت ملتی ہے۔ کیا ایسا شخص جس کی شان میں مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ ہو کسی علم سے بے خبر ہوسکتا ہے تو پھر کتاب الٰہی کا کمال مشکوک نظروں سے دیکھا جائے گا۔

آدمؑ کو فرشتوں پر فضیلت صرف علم ہی سے تو حاصل ہوئی تھی۔ پس اگر علم وجہ فضیلت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ علی انبیائے سابقین سے افضل نہ ہوں۔ اگر صرف نبوت وجہ فضیلت نہ ہوتی تو ملائکہ کے استدلال کے مقابل علمِ آدم کو لایا ہی نہ جاتا۔ اگر نبوت ہی وجہ فضیلت ہو تو پھر تمام انبیاء کو مساوی درجہ میں ہونا چاہیے۔

کیا علیؑ کے سوا کسی اور نے بھی قبل و بعد یہ دعویٰ کیا کہ سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ کیا کسی نبی نے کسی رسول نے یہ کہا ہے کہ میں تمام آسمانی کتابوں کا عالم ہوں۔ ہر رسول اپنی ہی کتاب کا عالم ہوتا تھا۔ برخلاف اس کے علیؑ نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا کہ اگر مسندِ حکومت میرے لیے بچھا دی جائے تو میں اہل توریت کے

درمیان توریت سے اہل زبور کے درمیان زبور سے اور اہل انجیل کے درمیان انجیل سے۔ اور اہل قرآن کے درمیان قرآن سے حکم کروں گا۔ اور صحیح حکم کہ ہر کتاب اپنے منہ سے بول اٹھے گی کہ علیؑ نے ہمارے بارے میں وہی حکم کیا ہے جو خدا کا حکم ہے۔

کیا کسی نبی نے پیدا ہوتے ہی تمام آسمانی کتابوں کو سنایا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو حضرت علیؑ ان سے ضرور افضل ہوئے۔

ینابیع المودۃ میں ہے کہ تمام اسرارِ سماویہ قرآن میں موجود ہیں اور تمام علوم قرآن سورۂ فاتحہ میں ہے اور جو کچھ سورہ فاتحہ میں ہے وہ بسم اللہ میں ہے اور جو بسم اللہ میں ہے وہ بائے بسم اللہ میں ہے اور جو بائے بسم اللہ میں ہے وہ نقطہ بائے بسم اللہ میں ہے۔ اور حضرت علیؑ نے فرمایا ہے وہ نقطہ میں ہوں لہٰذا تمام علوم قرآن حضرت علیؑ کے سینے میں تھے۔

ابن عباس کہا کرتے تھے کہ علم کے دس حصے ہیں۔ ان میں نو علیؑ کو ملے اور دسویں میں تمام لوگ شریک ہیں جن میں علیؑ بھی شامل ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کو صرف اپنی اپنی شریعت کا علم تھا اور علی علیہ السلام کو تمام شرائع سابقہ کا علم تھا۔ انبیاء کی جو مخصوص صفات تھیں۔ آدم کی صفوت نوحؑ قلب، ابراہیمؑ کی خلت، یعقوب کا حزن۔ یوسف کا جمال۔ موسیٰ کی مناجات ایوب کا صبر، یحییٰ کا زہد، عیسیٰ کی سنت، یونس کا ورع، محمد مصطفےٰ کا علم۔ یہ سب علیؑ کے چہرے سے ظاہر ہوتی تھیں۔ بلکہ انبیاء کی نوے خصلتیں آپ میں موجود تھیں۔ حضرت رسولؐ خدا نے خود فرمایا ہے عَلِيٌّ خَيْرُ الْبَشَرِ مَنْ أَبَىٰ فَقَدْ كَفَرَ (علیؑ بہترین بشر ہیں جس نے انکار کیا اس نے کفر کیا) اگر حضرت علیؑ اور فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ سے زیادہ گرامی قدر اور کوئی خدا کے نزدیک ہوتا تو ضرور مباہلہ میں آنحضرتؐ کو اس کے ساتھ لے جانے کا حکم ہوتا۔

حضرت رسولؐ خدا کی تمام صفاتِ حسنہ کے یہی حضرات وارث تھے اور یہی لوگ شریعتِ محمدی کے محافظ تھے۔ ان کے روحانی اقتدار کو انسانوں کا کیا ذکر فرشتوں اور جنوں تک نے تسلیم کر لیا ہے۔

تبلیغ اسلام میں جن مصائب کا سامنا ان حضرات کو ہوا وہ اس کی نظیر کسی زمانے میں نظر نہیں آتی یا اسلام کی بقاء اور استحکام کے لیے انہوں نے اپنی ہر چیز قربان کر دی۔ عزت، آبرو، جان اور مال، کسی چیز کو دین الٰہی کے مقابل عزیز نہ سمجھا۔ واقعہ کربلا میں کون سی چیز تھی جو اس قربانی سے بچ گئی۔ کیسی کیسی عزیز جانیں کربلا کے میدان میں اسلام پر قربان ہوئیں۔ جو لوگ ہدایت کے منارے، آسمانِ ایمان و یقین کے چاند ستارے اور رسولؐ اکرم کی گود کے پالے تھے۔ ان کو دشمنانِ دین نے گوسفندانِ قربانی کی طرح ذبح کر دیا۔ اور اس گھر کو جو مرکز ہدایت و کرامت تھا جہاں فرشتے وحی لے کر آتے تھے۔ جہاں سے اسلام کی نشوونما ہوئی تھی۔ جہاں انسانیت اپنے پورے کمال کے ساتھ

جلوہ گر ہوئی تھی۔ ایسا تباہ و برباد کیا کہ پھر اس گھر والوں کو کبھی اطمینان کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ اس گھر سے خوشی اس طرح رخصت ہوئی کہ پھر کبھی ان بے کسوں کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں آئی۔

منقول ہے کہ جب اہل حرم قید یزید سے رہا ہو کر مدینہ میں آئے۔ اور اس گھر میں داخلہ ہوا۔ جہاں کچھ روز پہلے زن و مرد سے بھرا ہوا تھا آج وہ سنسان پڑا ہوا ہے۔ آہ نہ اب اس میں کوئی جوان ہے نہ بوڑھا۔ چند مصیبت زدہ، فلک ستائی، کنبہ موئی بی بیاں باحال پریشان اس مدینہ میں آئی ہیں۔ جوان کے نانا کا مدینہ کہلاتا ہے۔ آہ نکلی تھیں بھرے کنبہ کے ساتھ، واپس ہوئیں تو اس حال کے ساتھ کہ سوائے امام زین العابدینؑ کے کوئی اور باقی نہیں اپنی درد بھری کہانی سنانے کے لیے پہلے روضۂ رسولؐ میں گئیں۔ ایک ایک بی بی نے بیقرار ہو کر اپنے کو قبر رسولؐ پر گرا دیا۔ جناب زینبؑ نے وہ دلخراش بین کیے کہ زمین و آسمان ہل گئے۔ نانا ہیں آپ کے پیارے حسین کو کھو آئی۔ نانا آپ کا گھر تباہ و برباد ہو گیا۔ ہمارا ایک ایک جوان ایک ایک بچّہ گوسفندِ قربانی کی طرح ذبح کر دیا۔ نانا آپ کے پیارے حسین کا سر ظالموں نے کاٹ کر نوک نیزہ پر چڑھا دیا۔ ان کی لاش سے لباس اُتارا۔ آہ! ان کی لاش پر ظالموں نے گھوڑے دوڑائے نانا ہمارے خیموں میں آگ لگائی گئی اور ہم کو اس بیدردی سے لوٹا گیا کہ کسی بی بی کے سر پر چادر نہ چھوڑی۔ ظالموں نے ہمارے شانوں میں رسی باندھی ہمیں سر برہنہ شہروں شہروں میں لیے پھرے۔ درباروں میں لے گئے۔ زندانوں میں بند کیا۔ آہ یہ بین سُن کر قبر رسولؐ کانپ گئی۔ وہاں سے روتے پیٹتے جنت البقیع میں آئے۔ جب قبر فاطمہ زہراؑ نظر آئی تو بیبیوں نے اپنے کو اس پر گرا دیا۔ جناب زینبؑ نے قبر کو چھاتی سے لگا کر فریاد کی اماں جان! ذرا قبر سے نکل کر اپنی زینبؑ کی صورت کو دیکھئے۔ اس کی داستانِ مصیبت تو سنیئے۔ اماں ہیں بھرے کنبے کی ستائی لے کر آئی ہوں۔ میرے بھیا حسین شہید ہو گئے۔ آہ قمر بنی ہاشم عباسؑ مارے گئے۔ علی اکبر و قاسم دُنیا سے رخصت ہوئے۔ اماں! اب سوائے عابد بیمار کے مردوں میں کوئی باقی نہ رہا۔ آہ! اماں میں بڑے بڑے مصائب جھیل کر آئی ہوں۔ اماں تمہارا تو جنازہ تک رات کو اُٹھا۔ اور تمہاری بیٹیاں سر کھلے بازاروں میں تشہیر ہوئیں۔ آہ نانا کی اُمت نے کوئی دقیقہ ہمارے ستانے میں باقی نہ رکھا۔ وہاں سے سب قبر امام حسنؑ پر آئے اور دلخراش بین کرتے رہے اس کے بعد محلہ بنی ہاشم میں داخلہ ہوا۔ زنانِ بنی ہاشم روتی پیٹتی گھروں سے نکل پڑیں۔ اس اُجڑے گھر میں ایک کہرام بپا تھا۔ آہ پُرسا دینے والیاں کس کس کا پُرسا دیں۔ جناب زینبؑ و کلثوم کی صورتیں پہچانی نہ جاتی تھیں۔ محلہ کی تمام بی بیاں گھیرے ہوئے تھیں۔ واحسیناہ واحسیناہ کی صدائیں ہر طرف بلند تھیں۔ بی بیاں ایک ایک فلک ستائی بی بی سے گلے مل مل کر رو رہی تھیں۔ آہ! اب اس گھر میں حسین کہاں۔ عباس کہاں، علی اکبر کہاں۔ اب تو یہ گھر بیواؤں کا گھر ہے۔ یتیموں کا گھر ہے بے وارثوں کا گھر ہے اور دیواروں پر حسرت برس رہی ہے زمین و آسمان سے نالہ و فغاں کی آوازیں آرہی تھیں۔ آہ کربلا کے مسافر کس گھڑی گھر سے نکلے تھے۔ پھر مدینہ میں آنا نصیب نہ ہوا۔ قبر رسولؐ کا مجاور علیؑ کا لال

فاطمہؑ کا دُلارا۔ مدینہ کا سرتاج اب بجائے مدینہ کے کربلا میں سو رہا ہے۔

کیا اب ان بیبیوں کو اس غم میں صبر آئے گا۔ کیا یہ قلب و جگر کے گہرے زخم مندمل ہوں گے۔ کیا یہ خون کے آنسو اب کبھی رُکیں گے۔ نہیں نہیں یہ وہ غم نہیں جس میں صبر آئے۔ یہ وہ مصیبت نہیں جس کا بار کسی وقت دل سے کم ہو۔ اب تو یہ عمر بھر کا رونا ہے۔ اس گھر والے ہی نہیں بلکہ حسینؑ کے غم میں دُنیا روئے گی۔ اور قیامت تک روئے گی جب محرّم کا چاند نظر آئے گا عاشقان حسینؑ اس غم کی یاد تازہ کریں گے۔ دل کے گہرے زخم اُبلے ہو کر بھر آنکھوں سے خون ٹپکانے لگیں گے۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

اکتالیسویں مجلس

فضائل جناب سیدہؑ اور اہل حرم کی مدینہ میں عبرتناک زندگی

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ فَاطِمَۃُ بِضْعَۃٌ مِنِّیْ مَنْ اٰذَاھَا فَقَدْ اٰذَانِیْ وَمَنْ اٰذَانِیْ فَقَدْ اٰذَی اللّٰہَ

فاطمہؑ میری رسالت کا ٹکڑا ہے جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے خدا کو اذیت دی۔

اگر بضعۃ منی سے مادی جسم کا ٹکڑا مراد لیا جائے تو خاص فضیلت معصومہ عالم کی ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہر بیٹی اپنے باپ کے جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ اس میں سیدہ کی کیا خصوصیت۔ لیکن اگر اس سے مراد رسالت کا ٹکڑا مراد ہو تو البتہ ایک بہت بڑی فضیلت ہوگی۔ حضور سرور انبیاءؐ کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک بشری دوسری نبوتی۔ ان کے خصوصیات بھی جداگانہ تھے اور ان کے رشتہ دار بھی الگ تھے۔ مثلاً بشری اعتبار سے حضورؐ کے بہت سے نسبتی اور سببی رشتہ دار تھے۔ ازدواج بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ لیکن نبوت و رسالت کے اعتبار سے ان رشتہ داروں کی تعداد چار سے آگے حیات رسولؐ میں نہ بڑھی یہی رسالت کے ٹکڑے تھے جن کے مجموعے کا نام پنجتن پاک تھا۔ یہی رسالت کے رشتہ دار تھے۔ جن کے سروں پر چادر تطہیر نے سایہ کیا تھا۔ اگر اس میں بشری رشتہ داروں کے سمانے کی گنجائش ہوتی تو ام سلمہ ضرور اس چادر کے اندر داخل کر لی جاتیں۔ یہی نبوت کے رشتہ دار تھے۔ جن کو حضورؐ اپنی رسالت کی گواہی دلوانے روز مباہلہ نکلے تھے یہی نبوت کے رشتہ دار تھے۔ جن کو

حضورؐ نے لفظ منّی سے نسبت دی ہے عَلِیٌّ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ الرَّأسِ مِنَ الْجَسَدِ۔ فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِنِّیْ حَسَنٌ مِنِّیْ وَحُسَیْنٌ مِنِّیْ ان کے سوا اور کہیں یہ نسبت نہیں پائی جاتی حالانکہ بشری رشتہ بہت سے ہیں۔

یہی رسولؐ کے اجزائے رسالت تھے جن کی شان میں آیۂ تطہیر نازل ہوئی۔ اگر یہ اہل بیت بشری حیثیت کے ہوتے تو یہ تطہیر کاملہ سب میں یکساں پائی جانی چاہیے تھی۔ کیونکہ خاندان والے تو سب ہی تھے یا کم سے کم ازدواج میں یہ طہارت کاملہ ہوتی یعنی رجس ظاہری و باطنی سے کوسوں دور ہوتی۔ مگر وہ حیض و نفاس سے پاک نہ تھیں اور گناہوں کا صدور بھی ان سے ثابت ہے جیساکہ قرآن میں کئی جگہ ان کی کجروی پر توبیخ ہے اور ان کے قلوب کی کجی کی خبر دی ہے برخلاف اس کے اجزائے رسالت کی ہر جگہ قرآن میں تعریف ہے۔

خداوند عالم نے جس طرح مردوں کی ہدایت کے لیے بے شمار ہادی بھیجے عورتوں کی ہدایت کا بھی بندوبست کیا ورنہ ان پر حجت تمام نہ ہوتی کوتاہی عمل پر کہہ سکتی تھیں کہ مردوں کی حالت کا ہم پر قیاس نہیں ہوسکتا۔

جناب نوحؑ کے بعد شجرۃ الانبیاء جناب ابراہیمؑ قرار پائے جن سے دو شاخیں چلیں۔ ایک جناب اسمٰعیل سے دوسری جناب اسحٰق سے ان دونوں سلسلوں میں ایک عورت مرکز ہدایت رہی۔ نسل اسحاق میں جناب مریمؑ تھیں اور نسل اسماعیل میں جناب فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا۔ دونوں معصوم دونوں صاحب طہارت، دونوں نساء عالمین کی سردار لیکن مریمؑ و فاطمہؑ میں بلحاظِ فضیلت بڑا نمایاں فرق ہے۔

۱۔ مریم کے باپ عمران انبیاء میں سے نہ تھے۔ فاطمہؑ کے باپ سردار الانبیاء ہیں۔

۲۔ مریم کی والدہ ایک نیک بی بی ضرور تھیں لیکن وہ محسنہ اسلام کے لقب سے محروم رہیں۔ برخلاف اس کے سیدہ عالم کی والدہ محسنہ اسلام ہیں۔

۳۔ مریم صرف اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار ہیں اور فاطمہ قیامت تک عورتوں کی سردار ہیں۔

۴۔ مریم صرف دنیا کی عورتوں کی سردار تھیں اور سیدہ عالم سیدہ نساء اہل الجنۃ بھی ہیں۔

۵۔ مریم صرف ایک حیثیت سے عزیز ہیں۔ یعنی جناب عیسیٰ کی نسبت سے اور فاطمہ دو حیثیتوں سے عزیز ہیں یعنی حسنؑ و حسینؑ دو معصوموں کی ماں ہیں۔

۶۔ مریم کے لیے شوہر کی نسبت سے عظمت کا فقدان ہے۔ کیونکہ ان کے شوہر ہی نہ تھے اور سیدہ عالم کے شوہر دلی امر تھے۔ نفس رسولؐ تھے۔ مطاع مطلق تھے۔

۷۔ مریم کے متعلق یہودیوں نے افترا پردازی کی اور آج تک وہ اپنے اس غلط خیال پر قائم ہیں لیکن سیدہ عالم کے دامن حیات پر اس قسم کی ہلکی سی چھینٹ بھی نہیں۔

قرآن مجید میں بہت سی عورتوں کا ذکر ہے جن کا نام لیا گیا ہے۔ بعض کے حالات بیان کئے گئے ہیں مثلاً حوّا۔ زوجہ نوح اور لوط۔ آسیہ زن فرعون، جناب سارہ زوجہ ابراہیم۔ مادر موسیٰ۔ زلیخا (امراۃ العزیز) بلقیس زوجہ سلیمان، زوجہ زکریا حسینیہ مادر جناب مریم۔ جناب مریم ازدواج رسولؐ۔ لیکن ان میں ایک بھی جناب سیدہ کے برابر نہیں۔ عورت کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کی اچھی بیٹی ثابت ہو۔ شوہر کی اچھی بی بی اولاد کی اچھی ماں۔ ان ہی تین نسبتوں سے عورت کے اخلاقی فضائل اور نسوانی کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔ ان تینوں حلقوں میں سیدۃ نساء العالمین کا درجہ سب سے بلند ہے آیئے ذرا اس پر ایک تفصیلی نظر ڈالیں۔ حوّا نبی کی بی بی ہیں۔ برگزیدہ عورت ہیں۔ لیکن ترک اولیٰ ہیں آدم کے ساتھ شریک ہیں۔ سب سے پہلے شیطان نے اپنا جال ان ہی پر ڈالا اور ان ہی نے اصرار کر کے آدم کو گیہوں کھلوایا۔ لہذا وہ اپنے شوہر کی اس لحاظ سے اچھی بی بی ثابت نہ ہوئیں۔ اور ان کی فضیلت کا یہ رکن تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ زوجہ نوح و لوط کی تو کھلی مذمت قرآن میں موجود ہے۔ لہذا ان کا تو فضیلت سے تعلق ہی نہ رہا۔ جناب سارا زوجہ ابراہیم نسل انبیاء سے ضرور ہیں۔ لیکن ان کے اندر سوتیا ڈاہ اس حد تک تھی کہ جناب ابراہیم کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ جناب ہاجرہ کو ملک شام سے لے کر جا کر کسی ملک میں بسائیں۔ لہذا وہ اپنے شوہر کے لیے اچھی بی بی ثابت نہ ہوئیں۔ دوسرے جب فرشتے جناب اسحٰق کی ان کو بشارت دی تو ان کو بڑا تعجب ہوا۔ اور اس پر یقین نہ آیا کہ ایک بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے بھی بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ فرشتہ نے کہا۔ اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ (سورہ ہود ۷۳/۱۱) کیا تم امر خدا پر تعجب کر رہی ہو۔ اس سے معلوم ہوا ایمان میں کچھ خلا ضرور تھا لہذا اس نے ان میں فضیلت کا رنگ ہلکا کر دیا۔ زلیخا بھی بلحاظ کردار اچھی عورت ثابت نہ ہوئی۔ اس نے اپنے ہونے والے شوہر سے انتہائی بدسلوکی کی۔

مادر موسیٰ اچھی ماں ضرور تھیں لیکن شوہر کے لیے اچھی بی بی ثابت ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ زوجہ موسیٰ صفورا نبی زادی ضرور تھیں، لیکن وہ وصی موسیٰ جناب یوشع سے چونکہ لڑیں لہذا اچھی بی بی ثابت نہ ہوئیں آسیہ زن فرعون اچھی بی بی ضرور تھیں مگر بے اولاد ہیں۔ اس لیے اچھی ماں بن کر دکھلانے کا شرف حاصل نہ ہوا۔ مریم اچھی بیٹی تھیں اچھی ماں تھیں لیکن اچھی بی بی بن کر دکھانے کا موقعہ نہ ملا لہذا ان کا یہ کمال پردہ میں ہی رہا۔ بلقیس اچھی بی بی تھیں لیکن اولاد نہ ہوئی تو اچھی ماں بن کر نہ دکھا سکی۔ ازدواج رسولؐ میں سوائے جناب خدیجہ کبریٰ سب بے اولاد مریں۔ لہذا یہ فضیلت ان کو بھی نہ ملی کہ اچھی ماں بن کر دکھائیں۔ البتہ جناب خدیجہ کو یہ شرف حاصل ہوئے۔ باپ کی اطاعت شعار بیٹی تھیں شوہر کی فرمانبردار بی بی فاطمہؑ کی شفیق ماں۔ اب ایک نظر فاطمہ کے اندر ان تینوں نسبتوں کی برتری پر ڈالیے۔

۱۔ باپ کی ایسی پیاری بیٹی کہ رسولؐ نے اپنی رسالت کا جزو بنایا۔ ایسی صاحب فضیلت کہ رسولؐ ان کی تعظیم کے لیے اُٹھتے تھے یہی ثبوت ہے اس کا کہ شریک نبوت رسالت تھیں۔ شریک عصمت و طہارت تھیں۔ قربت ایزدی کا شرف ان کو حاصل تھا۔ ورنہ باپ پر بیٹی کی تعظیم روا نہیں۔ لیکن آنحضرتؐ بشری رشتہ کی بناء پر

تعلیم نہ کرتے تھے بلکہ رسالت کے رشتہ دار کی حیثیت سے کرتے تھے۔ سیدہ اپنے باپ کی ایسی پیاری بیٹی کہ خدا نے ان ہی پر رسولؐ کی اولاد کا خاتمہ کردیا کہ رسولؐ کی شفقت سوائے فاطمہؑ کے دوسری طرف نہ جائے۔

۲۔ شوہر کی ایسی فرض شناس بی بی کہ ان کے سوا دنیا میں کوئی دوسری بی بی نظر نہیں آتی۔ ہر عورت فطرتاً اس کی خواہاں ہوتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے یہاں عیش و آرام کی زندگی بسر کرے۔ لیکن فاطمہ جب بیاہی ہوئی علیؑ کے گھر میں آئیں تو یہاں سوائے رحمت و برکت کے گھر میں تھا ہی کیا۔ جو جہیز لائی تھیں وہی علیؑ کے گھر کا سرمایہ تھا۔ اسلامی محبت میں علیؑ و فاطمہؑ نے جس تنگ دستی میں بسر کی۔ اس کا مختصر حال یہ ہے کہ فاقے پر فاقے کیے۔ چکیاں پیسیں۔ تنور روشن کیے، کپڑوں میں پیوند لگائے مگر کیا ممکن کہ اُف تو کرلیں۔ شوہر کی شکایت کا کوئی حرف زبان پر آجائے۔ ہر حال میں راضی خوش۔ جب تک زندہ رہیں شوہر کی انتہائی فرمانبردار بی بی رہیں۔

۳۔ اولاد کی بہترین ماں بن کے دکھایا۔ اپنے دونوں صاحبزادوں کو ایسی تعلیم دی کہ جوانانِ جنت کے سردار بن گئے۔ اسلام کے شہزادے کہلائے۔ دین حق کی حمایت میں اپنی جانیں قربان کردیں۔

اب ایک دوسری حیثیت سے سیدہ عالم کی فضیلت کا اندازہ کیجئے۔ دُنیا کی ہر عورت میں تین نقص پائے جاتے ہیں۔ اوّل وہ ناقص العقل ہے۔ اسی لیے شریعتِ اسلامیہ نے دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر رکھی ہے۔ دوسرے وہ ناقص العبادہ ہے۔ یعنی ہر ماہ اس کو چند روز کے لیے عبادت سے محروم رہنا پڑتا ہے۔ تیسرے وہ ناقص الحظ ہے یعنی میراث میں اس کا حصّہ مرد سے آدھا ہے۔ لیکن سیّدہ عالم ان تینوں عیبوں سے بری تھیں۔ وہ ناقص العقل تھیں کیونکہ عصمت کا ان پر سایہ تھا۔ مباہلہ میں رسولؐ ان کو مرد کے برابر گواہ بنا کر لے گئے۔ وہ ناقص العبادہ بھی نہ تھیں کیونکہ ہر قسم کے رجس ظاہری سے پاک تھیں۔ تیسرے ناقص الحظ بھی نہ تھیں کیونکہ رسولؐ کے پورے ترکہ کی مالک تھیں۔ غالباً اسی لیے خدا نے رسولؐ کا کوئی بیٹا باقی نہ رکھا۔ کہ سیدہ اس فضیلت سے محروم ہو جاتیں۔ مریم طاہرہ ضرور ہیں لیکن ناقص العبادہ تو نہیں کہی جاتیں۔ لیکن باقی دو فضیلتوں کا اظہار ان سے نہیں ہوا۔ مردوں کی ہدایت کے لیے بہت سے ہادی آتے رہے۔ آنحضرتؐ کے بعد ان کا سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رہا۔ لیکن عورتوں کی ہدایت کو صرف سیّدہؑ عالم کا اسوہ حسنہ کافی سمجھا گیا جو قیامت تک نسواں عالم کے لیے نمونہ عمل رہے گا۔ مریمؑ ایک نبی کی ماں تھیں۔ عیسائیوں نے ان کا کیسا احترام کیا کہ ان کا بت بنا کر پوجا۔ لیکن فاطمہؑ جو خاتم الانبیا اور سیدالمرسلینؐ کی پارۂ جگر تھیں اور فضائل و مناقب میں مریمؑ سے کہیں زیادہ تھیں۔ اُمّتِ رسولؐ نے ان کی قدر نہ کی۔ قدر کرنا تو ایک طرف بعد رسولؐ معصومۂ عالم ایسی ستائی گئیں۔ کہ ایک دن آنکھ سے آنسو نہ تھما۔ انتہائی کرب میں یہ شعر فرماتی تھیں ؎

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّهَا ‌ ‌ ‌ صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

مجھ پر ایسی مصیبتیں نازل ہوئیں اگر دنوں پر پڑتیں تو راتیں بن جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسولؐ کے بعد اس گھر کے در و دیوار پر ایسی حسرت چھائی کہ کوئی دن پھر اس گھر والوں کو اطمینان کا نصیب ہی نہ ہوا۔ غم کا کانٹا دل سے نکلا ہی نہیں اور کربلا کے واقعہ کے بعد تو وہ مصیبت کبریٰ نازل ہوئی کہ اس کے تصور سے کلیجہ کانپ اُٹھتا ہے۔ سنہ ۶۱ھ میں یہ گھر ایسا اُجڑا کہ پھر آباد ہوا ہی نہیں۔ کسی خاندان کی عورتوں نے اتنے مصائب کا مقابلہ نہیں کیا۔ جتنا زنانِ اہلِ حرم کو کرنا پڑا۔ گرمی کے موسم میں سفر کی سخت سے سخت تکالیف صبر سے برداشت کیں، کربلا میں پہنچیں تو بھوک و پیاس کی شدت نے جانوں پر بنا دی۔ عاشورہ کا دن آیا تو اپنے وارثوں، عزیزوں اور گود کے پالوں کے لاشے خاک پر گرتے دیکھے ان کے اجسام مطہرہ کو پامال ہوتے دیکھا ان کے سروں کو نیزوں پر بلند دیکھا ان کے قتل کی دشمنوں کو خوشی مناتے دیکھا اس واقعہ ہائلہ کے بعد دشمنوں نے لوٹنا شروع کیا۔ کسی بی بی کے سر پر چادر تک نہ چھوڑی۔ پھر خیموں کا جلنا دیکھا شامِ غریباں کا ہولناک منظر بھی نظر کے سامنے آیا۔ اس کے بعد اسیری کی تکلیفیں جھیلیں۔ شہروں شہروں میں تشہیر بھی ہوئی ظالموں کے درباروں میں بھی جانا پڑا۔

بتایئے ان واقعات کے بعد ان بیکسوں کی زندگی کیسی تلخ ہو گئی ہوگی۔ اسلام کے نام پر ساری بضاعت مٹا کر مدینہ واپس آئیں۔ مگر اس طرح کہ جس بھرے گھر سے نکلیں تھیں وہ اب اُجاڑ و ویران ہے۔ اس کے در و دیوار پر حسرت برس رہی ہے۔ نہ کسی جوان کی صورت نظر آتی ہے نہ بچے کی۔ ایک امام زین العابدینؑ کے سوا کوئی زندگی کا سہارا نہیں۔

ساری عمر اس طرح گزری کہ دھوپ سے سایہ میں نہ آئیں۔ ٹھنڈا پانی پیا نہیں، چولہے میں آگ سُلگی نہیں۔ بالوں میں کنگھی نہ کی۔ سر میں تیل نہ ڈالا۔ آنکھوں میں سُرمہ نہ کیا۔ رونے کے سوا دوسرا کام نہ تھا۔ جب پہلا سماں یاد آتا ہوگا تو دل پر کیسی چھری چلتی ہوگی۔ حسینؑ جیسا سرپرست سر پر نہ رہا۔ علی اکبر جیسا جوان شبیہ پیغمبر اب کہاں قاسم جیسا ثانی حسنؑ کہاں۔ عون و محمد کہاں۔ بیشۂ شجاعت کا شیر سکینہ کا سقّا ابوالفضل عباسؑ کہاں۔ ان کے بھائی کہاں۔ ہائے بیکس و بے بس بیبیاں کس کس کا ماتم کریں۔ کس کس کو روئیں۔ صبر کریں تو کیوں کر کلیجہ کو کہاں تک مسوسیں پرسا دیں تو کس کس کا۔ داستانِ غم سنائیں تو کس کس کو۔

امام زین العابدینؑ کا یہ حال کہ جب تک زندہ رہے آنکھ کا آنسو نہ تھما۔ حضرت یعقوب کا گریہ مشہور ہے مگر وہ چند سال تھا۔ اس کے بعد غم خوشی سے بدل گیا اور آنکھوں کی گئی ہوئی بینائی واپس آ گئی۔ لیکن امام زین العابدینؑ نے تو چالیس سال تک گریہ کیا۔ اور ایسا گریہ کیا کہ رخسارے زخمی ہو گئے۔ پھر ایسا گریہ کہ مرتے دم تک خوشی کا نام نہ آیا۔ پانی سامنے آتا تو اتنا روتے کہ آنسوؤں سے ممزوج ہو جاتا اس کو پھینک دیتے کئی کئی بار ایسا ہوتا ٹھنڈا پانی تو پینا ہی چھوڑ دیا تھا اگر کبھی کبھار کسی ضرورت سے گھر سے نکلتے تو قصاب کے کٹے ہوئے سروں پر پردہ ڈال دیتے۔ ایک بار کٹا ہوا سر دیکھ لیا تو غش

کھاکر گر پڑے۔ عمر بھر سیاہ لباس پہنا۔

جو کوئی ملنے کو آتا اسے اجازت نہ تھی کہ سوائے واقعہ کربلا کے کوئی دوسرا ذکر کرے۔ منہال کوفی کہتے ہیں۔ جب امام قید یزید سے رہا ہو کر مدینہ میں آگئے تو میں ایک روز امام زین العابدینؑ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے مدینہ آیا۔ جب دروازہ پر پہنچا تو پہلا زمانہ یاد آگیا۔ ہاشمی اور علوی جوانوں کی صورتیں آنکھوں میں پھرنے لگیں۔ امام حسین علیہ السلام کی ایمان افروز صحبتوں کی یاد نے کلیجہ بھر مادیا بڑے صبر و ضبط کے ساتھ دق الباب کیا۔ ایک کنیز نے جو سیاہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ دروازہ کھولا۔ مجھ سے پوچھا تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو، میں نے کہا میں منہال کوفی ہوں اور امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا ٹھہرو میں باریابی کی اجازت حاصل کر لوں۔ کچھ دیر بعد واپس آئی اور مجھ سے کہا چلیئے امام علیہ السلام نے اجازت دی ہے۔ جب میں چلنے لگا تو اس نے میری آستین پکڑ کر کہا سنو امام کے سامنے سوائے پُرسا دینے کے اور کوئی بات نہ کرنا۔

جب میں اندر داخل ہوا تو مکان میں ایک طرف پس پردہ مجھے بی بیوں کے رونے کی آواز سنائی دی۔ واحسیناہ واعباساہ واعلی اکبراہ کے نعرے بلند تھے۔ عالم اضطراب میں میرا یہ حال تھا کہ پاؤں ڈالتا کہیں اور پڑتا کہیں تھا آنکھوں تلے اندھیرا چھایا ہوا تھا اور دل سینے میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ کنیز نے ایک حجرہ کی طرف اشارہ کیا کہ امام علیہ السلام یہاں ہیں۔ میں وہاں گیا۔ تو آپ کو ایک حصیر کہنہ پر بیٹھا ہوا پایا۔ میں نے سلام کیا اور اشک بار آنکھوں سے قدموں پر گر پڑا۔ امام علیہ السلام بھی زار زار رو رہے تھے۔ اسی اثنا میں حضرت کے ساق پا سے کپڑا ہٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں میں نے کہا۔ حضور یہ سیاہ حلقے کیسے ہیں فرمایا منہال کیا پوچھتے ہو ان پیروں میں دوہری بیڑیاں پہنائی گئی تھیں۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور گلے میں خاردار طوق ڈالا تھا۔ اس کے بعد اپنا سینہ دکھایا جس میں ایک ناسور تھا۔ فرمایا یہ اس خاردار طوق نے ایسا زخمی کیا تھا کہ آج تک وہ زخم نہیں بھرا۔ اس کے خار ہر وقت میرے سینے میں چبھتے تھے۔

منہال کہتے ہیں۔ میں نے عرض کی مولا واقعہ کربلا کو بیان فرمایئے۔ یہ سن کر تاب ضبط نہ رہی۔ بے قراری سے رونے لگے۔ اور فرمایا اے منہال کون کون سی مصیبت بیان کروں تین روز تک ہمارے بچے پانی سے ترسائے گئے۔ ہمارے ہر خیمہ سے آوازِ العطش العطش بلند ہوتی تھی۔

عاشورہ کے دن فرزند رسول کے تمام ساتھی جن میں اٹھارہ بنی ہاشم تھے بھوکے پیاسے گوسفندانِ قربانی کی طرح ذبح کر دیئے گئے۔ یہاں تک کہ میرا ششماہہ بھیا علی اصغر بھی ان ظالموں کے ظلم سے نہ بچ سکا۔ اسے بھی تیر ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ میرے بابا کا سر جدا کر کے نیزہ پر چڑھایا گیا۔ بعد شہادت ہم کو بے دردی سے لوٹا گیا۔ ہمارے خیمے جلائے گئے۔ ہماری عورتوں اور بچوں کو قید کر کے کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے گئے۔ ہماری بی بیوں کو سر دیا برہنہ ابن زیاد و یزید کے

پھرے درباروں میں کھڑا کیا گیا۔

اے منہال یہ وہ مصائب ہیں کہ اگر پتھروں پر پڑتے تو پانی ہو جاتے۔ لوہا موم کی طرح پگھل جاتا۔ آدم سے لے کر عیسیٰؑ مریمؑ تک کسی نبی کی اولاد پر ایسا ظلم نہیں ہوا جیسا پیغمبر آخرالزمان کی اولاد پر خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہوا۔ آپ یہ داستانِ غم بیان کرتے جاتے تھے اور آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں نے عرض کی مولا صبر کیجئے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اس غم میں ہلاک ہو جائیں۔

فرمایا اے منہال انصاف کر دیعقوب کے بارہ فرزند تھے ان میں سے صرف یوسف ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے تو اتنا گریہ کیا تھا کہ آنکھوں کی بینائی کھو بیٹھے تھے اور میرا تو گھر کا گھر تباہ ہو گیا۔ نہ کوئی بوڑھا باقی ہے نہ جوان نہ بچہ کسی گھر سے ایک جنازہ نکلتا ہے تو رونے والے مدتوں تک اسے یاد کر کے روتے ہیں اور کسی طرح صبر نہیں آتا اور میرے گھر سے تو بہتر جنازے نکل گئے۔ اے منہال اسلامی دستور تو یہ ہے کہ جب کسی کے گھر کوئی مر جاتا ہے تو لوگ اس کے عزیزوں کے پاس تعزیت کو آتے ہیں۔ اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ اس کا غم مٹانے کی کوشش کرتے ہیں مگر آہ کربلا میں بجائے تسلّی دلاسا دینے کے ہماری مدد کرنے اور ہماری ظاہر کرنے کے ظالموں نے کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو ہم پر نہ کیا۔ انتہا یہ کہ ہماری بی بیاں جی بھر کر اپنے شہیدوں کو رو بھی نہ سکیں۔ آہ ہمارے شہیدوں کو دفن تک نہ کیا گیا۔

منہال کہتے ہیں۔ قریب تھا کہ ان واقعاتِ جاں فرسا کو سن کر مجھے غش آ جائے میں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ جب میں چلنے لگا تو حضرت نے پوچھا منہال کہاں کا ارادہ ہے میں نے کہا کوفہ کا۔ فرمایا ہم نے سنا ہے مختار قاتلانِ حسینؑ سے بدلے رہے ہیں اور چن چن کر ان کو قتل کر رہے ہیں۔ تم کوفہ جا کر مختار سے ضرور ملنا اور ہماری طرف سے کہنا کہ اگر حرملہ پر قابو پا لینا تو اس شقی کے ہاتھ قلم کر دینا۔ اس نے ہم اہلبیتؑ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ میرے شیرخوار بھائی علی اصغر کا گلا تیر سے اس ظالم نے چھیدا تھا۔ منہال کہتے ہیں جب میں کوفہ پہنچا تو مختار سے ملنے گیا۔ ابھی میں مختار کے پاس امام کی خواہش بیان کرنے بھی نہ پایا تھا کہ شور و غل کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ لوگ حرملہ کو گرفتار کر کے لائے ہیں۔ جب وہ شقی مختار کے سامنے آیا تو اس کو دیکھتے ہی مختار کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ڈانٹ کر فرمایا بتا ظالم تو نے کربلا میں کیا کیا ستم ڈھائے تھے۔ اس نے کہا روزِ عاشورہ میرے ترکش میں تین تیر تھے۔ جن میں سے ایک تیر میں نے مشکِ عباس پر لگایا جب وہ بھری ہوئی مشک خیامِ حسینی تک لے جانا چاہتے تھے۔ میرا تیر لگتے ہی پانی مشک سے بہہ گیا۔ مختار نے کہا لعنت ہو تجھ پر اے شقی تو نے نہ چاہا کہ حسین علیہ السلام کے پیاسے بچے سیراب ہوں۔ اچھا بتا دوسرا تیر تو نے کہاں مارا۔ اس نے کہا جب حسینؑ اپنے شش ماہہ بچے کو ہاتھوں پر لے کر آئے اور اس کی تباہ حالت دیکھ کر لشکرِ یزید کی حالت دگرگوں ہو گئی تو میں نے ایک تیر مار کر اس بچہ کا کام تمام کر دیا۔ مختار رونے لگے اور فرمایا اچھا تیسرا تیر کہاں مارا۔ اس نے کہا جب حسینؑ گھوڑے سے ڈگمگا رہے تھے تو میں نے ان کی پیشانی پر ایسا تیر مارا کہ پھر وہ گھوڑے پر رک نہ سکے۔

یہ سنتے ہی مختار نے حکم دیا کہ پہلے اس شقی کے ہاتھ کاٹو۔ پھر پیر کاٹو۔ پھر اس کی کھال کھینچی گئی۔ اس کے بعد اسے کھولتے تیل میں ڈال دیا گیا۔

میں یہ حکم سُن کر رونے لگا۔ مختار نے کہا۔ یہ وقت خوشی کا ہے۔ روتے کیوں ہو۔ میں نے امام کا پیغام پہنچایا اور کہا آپ نے وہی کیا جو امام کی خواہش تھی۔ رویا اس بات پر کہ ایسے مستجاب الدعوات اور مقرب بارگاہِ ایزدی کو ظالموں نے کیسا کیسا ستایا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ساقین بیڑی سے اور سینہ طوق سے ابھی تک زخمی تھا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ

انتساب

میں اپنی اس مقبول عام کتاب کی جلد چہارم کا انتساب اپنے مرحوم والدین کے نام سے کرتا ہوں جن کی دعاؤں کا اثر میری دینی خدمات اور منازل حیات میں میری کامیابی ہے۔ اے خالق بے نیاز اے معبود برحق تیری بارگاہ عزت و جلال میں میری یہ درخواست ہے کہ جب تک میری یہ کتاب مجلسوں اور منبروں پر پڑھی جائے جب تک اہل ایمان اس سے فیض روحانی حاصل کرتے رہیں اس کا ثواب میرے شفیق والدین کی روح کو پہنچتا رہے تیری رحمت بے پایاں میری امید کا سہارا ہے۔

ناچیز
ظفر حسن

التماس دعا

حضرت ادیب اعظم و مفسر قرآن مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ (مرحوم) ابن سید دلشاد علی صاحب مرحوم کی روح کے ایصال ثواب کے لیے مومنین سے سورہ فاتحہ کی درخواست ہے۔

کچھ اس ایڈیشن کے بارے میں

ظفر پبلیکیشنز ٹرسٹ کے ممبران اور مومنین کی خواہش پر مصباح المجالس جلد چہارم کی کتابت از سرِ نو کرا لی گئی ہے اس کے علاوہ آیاتِ قرآنی کے حوالہ جات بھی ہر آیت کے نیچے بمعہ سورہ اور آیت نمبر دیئے گئے ہیں طباعت اور کاغذ کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے تاکہ اس کا معیار ٹرسٹ کی دوسری کتب کی طرح دیدہ زیب رہے اس کتاب کی عربی عبارت خصوصاً احادیث کی تصحیح کے سلسلہ میں قبلہ کعبہ عالیجناب مولانا علی اصغر صاحب پرنسپل جامعہ کراچی کا تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے میری معاونت فرمائی۔

سیّد شبیہ الحسن نقوی
ٹرسٹی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر ... ... ظفر شمیم پبلیکیشنز ٹرسٹ ناظم آباد ۲ کراچی

مطبع ... ... قریشی آرٹ پریس ناظم آباد کراچی
کتابت ... ... سیّد شبیہ الحسن نقوی امروہوی
سالِ اشاعت ... ... جون ۱۹۹۶ء
ہدیہ ... ... ۱۵۰/= روپے

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
پہلی مجلس	فضائل حضرت رسولخداؐ و وفات آنحضرتؐ، جناب سکینہ کا لاش پدر سے لپٹ کر رونا۔	۱
دوسری مجلس	مودت اہلبیتؑ کے متعلق قیامت میں سوال، مصائب جناب سیدہ۔ امام حسینؑ کی مدینہ سے رخصت	۱۳
تیسری مجلس	آل محمدؐ کے فضائل، مدینہ سے امام حسین علیہ السلام کا کوچ۔	۲۶
چوتھی مجلس	انسان کی فضیلت، محمدؐ و آل محمد کے فضائل۔ شہادت امام حسین علیہ السلام۔	۳۸
پانچویں مجلس	انبیاءؑ کے مصائب کا مقابلہ مصائب حسینؑ سے، زنان الحرم کے مصائب۔	۴۷
چھٹی مجلس	تزکیۂ نفس کا بیان۔ حُر کے لشکر کو پانی پلانا۔ حضرت حُر کی شہادت۔	۵۶
ساتویں مجلس	دُعا کے فضائل اور اس کی قبولیت کی شرائط۔ عبدیت کا بیان۔ امام علیہ السلام کا کربلا میں ورود۔	۶۸
آٹھویں مجلس	اسلامی احکام کی خوبیاں۔ اسلامی زندگی، امیرالمومنین کے فضائل۔ کربلا سے اہلحرم کی روانگی۔	۷۸
نویں مجلس	موسیٰؑ اور حضرت رسولخداؐ کے واقعات میں مساواتی صورت۔ شہادت حضرت مسلمؑ۔	۸۸
دسویں مجلس	آئمہ اہل بیت کا علم، شہادت حبیب ابن مظاہر۔	۹۹
گیارہویں مجلس	والدین کا حق فضائل اصحاب حسین۔ شہادت وہب۔	۱۰۹
بارہویں مجلس	امیرالمومنین علی علیہ السلام کے فضائل، شہادت پسران جناب زینب۔	۱۱۸
تیرہویں مجلس	پانی کا بیان اور کربلا میں بندش آب، شہادت جناب بریر ہمدانی۔	۱۲۶
چودہویں مجلس	شہد کی مکھی کا حال امیرالمومنینؑ کی سیاست، حضرت قاسم کی شہادت۔	۱۳۵
پندرہویں مجلس	معجزات و کتاب و میزان کا بیان، شہادت حضرت علی اکبر علیہ السلام	۱۴۷
سولہویں مجلس	فضائل حضرت رسولخداؐ اور شہادت امام حسین علیہ السلام۔	۱۶۲
سترہویں مجلس	مسئلہ شفاعت، فضائل اہلبیتؑ۔ شہادت حضرت عباسؑ	۱۷۷

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
اٹھارہویں مجلس	ذکر فضیلت حضرت رسولخدا انبیاء علیہم السلام پر اور فضائل اہلبیتؑ اور شہادت انصار حسین ۔	۱۸۸
انیسویں مجلس	قصہ حضرت آدم علیہ السلام و فضائل اہل بیتؑ ۔ واقعات بعد شہادت امام مظلوم ۔	۲۰۱
بیسویں مجلس	واقعات حضرت نوحؑ فضائل اہلبیتؑ اور شام غریباں ۔	۲۱۱
اکیسویں مجلس	قصہ حضرت ہود مع فضائل اہل بیتؑ اور گیارہویں محرّم کے واقعات ۔	۲۱۹
بائیسویں مجلس	قصہ جناب صالح ۔ فضائل اہلبیتؑ اور اہل حرم کا ورود سرحد کوفہ میں ۔	۲۲۷
تیئسویں مجلس	قصہ حضرت ابراہیمؑ اور فضائل و مصائب اہلبیتؑ ۔	۲۳۶
چوبیسویں مجلس	قصہ حضرت لوط علیہ السلام فضائل و مصائب اہلبیتؑ ۔	۲۴۷
پچیسویں مجلس	قصہ حضرت یعقوب و یوسفؑ اور فضائل اہلبیتؑ اور واقعہ عبداللہ بن عفیف ۔	۲۵۶
چھبیسویں مجلس	قصہ حضرت یوسف مع فضائل و مصائب اور اہلبیتؑ الحرم کا دربار ابن زیاد میں داخلہ ۔	۲۶۶
ستائیسویں مجلس	جناب ایوب کا قصہ و فضائل اور مصائب اہلبیتؑ (زندان کوفہ) ۔	۲۷۴
اٹھائیسویں مجلس	حضرت شعیب علیہ السلام کا قصہ ۔ فضائل اہلبیتؑ و روانگی اہلحرم بہ دمشق	۲۸۲
انتیسویں مجلس	قصہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ۔ فضائل اہلبیتؑ و دمشق میں اہلحرم کا داخلہ ۔	۲۹۲
تیسویں مجلس	قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام و فضائل اہل بیتؑ اور بازار شام ۔	۳۰۲
اکتیسویں مجلس	قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام و فضائل اہلبیتؑ اور دربار یزید ۔	۳۱۲
بتیسویں مجلس	قصہ حضرت داؤد و سلیمان و فضائل اہل بیتؑ دربار یزید ۔	۳۲۲
تنتیسویں مجلس	قصہ حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام و فضائل اہل بیتؑ اور زندان شام ۔	۳۳۱
چونتیسویں مجلس	حضرت مریم و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا قصہ اور فضائل اہلبیتؑ اور زندان شام ۔	۳۳۷
پینتیسویں مجلس	فضائل جناب سلمان و فضائل اہلبیتؑ و حال زندان شام ۔	۳۴۶
چھتیسویں مجلس	فضائل حضرت ابوذر غفاریؓ و فضائل اہل بیتؑ و قید یزید سے رہائی ۔	۳۵۴
سینتیسویں مجلس	فضائل حضرت عمار یاسرؓ فضائل اہلبیتؑ و روانگی اہلحرم دمشق سے ۔	۳۶۴
اڑتیسویں مجلس	نفس انسانی کا بیان ۔ فضائل اہلبیتؑ ۔ ورود اہل حرم کربلا میں ۔	۳۷۲
انتالیسویں مجلس	ایمان کی صورتیں، فضائل امیرالمومنین و ورود اہلحرم مدینہ میں ۔	۳۸۳
چالیسویں مجلس	شان رسالت و امامت اہلحرم کا مدینہ میں داخلہ ۔	۳۹۳
اکتالیسویں مجلس	فضائل جناب سیدہؑ اور اہلحرم کی مدینہ میں عبرتناک زندگی ۔	۳۹۹